

مشارکتی و عرف جہانی استاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت

# تناول

خاطرِ یادِ پیدل



بدوش بھی یہ نام لے رہا تھا۔ اس نام کے ساتھ اس نے کسی ارچند بانو کا ذکر بھی کیا تھا۔

”تو انھو میاں سے۔“ بابولیات نے تیزی سے کہا۔

”تمہارا میاں موجود ہونا ٹھیک نہیں۔“ اس نے مجھے باقاعدہ

بازو سے تھاما اور آٹھ دس قدم چلا کر نشست گاہ کے ایک بنگلی

دروازے پر لے آیا۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے ایک مختصر

سے کمرے میں دھکیلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ چند ہی

لمحے گزرتے تھے کہ نشست گاہ میں ”نستے“ کی شرلی زنانہ

آواز گونجی۔ میں ایک ساعت میں پہچان گیا، یہ ارچند بانو کی

آواز تھی۔ نشست گاہ سے ملی جلی آواز اس آئے لگیں، ان

میں شیطان اے ایس آئی بلراج کی آواز بھی تھی۔ میں جس

کمرے میں بند تھا یہ بالکل تاریک تھا۔ روزانہ یا کمزری تو دور

کی بات ہے، درود پوار میں کہیں جھری تک موجود نہیں تھی۔

میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے

اندازہ ہوا کہ میں کسی ”ڈارک روم“ میں ہوں۔ میاں قلموں

کی ڈوب پلنگ پر تنگ کے مختلف آلات رکھے تھے اور تازہ

پرنت کی ہوئی بہت سی تصویریں ایک ڈوری سے جھول رہی

تھیں۔

کمرے میں ہونے والی منگٹو میں ایک شخص زیادہ بول

رہا تھا اور بہت بے تکلفی سے بول رہا تھا۔ پتا چلا کہ یہی

تواری لال ہے۔ وہ بابولیات سے ارچند بانو کا تعارف

کرا رہا تھا۔ ”یہ مس سروج ہیں۔“ سبھی کے سامنی قلموں کی

مشور و مہوف شخصیت، ”پچھ عرصہ پہلے انہوں نے ایک

اجلی بابولیات کے ساتھ میری گفتگو جاری تھی کہ بتائی

پر رہے ہوئے انٹرکام کی تختی بج اٹھی۔ بابولیات ریسور انڈا

گردھ سے لمبے میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے ایک نگاہ گردو پیش

پر ڈالی۔ یہ بڑی تھی سجائی نشست گاہ تھی۔ قالمین ”فرنیچر

پر دے“ ہر چیز اہل خانہ کی خواست کا منظر تھی۔ نشست گاہ کی

دیواروں پر بڑے بڑے فریم شدہ فوٹو گراف آویزاں تھے۔

ان فوٹو گرافز کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپوزیشن پارٹی

سے بابولیات کی دیرینہ وابستگی ہے۔ جو دوسری بات سامنے

آتی تھی وہ یہ تھی کہ اہل خانہ میں سے کوئی فرد فوٹو گرافی میں

بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ چھوٹی بڑی رنگیں بلیک اینڈ وھائٹ

فریم شدہ اور بغیر فریم کے بے شمار تصاویر اس نشست گاہ میں

بچی تھیں اور ان میں سے کچھ تصویریں واقعی شاہکار کہلا سکتی

تھیں۔ اچانک میری توجہ انٹرکام پر ہونے والی گفتگو پر مرکوز

ہو گئی۔ اس گفتگو میں مس سروج کا نام آیا تھا اور یہ نام آتے

ہی بابولیات کے چہرے پر تشویش کے سائے منڈلانے لگے

تھے۔

اس نے جلدی سے انٹرکام بند کیا اور میری طرف دیکھ

کر بولا۔ ”تم کہہ رہے ہو کہ مس سروج کو نہیں جانتے لیکن

مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ وہ تمہیں ہی ڈھونڈتی ہوئی میاں آئی

ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اسے کسی اور نام سے جانتے

ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔ اب آپ

نے جلال نام کے شخص کا ذکر کیا ہے تو مجھے یاد آیا ہے کہ خانہ

آپ فرمادی ہیں کہ وہ ٹرک سمیت میاں آئے ہیں۔ میرے خیال میں تو فریڈ کوٹ کے اندر یا گردونواح میں چھپائے گئے ایک ٹرک کا کھوج لگانا کچھ زیادہ دشوار کام نہیں ہے۔ ویسے اس ٹرک پر لدا کیا ہوا ہے؟

”جی ہاں“ تیسری لال نے جواب دیا۔

گتے کے نیچے کیا ہے؟ یہ سوال بابو لیاقت نے پوچھا۔ ارجمند بانو نے اس کا جواب دیا اور یہی وہ سوال تھا جس کے گرد باقی سارے سوالات اور ان کے ہنگامہ خیز جوابات گردش کر رہے تھے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا کہ ٹرک کے اندر کیا ہے وہ اس ”علم“ کو اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ یہ ”علم کی دولت“ نہیں تھی۔ دولت کا علم تھا اور ایسا علم جب عام ہو جائے تو بے کار ہو جاتا ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو اس علم کو اپنے تک محدود رکھنے پر مجبور تھے۔ میں بابو لیاقت سے مدد طلب کرنے کے لیے آیا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اصل ردوداد کے بجائے اسے ایک گھڑی کھڑائی کمالی سنائی تھی۔ یہی دیتہ ارجمند بانو اختیار کر رہی تھی۔ وہ ہمیں قائل بتا رہی تھی اور یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اسے ٹرک سے نہیں نظر اپنی وفادار ملازمہ کے قاتلوں سے غرض ہے۔ وہ قائل جو ”یہ گناہ“ تھے اور وہ ملازمہ جو سرے سے ”قتل“ ہی نہیں ہوئی تھی۔

بابو لیاقت نے کہا۔ ”محترمہ! یہ تیسری صاحب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں“ انہیں بتا ہے کہ میری ایک سیاسی حیثیت بھی ہے اس لیے میں کسی متنازع معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالتا لیکن آپ سے انکار بھی ممکن نہیں۔“

ابھی بابو لیاقت کا تھو کھل نہیں ہوا تھا کہ باہر سے دھماکو کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا جیسے کسی شخص کو زد و کوب کیا جا رہا ہے۔ میں نے ڈارک روم کے واحد دروازے میں بمشکل ایک جھری تلاش کی اور اس سے آنکھ لگا کر بیٹھ گیا۔ نشست گاہ کا ایک تھائی حصہ میری آنکھوں بلکہ ”آنکھ“ کے سامنے آگیا۔ اس حصے میں نشست گاہ کا دروازہ ایک صوف اور دو تہائی نظر آ رہی تھی جس پر دو رنگوں کے نیلی فون سیٹ رکھے تھے۔ صوفے پر ارجمند کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں اور بہت قریب جسم والا ایک سرخ و سبید شخص بیٹھا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا میں تیسری لال تھا۔ ارجمند پتلون اور جرسی میں نظر آ رہی تھی۔ اس کے لیے بال شانوں پر بکھرے تھے اور کدے سے ایک تھیں قسم کا ٹیکہ جھول رہا تھا۔ ممکن تھا کہ اس ٹیکہ میں کوئی اطمینان بخشیار بھی موجود ہو۔ ایسے زنانہ ٹیکہ ہوتے ہی اسٹے کے لیے ہیں۔

پاکستانی صنعت کار سے شادی کر لی تھی اور ڈیڑھ دو سال سے پاکستان میں ہی رہ رہی تھیں۔ آج کل ان کے شوہر کا روباہر کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی دلیر خاتون ہیں۔ تن تنہا میاں سارے کا روباہری امور انجام دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ زمینوں کا کام بھی ہے، ان کے شوہر کا کٹار خوشاب کے گتے بننے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ وہ تین بیٹے پہلے چند اوباش افراد نے انہیں مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ خاتون ہیں ”دب جائیں گی“ لیکن انہوں نے اپنا بھروسہ دفاع کیا۔ قاتلے پکڑی تک فوت ہوئے۔ پانچ روز پہلے ان اوباش افراد نے ارجمند صاحب کی نوجوان سیکرٹری کو اغوا کرنے کی کوشش کی اور مزاحمت پر گولی مار دی۔ ارجمند صاحب نے اپنے کارندوں کے ساتھ قاتلوں کا تعاقب کیا۔ وہ سرحد پار کر کے انڈیا میں گھس آئے۔ ارجمند صاحب انہیں کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے انہیں سزا دینا چاہتی ہیں اور ان کی یہ خواہش ناجائز بھی نہیں ہے۔ قاتلے پکڑی سے کب کسی کو انصاف ملا ہے اور اگر کسی کو ملا بھی ہے تو اتنی قیمت پر اور اتنی دیر سے کہ وہ ”انصاف“ بھی ظلم بن جاتا ہے۔

ارجمند بانو کی آواز آئی۔ ”میرا مطلب یہ نہیں کہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے گولی مارنا یا پھانسی دینا چاہتی ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ ان درندوں کو پکڑ کر قانون کے حوالے کر دوں اور عدالت کے سامنے وہ سارے ثبوت پیش کر دوں جو ان قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہیں۔“

بابو لیاقت نے کہا۔ ”تیسری لال صاحب ہمارے بڑے پیرائے مہربان ہیں۔ آپ ان کے ساتھ آئی ہیں۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہو گا۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

ارجمند بانو ”میں معلوم ہوا ہے کہ شرمیں آپ کا اثر و رسوخ ہے۔ لوگ آپ کی بات سامنے ہیں اور ایسے بہت سے کارکن بھی آپ کے پاس ہیں جو ہر قسم کا کام کر سکتے ہیں۔ میں اس معاملے کوئی الحال پولیس میں نہیں لے جانا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ مجرموں کو ”ٹرینس“ کرنے میں آپ ہماری مدد کریں۔ وہ لوگ بیس فریڈ کوٹ میں موجود ہیں جیسا کہ میں نے اور تیسری صاحب نے آپ کو فون پر بتایا تھا“ ان میں سے ایک بندہ برسوں سے پھر کو پکڑا بھی گیا تھا لیکن ہمارے ایک کارندہ کی غلطی سے بعد میں بچ نکلا۔“

بابو لیاقت نے سوجھ بوجھ لیے میں کہا۔ ”اگر صرف تین چار افراد کا معاملہ ہو تو انہیں ڈھونڈنا خاصا مشکل کام ہے لیکن

یہ اسلحہ ریوالتور فریڈ کی شکل میں نہ ہو تو سرنی پاؤڈر کی شکل میں تو ضرور ہوتا ہے۔ میں نے ارجمند بانو کو کمری نظر سے دیکھا۔ ڈھکی ڈھالی جرسی میں بھی اس کا بھرپور شباب نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ مکمل ہاتھ پیر کی ٹوکی تھی۔ اس کے حُسن میں سب سے جُدا چیز اس کی جلد کی خوبصورتی اور ملا نعت تھی۔ اگر وہ واقعی اسٹنٹ میں جلال سے محبت کرتی تھی تو پھر کوئی بھی شخص جلال کی قسمت پر رشک کر سکتا تھا۔

میرے دیکھنے ہی دیکھتے نشست گاہ کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور بابو لیاقت کے کارکن ایک شخص کو کمرے دھکیلے ہوئے اندر لے آئے۔ وہ ایک موٹا نازہ شخص تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کوٹ کی ایک آستین پٹی ہوئی تھی اور گریبان چاک ہو کر ناف تک پہنچا ہوا تھا۔ لمبے ترنگے ملازم نے دھکی گریبان سے پکڑا ہوا تھا۔ اسے بابو لیاقت کے قدموں میں جھینٹے ہوئے بولا۔ ”بابو! یہ حرامی بیشک کے باہر منڈلا رہا تھا۔ اس کا ایک سامی بھی تھا۔ وہ بھاگ گیا۔ یہ ریوالتور نکلا ہے اس کے پاس سے۔“ لمبے ترنگے شخص نے ایک چمکا دھککا ریوالتور پائی پر رکھ دیا۔

”کوئی ہو تم؟“ بابو لیاقت نے گرج کر پوچھا۔

زخمی شخص طعنے سے خون عاں کی آوازیں نکالنے لگا۔

قد آور ملازم نے اس کے سر پر پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ ”کوٹ کا بن رہا ہے حرام زاد۔“

زخمی نے اپنی اٹھلی سے زبان کی طرف اشارہ کیا اور انگار میں سر ملانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ ہاتھ بھی جوڑ رہا تھا اور فریڈی انداز میں بار بار بتیسی نکالنے لگا تھا۔ وہ اپنے روئے سے خود کو ایک معمولی داروایتا ظاہر کر رہا تھا جو اتفاقاً پکڑا گیا تھا اور پولیس میں جانے کے خوف سے ہلکا ہو رہا تھا۔ اس کی اوٹکاری متاثر نہیں تھی۔ اگر میں اس شخص کو پہلے سے نہ جانتا ہوتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ وہ کوئی معمولی چور کا بچہ ہے جو اپنی شامت اعمال کے سبب پکڑا گیا ہے اور اب محسوس بھی طرح دیکھتے کر اور معافان نامک کر اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے لیکن میں اس بات کو گتے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ جب ہمیں ارجمند نے پہلے والی حولی سے نکال باہر کیا تھا تو راستے میں افزائیم ہمیں ملا تھا اور بڑی رازداری سے ایک پھلوری میں لے آیا تھا۔ اس پھلوری کا مالک ایک موٹا سا ستلہ الوجود شخص سلطان تھا۔ یہ سلطان بڑا مگر شخص تھا اور افزائیم کا خاص آدمی تھا۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ ہمیں کئی دن زمری میں چھپائے رکھا تھا۔ اب وہ ہمارے سامنے قاتلین پر گرا پڑا تھا اور بابو لیاقت کی منت سناہت کر رہا تھا۔ اس

شخص کو پہچانتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی آن گھنٹاں بجنے لگی تھیں۔ ایک ایک کر کے میرے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ اس ہماری شہر کے گلی کوچوں میں پہلے ارجمند بانو اور جلال سے ملاقات ہوئی تھی، اب افزائیم کے دیدار کے امکانات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص نشست گاہ کے قاتلین پر بیٹھا خون قھوک رہا تھا، وہ افزائیم کے ان کارندوں میں سے تھا جس کے بارے میں ارجمند بانو بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ کارندہ خاص اگر فریڈ کوٹ میں موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ افزائیم بھی میاں واروند نہ ہو چکا ہو۔ مجھے لگا جیسے ارجمند بانو ”افزائیم“ کا در زمانہ، یعنی جان بیکش اور ان کے سیکڑوں ہر کارے کو گتہ و پوست کے نہیں لوہے کے انسان ہیں اور میں جتنے بے نیکی حولی سے دولت نہیں ایک بہت بڑا محتاط شخص نکال کر لایا ہوں۔ یہ محتاط لوہے کے لوگوں کو چاروں جانب سے اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور کھینچتا چلا جا رہا ہے۔

بابو لیاقت کے قد آور ملازم نے ایک اور زوردار ٹھوکر زخمی کے سر پر رسید کی اور غر کر بولا ”بابو! ہمارا خیال ہے یہ بندہ میڈم صاحب کا بچھا کرتے ہوئے میاں پہنچا ہے۔ جب میڈم صاحب کی گاڑی بیشک کے دروازے پر ٹکی تھی اس وقت یہ بھی اسکوڑر پر کھلی سے گزرا تھا۔ اس نے اسکوڑر حکیم شفیق کی دکان کے سامنے کھڑا کیا۔ اپنے سامی کو اسکوڑر کے پاس چھوڑا اور خود بیشک کے آس پاس منڈلا لگا۔

ٹھوڑی دیر بعد اس کا کٹھ سامی بھی آگیا۔ مجھے شک ہے کہ وہ شخص فریڈ کوٹ کا ہی رہنے والا ہے۔“

ارجمند بانو کے خوبصورت چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ بات بھی بھی تشویش کی۔ اگر یہ شخص واقعی اس کے پیچھے آیا تھا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے اسے ایس آئی بلراج کو اشارہ کیا۔ وہ کالے رنگ کا ریلوے انجن کسی قریبی کرسی پر بیٹھا تھا لیکن کر سلطان کے سر پر پہنچا۔ نیچے بیشک کر اس نے ایک ایسا چھڑ سلطان کے منہ پر مارا کہ درد و یوار چٹان کی آواز سے گونج اٹھے سلطان مسلسل معافیاں مانگ رہا تھا اور منہ سے خون عاں کی آوازیں نکال کر التجائیں کر رہا تھا۔ بلراج نے اسے قاتلین پر گرا کر اس کی گردن پر اپنا بھاری بھر کم بٹ رکھ دیا۔ دباؤ کی وجہ سے سلطان کے منہ خود بخود کھل گیا۔ بلراج نے اس کے منہ میں زخمی کا اپنا ریوالتور عاں طرح کھینچا کہ اس کی ٹال دور تک اتر گئی۔

”کوئی ہے تم؟“ اس نے خور خور لیے میں پوچھا۔

بابو لیاقت نے جلدی سے اٹھ کر سلطان کی جان بلراج

سے جزائی۔ یقیناً اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ کوئی باہر کا شخص اس کی بیشک میں پڑھ کر روائی کرے اور کسی طرح کی بانی کا باعث ہو۔  
جو بات مجھے معلوم تھی وہ اس صحت سے اور کسی کو معلوم نہیں تھی۔ یہ شخص جو پڑھ کر مایا لایا گیا تھا، "افراہیم" کا کارندہ تھا اور اس کا ایک سماجی موقع سے فرار بھی ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر افراہیم فریڈ کوٹ میں موجود ہے تو وہ کسی بھی لمحے آندھی اور طوفان کی طرح باہر لیاقت کی بیشک پر پلکار کرنے والا ہے۔  
میری اس سوچ کی تصدیق اتنی جلدی ہوئی کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ بیشک مجھے بیرونی دروازے کے پاس گاڑیاں رکھنے کی مذہم آوازیں آئیں۔ پھر ایک ملازم بھاگتا ہوا نشست گاہ میں پہنچا۔ "ممن" جو تھوڑی دیر پہلے اس کے کندھے سے بھول رہی تھی، اب ہاتھ میں تھی۔ گن کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔  
وہ تیزی سے بولا۔ "بابو جی! کچھ بندے آئے ہیں جی۔ آہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"  
اسی دوران دروازے کی طرف سے قد آور شخص کی بلند آواز ابھری۔ وہ کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ "میں آپ سے کہہ رہا ہوں جی آپ اسلحہ لے کر اندر نہیں جا سکتے۔"  
"اندر تیرے بہنوئی نے گرفتار لگایا ہوا ہے؟" ایک دوسری آواز نے فراق کو پچھا۔ پھر نشست گاہ کا دروازہ زور دار آواز سے کھلا اور قد آور شخص لڑکھاتا ہوا اگلے پاؤں اندر گیا۔ اسے دھکیل کر اندر آنے والا افراہیم تھا۔  
افراہیم کو آخری بار میں نے پہنے پل کی حویلی میں دیکھا تھا۔ خانہ بدوشوں نے حویلی پر بلہ بولا تھا۔ افراہیم کا چوکیدار نشان علی میری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار تھا اور خود افراہیم زخمی حالت میں حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ بعد میں میں نے حویلی میں خانہ بدوشوں کے لٹکارے سنے تھے۔ وہ ہر طرف افراہیم کو پکارتے پھر رہے تھے۔ ان ساعتوں میں مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ میں افراہیم کو دوبارہ زندہ دیکھ سکوں گا لیکن آج وہ ایک بار پھر سامنے تھا اور اس کی آنکھوں میں وہی وحشی چمک نظر آ رہی تھی جو زور و جہاں سے بھرا ہوا بیلا صندوق دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ابھری تھی۔ دروازہ قد شخص نے افراہیم کا دھکا کھانے کے بعد اچانک قیص کے نیچے سے دیواروں کا لال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دیواروں افراہیم کی طرف سیدھا کرتا، افراہیم کے ایک سماجی نے بھی خود کار رائل نقل ٹان لے۔

نشست گاہ میں چند لمحے "دوئے" اویئے کی حکمانہ آوازیں ابھریں پھر باہر لیاقت لپک کر فریقین کے درمیان آگیا۔ اس نے اپنے دروازہ ملازم کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور افراہیم کے مشتعل سماجی کی رائل نقل پیچھے چھوڑ دی۔  
افراہیم کو دیکھ کر ارجمند بانو کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک تک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ افراہیم کی نگاہوں میں طنز کی چمک اور غضب کی چنگاریاں تھیں۔ وہ اپنے تلتے قدموں سے چلتا ارجمند بانو کے سینے کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ اس کے عقب میں اس کے مسلح کارندے تھے۔ ان کی تعداد اس سے کم ہرگز نہیں تھی۔ وہ صورتوں سے ہی خونخوار لوگ نظر آتے تھے۔ مجھے ان میں قادر زباں کا ایک کارندہ نظر آیا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے بھی تھے۔  
باہر لیاقت نے ارجمند اور افراہیم کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ دونوں۔ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"  
افراہیم بولا "کچھ زیادہ نہیں"۔ اس کی ڈیڑھ دو سال میری بڑی رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں اس کا شوہر رہا ہوں۔"  
ارجمند بانو جنگلی لہجے کی طرح غرائی۔ "میں تمہیں نہیں جانتی اور تمہیں یہ جرات کیسے ہوئی کہ میرا بیچھا کو اور زبردستی کسی کی کارروائی میں گھسوں۔"  
افراہیم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "جراثیم تو تم نے بھی بڑی بڑی کی ہیں ارجمند بیگم، اور تمہاری جرات کا یہ تازہ ترین شاہکار زخمی حالت میں میرے سامنے بڑا ہے۔"  
اس نے اپنے فریڈ اندام کارندے کی طرف اشارہ کیا جو اب اپنے ایک سماجی کا سارا لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور غضب ناک نظروں سے باہر لیاقت کے دروازہ ملازم کو دیکھ رہا تھا۔

ارجمند بانو نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ کون؟"  
تواری لال نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ شخص باہر مشکوک حالت میں گھوم رہا تھا۔ لیاقت صاحب کے ملازم پڑھ کر مایا لے آئے اور کچھ نہیں ہوئے اس کے ساتھ۔ باقی آپ لوگ جس طرح اس بیشک میں گھسے ہیں یہ کسی طور مناسب نہیں۔ ہم خاموش ہیں تو آپ اسے ہماری کمزوری نہ سمجھیں۔ ہمارے پاس بھی اسلحہ ہے، ہم بھی گولیاں چلا سکتے ہیں۔ درجنوں لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ آپ زبردستی اندر گھسے ہیں۔ ہم ایک دو کار بھی دیں گے تو کچھ

نہیں مجھوے گا ہمارا۔ بہتر ہے کہ آپ اسلحہ کا رعب نہ ڈالیں۔ اگر کوئی کرنے والی بات ہے تو ہم بیٹھ کر سمجھ سکتے ہیں۔"  
ایک سکھ رائل نقل بدھاڑنے رائل نقل کی ٹال تواری لال کے سینے پر رکھ دی اور خطرناک لہجے میں بولا۔ "تو زیادہ بڑبڑ نہ کر مجھڑو۔ چل اوروہ بیٹھ بندے کا پتھر بن کے اس نے رائل نقل سے ہی تواری لال کو زور دار ٹھوکارا۔ وہ لڑکھا کر ارجمند بانو سے ٹکرایا اور صوفے پر جاگرا۔ ایک بار پھر نشست گاہ کی فضا میں زبردست تازہ پیدا ہو گیا۔ چرے تھمتھا اٹھے اور اعصاب تن گئے۔ یوں لگا کہ ابھی گولی چل جائے گی لیکن پھر باہر لیاقت نے بڑی ذہانت اور جرأت سے اس صورت حال پر قابو پایا۔ وہ واقعی سیاسی مزاج کا شخص تھا اور باروداڑ سے زیادہ ڈانڈیگ پر یقین رکھتا تھا۔ وہ یہ بات تو جان ہی چکا تھا کہ اس کی مسمان (ارجمند بانو) اور بن بلائے مسمان (افراہیم) میں کوئی عین غمیت کا تازہ ہے۔ اس نے ان دونوں کا اشتعال کم کرنے کی کوشش کی اور ان سے کہا کہ وہ تسلی سے ایک دوسرے کی بات سنیں۔  
افراہیم نے ارجمند سے خطاب ہو کر کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ وہ بندہ میرے حوالے کر دو جسے تمہارے کارندوں نے شاپ سنیما سے پکڑا ہے۔"  
ارجمند چلا کر بولی "میں نے کسی کو نہیں پکڑا اور پکڑا بھی ہوتا تو تیرے کہنے پر تیرے حوالے نہ کرتی۔ جاؤ چلے جاؤ میاں سے۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"  
افراہیم نے کہا۔ "صورت تو تم اس بازی مگر کی دیکھنا چاہو گی جو تمہارے دل میں بٹا ہوا ہے اور مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم جیسی پکڑکار کو اپنی صورت دکھانے کا۔ بندہ میرے حوالے کر دو۔ میں ایک سو مرتبہ تجھ پر لعنت بھیج دوں گا۔"

کچھ دیر میاں بڑی میں تلخ کھلی جاری رہی۔ پھر وہ کچھ اٹھیلے ڈھنگ سے باہر لیاقت نے اس صوفے سے قائمہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے جی کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاتے ہیں۔ آپ دونوں تسلی سے بات کر لیں۔"  
افراہیم کو بھی یہ تجویز پسند آئی تھی۔ اس نے اپنے کارندوں سے خطاب ہو کر کہا۔ "تم لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلو۔ میں ابھی پھر تمہیں بلا تا ہوں۔"  
باہر لیاقت نے بھی اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ نشست گاہ سے باہر آجائیں۔ تواری لال نے کچھ ہم پیش سے کام لیا لیکن باہر لیاقت سمجھا بھگا کہ اسے بھی باہر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد نشست گاہ میں صرف افراہیم اور ارجمند رہ

گئے نشست گاہ کے تمام دروازے بند تھے۔ افراہیم نے پھر بھی ایک بار دروازوں کا جائزہ لیا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ نشست گاہ میں اطمینان سے بات کی جا سکتی ہے، ارجمند بانو کے سامنے بیٹھ گیا۔ اندرونی جوش سے اس کا چہرہ تھمتھا رہا تھا۔ بڑے جذباتی انداز میں اس نے ارجمند کے شانے تمام لیے۔ "دیکھ ارجمند! جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جا۔ تو جانتی ہے، ہمارے لیے یہ وقت براہیقی ہے۔ اس وقت کا ایک ایک لمحہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ لمحے گزر گئے تو ہماری زندگی افسوس میں ہاتھ لٹنے پڑیں گے۔ وہ سب کچھ جس کی تلاش میں ہم نے دن کا سکون اور راتوں کی نیند میں حرام کی ہیں، ہم حاصل کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے قبضے میں نہیں۔ یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔"

ارجمند نے بے حد تلخی سے کہا۔ "یہ قیامت اگر ٹوٹی ہے تو اس کا سبب تم ہو۔ ایک بے وقاف اور دھوکے باز شخص ہو تم۔ جو کچھ ہوا تمہاری خود غرضی اور لالچ کے سبب ہوا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے بے خبر کر دیا۔ خائے میں کھدائی کروائی اور صندوق نکالے سب کچھ تمہا ہضم کرنا چاہتے تھے تاہم "اب کو ہمیں زال لوس کچھ اسنے پیٹ میں۔"  
"خدا کے لیے ارجمند! خدا کے لیے۔ یہ طعنے دینے والے کا وقت نہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور غلطیاں مجھ سے ہی نہیں تم سے بھی ہوئی ہیں۔ بہر حال۔ بھول جاؤ۔ بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔ آؤ ہم مل کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔"

"کیا حل نکالیں؟" ارجمند بدستور غصہ ناک تھی۔ "ساری فہم و فراست تو تمہارے دماغ میں بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی حل ہے تمہارے پاس تو بتاؤ۔"

"حل میرے پاس نہیں! تمہارے پاس ہے۔" افراہیم نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں جانتا ہوں تم نے شباب سنیما سے حسناں کو پکڑا ہے اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حسناں بے خبر ہو۔ وہ ضرور جانتا ہے کہ صندوق کہاں ہیں۔ ساری دنیا بے خبر ہو سکتی ہے لیکن وہ شخص نہیں ہو سکتا۔"  
"لیکن حسناں میرے پاس نہیں ہے۔" ارجمند نے ہیزاری سے کہا۔

"وہ ہے تمہارے پاس۔ وہ ہے۔" افراہیم کے بظاہر نرم لہجے کے نیچے آتش فشانی لاداکھول رہا تھا۔ "لیکن شاید تمہیں احساس نہیں کہ وہ شخص ہمارے لیے کتنا قیمتی ہے اور نہ یہ احساس ہے کہ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے جو کچھ ارجمند! اگر تم نے کسی کی زبان کھلو چکی ہو تو پھر کسی طرح کی

خانوں سے پوچھ۔ تو اس کا چچا کر کے اس کے ساتھیوں تک پہنچنے لگی تھی؟ تو کاشے ہے اس کے سامنے شکر کر اس نے تجھے کہیں چہرہ ہمارا نہیں پہنچا دیا۔“

میری آنکھ نم ہوئی سے گلی تھی اور ارجمند بانو کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے نام کی بازگشت حیرت بن کر غمیری ہوئی تھی۔ سنگین ہونے کے باوجود یہ حالت دلچسپ تھی۔ میرا ایک حریف بند کمرے کے اندر میری شان میں قہیدے پڑھ رہا تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ میں سن رہا ہوں۔ ارجمند کی آنکھوں میں چمک آئے والی حیرت اور تشویش دیکھ کر مجھے لطف آیا۔ افراتیم کے جیب سے ایک اخباری تراشا نکال کر ارجمند کی آنکھوں کے سامنے لرایا اور گرجا۔ ”دیکھو! یہی ہے نا وہ حسان۔ دیکھو اس کو اچھی طرح۔“

ارجمند نے اس بوسیدہ تراشے پر ایک نگاہ دوڑائی۔ پھر براہ راست بنا کر بولی۔ ”پاکل کتے کی طرح مت چٹو۔ مجھے اللہ نام نہیں ہونا تھا کہ یہ ہو گیا ہے۔ تم بھی تو کتنے بھتے اسے حسان ہی سمجھتے رہے ہو اور گھدائی کو اتے رہے ہو اس سے۔“

ایک لمحہ توقف کر کے اس نے باغیانہ انداز میں سر جھٹکا اور بولی۔ ”ہمارے ساتھ جو ہوا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کی وجہ صرف اور صرف تمہارا کینہ پن ہے۔“

”کینہی تو خود ہے حرامزادی۔“ افراتیم کے منہ سے جھاک بہ رہا تھا۔ ”میں نے تجھ سے نکاح کیا تھا۔ تجھے زندگی کا شریک بنایا تھا۔ تو نے ثابت کیا کہ تو کسی بدکار ماں کی اولاد ہے۔ تو نے ہمیں سے اپنے یار کو اپنے پاس بلایا۔ میری بیوی گھلائی رہی اور اس کے بستر سوئی رہی۔ میری آنکھوں میں دھول جم چکی کہ اس بازی گر سے رنگ لیاں مٹائی رہی۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال اور ذرا سوچ تیری لعنتی زبان اس قاتل ہے کہ کسی کو فریاد اور دعا باز نہ سکے۔ تا تیری زبان ہے اس قاتل کی؟“

”بذکار تو خود ہے حرامی۔“ ارجمند ہنسنے لگی اور پوری قوت سے جیٹی۔ ”اس عمر میں بھی تیری ہوس کم نہیں ہوئی۔ مجھے گھر میں ڈال کر رنگ برنگی عورتوں پر منہ مار رہا ہے۔ تیرا کون سا کرتوت مجھ سے چھپا ہوا ہے۔ تیری ہر کالی رات میری آنکھوں کے سامنے ہے اور یہ بھی جانتی ہوں میں کہ خوشاب کی کس کس گلی میں تیرے حرامی بچے کھیل رہے ہیں۔“

ڈارک روم کے اندر سے میاں بیوی کی یہ جنگ دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ باکس میں بیٹھا ہوں اور مارو حاز سے بھر پور

تاخیر نہ کرو اور اگر ابھی تک وہ چپ ہے تو پھر ہمیں جلد از جلد اس کی زبان کھلوانی ہوگی۔ اگر جلد ہی ایسا نہ ہو سکا تو سب کچھ راکھ ہو جائے گا اور یہ راکھ ساری زندگی اڑا کر ہمارے سون پر پڑتی رہے گی۔“ اس نے ایک بار پھر ارجمند کے شانے تمام کیے۔ ”تاؤ کماں ہے حسان! بناؤ ارجمند۔“

ارجمند کے چہرے پر ابھی تک نفرت اور بے گامگی کی چمک تھی۔ اس نے افراتیم کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے اور بولی۔ ”وہ شخص بڑا ضرور گھیا تھا لیکن کل رات وہ تیرا صاحب کی کوٹھی سے بھاگ گیا ہے۔“

”کیسے بھاگ گیا ہے؟“ افراتیم نے بیجا بی بیجے میں پوچھا۔

”بہن چکاڑے گیا ہے۔“

”کھنگ کیا مطلب؟“

ارجمند نے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں پیشانی سے ہٹایا اور بولی۔ ”تیرا بیوی صاحب کا خیال تھا کہ وہ تخت جاں بندہ ہے۔ مار پیٹ سے گھر کر زبان نہیں کھولے گا۔ انہوں نے رائے دی کہ اسے کوٹھی سے نکلے کا سوچ دیا جائے بعد میں اس کا چچا کر کے نرک کے ٹھکانے کا پتا چلایا جائے۔ ہم نے اسے کوٹھی سے نکال کر اس کا تعاقب شروع کیا لیکن وہ توقع سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ کل رات اشار ہو گل میں جو ہنگامہ ہوا اسی کے سبب ہوا تھا۔ اس نے ہمارے آدمیوں کو زخمی کیا اور بھاگ نکلا۔“

”اوہ نوہ۔ نوہ۔“ افراتیم کو ارجمند کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”جو حقیقت ہے وہ میں نے بتادی ہے۔ اب تمہاری مرضی کی تعین کرو یا نہیں۔“

افراتیم کچھ دیر ارجمند سے ٹھکر کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن جب اسے تعین ہو گیا کہ اصل بات وہی ہے جو وہ بتا رہی ہے تو ایک دم اس کا پارا پھر چھٹنا شروع ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہونا جا رہا ہے اور آنکھیں فرط غضب سے پھیل رہی ہیں۔ ایک دم وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کی توازی نری اور ملاحت ہوا ہو گئی اور لہجہ دے ہوئے پھر برسا لگے۔ وہ چیخ کر بولا۔ ”حرامزادی۔ کتے کی پچی! جانتی ہے تو نے کیا کیا ہے کچھ جانتی ہے تو؟ وہ تیری ماں کا قصہ ہے تو حسان کہہ رہی ہے حسان نہیں تھا وہ استاد جانی تھا۔ وہ تیرے جیسی کنبڑوں اور جلال جیسے زبوں کو چنگیوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے بارے میں جانتا چاہتی ہے تو قادر زماں اور شکر جیسے بچے

دوسری اے ایس آئی بلراج کی یہ دوسری لاش دیکھ کر مجھے دکھ کے بجائے ایک طرح کا اطمینان ہوا۔ ایسے شخص کی موت پر کسی کارکنی ہونا بہت مشکل ہوتا ہے اور آنسو تو ایسی لاشوں کو شائد نادر ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہ ایک درندہ صفت تھا۔ میں کل رات سے کئی بار سوچ چکا تھا کہ اگر میں بدستور اس کے کچل میں پھنسا رہتا اور وہ نرک آلود ہتھوڑی کی ضربوں سے میرے پاؤں کی انگلیاں چپٹی کرتا رہتا تو میری برداشت کماں تک ساتھ دیتی۔ شاید ایذا رسائی کا یہ طریقہ عہد قدیم کے رومنوں کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا ورنہ انہیں عذاب دی کے لیے بیش قیمت آلات ایجاد نہ کرنے پڑتے۔ بس ایک، غصہ ہر جگہ کو فراہم کر دی جاتی اور وہ مزے سے بیٹھا دھیرے دھیرے شامی معنویں کی انگلیاں کچلتا رہتا۔

ایک نگاہ غلہ اندازے ایس آئی بلراج کی سیاہ لاش پر ڈال کر میں بھلی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس دوسرے کمرے میں ایک تنگ زینہ دیکھ چکا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ زینہ مجھے چھت پر پہنچا سکتا ہے۔ جوئی میں نے زینے پر پاؤں رکھا۔ مجھے خیال آیا کہ میری ایک چیز میاں رہ گئی ہے۔ میں واپس مڑا اور اس چوبی الماری کی طرف بڑھا جس میں میرا مازر رکھا گیا تھا۔ اس الماری کے دروازے میں اب کئی سوراخ نظر آ رہے تھے۔ دروازہ کھول کر میں نے مازر نکالا اور جھک کر بھاگتا ہوا زینے طے کرنے لگا۔ میرے ارد گرد فائرنگ ہو رہی تھی لیکن چھت کی طرف سکون تھا۔ ٹانگ چنری اینٹوں کی بیڑ میاں طے کر کے میں چھت پر پہنچا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ یہ علاقہ بالکل اندرون لاہور جیسا تھا۔ مجھے لگا جیسے بھائی لوہاری کی کسی چھت پر کھڑا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چھتیں آسمان میں ملی ہوئی تھیں۔ کبوتروں کی جھڑپاں، ٹپکی ڈٹوں کے ایئرلے، بجلی کے تار اور کہیں کہیں برساتیوں کی ٹھٹھاتی روشنیاں جوئی میں نے چھت پر قدم رکھا۔ ایک سایہ سایہ میرے پیلوں میں لیرایا۔ اس کے ساتھ ہی منڈیر کے پاس سے چنگاریاں چھوٹیں۔ یہ زہل نوکن کا فائر تھا۔ میں ٹرپ کر پھر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس دوران ایک شخص جھک کر بھاگتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اس نے بلا تکلف میرا بازو تھام لیا اور تیز سرگوشی میں بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

میں بچان گیا۔ یہ باہولیات کی آواز تھی۔ اس نے مجھے سمجھا تو میں اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ جھک کر بھاگ رہا تھا۔ مجھے بھی جھک کر بھاگنا پڑا۔ اور یہ احتیاطی تدبیریں ضرورت

ہم دیکھ رہا ہوں۔ انکا ایک افراتیم آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے ٹپک کر ارجمند کا گلا دوچارا سے گرا کر اس کے اوپر چھ بیٹھا۔ اس کے منہ سے گالوں کے فوارے جھوٹ رہے تھے۔ ارجمند کی نگاہوں میں خوف کے بجائے غضب کی چنگاریاں تھیں۔ اس نے اضطرابی طور پر پہلے تو اپنی جوتی اٹارنے کی کوٹھی کی پھر پھرتی سے اپنے پنڈیک میں ہاتھ ڈالا۔ اسی دوران نشست گاہ کا بھلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور باہولیات سمیت کئی افراد دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ باہولیات نے سب سے پہلے ارجمند بانو کا وہ ہاتھ دوچارا جو اس نے پنڈیک میں ڈال رکھا تھا۔ یقیناً وہ کوئی آنکھیں ہتھیار برآمد کرنا چاہ رہی تھی۔ تیرا بی لال نے افراتیم کو ہتھیار کر ارجمند بانو سے پیچھے ہٹا دیا۔ افراتیم جیسے کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے تیرا بی لال کے رخسار پر ہتھیار کر ایک پھپر مارا۔ اس پھپکے کے ساتھ ہی وہ طوفان جو نشست گاہ میں بڑی دیر سے چل رہا تھا بے قابو ہو گیا۔ سب سے پہلا فائر کس نے کیا؟ یہ میں نہیں دیکھ سکا کیونکہ فائر کسے والا میری نگاہ سے اوچھل گیا۔ یہ ۳۸ پور پور اور کافر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ”ری پٹر“ کے دو دھماکے سنائی دیے۔ میں نے تیرا بی لال کو ٹرپ کر تپائی پر گرتے دیکھا۔ انکا ایک نشست گاہ میدان جنگ بن گئی۔

مختصر سی جگہ میں حسان کارن پڑ گیا تھا۔ میرے سامنے راتقل کا ایک برست گاندھی کی بست بڑی فریم شدہ تصویر کو لگا اور وہ چٹا چور ہو کر قاتلین پر گری۔ پھر کوئی شخص زور سے پچھا۔ اس کے ساتھ ہی دو عین افراد ایک دوسرے سے تقصیر کھا نشست گاہ کے دروازے سے باہر جا کر۔ فائرنگ چند لمبے نشست گاہ میں مرکوز رہنے کے بعد اچانک پوری عمارت میں پھیل گئی۔ فریقین مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر گولیاں چلا رہے تھے۔ میرے کانوں میں بار بار افراتیم کی لٹکار گونج رہی تھی۔ ”جان سے مار دو حرامزادوں کو۔ کسی کو نہ چھوڑو۔“

یہ ہنگامہ بہ مشکل ایک منٹ چلا ہو گا کہ پولیس کار کے نور دار سائزن سے درود پوار گونج اٹھے۔ اب میرے لیے حرکت میں آنا ضروری ہو گیا تھا۔ پولیس اس جھجک کو کھیرے میں لے لیتی تو پھر کوئی کوتاہدہ اس سے چھپا نہیں رہتا۔ وہ اس ڈارک روم میں بھی پہنچی اور ظاہر ہے سیلانی ٹوپی کے نیچے میرا پوشیدہ رہنا نامکن تھا۔ درود پوار فائرنگ سے گونج رہے تھے لیکن نشست گاہ میں اب کوئی نہیں تھا۔ میں نے ڈارک روم کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ نشست گاہ میں لاٹھی، مڑی تھیں۔ ایک نیم نیم تیرا بی لال کی تھی اور

کے مطابق تھی۔ اندھیرے میں مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے تیزی سے چند کوشے پھلانگے اور بھٹک سے محفوظ دوری پر پہنچ گئے۔ بابولیات نے ایک مٹی کا دروازہ کھولا اور بلا تکلف پیچھے اترنے لگا۔ ابھی ہم چند زینے ہی اترے تھے کہ چند خواتین ہم سے آکر آئیں۔ وہ غالباً فائرنگ کی آواز سن کر چھوٹی جڑی تھیں۔ اچانک دو انجینی مردوں کو روک دیا کہ ان کی چھینٹیں نکل گئیں لیکن پھر جلد ہی وہ بابولیات کو پہچان گئیں۔ ”شکر ٹانہا جی“ معاف کرنا میں جی۔ ”بابولیات نے جلدی سے کہا۔

اس کی آواز نے جادو کا اثر کیا۔ نہ صرف یہ کہ خواتین چپ ہو گئیں بلکہ انہوں نے ایک جانب سٹ کر ہمیں راستہ بھی دے دیا۔ ایک بوڑھی عورت نے حیران ہو کر کہا۔ ”بیات بیاتہ؟“

”ہاں ماما! جھگڑا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس طرف سے نکلنا پڑا ہے۔ آپ گھبراہٹ مت، آپ کو کوئی کچھ نہیں کے گا۔“

ہم میڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے پہنچے اور پھر ایک ڈیوڑھی سے ہو کر گلی میں نکل آئے۔ یہ نسبتاً کشادہ گلی تھی بلکہ اسے سڑک کہنا زیادہ مناسب تھا۔ یہاں ایک طرف دیوار کے بالکل ساتھ ایک ٹیکسی کار کھڑی تھی۔ ہم ٹیکسی کی طرف لپکے۔ میں نے دیکھا کہ کار میں ایک شخص پہلے سے موجود ہے۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی مقبلی دروازہ کھول دیا۔ بابولیات مجھے لے کر کار میں گھس گیا۔

”اگلی ہے؟“ بابولیات نے ڈرائیور سے ہم ساسوال کیا۔

”ہاں جی۔“ ڈرائیور نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک جھنگل سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو ڈرائیور کے ساتھ بھی ایک دروازہ کھول بیٹھا نظر آیا۔ یہ بابولیات کا وہی ملازم تھا جس نے بھٹک میں مجھ سے ماؤزر رکھوایا تھا۔ یہ ایک کشادہ ٹیکسی تھی۔ چھت کافی اونچی تھی پھر بھی دروازہ کھول کر گردن نیچے کر کے بیٹھنا پڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹیکسی میں بھی بیٹھنے کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں یہ خوشبو... کہاں سے اٹھ رہی تھی۔

عقب میں ابھی تک فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں اور پولیس کار کا سائرن مسلسل شور مچا رہا تھا۔ ٹیکسی کار کے ڈرائیور نے بڑی مشاقی سے دو تین موڑ کاٹے اور کار کو ہلکا کر دی سڑک پر لے آیا۔ ”کہاں چلوں بابو جی؟“ ڈرائیور نے

پوچھا۔

”کوئی چلو۔“ بابولیات نے مختصر جواب دیا۔ ڈرائیور نے رفتار بڑھا دی۔ بابولیات بیزیاں۔ ”بھت برا ہوا ہے۔ تین آدمی تو بیٹھی طور پر مر گئے ہیں۔“ صبح اخباروں نے اپنے صفحے کالے کر دیئے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ٹیکسی کار کے بریک چرچرائے اور وہ ایک جھنگل سے رگ گئی۔ ایک موٹر سائیکل سوار گاڑی کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے اسی کے اشارے پر گاڑی روک لی تھی۔ موٹر سائیکل سوار نے بیک پیٹ رگھی تھی اور چہرہ مظلم چھا رکھا تھا۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر کر تیزی سے ٹیکسی کے قریب آیا اور کھڑکی میں سر ڈال کر بابولیات سے بولا۔ ”اس طرف گزرو یہ جی۔ ایک جیب میں چار پانچ سلاخ آدمی موجود ہیں۔ آتی جاتی ہر گاڑی کا معائنہ کر رہے ہیں۔“

بابولیات کے ہونٹ تشویش ناک انداز میں سکڑ گئے۔ وہ ڈرائیور سے بولا۔ ”واپس چلو شکور! نشین کی طرف سے نکلنا اور ہمیں ٹیکری بچاؤ۔“

ڈرائیور شکور نے مستعدی سے سر ہلایا اور گاڑی موڑ لی۔

چند چھوٹی چھوٹی گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر ہم ایک ”میں روڈ“ پر پہنچے اور پھر دس پندرہ منٹ کے تیز رفتار سفر کے بعد ایک ٹیکسی نما عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ مضافاتی علاقہ تھا۔ عمارت اچھے خاصے رتبے پر تھی۔ بیرونی چار دیواری بلند تھی۔ داخلے کے لیے ایک بڑا آہنی گیٹ تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مخصوص انداز میں ہارن بجایا تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر جا کر کیراج میں رکی اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ کار میں ایک بانجواں شخص بھی موجود ہے۔ یہ کار مختصر ڈی والی تھی۔ عقبی نشست کے پیچھے تھوڑی سی جگہ گود کی شکل دے دی گئی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر اس مختصر جگہ میں جھانکا تو چونک گیا۔ یہی بیٹھی خوشبو میں سے اٹھ رہی تھی۔ کیراج کی دھم دھم روشنی میں ڈی کے اندر ایک قیامت بخیز خواب تھی۔ یہ ارشد بانو تھی۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا کہ اس کے نصف چہرے کو جھک چکا تھا۔ اب آدھا حسن لوہوں میں ڈوبا ہوا تھا اور آدھا کیراج کی روشنی میں دک رہا تھا۔ اس مختصر جگہ میں وہ حسن کی ملکہ ہوئے ”ہنگ آمیز“ انداز میں مڑی مڑی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا ”ایک نہایت نہیں“ استری شدہ لباس کو شاپنگ بیگ میں باندھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ بابولیات نے مجھے ارشد کو

مکڑے دیکھا تو بولا۔ ”یہ زینوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں بڑی رہتی تو اب تک پار ہو گئی ہوتی۔“ شکورے اور زین نے ڈکری دکھائی اور اسے نکال لائے۔“

ٹیکسی سے نکلنے ہی سب سے پہلے بے ہوش ارشد کو ڈی سے نکال دیا۔ دروازہ دروازہ فرما علی نے اسے کسی گڑیا کی طرح کندھے پر ڈالا اور ڈرائیور شکور کے ہمراہ اندرونی حصے میں لے گیا۔ ایک نظر ٹیکری کا جائزہ لیتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سرائیکس اور خاص طور پر ٹائل سازی کا کام ہوتا ہے۔ ایک جانب بہت بڑے شیڈ کے نیچے ٹائیں اور ٹوٹی ہوئی ٹائلوں کا بہت بڑا ڈھیر بڑا تھا۔ ریل انجن کے بوائے جیسے بڑے بڑے آہنی سیلنڈر خود کاچہ خوں پر گھوم رہے تھے اور ان کے اندر سے کھڑکھڑاہٹ کی زوردار آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ان سیلنڈروں میں مخصوص پتھر اور دیگر مسالہ جات ڈال کر انہیں رات دن متحرک رکھا جاتا ہے اور یوں وہ میٹرل و جود میں آتا ہے جس سے ٹائل اور ٹریف سازی ہوتی ہے۔

اس بے پناہ شور کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم ایک بہت بڑے ہال نما حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں ٹیکری کی بیٹھیوں سے نکلے والا تیار شدہ مال بڑی احتیاط اور ترتیب سے جوتا گیا تھا۔ ہال میں روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی نہایت دیدہ زیب منقش برتن اچھی قدرو قیمت کا احساس دلا رہے تھے اور خوبصورت ٹائیں جھنگ رہی تھیں۔ ہم ایک آرائش دفتر میں داخل ہوئے اور اس دفتر میں داخل ہو کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس ٹیکری کا مالک بابولیات خود ہے۔ دفتر کی دیواروں پر خوبصورت ٹونوگراف آویزاں تھے اور میرے ایک کونے میں کائیکس مخالف پارٹی کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔

بابولیات نے کہا۔ ”تم یہاں تسلی سے بیٹھو، کسی طرح بیٹھنا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“

دفتر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ارشد بانو کو دیکھنے گیا ہے۔ لیکن تھا کہ اسے ہوش میں لانے کے لیے کسی ڈاکٹر وغیرہ کو بلانا پڑتا ہو سیدہ کھیں ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ اس کھیں کے نیچے ”ایڈیشن ہاک“ کے ٹیبل سے تیار کیا ہونے والا لباس تھا اور اس لباس سے نیچے گرد و اڑے سے مستحار لیا ہوا جوتا تھا۔ اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ چار بیٹوں پر حرکت کرنے والا قیامت خیز راز اپنے جلو میں ان بہت بنگاموں کی پرورش کر رہا ہے معلوم نہیں پہنچنے والی کی حویلی سے یہاں پہنچنے

والے ٹک کے پیچھے کون کون یہاں پہنچ چکا تھا اور کون کون پہنچے والا تھا۔ پھر میرے خیالات کا دھارا ارشد بانو کی طرف بہ نکلا۔ اس بار غیر میں مجھے سب سے پہلے ”غرض آمدید“ کہنے والی وہی تھی۔ اس نے پہلے مجھے تشدد کی چٹائی میں بیٹھا چاہا تھا۔ پھر چال میل تھی اور مجھے تیار لال کی کوٹھی سے فرار ہونے کا موقع جان بوجھ کر دیا تھا۔ کوٹھی کے کونے میں جو کچھ بوا وہ سب منصوبے کے مطابق تھا۔ جان بوجھ کر ایسا تاثر دیا گیا تھا کہ کوٹھی کے سامنے کھین اچانک کھیں چلے گئے ہیں۔ پھر ناشتے کے بہانے میرے ہاتھ کھولے گئے۔ ایک ایسا کن میں میرے سر پر کھڑا کیا گیا جس کی کن میں اصل کے بجائے ڈی گولیاں تھیں۔ کن میں نے مجھے موقع دیا کہ میں اس کے ہاتھ سے کن چھین لوں۔ عین ممکن تھا کہ میں اس پر فائر کرنا تو وہ ڈراما بازی کرنا اور جھوٹ موٹ ”جاں بحق“ بھی ہوتا۔ بہر طور اس کی نیت نہیں اتنی تھی اور میں کن میں کن کے ”خون سے ہاتھ رنگے بغیر“ تیار لال کی کوٹھی سے نکل آیا تھا۔ بعد ازاں اگر اشارہ ہوئی کی چھت پر جلال سے میرا متحرک نہ ہونا اور میں کن استعمال نہ کرنا تو شاید مجھے خبری نہ ہوتی کہ کن میں گولیاں نہیں پٹانے تھے۔

کن کا خیال آتے ہی میرا دھیان اس ماؤزر کی طرف چلا گیا جو میٹل ریسٹورنٹ کی چھت پر جلال کے ہاتھ سے نکلا تھا اور اب میرے لباس کے نیچے موجود تھا۔ ساتھ ہی تحریکات کے پیش نظر میں نے ماؤزر نکال کر اچھی طرح چیک کیا اور دوبارہ کھیں کے نیچے رکھ لیا۔ میری دست و پاؤں دس کا وقت تھا تیار تھی۔ اس کا مطلب تھا مفرد اور ڈرٹس گل سے جدا ہونے مجھے ۳۱ گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھے۔ فریڈ کوٹ میں جو اتاری پھیلی ہوئی تھی اور جس طرح پڑا اسرار لوگ ہر جگہ گھس مارتے پھرتے تھے ”اس کے پیش نظر یہ غصہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ٹک زیادہ دیر متلاشی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ میں مفرد اور ڈرٹس گل کو واضح ہدایات دے کر نہیں آیا تھا۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا موقع کے لحاظ سے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کرنا تھا۔ اگر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ مزاحمت کرتے اور پتہ لوگوں کو مشین کن سے بھون ڈالتے تو پھر ان کا اپنا زندہ چتا بھی محال تھا۔ ہم اپنے ملک میں نہیں دار غیر میں تھے اور ہر طرف سے موت کے زلزلے میں تھے۔

تھوڑی دیر بعد بابولیات واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی کی حالت نسلی بخش ہے۔ اس کی گہری بے ہوشی نوٹ کی ہے اور جلد ہی وہ آنکھیں کھول دے گی۔ بابولیات کالب

دلجو نرم اور رویتہ دوستانہ تھا۔ وہ بات کرنے کا ذمہ جاتا تھا اور جب تک مخاطب کو قائل نہیں کر لیتا تھا بات آگے نہیں بڑھتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”عزیزم یہ بات تو اب ذمہ جی نہیں رہی کہ جس طرح تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اسی طرح اس لڑکی نے بھی مجھے جھوٹی کمائی سنائی جسے تم ارجمند کہہ رہے ہو اور پھر جو تیسرے حضرت مسٹر افراہیم صاحب آئے انہوں نے جھوٹ بولا نہ ج اور سیدہ مار دھاڑا پر اتر آئے ظاہر ہے یہ سب کچھ اس ٹرک کے لیے کیا جا رہا ہے جسے تم پاکستان سے ڈرائیو کر کے یہاں لائے ہو اور اب تم نے کس چھاپا رکھا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

میں نے کہا۔ ”تم بولتے جاؤ“ میں اپنی رائے آخر میں بیان کروں گا۔“

وہ اپنے لبوترے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”یہ بات بھی اب طے ہے کہ وہ کوئی معمولی ٹرک نہیں۔ اس میں بے حد قیمتی چیز لدی ہوئی ہے اور اگر اس چیز کا شمار منشیات میں ہوتا ہے تو پھر جو سکتا ہے وہ بیکور ہو۔“ ایک لکھ رک کر اس نے میری آنکھوں میں جھانک جیسے اپنی بات کا رد عمل دیکھنا چاہتا ہو۔

میں نے کہا۔ ”بے شک وہ قیمتی چیز ہے لیکن منشیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ کوئی ایسی شے ہے کہ اس کی نقل و حرکت مجازاً نقل سمجھی جائے۔“

بابو لیاقت کی بڑی بڑی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔ اپنے ہاتھ سے دونوں سگریٹ سلگائے اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ جس طرح یہ ٹرک معمولی نہیں اسی طرح تم بھی وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ میری ہینک میں جب افراہیم ارجمند پر چڑ پکھاڑا تھا تو اس کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ ارجمند سے کہہ رہا تھا کہ جسے وہ حساں سمجھ رہی ہے وہ حساں نہیں استاد جانی ہے۔ میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا لیکن چمنی حس کہہ رہی ہے کہ وہ کوئی دینگ حس کا مار دھاڑا کرنے والا بندہ رہا ہو گا۔ اور مار دھاڑا تو تم نے بھی اشارہ ہوئی میں خوب کی ہے۔“ وہ ایک بار پھر گنگو روک کر میرا چہرہ لگنے لگا۔ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے“ میں یہ تعارف والا معاملہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ لیکن اس موقع پر ایک بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ میں یہ دل سے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں اور یہی سبب ہے کہ جسیں کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس طرح ڈاکٹر اور سکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے میرا خیال ہے کہ ایک

مخلص خیر خواہ سے بھی کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔“

میں نے ایک بہرورنگہ بابو لیاقت کے چہرے پر ڈالی اسی ایک لمحے میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ بابو لیاقت کا مجھ سے معاملہ ختم ہے اور ایک حد تک اسے حقیقت بتا دینے کوئی حرج نہیں ہے۔ اگلے چند روز میں منٹ تک ہمارے درمیان بہت اہم گفتگو ہوئی۔ میں نے نہ صرف اپنا فخر ٹھیک خاف کر دیا بلکہ بابو لیاقت کو یہ بھی بتا دیا کہ پاکستان سے آنے والے ٹرک میں کچھ منہ دو دن لدے ہیں جن میں قیمتی سامان اور نوادرات وغیرہ ہیں۔

میں نے دوپے میں سے چار آنے بات بتائی تھی۔ اب بھی بابو لیاقت کی آنکھیں حیرت سے کشادہ نظر آنے لگیں اس نے مجھ سے میرے سامنیوں کے بارے میں تفصیلات پوچھیں اور یہ دریافت کیا کہ ہم کس حالات سے گزر کر رہا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اسے تمام ضروری تفصیلات فراہم کر دی تھیں لیکن ٹرک کی صحیح لوکیشن کے بارے میں میں نہیں بتایا اور نہ اس نے پوچھ کر شرمندگی مول لی۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے جیج دیکار کی آواز آئی آنے لگیں۔ آواز قاطع سے آ رہی تھی لیکن پھر بھی بچائی جا رہی تھی۔ ارجمند بانو کی آواز تھی۔ وہ کسی جنگی بیٹی کی طرح غراری تم اور جیج رہی تھی۔

”آؤ دیکھیں کیا ہے؟“ بابو لیاقت نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

ہم آگے پیچھے چلتے آفس سے نکلے اور آوازوں کی سوز بڑھے۔ ایک بندہ دوڑنے کے سامنے رک کر بابو لیاقت کے خاص انداز میں دستک دی۔ یہ آہنی دروازہ تھا۔ دوسری طرف قفل میں چابی گھومتی کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ ”آئیے بابو۔“

ایک شخص نے نہایت ادب سے جھک کر کہا۔ اس شخص کو میں نے آواز سے پہچانا۔ یہ وہی موز سائیکل سوار تھا جس نے راستے میں ہماری نیکی کا رد کر دیا تھا۔ وہی مصلحت پر تھا کہ آگے گزرتا ہے۔ اس اطلاع کے بعد ہم کو بھی جانے کے بجائے اس فیکٹری میں آگئے تھے اس شخص نے ابھی تک چہرے پر مفلر لپٹ رکھا تھا۔ یہ مفلر اس کے چہرے پر ذرا عجیب سا لگا رہا تھا جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ میں نے قیافہ لگایا کہ اس شخص نے اپنی کسی بدنامی کو پردے میں رکھنے کے لیے مفلر کا سہارا لیا ہے بعد ازاں میرا قیافہ درست ثابت ہوا۔ اس شخص کا تین چوتھائی چہرہ آگ میں بڑی طرح جھلسا ہوا تھا۔

اب ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا کھانا تھا اس کمرے کی ایک کونہ میں لوہے کی گرل لگی تھی۔ آواز اس کمرے سے آ رہی تھی۔ میں ارجمند کے سامنے آتا نہیں چاہتا تھا۔ ایک نیم تاریک گوشے میں ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ بابو لیاقت نے میری یہ حرکت دیکھ کر حیرت ظاہر کی۔ ہمارے ہاتھوں پر اٹھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بابو لیاقت کونہ کے پاس پہنچا تو ارجمند لپک کر اس کے ہاتھ آئی۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس چوڑی ہاتھوں کی ٹھونڈی کے پیچھے سے نکال کر کھینچی کے قریب کر دے دی گئی تھی۔ کچھ خون ارجمند کی جری پر بھی گرا تھا۔ ٹالپ کی روشنی میں اس کا خوبصورت چہرہ تنہا نظر آتا اور آنکھوں میں بھیاں خیز جھلک تھی۔ وہ بولی ”کہاں ہے وہ“

”اے میرے سامنے لاؤ۔“ میں اس کی بولیوں نہ توجہ لوں اپنے باپ کی اولاد نہیں۔ کہاں ہے وہ گندی ٹائی کا کیرٹا۔“

باہر اپنے شوہر ناچار کا ذکر خیر کر رہی تھی۔ وہی شوہر ناچار وہ چند ہفتے پہلے تک ”آپ جناب“ کہہ کر بلاتی تھی اور ہمارے اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتی تھی۔ آج ت کی دیوی نے ان دونوں کے شعلہ رنگ چہروں سے ذہنی جھٹ کے نقاب نوج لے گئے اور وہ ایک دوسرے کے سر میں سرمایہ بڑھتے مار رہے تھے پھر وہ براہ راست ہم کو لٹکارتے گئی۔ ”کہاں ہے کہیں میرے سامنے آ۔“

مجھے تیزی مروا گئی کی اوقات بتائیں۔ نکال مجھے۔ نکال مجھے یہاں سے ورنہ۔“ پھر وہ افراہیم کو سیدھی سیدھی بڑی میں گالیاں دینے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسی میں ہے جہاں افراہیم کے کارندوں سے اس کے ملائی کی خوریز جھڑپ ہوئی تھی۔ اس حوالے سے وہ یہ رہی تھی کہ شاید افراہیم بھی میں پر موجود ہے۔ جب وہ ہم کو لٹکارتا تھا کہ ٹھیک تھی اور بابو لیاقت نے اسے نہیں لہ نہ افراہیم یہاں موجود ہے اور نہ ہی یہ وہ جھنک ہے وہ بے ہوش ہونے سے پہلے موجود تھی تو اس کا جنون مد تک کم ہو گیا۔ وہ بابو لیاقت سے پوچھنے لگی۔ ”اگر وہ یہاں ہے یہاں تو پھر مجھے کس نے بند کیا ہے؟“

بابو لیاقت بڑی ذہنیٹ آواز میں بولا۔ ”بات صرف یہ کہ اس دوڑنے کی چابی میں مل رہی۔ ورنہ آپ آ آواز ہیں۔ ہم آپ کو جھنک سے بے ہوش کی حالت میں لے آ رہے ہیں۔ آپ بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں اور ہر کمرے رنگ ہو رہی تھی۔ آپ کو وہاں سے نکالا نہ جاتا تو

وہ بولی ”تواری صاحب اور بلراج کہاں ہیں؟“

بابو لیاقت بولا۔ ”بلراج کا تو پتا نہیں لیکن تواری صاحب کو میرے سامنے کوئی لگ گئی تھی۔ پتا نہیں پہنچے بھی ہیں یا نہیں۔“

ارجمند کے چہرے پر کوئی نیا تاثر نہیں ابھرا۔ جیسے تواری کو کوئی لگنے کی اطلاع قطعی غیر اہم ہو۔ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے بابو لیاقت کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”مسٹر لیاقت! اگر تم مجھے ٹرک تک بازگ والوں تک پہنچا سکو تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دے سکتی ہوں اور یہ کام کوئی ایسا مشکل بھی نہیں۔ تم یہ آسانی کر سکتے ہو۔ اس شرمیں ہزاروں نوجوان ایسے ہیں جو تمہارے ایک اشارے پر یہاں کا چنچا چھپا سکتے ہیں۔“

بابو لیاقت نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ارجمند صاحب آپ نے ٹرک کے بارے میں جو پہلی بات بتائی تھی وہ صحیح نہیں ہے مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک ملازمہ کے کل سے بہت آگے کا معاملہ ہے شاید کوئی بہت قیمتی شے لدی ہوئی ہے ٹرک پر۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”ہاں۔ ایک قیمتی شے ہے۔ میں اس قیمتی شے تک پہنچنے کے لیے تمہیں منہ مانگا معاوضہ دے سکتی ہوں۔ تم جو رقم چاہو میں دینے کو تیار ہوں۔ سادہ کاغذ پر دستخط کر لو۔ اسام کھو لو۔ کسی طرح کی ضمانت لے لو۔ ہاں بس ایک بات ہے۔ ایک بار جب معاملہ طے ہو جائے تو پھر سب کچھ دیانت داری سے ہونا چاہیے۔ شروع سے لے کر آخر تک۔“ وہ چند لمحے بابو لیاقت کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر بولی۔ ”بتاؤ اس کام کا کیا معاوضہ ہو گا؟“

وہ بابو لیاقت کے ہاتھ پائس باندھنے کے لیے نفسیاتی حربہ استعمال کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بابو لیاقت ایک دیانت دار شخص ہے اور اگر ان دونوں کے درمیان کوئی بات طے ہو جائے تو وہ اس پر ہی جان سے عمل کرے گا۔ اب وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کا اعلان کر رہی تھی۔ ظاہر ہے اگر بابو لیاقت کی سوچ بہت آگے تک جاتی اور وہ اپنی طرف سے بہت بڑی جھلک لگا کر کچاس لاکھ یا ایک کروڑ بھی مانگ لیتا تو ارجمند با آسانی اسے دے سکتی تھی بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ ارجمند اپنے شوہر کو بچا دیکھنے اور حولی سے برآمد ہونے والی دولت تک پہنچنے کے لیے ہر مطالبہ مان سکتی ہے۔ بابو لیاقت نے کہا۔ ”یہی! مجھے تمہارا سواقت دیں۔ میں اپنے ایک قریبی ساتھی سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ ابھر سوا کر کی طرح بولی ”نہیں مسٹر لیاقت! ہاں یا نہ میں جواب دو۔ جو طے ہوتا ہے ابھی اور اسی وقت ہو جائے

بولو کیا معاملہ ہے تمہارا، بولو۔

میں دیکھ رہا تھا کہ بابو لیاقت اس حلیے عورت سے جان چمکانا چاہ رہے لیکن وہ اس سے چٹنی جاری ہے اس کی آنکھوں میں جنونی چمک تھی اور وہ سارے پیش قیامت خواب تھے جو وہ نہ جانے کتنی مدت سے دیکھ رہی تھی۔ میں ایک ایسے ستون کے عقب میں کھڑا تھا جس کے بالائی سرے پر سنگل فیس کا ایک میٹر اور مین سرچ موجود تھا۔ نیچنی بات تھی کہ یہ مین سرچ ٹیکسری کے اس حصے کو روشنی وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی بات آئی کہ بابو لیاقت کی جان چمکانے کے لیے مین سرچ آنف کر رہا جائے جو جی میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ قرب و جوار تاریکی میں ڈوب گئے۔ بابو لیاقت کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ارجمند سے کہہ رہا تھا کہ لائٹ کا انتظام کر کے ابھی آتا ہے ارجمند اسے پکارنے لگی۔ ”مسٹر لیاقت۔ لیاقت صاحب لیاقت صاحب میری بات سنیں۔“ بابو لیاقت سنی اُن سنی کرتا ہوا آہنی دروازے کی طرف لوٹ آیا۔ اسی دوران میں باس بی لائٹیں کی مدد موم روشنی چکی۔ کوئی شخص مین سرچ دیکھنے کے لیے ستون کی طرف آ رہا تھا۔ چند لمبے بعد وہ میرے قریب پہنچ گیا۔ میں ستون کی اوٹ میں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ وہی منظر پوش شخص تھا جس نے ابھی میرے اور بابو لیاقت کے لیے آہنی دروازہ کھولا تھا۔ اس کا منظر چہرے پر سے کچھ کھسکا ہوا تھا۔ لائٹیں کی روشنی اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے لائٹیں کی روشنی دنیا کی کبیر ترین چیز پر پڑ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے دماغ نے کھڑے ہو گئے اس کا چوہہ بہت بری طرح جلا ہوا تھا۔ بائیں رخسار پر لوہے سے لٹک رہے تھے اور اس رخسار میں سے دانت بالکل کسی ٹوڑے کے دانتوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں ٹھیک سے اندازہ نہ کر سکا کہ لائٹیں کی مدد موم روشنی کے سبب مجھے اس چہرے کی ”خونفاکی“ کتنی محسوس ہو رہی ہے یا زیادہ۔ اچانک اس شخص کو ستون کے قریب میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے چہرے پر منظر درست کیا اور مین سرچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دس منٹ بعد ٹیکسری کے آراستہ دفتر میں بابو لیاقت اور میں آئے سائے بیٹھے تھے۔ بابو لیاقت کہہ رہا تھا۔ ”ابھی گاندھی اسکوائر سے میری بیوی کا ٹیلی فون آیا ہے۔ گفتا ہے اے ایس آئی بلراج کے مرنے سے شرمیں کشیدی جیل گئی ہے۔ وہ سکتا ہے ہندو مت کو فساد ہی ہو جائے۔“

”ہندو مت کو فساد؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔ ”یہ سارا معاملہ کیسے ہو گیا۔“ افراتیم کے غنڈوں نے ارجمند بالوے غنڈوں پر حملہ کیا۔ دونوں طرف کے لوگوں کا سیاست سے دو کا تعلق بھی نظر نہیں آتا۔“

بابو لیاقت بولا۔ ”میں اتفاق ہی ہو گیا ہے۔ سابق اے۔ ایس آئی بلراج کا لٹنا جتنا ایسے لوگوں سے تھا جو علیحدگی پسند سکھوں کو کچلنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ سونے پر ساگیا ہوا۔ کہ افراتیم جن غنڈوں کو لے کر میری بیٹک پر حملہ آور ہو ان کا کرتا دھرتا ایک سکھ بھلوان ڈنگا تھکے۔ اب جو بات بلیک تھک پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ ڈنگا تھک کے آدمیوں نے بلراج کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میری بیوی نے جو باز بتائی ہے اس کے مطابق اندرون شہر چند مشتعل ہندوؤں نے ایک سکھ کو قتل کر دیا۔ پھر اچانک وہاں سے ابھر کر اس کے پورے شرمیں کشیدی کی پائی جاتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بلراج جیسے بد معاش سے ہمدردی نہ۔ والوں کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ بابو لیاقت نے کہا۔ ”بد معاش کا نظا اس شخص کے بہت چھوٹا ہے۔ میں اس بد بخت کی پوری ہسٹری سے واقف ہوں۔ یہ پولیس سے نکلا اس لیے کیا تھا کہ اس نے ایک لڑ مارنگ کو مار مار کر جان سے مار ڈالا تھا۔ بعد ازاں اس کا وکیل بہن رتنی کو روک کر اغوا کر کے لے گیا تھا اور حوالات میں رکھ کر کئی روز اس سے منہ کالا کرتا رہا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ شرمیں کشیدی دم جو کشیدی جیل میں ہے اس کا ایک سبب واقعہ بھی ہے۔ میں ممکن ہے کہ ہندوؤں نے سمجھا ہوا بلراج کو مارنگ کا دل لینے کے لیے قتل کیا کیا ہے۔ سہر طور یہ جو ہو رہا ہے اچھا نہیں ہوا۔“

مارنگ اور اس کی وکیل بہن والا واقعہ میں اس نے پہلے بھی ارجمند کے گن مین کی زبانی سن چکا تھا۔ اس مطلب تھا اس واقعے میں صداقت تھی۔ لوگ کہتے ہیں بات کا جھگڑ بن جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ کر لیتے ہیں کہ بات کے بغیر جھگڑ نہیں بنتا۔ میں نے بابو لیاقت سے پوچھا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“

وہ میرے سوال کی اہمیت اور گرمائی کو سمجھ رہا تھا۔ ”کی بڑی بڑی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچائیاں لہرا گئیں اور کشادہ پیشانی ممکن حلق ہو گئی۔ اپنی بات کو قوت کے لیے اس نے قریب نصف منٹ لیا اور بولا۔ ”یہ بات تو پھر کبیر بھاپائی کہ جو خبیث ہم نے ٹرک کو اس کی جگہ پر لایا وہ بڑا کیا۔ اس لحاظ سے اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ

ایک گاڑی یا کسی بڑے لوہار کا انتظام کریں۔ اس لوہار یا گاڑی کے ساتھ رات کی تاریکی میں بڑگ تک پہنچیں اور بڑگ کا سامان اس دوسری گاڑی میں منتقل کر لیں کیا خیال ہے آپ کا؟“

”بالکل ٹھیک سوچ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”اس کے بعد سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“ بابو لیاقت نے کامل اطمینان سے کہا۔ ”جو کچھ آپ پاکستان سے لائے ہیں وہ پاکستان بخفاخت پہنچانے کا انتظام میں کروں گا اور یہ سب کچھ ایسی خوش اسطولی سے ہوگا کہ آپ فریڈ کوٹ کے اس خدمت گار کو دقت یاد رکھیں گے۔“

اچانک دروازہ کھلا اور وہی کبیرہ صورت شخص اندر آیا جس کی دیدہ تمویذی دیر پہلے میرے دماغ نے کھڑے کر چکی تھی۔ بابو لیاقت کے بالکل قریب پہنچ کر وہ اوپ سے جھک گیا اور اس کے کان میں کوئی سرگوشی کر کے لگا۔ سرگوشی سننے کے بعد بابو لیاقت نے بڑی دلچسپی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ لیکن صبح ہوتے ہی پہنچ جانا اور چائیاں فرمان علی کو دے جاؤ۔“

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ منظر پوش شخص جس کا نام بالا تھک تھا۔ بابو لیاقت کے بہت قریب تھا۔ بابو لیاقت اس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا تھا اور بالا تھک بھی ہر جگہ بالادک ٹوٹ پہنچ جاتا تھا۔ بابو لیاقت نے کہا۔ ”بالا تھک کو بھی فکر لاحق ہو گئی ہے کہ کہیں شرمیں کشیدی شروع نہ ہو جائے۔ بلراج کی خبریں کہ ہندو مت بھڑکے ہوئے ہیں۔ اب کرنا نہ فروش کے قتل نے سکھوں کو بھی بھڑکا دیا ہے۔ بالا تھک کے اہل خانہ لاری آؤے کے پاس رہتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ انہیں وہاں سے نکال کر قریبی گاؤں میں چھوڑ آئے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس شخص کے چہرے کو کیا ہوا ہے؟“

بابو لیاقت کے چہرے پر اواسی ہی لہرائی۔ بولا۔ ”بڑی زبردستی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔ ڈھائی تین سال پہلے ہوا خود بخود تھا۔ ہماری ٹیکسری میں بھی پر مزدوری کرتا تھا لیکن ڈیوٹی ٹائم کے بعد کوئی اسے دیکھ کر کہہ نہیں سکتا تھا کہ ٹیکسری مزدور ہے۔ وہاں بہن کھن کر رہتا تھا۔ ایک دن بھی میں نعل کا کدتر کر گیا اور اہل بھڑک اٹھی۔ بالا تھک کا چوہہ جل کر کباب ہو گیا۔ یہ ایک بڑی سنگین حقیقت ہے کہ کسی خوبصورت انسان کا چوہہ بھی جلتا ہے تو اس کا دل اس کی خواہشات اور اس کے احساسات وہی رہتے ہیں۔ مجھے اس

شخص پر بڑا ترس آتا ہے۔“

”شادی ہو چکی ہے اس کی؟“

”نہیں۔“ بابو لیاقت نے جواب دیا۔ ”میں نے کئی بار کوشش کی ہے لیکن کوئی دھمک کی لڑکی یا عورت نہیں ملی۔ اکثر لوگ تو اس کا چوہہ دیکھ کر اتنے خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے جانے پہنچانے میں محال ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل بالا تھک میں بھی کچھ خزا تھا لیکن اب اس نے اپنے دل کو اپنی صورت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ سوچتا ہے کہ کوئی نکلی کٹنی بد صورت، جھنگی، ٹیکسری ہی مل جائے لیکن گلتا ہے کہ اس جنم میں تو بے چارے کی بیوی والی خواہش پوری نہیں ہوگی۔ ویسے ہے بڑا صابر انسان اور وقار داری اتنی ہے کہ ابھی میں کسوں کو جلتی بھی نہیں کوڑ جائے تو کوڑ جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اب تو پلاسٹک سرجری بھی ہونے لگی ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں نے اسے ایک بار بھیجا تھا دہلی۔ وہاں ایک کلینک ہے لیکن ابھی ہمارے ہاں یہ کام اتنے اچھے طریقے سے نہیں ہو سکتا اور پالے کا چوہہ بھی حد سے بگڑا ہوا ہے۔ سرجن نے انکار کر دیا تھا۔“

اتنے میں فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ بابو لیاقت نے ریسیور اٹھایا اور کسی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں کے دوران اندر دلی کمرے سے ارجمند کے چپٹے چلائے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ بار بار بابو لیاقت کو پکار رہی تھی۔ یہ ایک بڑی ٹیکسری تھی۔ یہاں سے ارجمند کی آواز باہر نہیں جاسکتی تھی۔ ارجمند تو دہلی ایک طرف دس میں افراد اکٹھے ہو کر بھی چپٹے فون کی آواز ٹیکسری کی مسلسل دواں ”رو ٹینگ مینوں“ کے شور میں دب جاتی۔

فون پر بات ختم کر کے بابو لیاقت نے نیا سگریٹ لٹکایا اور بولا۔ ”وہ ٹیکسری ڈرائیور جو ہمیں یہاں لایا ہے اس کا نام شکور ہے۔ یہ اس کا فون تھا۔ اس کی طرف سے آپ کے لیے خوش خبری ہے کہ ایک بڑے لوہار کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس میں دس پندرہ میں یا بیسٹے بھی صندوق ہیں آسانی سے آسکیں گے۔“

”بڑی مستعدی دکھائی ہے یعنی اس شکور صاحب نے۔ کبیر۔ یہ اس کا اپنا لوہار ہی تو نہیں۔“ (در اصل مجھے ذہن کی یاد آ گیا تھا جس سے میں نے بارہ چار میں یک آپ کا تذکرہ کیا تھا اور وہ اپنے بیٹوں کی یک آپ لے آیا تھا) بابو لیاقت نے کہا۔ ”نہیں اپنا لوہار ہوتا تو ٹیکسری کیوں جلتا۔ کسی کی منت سزاوت کی ہوئی ہے ہمارے نے۔ یہ اسی



کا کام ہے کہ اتنی رات گئے اور اتنی جلدی اس نے بندوست کر دیا ہے۔ دراصل یہ ساری شوق کی بات ہے۔  
”شوق کی؟“ میں نے جراتی سے پوچھا۔

بابو لیاقت کے ہونٹ مسکراتے والے انداز میں سمجھ گئے۔ وہ مجھے کمری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے“ مجھے اب کو بتانا چاہئے کہ آپ استاد جہانی کے طور پر بچانے چاہتے ہیں۔ درحقیقت بیشک میں ارجمند اور افرانیم کے درمیان ہونے والی گفتگو میں اتنی زیادہ جچ پکار شامل تھی کہ اس گفتگو کا بیشتر حصہ بیشک سے باہر بھی سنا گیا تھا۔ اس گفتگو میں افرانیم نے آپ کے بارے میں انکشاف کیا تھا کہ آپ حسانا نہیں استاد جہانی ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر تو یہ نام نہیں سنا تاہم میرے کارکنوں میں سے کئی ایک اس نام سے آگاہ ہیں۔ اپنے درمیان آپ کو موجود پاکر وہ خود کو بہت بُرجوش محسوس کر رہے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور شکور بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ آپ کو اس سے پہلے بھی نہیں دیکھ چکا ہے۔ یہ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس وقت آپ کچھ زیادہ ہی ڈبلے پتلے تھے۔ بمبئی کے رئیس کو رس میں بدنام غصے سے شکر بھارتی کے کچوں سے آپ کی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ سرعام چاقو چلے تھے اور فائرنگ کی گئی تھی۔“

میں نے کہا ”شکور صاحب نے مجھے ٹھیک پہچانا ہے اور جو دیگر افراد مجھ سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں میں ان کا بھی شکر گزار ہوں لیکن ایک بات آپ بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ مجھے اس وقت مشورہ کی نہیں گمانی کی ضرورت ہے۔ آپ کے اس شوقی پنجاب میں میرے اُن گت و دشمن ہیں اور میں فی الحال خود میں اتنی بہت نہیں پاؤں کہ وہ ساری لائی و دشمنیاں تازہ کر سکیں۔ پلیز آپ اپنے کارکنوں کو سمجھائیے کہ یہ بات پھیلا میں مت۔ لیکن کریں میں پہلے ہی بہت بری طرح بھنسا ہوا ہوں۔ کچھ اور چس گیا تو پھر میرے یہ چاہنے والے ہی میرا تشاد دیکھنے والوں میں سب سے آگے ہوں گے۔“

بابو لیاقت چھپی انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ خود بھی ایک جاتی پہچانی شخصیت تھا اور اسے معلوم تھا کہ مشہور ہوجانے کے کیا فائدے اور کیا نقصانات ہوتے ہیں۔

بہرحال وہ میں منٹ آنکھ کلا کھنچ کر تیار کرتے رہے۔ شاید یہ گفتگو مزید جاری رہتی مگر پھر ہم دونوں کو آفس سے نکل کر باہر ٹیکسی کے محن میں آنا پڑا۔ دراصل کہیں قریب

ہی خود کار رائل کی تیز رفتاری تھی اور پھر پولیس کانسٹبل سائمن مسلسل خالی دیکھ گئے تھے۔ ان آوازوں کا فحش ٹیکسی سے کافی فاصلے پر تھا لیکن چونکہ رات تھی اس لیے یہ آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ بابو لیاقت نے مجھ سے کہا کہ میں آفس میں بیٹھوں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے۔ میں آفس میں چلا گیا اور سوچ بچار کرنے لگا کہ اگر شکور واقعی تھوڑی دیر میں لوڈ لے آیا تو ہمیں اپنی ”سم“ پر فوراً نکل جانا چاہیے یا کل رات تک انتظار کرنا چاہیے۔

بابو لیاقت کے واپس آنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ وہ بارہ بجے کے قریب نکلا تھا۔ تین بجے سے پہلے اس نے دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھائی۔ اس دوران میں آفس میں بیٹھا رہا۔ تین چار بار فون کی گھنٹی بجی تھی۔ فون بابو کے دروازہ قدامت فرماں نے سنے اور بات کرنے والوں کو بتایا کہ بابو صاحب کسی کام سے گئے ہیں۔ بابو لیاقت واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے انکشاف کیا کہ شمر میں دو تین جگہ خورز بنگاے ہوئے ہیں اور کئی علاقوں میں غیر معینہ مدت کے لیے گرفتار لگا دیا گیا ہے۔

یہ واقعی سنسنی خیز خبر تھی۔ اس خبر کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اب نہ تو لوڈز اس ٹیکسی میں بیٹھنے کا اور نہ ہم یہاں سے ٹھیک کے مندر اور ڈزیز محل تک پہنچنے کا معاملہ کچھ دیر کے لیے مؤخر ہو تا نظر آتا تھا۔ میں جس وقت بابو لیاقت سے ملنے اس کی بیشک میں جا رہا تھا، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں ہمارے بدترین دشمن اکٹھے ہو جائیں گے اور ایک شخص کے قتل ہو جانے کے سبب پورے شمر میں فساد کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

○☆☆○

اگلے روز سہ پہر کو ایک گھنٹے کے لیے کرلو میں وقفہ دیا گیا تھا۔ بابو لیاقت خود تو کہیں نہیں گیا لیکن اس کے دو خاص آدمی شمر میں محوم پھر کر آئے۔ یہ لوگ اشیاء خوردنی کے ساتھ ساتھ ایک اہم خبر بھی لائے۔ انہوں نے بابو لیاقت کو بتایا کہ شمر میں پُر اسرار لوگوں کی نقل و حرکت ہے۔ بہت سے نامی گرامی چہرے گلی کوچوں میں نظر آ رہے ہیں اور اسٹیشن کے علاقے میں ایک ایسی کار بھی دیکھی گئی ہے جو سات آٹھ ماہ پہلے تک بمبئی کے بدنام ترین بد معاش شکر شرما کے ذمہ استعمال تھی۔

اس آخری اطلاع نے میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑادی۔ اگر یہ خبر درست تھی تو اس کا مطلب تھا میرا دشمن نمبر ایک، کل کانٹے سے لیس ہو کر فریڈ کوٹ پہنچ چکا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ٹرک جو میں جنگ سے چلا کر ماں لایا تھا، ایک طاقتور محتا میس کی طرح تھا جو اپنے اندر گرد کی ہر بڑی چیز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور یوں مسکینے کے اندر اندر فریڈ کوٹ میں ہر طرف خطرے کے بھوت ٹانے لگے تھے۔ میں نے بابو کے آدمیوں سے اس مشکوک کار کے بارے میں چند مزید باتیں پوچھیں اور میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ شکر شرما مری سے فریڈ کوٹ تک کا سفر طے کر چکا ہے۔

اگلے دو روز ہم نے اسی سرائیکس ٹیکسی میں متحیدہ روکر گزارا۔ شمر کے حالات اتھر تھے۔ کرلو میں دفتروں کے دوران بھی خطاب گروہوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک کثیر الاشاعت اخبار نے ان پراسرار سرگرمیوں کا نوٹس لیا تھا جو کئی روز سے فریڈ کوٹ میں جاری تھیں۔ اخبار نے لکھا تھا کہ پچھلے چند روز میں شمر کے اندر جرائم پیشہ لوگوں کی نقل و حرکت میں اضافہ ہوا ہے اور کرلو کے باوجود کئی جگہ دروازا بھی ہوئی ہیں۔

ان دو دنوں میں ارجمند کا دواپلا مسلسل جاری رہا تھا۔ میں ابھی تک اس کے سامنے نہیں گیا تھا لیکن بابو لیاقت کو بہر حال اس کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ بھی تو بابو لیاقت کو دھمکیاں دیتی تھی اور کبھی منت سناہت پر اتر آتی تھی۔ وہ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر اس چار دیواری سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ میں اس کے دل پر زور دے دیا تو اقامت سے آگاہ تھا۔ وہ دونوں دولت جس کی خاطر اس نے وطن چھوڑا تھا۔ ایک اوجیز عمر شخص سے شادی کی تھی اور دوسری تک جنگ کے دورانوں کی خاک چھائی تھی ”اب برآمد ہو گئی تھی لیکن ارجمند کی پہنچ سے دور تھی اور ارجمند چاہتی تھی کہ اب اگر وہ دولت ہاتھ سے نکل گئی تو جیسی اس کا کھوج نہیں ملے گا۔“

دوسرے روز شام کو بابو لیاقت نے مجھ سے کہا۔ ”وہ جان پکے ہے کہ آپ بھی اس چار دیواری میں ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“ اس کا اشارہ ارجمند کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ”اتنی حسین اور دلکش عورت سے ملنے کو کس کا دل نہیں چاہتا لیکن میرے خیال میں ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی طرح وہ مجھ پر بھی چھٹے چلائے گی اور کہے گی کہ ہم اسے یہاں سے نکالیں ورنہ وہ اپنے حسن کی بجلیاں گر کر پورے فریڈ کوٹ کو بھسم کر دے گی۔“

بابو لیاقت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی اور تجویز بھی ہو۔“

بابو لیاقت کے اصرار میں ارجمند سے ملنے چل پڑا۔

میری دسک پر منظر پوش بالا سٹکھ نے آہنی دوازے کا قفل کھولا اور میں کمرے کی گرل وار کمری کے پاس ارجمند کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کے ریشمی بال منتشر تھے اور آنکھیں رت جھکے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اسی چپٹ جرسی میں تھی جس میں میں نے اسے تین روز پہلے دیکھا تھا۔ وہ بڑی بے باکی سے مجھے دیکھتی رہی مگر غیر متوقع طور پر بہت نرم لہجے میں بولی۔ ”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ ہمیں جان جانا چاہیے تھا کہ کنوئیں میں اتر کر خطرناک ترین اسٹے کو ہاتھ ڈالنے والا شخص معمولی اور ادا تھا نہیں ہے۔ بہر حال تم سے مل کر خوشی ہوئی استاد جہانی۔“ اس نے اپنا سر ڈھکیا ہاتھ مٹانے کے لیے گرل میں سے باہر نکال دیا۔ میں نے بے دلی سے ہاتھ تمام کر چھو دیا۔ وہ بولی۔ ”مجھے افسوس ہے استاد جہانی کہ اے ایس آئی بلراج کی طرف سے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا لیکن یہ سب کچھ قابل معافی ہے کیونکہ بے خبری میں ہوا ہے۔ شاید خود بلراج کو بھی یہ جان کر افسوس ہو کہ وہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کمر قنسی سے کام لے رہی ہیں۔ آپ جیسی ”اسٹائنڈ“ کے ہوتے ہوئے میں کہاں کا استاد ہوں اور پھر دوبارہ کے پاس بیٹھنے سے کہنے تو جلتے ہی ہیں۔ آپ جیسے لوگوں سے واسطہ ہو تو بندے کو ایسے بڑے سلوک کے لیے ہر دقت تیار رہنا چاہیے۔“

ارجمند کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگا دیا کہ وہ بلراج اور تیواری لال کی موت سے ابھی تک بے خبر ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ شبہ بھی اب تک بے قرار تھا کہ شاید بابو لیاقت نے اسے اپنی بیشک کے آفس پاس ہی نہیں رکھا ہوا ہے۔ وہ گفتگو کا رخ بتدریج اس موضوع کی طرف موڑنے لگی جس نے اس کے شب و روز کا چین حرام کر رکھا تھا۔ وہ مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”استاد جہانی، تم نے سارے باؤنڈریل کر دیکھے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ دولت کتنی بے رحم تھے۔ جب خونی اور قریبی سے قریبی رشتے بھی اس کی کاٹ کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم بابو لیاقت پر کس حد تک اعتبار کر رہے ہو لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ بابو لیاقت ناقابل مہوسا شخص ہے۔ میری ایک بات پھر لکیرے اور اس بات کو یاد رکھنا۔ بابو لیاقت چپکا نہیں بیٹھا۔ اس نے کرلو اور افرانیم کا ہوا دکھا کر غصیں اور مجھے اس چار دیواری میں بند کر رکھا ہے جبکہ وہ خود

دیکھ نہیں سکتا تھا۔

پانچویں روز کرفو میں خاصی نرمی کر دی گئی۔ صبح سات سے رات دس بجے تک کرفو نہیں تھا۔ اس روز شکر احمد بھی لوڈر لے کر فیکٹری میں پہنچ گیا۔ یہ ایک ”مڑوا پیس“ تھی جس پر لوکل باڈی بنائی گئی تھی۔ چھٹی صبح میں صرف ایک دوواڑہ تھا جو پیچھے کی جانب کھٹا تھا، صندوق رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے یہ بڑی محفوظ گاڑی تھی۔ اس انتخاب پر میں نے بے ساختہ شکر احمد کو شاباش دی۔ وہ خوشی سے پھول گیا۔ اس رات نو بجے کے قریب بابولیات بھی فیکٹری آیا۔ میرے لیے دو جوڑے کپڑوں کا انتظام اس نے دو روز پہلے ہی کر لیا تھا۔ اب وہ کوٹ چادر اور جوئے وغیرہ بھی لے آیا۔ اس نے بتایا کہ گاندھی اسکوائر میں حالات اب قابو میں ہیں لیکن کشیدگی بدستور پائی جاتی ہے۔ بابولیات اور شکر احمد سے صلاح مشورے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ رُک تک پہنچنے کے لیے کل رات تک انتظار کر لیا جائے۔ اس فیصلے کی بنیاد اس توقع پر تھی کہ شاید کل رات کرفو بھی اٹھایا جائے اور ہم دن کی روشنی میں خطرہ مول لینے کے بجائے رات کی تاریکی میں اپنا کام کر سکیں۔ لیکن اسی شب ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ہمارا سارا منصوبہ درہم برہم کر دیا اور ہمیں کرفو ختم ہوتے ہی فیکٹری سے نکلنا پڑا۔ یہ واقعہ جتنا سنسنی خیز تھا، اتنا ہی حیران کن بھی تھا اور مجھ سے زیادہ یہ بابولیات کے لیے سنسنی خیز اور حیران کن

تھا۔ وہ پالا سنگھ کو ایک نہایت رمانت دار اور یادگارانہ ملازم سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اپنا تین من دھن اس کے ایک اشارے پر قربان کر سکتا ہے لیکن اس رات پالا سنگھ ایک ایسا کام کر گیا جو کسی طرح بھی اس کی ”ریپوٹیشن“ کے مطابق نہیں تھا۔ یہ وہ غلطی تھی جو دو روزہ آفریش سے اپن آدم کے نصیب میں تھی مگر یہ جو ہر روز ہزار ہا انسانوں سے ہزار ہا صورتوں میں مرزد ہوتی ہے اور شاید مشرک ہوتی رہے۔ تاہم پالا سنگھ کے حوالے سے یہ غلطی اس لیے زیادہ عجیب خیر تھی کہ وہ ایک ایسا بد صورت مرد تھا جس کی بانوں میں کسی عورت کا سناٹا تو درد کی بات ہے کوئی آدم زادی اس کے پاس سے بھی نہیں گزرتی تھی لیکن ایک آدم زادی اس کی بانوں میں سٹائی تھی اور آدم زادی بھی ایسی جو سر پائیا حسن تھی۔ وہ ارچند بانو تھی۔ تارک اور سنسان شب کے اند میرے میں اس عورت نے اپنے ہرے دار سے ایک عجیب و غریب سودا کیا تھا۔ اس نے اپنا انتہائی حسین جسم، انتہائی بد صورت پالا سنگھ کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے بدلے میں اپنے لیے

بھی چکا ہوا۔ ہم بہت زیادہ دقت خالق کر چکے ہیں استاد جنابی لیکن ابھی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔ بابولیات کی باتوں میں مت آؤ۔ میاں سے نکلنے کی ترکیب سوچو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرے سارے کارندے تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم ہر حال تو ذکر میاں سے نکل سکتے ہیں۔“ ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ ”ان صندوقوں تک پہنچنے کے لیے میں نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں استاد! میں اب یہ دولت یوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ان صندوقوں پر جتنا حق میرا ہے، شاید کسی کا نہ ہو لیکن۔ میں یہ حق تمہارے ساتھ تقسیم کر سکتی ہوں۔ تم جو کوسے میں مانے کو تیار ہوں لیکن ناندے لوگوں کے ہاتھوں سے اس دولت کے یوں حصے بخرے نہیں ہونے چاہئیں۔“

ارچند کی حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے ترس آ گیا۔ طبع اور لالچ کی دھوپ نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہمتی کے مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ کسی بھی شریف، خوشحال شخص سے شادی کر کے اپنی زندگی بچیں سکون سے گزار سکتی تھی لیکن دولت کی ہوس اسے اندھی خواہشات کی رتی سے باندھ کر کوہِ چوچھٹین پہنچاتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بابولیات ابھی تک ایک مخلص شخص ثابت ہوا ہے اور اس کا یہ بیان سو فیصد درست ہے کہ اس فیکٹری سے باہر حالات ایسے نہیں کہ ہم میاں سے نکل سکیں۔ میں نے اسے وہ اخبار بھی دکھایا

جس میں کرفو کے بارے میں دو کالمی خبر چھپی تھی اور ایک صفحے پر فید کوٹ میں پراسرار لوگوں کی سرگرمیوں کا ذکر تھا۔ یہ محسوس ہوتا دیکھنے کے باوجود ارچند کی بے گلی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک بیجان بڑا تھا اس کے اندر اور اس کی آنکھیں چچ چچا کر اس خدشے کا اظہار کر رہی تھیں کہ ہم اس چادر واری میں محسوس رہ جائیں گے اور فید کوٹ کے گرد نواح سے وہ ٹرک تلاش کر کے غائب کر دیا جائے گا۔

ارچند کے پاس سے کھٹکنے کے لیے نجانے مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑا لیکن پالا سنگھ نے اگر میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے بتایا کہ بابو صاحب مجھے آفس میں بلا رہے ہیں۔ پالا سنگھ کو کھڑکی کے پاس دیکھ کر ارچند کی آنکھوں میں گراہیت آمیز خوف نمایاں ہو گیا۔ اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا جیسے ڈر رہی ہو کہ نہیں بھولے تھے اس کی نگاہ پالہ کے چہرے پر نہ پڑ جائے وہ تو خیر عورت تھی (جو ویسے بھی نازک

رہائی حاصل کر لی تھی۔ رہائی جو اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال بنی ہوئی تھی۔ درحقیقت اس سوڈے میں دونوں فریقوں نے کچھ کھو کر کچھ پایا تھا۔ ارچند نے اپنے دل پرستم کے پھاڑ توڑے تھے اور خود کو ایک انسانی کمرہ لمس کے حوالے کر کے اس چادر واری سے آزادی حاصل کی تھی دوسری طرف پالا سنگھ نے اپنی ساری ٹیک نمایاں اور وقار پرانے ڈاؤرنگر ایک شاداب جسم سے اپنی انہی پیاس بجھائی تھی۔

معلوم نہیں یہ سودا کب ہوا اور کیسے ہوا لیکن یہ پونچکا تھا اور اس کے ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ علی الصباح ایک ملازم کی اطلاع پر جب ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ارچند کو رکھا گیا تھا تو کمرے کا دوواڑہ چوٹ کھلا پایا۔ ارچند کی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ آہنی دوواڑہ بھی کھلا تھا جس کی چابی ہر وقت پالا سنگھ کے پاس رہتی تھی۔ اس واقعے کے بعد پالا سنگھ کو بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن وہ بھاگا نہیں تھا۔ ہم نے اسے فیکٹری کے پچھواڑے کا ٹھکانہ کے درمیان ایک چارپائی پر بدھوش پڑے پایا۔ اس نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی۔ جب اسے ہوش میں لاکر جھنجھوڑا گیا تو وہ نئے میں بیڑا لگا۔ ”میں گناہ گار ہوں بابو جی میں تمہارا ابراہم ہوں۔ مجھے گولی مار دیا کسی بھٹی میں پھونکا دو۔ میں نے تم سے دعا کی ہے بابو جی۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ وہ خوبصورت بلا مجھ سے چٹ گئی تھی۔ میں اس سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا۔ میں کتا ہوں۔“ کہتے سے بھی بدتر ہوں۔ میرا سر اپنے پاؤں سے کھل کر گھبر پر دم کر دیا بابو جی۔“

بابولیات کچھ بچ آئے سے باہر ہو گیا۔ وہ پالا سنگھ پر پل پڑا۔ پالا سنگھ کے چہرے سے لپٹا ہوا منظر کھل گیا۔ اس کا بے حد کمرہ چوٹ کھٹکے میں عیاں ہو گیا۔

بابولیات نے پہلے اسے بے درجہ غور کریں رسید کیس پھر اٹھا اٹھا کر دیواروں سے مارنے لگا۔ مجھے بھی لگا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ میں نے ان دونوں کے درمیان آکر بمشکل پالا سنگھ کی جان بچائی۔ پالا سنگھ بچ رہا تھا۔ مجھے مار ڈالو بابو جی! تم نے مارو گے تو میں اپنے ہاتھوں سے خود کو گولی مار لوں گا۔“

دوسری طرف بابولیات چلا رہا تھا۔ ”ہاں ہاں ماروں گا چچے اور کہنے کی موت ماروں گا۔ تیری ٹانگیں جبر کر گاندھی چوک میں پھینکوں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ یہ دو وفادار نوکر ہے جس نے ایک عورت کی خاطر اپنے مالک کے منہ پر تھوکا سب۔“

میں بابولیات کو بمشکل کھینچتا ہوا آفس کی جانب لے گیا۔ اس کے ملازم بدھوش پالا سنگھ کو کھینٹ کھٹات کر گودام میں لے گئے۔

آفس میں پہنچ کر بابولیات سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ انسان کیا ہے؟ ایک کو رکھ دینا ہے اس کے اندر نہ جانے کیسے کیسے طوفان پلٹے ہیں۔ خوبصورت چہروں کے پیچھے بھیاک چہرے ہوتے ہیں اور بھیاک چہروں کے پیچھے بھی بھیاک چہرے ہوتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب ہے انسان کہ اسے پڑھتے ہوئے

ہر لکھ ایک نیا انکشاف سامنے آتا ہے مجھے وہ ہر صاحب یاد آگئے جن سے جنگ کے گرد نواح میں ملک صاحب کے گودام میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں میں سیلابی ٹرمرہ لگا کر بیٹھتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ سامنے کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف سرحدی گاؤں کا پوتا سنگھ تھا۔ وہ لوگوں کی نظر میں ایک بے کار، نٹے باز اور بزدل شخص تھا لیکن اس کے اندر ایک ایسی بجلی چمکتی تھی جو ہر آنکھ سے اوجھل تھی۔ اچانک بابولیات کی آواز نے مجھے اپنے خیال سے جھونکا دیا۔ وہ بڑے عجیبے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا اور اپنے لڑاں ہاتھوں سے سرکٹ لگا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے“ اب ہمیں جلد سے جلد میاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ عورت ہم سب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوگی۔“

”اس بارے میں دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن سوال یہ ہے کہ اب کہاں جائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے پاس ایک دو ٹھکانے ہیں میاں۔“

میں نے کہا۔ ”بابولیات“ اگر ہمیں اس فیکٹری سے نکلنے کا خطرہ مول لینا ہی ہے تو چور کیوں نہ ابھی رُک کی طرف نکل جائیں۔“

بابولیات کا چہرہ ایک دم پیکا پڑا محسوس ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بابولیات ایک دلیر اور بااثر شخص ہونے کے باوجود ہنگامہ آرائی سے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ سیاسی آدمی تھا اور ایسے لوگ ہاتھ پاؤں پھار کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”مجھے سخت افسوس ہے لیاقت صاحب کہ میری راجہ سے آپ بھی اس پکر میں چسپن گئے ہیں۔“

وہ پچھلی سی ایسی ہنسا۔ ”پکر تو زندگی کے ساتھ ہی ہے جنابی صاحب مجھے لڑکی کے بھانجے کا اتنا افسوس نہیں جتنا اس بدکاری کی غمناکی کا ہے۔“ بابولیات کا چہرہ غم و اندوہ میں

دو تاجا جا رہا تھا۔

میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "ایک بات سامنے کی ہے لیاقت صاحب شراسر وقت جرائم پیشہ لوگوں کی تاجا دینا ہوا ہے۔ افراتیم اور ارشد کے آدمی تو یہی طور پر شرم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نجانے کون کون گمات لگائے بیٹھا ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ صرف میری تلاش میں تھے اب ارشد بانو کے فرار ہونے کے بعد آپ بھی مطلوبہ فردین گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں خود کو ایک ساتھ خطرے میں نہ ڈالیں۔ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں تو لورڈ کی چالی مجھے دے دیجئے میں اپنے ساتھ شکور کو لے جاتا ہوں یا کوئی دوسرا آدمی جسے آپ مناسب سمجھیں۔ میرے ساتھ بیچ دیں۔ آپ نے جو ٹھکانا ذہن میں سوچ رکھا ہے، ہمیں بتادیں، ہم رات کو صندوق لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "ٹھکانا شرم میں نہیں گاؤں میں ہے۔ بالکل سرحد کے پاس اور جب تک میں آپ کے ساتھ نہ ہوں گا، آپ وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔" وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی، کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے، آپ شکور کے ساتھ لورڈ پر روانہ ہوں۔ میں شکور کو سمجھا دیتا ہوں، وہ چوکی کے پاس کچھ دیر کے لیے رُک جائے گا، میں وہیں پر آپ لوگوں سے ملوں گا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

میں نے کپڑے بدل لیے تھے سر گرم ٹوپی تھی۔ ٹوپی کے اوپر سے منظر پرست کر میں نے اپنا چہرہ کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ ماؤز کی پردہ میں گولیاں مجھے اور مل گئی تھیں۔ شکر شروع سے میری ہڈی کے ساتھ تھا۔ اب میں پوری طرح مسلح تھا۔ توڑی ی دیو بعد میں اور شکور مرزا لورڈ پر سوار فیکٹری کے مین گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ شکور ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جبکہ میں لورڈ کے عقبی حصے میں چھپ چکا کر بیٹھا تھا۔ لورڈ کی رنگ دار شیشے والی کڑکی میں سے میں نے سنے دن کا سورج طلوع ہوتے دیکھا۔ وہ سورج جو فرید کوٹ پر طلوع ہوا تھا اور ان تمام خطرناک لوگوں پر بھی جو فرید کوٹ کے گلی کوچوں میں پھیلے تھے اور ایک نرک کی تلاش میں بلکان ہو رہے تھے۔

فیکٹری سے نکلنے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی محفوظ موڑ پر سے نکل کر کسے میدان میں آ گیا ہوں۔ ابھی کسی رائفل یا ہسٹل کی ٹال سے کوئی گولی ناز ہوئی اور میری طرف

روانہ ہو جائے گی۔ میرے رگ دپے میں بیٹھا مشاورد ہوئے لگا۔ یہ دور میرا پڑا نامی تھا۔ جب بتیاری تو لے جاتے تھے، جب موت کے سائے پھیلتے تھے، جب فضاؤں میں غلو سستا تھا تو میرے بدن میں یہ درد آپوں آپ جاگ اٹھتا تھا۔ یہ وہی درد تھا جو اپنے والدین کی موت پر مجھے تختے میں ملا تھا اور جس نے مجھے شاہجہاں سے جانی اُستاد بنایا تھا۔

لورڈ کے اندر سامان تھا۔ یہ سامان مجھے کے چوکور ڈبوں کی شکل میں تھا۔ ان ڈبوں میں خوب صورت آرائشی ٹائلس "پیک" تھیں۔ میں ڈبوں کے انبار کے اندر ہی چھپ چکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ تازہ اخبار میرے سامنے تھا۔ ایک خبر اُتر میری نظر فیکٹری کی۔ یہ خبر اس تصادم کے بارے میں تھی جو چھ روز پہلے بابو لیاقت کی بیشک میں افراتیم اور ارشد کے غنڈوں کے درمیان ہوا تھا۔ اخباری خبر کے مطابق اس تصادم میں تین افراد مارے گئے اور یہ تین اموات اس سنگین ہنگامے کا باعث بنی تھیں جس کے نتیجے میں فرید کوٹ اور گرد و نواح میں ہندو سکھ فساد شروع ہوا تھا اور کئی مزید جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ چونکہ اس ہنگامے کا آغاز بابو لیاقت کی بیشک سے ہوا تھا لہذا قتل ہونے والے اے ایس آئی بلراج کے کچھ ساتھی بابو لیاقت کو بھی موبو الزام ٹھہرا رہے تھے۔ تاہم اس جھگڑے کے اصل فریق ہندو اور سکھ ہی تھے۔

لورڈ تاجا ہوا سڑک پر چھو لے کھاتا آگے بڑھ رہا تھا اور میری نظرس اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی ہم فیکٹری سے بھٹکل تین چار فرلانگ ہی دور گئے ہوں گے کہ لورڈ کی رفتار آہستہ ہوئی اور وہ سڑک سے اُتر کر گر گیا۔ میں نے لورڈ کی کڑکی سے باہر جھانکا۔ اس کڑکی میں رنگ دار شیشے لگا تھا اور اس طرح "ٹھس" تھا کہ کڑکی کھلی نہیں جاسکتی تھی۔ معلوم نہیں ایسا شیشہ لگائے جانے میں کیا حکمت تھی۔ رنگ دار شیشے کی دوسری جانب مجھے پولیس کے اہل کار نظر آئے اور تیزی سے دھڑکتا ہوا دل کچھ اور تیز ہو گیا۔ ایک موٹے تازے سکھ سب انسپکٹر کے ساتھ دو کانٹیل یا ہڈ کا ٹیشیل کمرے تھے سکھ سب انسپکٹر شکور کو لورڈ سے نیچے اُتار چکا تھا اور اس سے سوال وجواب کر رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہا ہے یہ لورڈ؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔ "فیکٹری سے" شکور نے جواب دیا۔ "کس فیکٹری سے؟" "سراٹھیکس فیکٹری سے۔" "سیدھی طرح جواب دو" سب انسپکٹر غرایا۔

"سراٹھیکس کی ورکشاپ تو ادھر ایک ہی ہے۔ بابو لیاقت کی! "ہاں۔ بابو لیاقت کی ورکشاپ سے آ رہا ہوں۔" شکور نے گویا اعتراف کیا۔ "دروازہ کھلو۔" سب انسپکٹر نے نار شاہی حکم جاری کیا۔

میں نے ماؤز پر ہاتھ میں لے کر سیٹھی کچھ بنالیا۔ میرے لئے انڈین پولیس کے جتنے چھاننی اتنی نقصان دہ تھا جتنا افراتیم یا شکر کے زرنے میں آتا۔ اس بات کا خطرہ تو شروع سے موجود تھا کہ فیکٹری سے نکل کر میں ہنگاموں کی زد میں آ جاؤں گا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ سرمنڈوا ہی اوٹے پڑیں گے اور ہم فیکٹری سے چار فرلانگ بھی دور نہ جا پائیں گے کہ تاکے پر روک لے جائیں گے۔

لورڈ کے عقب میں واقع اٹھارہ ماؤز دروازے کھلا اور میں نے سکھ سب انسپکٹر اور اس کے محلے کی آواز اس اپنے بالکل قریب سنیں۔ سب انسپکٹر نے شکور کو مخاطب کیا اور مجھے کے ڈبوں کو ایک غلیظ گالی دے کر بولا "کیا ہے ان کے اندر؟"

"قتل خانے کی ٹائلس ہیں جی۔ مارکیٹ پہنچانی ہیں۔" شکور نے مختصر اور مناسب ترین جواب دیا۔

سب انسپکٹر نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس کی غصیلی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ڈرائیور شکور سے مخاطب تھا۔ "کچھ خبریں ہے مجھے کہ کدھر چلا جا رہا ہے؟

آگے جلوس نکلا ہوا ہے۔ ہنگامہ ہو رہا ہے۔ گاڑی کو ٹھک لگوائے گا اور خود بھی مار کھائے گا۔ اور اگر فسادیں کو پتا چل گیا کہ یہ لورڈ بابو لیاقت کی فیکٹری سے آیا ہے تو وہ مجھے بھی لورڈ کے ساتھ ہی جلا دیں گے۔ چل واپس موڑ اس اپنے کہ جلدی کہ بس ایک سیکنڈ لگا۔ جلوس اس سامنے والے موڑ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ کچھ ٹائڈ کا دھواں۔

شکور نے پس و پیش سے کام لیتا جا پائے سب انسپکٹر نے اس پر گالیوں کی بارش کر دی اور دھکیل دھکال کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا۔ "چل اشارت کر اپنی ماں کے ختم کر۔" پھر چلا کر ایک حوالدار سے مخاطب ہوا "انت سنگھ اس کو جیب گئے آگے لگا کر تین صاحب کی کوٹھی میں لے چلو۔ جب تک جلوس آگے نہ نکل جائے اس کو باہر نہ نکالنا۔"

چند لمبے بعد میں نے لورڈ کے اشارت ہونے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کھٹارایپ کا گانجن بھی جاگ

اٹھا۔ میں نے ذرا کان لگا کر سنا تو کچھ فاصلے پر سے شور و غل ابھرتا محسوس ہوا جیسے ایک بڑا جوم نعرہ زنی کر رہا ہو۔ سب انسپکٹر کی اطلاع درست تھی۔ کس پاس ہی مشتعل ہندوؤں کا ایک بڑا گروپ ہنگامہ آرائی میں مصروف تھا۔ لورڈ نے



ایک سالخوردہ بوڑھا جو صدیوں سے زندہ تھا۔ وہ اُس بہادر نوجوان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا۔

سپنس، خوف سے بھر پور ایک عجیب مغرب داستان قیمت -/۵۰ ڈاکل فرج -/۲۰

ناشر -	اسٹاکسٹ -
علی میاں پبلیکیشنز	علی ہکسٹال
عزیز مارکیٹ اردو بازار	نسبت روڈ چوک میسر پستال
لاہور فون ۴۲۴۴۴۱۴	لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۲

روبرس ہو کر اپنا رخ تبدیل کیا اور پھر پولیس کی جیب کے آگے آگے بنگلی سڑک پر مڑ گیا۔ بند لوڈر کے اندر بھی مجھے ملے ہوئے رہی کی بو آ رہی تھی۔ یہ ملنے ہوئے ٹائٹوں کی بو تھی۔ تازہ جو شر شر اور قصبہ قصبہ زندگی کو رواں رکھتے ہیں لیکن جب یہ ٹائٹریں چوراہے پر گرنی جذبات سے جل اٹھتے ہیں تو تصویر کا بالکل ایک دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔

لوڈر نے درمیانی رفتار سے دو صفائی فرلاٹک کا فاصلہ طے کیا اور پھر لب سڑک ایک کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ کوٹھی کے نیچے ایک وسیع خانے کو پارکنگ لائٹ کی شکل دی گئی تھی۔ پارکنگ لائٹ میں بیچتے ہوئے لوڈر کے اندر تیرگی چھائی۔ میں نے رنگ دار شیشے میں سے آنکھیں چاڑھ کر دیکھا میاں دو کاریں اور ایک ٹیکسی موجود تھی۔ اچانک پارکنگ لائٹ کے دیسے بڑے شریکٹ زور دار آوازوں کے ساتھ بند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ میں گھٹا ٹوپ تار کی کاراج ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ پولیس کا کام صرف اتنا تھا کہ لوڈر کا رخ اس راستے سے موڑ دیتی جس پر جلوس آ رہا تھا۔ لوڈر کو جب کے آگے لگا کر اس کو ٹھکی میں لانا اور پھر خانے میں بند کر دینا خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

میں تیس سیکنڈ بعد میرے تمام حداثات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ پارکنگ لائٹ کی تیاں روشن ہو گئیں اور کمرہ کی میں سے گرد و پیش کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ دائیں جانب ایک دروازے سے دو نئے نئے سردار صاحبان برآمد ہوئے۔ "نہیں صاحبان! کتنا کچھ مناسب نہیں تھا۔ ڈبل ڈول، مکھنے اور صورتوں سے وہ جیسے ہوئے بد معاش نظر آتے تھے۔ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے باور لیاقت کی بیشک میں نظر آتے تھے۔ انہیں افزائیم لے کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک بد معاش کا نام ڈنگا ٹھک تھا اور باور لیاقت نے بتایا تھا کہ وہ بتی خطرناک شخص ہے۔ میرے بدن میں سرد لرز دوڑ گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ فیکشن سے نکلنے ہی میں ایک بار پھر افزائیم کے چنگل میں آ گیا تھا۔ جو سب انسپکٹر ہمیں اس کو ٹھکی میں لے کر آیا تھا، اب وہ بے تکلفی کے ساتھ ایک مجھ خیم ٹھک سے باتیں کر رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہی ڈنگا ٹھک تھا۔ ڈنگا ٹھک دس بارہ سال پہلے تک ایک خوب دو نو جوان رہا ہو گا لیکن اب اس کے جسم پر چلی آچکی تھی اور کثرت سے نوشی سے چوبیس کچھ سوجا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک بال بال نشان بھی تھا۔ یہ کہانیاں کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ سب انسپکٹر نے شکر کو دھکیل کر ڈنگا ٹھک کے سامنے کیا۔ ڈنگا ٹھک نے شکر کو

سرتاپا گھورا اور پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس کا پہلا سوال ہی میرے بارے میں تھا۔ کتنے لگا "ہمیں شبہ ہے کہ وہ بندہ جو استاد ہوٹل کی چھت پر ہنگامہ کر کے بھاگا تھا، باور لیاقت کے پاس ہے۔"

شکور نے عاجزی سے کہا "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا سردار جی! کافی بڑی فیکٹری ہے۔ اگر کسی کمرے میں کوئی بندہ چھپا ہوا ہو تو کیا بتا چکا ہے۔"

ڈنگا ٹھک نے شکر کے منہ پر زبانی دار تھپسرا "جس اسکول میں تیری بے بے بنے تھے داخل کروا تھا اس اسکول کی ہم نے انہیں لگائی ہیں۔ ابھی الٹا ٹوکا ساری ہوشیاری ناک کے سامنے نکال دوں گا۔ تو صرف ذرا سہجور ہی نہیں ہے، باور لیاقت کا عاں بندہ بھی ہے۔ اندر باہر کی ساری باتوں کا کچھ پتا ہے۔"

شکور نے کہا "میں سچ کہتا ہوں سردار جی! میں نے فیکٹری میں کسی نئے بندے کو نہیں دیکھا ہے۔ بس دو تین گن میں سے آئے ہیں اور میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

شکور کافی اعتماد سے جواب دے رہا تھا مجھے اسے یقین ہو کر استاد جانی کے ہوتے ہوئے اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کا ساتھ میرے لئے بیش پریشانی کا باعث رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ پر ایک ہماری ذلت نئی عائد ہو گئی ہے اور میرے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو "اپنے چاہنے والے" کی توقع پر پورا اتروں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ماحول میں کام کرنا مجھے اچھا لگتا ہے جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ سب نفرت کرنے والے ہوں۔ کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ ایسے ماحول میں میرے اندر کی وحشت پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے اور میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص پاتا ہوں۔

شکور سے کہا "ماں! بس کی چند منتخب گالیاں دینے کے بعد مجھ خیم ڈنگا ٹھک لوڈر کے عہدی دروازے کی طرف بھاگا۔ وہ لوڈر کی تلاش لیتا جاتا تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ یہ تلاش صرف خانہ بڑی کے لیے لیتا جاتا ہے، ورنہ اس کے ہدم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مطلوب یہ شخص میاں ہو سکتا ہے۔ اس کی یہی بے پروائی اور بے یقینی اس کے لیے مصیبت کا باعث بنی۔ جو بھی اس نے ٹائٹلوں سے بھرے ہوئے چند ڈبے ایک طرف ہٹا کر خلا میں جھانکا میں نے پکڑتی سے اس کی خود رو داڑھی میں ہاتھ ڈالا اور ماڈر کی سردال اس کی کپڑی سے لگا دی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میں نے ہانک چلا کر انہوں سے بھرے ہوئے کچھ اور ڈبے فرش پر گرائے اور ڈنگا ٹھک کو نشانے پر رکھ کر

لوڈر سے باہر آ گیا۔ "خبردار" میری آواز پارکنگ لائٹ میں گونجی۔ "ٹھکی نے ہتھیار نکالا تو اسے جان سے مار ڈالوں گا۔" پارکنگ لائٹ میں ایک دم سکوت چھا گیا۔ سب انسپکٹر اور اس کے دو کانشیل سمیت کم از کم چھ افراد لائٹ میں موجود تھے۔ وہ سب حیرت ناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ڈنگا ٹھک کو کھینچتا ہوا دیوار کے قریب لے گیا۔ "کون ہو تم؟" سب انسپکٹر نے گرج کر پوچھا۔

"جس کی تلاش میں تم کتوں کی طرح مارے مارے پھر رہے ہو۔"

ڈنگا ٹھک کی کھلی ہوئی آنکھیں کچھ اور کھل گئیں۔ اس نے محنت کے عالم میں میرا چہرہ دیکھا اور بولا "تم؟ تم استاد جانی ہو؟"

"کون استاد جانی؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔

ڈنگا ٹھک سوالیہ نظروں سے سب انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ ان سب کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ ایک دم ہی وہ مجھ سے مرعوب نظر آنے لگے تھے۔ ڈنگا ٹھک نے کمری سانس لے کر کہا "دیکھو جن جی! اگر تم استاد جانی ہو تو یہ ہتھیار تانے کی تمہیں کوئی لوڑ نہیں۔ تم ہمیں دشمن مت سمجھو۔"

"بالکل! مجھے تو تم سب کو اپنا سرکاری دشمنہ دار سمجھنا چاہئے۔" میں نے کہا "خبردار" اگر کوئی چالاکی دکھائی تو میں لحاظ نہیں کروں گا۔"

سب انسپکٹر کا ہاتھ اپنے سرکاری ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری دھمکی نے اسے ایک دم ٹھنکا دیا۔ میں ڈنگا ٹھک کو کھینچتا ہوا کچھ اور پیچھے لے گیا۔

ڈنگا ٹھک نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور سب انسپکٹر کو آواز دے کر بولا "مستاب! جانی صاحب کو یقین نہیں آ رہا۔ تم اپنے ہتھیار بچے رکھ دو اور گاڑی سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

سب انسپکٹر سمیت تمام افراد نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میرے سامنے پچھلے فرش پر ایک ریوالور، ایک ہٹل "دو چاقو اور ایک کار بین نظر آنے لگی۔ ڈنگا ٹھک نے اپنی ڈب میں سے بھی ایک ہٹل نکال کر اور اسے ٹال کی طرف سے پکڑ کر فرش پر پھینک دیا۔ میں نے شکر سے کہا کہ وہ یہ سارا سامان انکھار کے لوڈر میں رکھ دے۔ شکر نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ڈنگا ٹھک دو ستانہ لیمے میں بولا "مجھے پورا دھڑاس ہے کہ تم استاد جانی ہو۔ ہمیں تمہاری تلاش ضرور تھی لیکن کسی بڑی نیت سے نہیں۔ تم یہ ماڈر جیب میں رکھ کر بڑے آرام سے یہاں بیٹھ سکتے ہو۔ پہلے ہم چائے

کے ساتھ کرما کریم بکڑے کھاتے ہیں، پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

ڈنگا ٹھک کا پیپر سکون نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں میں سچائی کی بیشک نظر آئی لیکن اتنی جلدی اس پر اعتبار کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے کہا "ان لوگوں کو میاں سے باہر بھیج دو پھر میں ماڈر جیب جیب میں رکھ لوں گا۔"

وہ بولا "ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں بادشاہو! اندر سے بوا بند کر لیتے ہیں۔ کوئی فکر قاتنے والی بات نہیں ہے۔"

میری انگلی بدستور ماڈر کے ڈریکر پر تھی۔ میں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلے ہوئے کہا "چلو کہاں چلنا ہے؟ لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں کوئی چلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے جانی صاحب!" وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں نے ڈنگا ٹھک کی خود رو داڑھی چھوڑ دی اور اسے نشانے پر لے کر دروازے کی طرف بھاگا۔ شکر میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بنگلی دروازے سے نکل کر ہم ایک چھوٹے سے ڈیڑھی نما کمرے میں آئے اور وہاں سے ایک آراستہ دھواستہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ میں اور شکر کمرے میں داخل ہو گئے تو ڈنگا ٹھک نے مجھے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اندر سے کئی لگا دی جائے۔ میں نے کہا "ہاں۔ دروازہ اندر سے بند کر دو۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ہم صوفوں پر آنے سامنے بیٹھ گئے۔ ڈنگا ٹھک نے دو ستانہ دوپٹے میں بظاہر کوئی چال نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ماڈر ایک جانب صوفے پر رکھتے ہوئے کہا "بولو ڈنگا ٹھک! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ کہنے لگا "بڑی ٹھنڈ ہے، اگر اجازت ہو تو چائے منگوالوں۔"

میں نے کہا "چائے پھر آتی رہے گی، تم وہ بات کو جو کرنے والی ہے۔"

وہ ایک کمری سانس لے کر بولا "جانی صاحب! اچھے بُرے لوگوں سے تمہارا بہت واسطہ رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ بد معاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ میں تم سے جو کہ رہا ہوں وہ بالکل حق سچ ہے اور اس میں ایک نقطہ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ یہ بات سولہ آنے سے صحیح ہے کہ چار پانچ دو پہلے تک میں اور میرے ساتھی تمہاری تلاش میں تھے۔ ہم خوشاب کے اس سینکو "ٹیک والے" افزائیم کے لئے کام کر رہے تھے۔ سینکو نے ہمارے ساتھ پچیس ہزار میں معاملہ

کیا تھا۔ ہمیں ایک پاکستانی ٹرک اور اس میں موجود تین ہندوؤں کو ڈھونڈنا تھا۔ یہ فیلے کا کام تھا۔ اس کام میں ہمیں دو مہینے لگتے۔ تین ہفتے لگتے، یا ایک دن میں کام ہو جاتا۔ ہمیں پچیس ہزار روپے ملتا تھے لیکن پھر نہ جانے کہاں سے یہی سے شکر شرا صیب اس معاملے میں گود پڑے۔ سینکڑوں ہمیں بتایا کہ اس کا خاص آدمی آیا ہے اور اب اسے ہماری ضرورت نہیں رہی۔ یہ بات تم بھی مانو گے کہ یہ اصول کی بات نہیں تھی۔ ہم مانتے ہیں کہ شکر شرا صیب بڑا بدعاش ہے۔ ہمارا اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس کے آنے پر سینکڑوں آنکھیں پھیری ہیں، ہمارا دل بالکل کھٹا ہو گیا ہے۔ کل جب مجھ کو پتا چلا کہ اشار ہوئی کی چمت پر بنگالہ کرنے والا جانی استاد تھا اور سینکڑوں غیر اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کئی کہ اگر موقع ملتا تو شکر شرا صیب اسٹا جمانی کا ساتھ دوں گا۔

اس نے اپنی آواز دہری کر لی اور آگے کو جھکتے ہوئے بولا "یہ جو پولیس والے تم کو پکڑ کر لائے ہیں نا، اپنے ہی بندے ہیں۔ بلکہ ایک تو میرا بھتیجا ہے۔ میں نے ان کو کمرہ رکھا تھا کہ آئے دو اے ہاں اچھی طرح نظر رکھی۔ جہاں کوئی مشکوک بندہ یا گاڑی ٹھانی نظر آئے پکڑ لیں۔ تمہارے لوڈر میں ٹائیلوں والے ڈبے دیکھ کر ان لوگوں کو شک ہو گیا کہ یہ لوڈر باور لیاقت کے کارخانے سے آیا ہے۔ یہ لوگ لوڈر کو یہاں لے آئے۔ بہر حال یہ بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ لوڈر کے اندر سے تم یہ قلم خود نکل آؤ گے۔"

اتنے میں دروازے پر ہدم دستک ہوئی۔ ڈنگا شکھ نے پھر اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مائزہ ہاتھ میں لے لیا اور اسے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی کی شکل نظر آئی۔ وہ شکل و صورت سے ہی "اس" بازار کی لڑکی تھی۔ مشکل میں سال عمری ہو گی لیکن چٹے کی دھوپ میں جس کردہ پچیس چپیس کی دکھائی دینے لگی تھی۔ بہر طور وہ جسمانی کشش سے پوری طرح محروم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نرے تھی۔ نرے میں شراب، سوزا اور گلاس تھے۔ ڈنگا شکھ نے اس کے ہاتھ سے نرے لے لیے۔ وہ ڈنگا شکھ کے کندھے کے اوپر سے میری طرف دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں عجیب سا اشتیاق تھا۔ ڈنگا شکھ نے کہا "کیا بات ہے! ایسے کیا نام لڑکی ہے دیکھنا ہے تو اندر آ کے دیکھ لے۔"

پھر مجھے جسم کی ایک اونچی لمبی لڑکی مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ "ست سری اکال" اس نے ٹیٹ بنگالی لہجے میں

کہا۔ میں نے سر کے اشارے سے جواب دے کر اسے سر ہٹا دیا۔ وہ گڑ بڑاتی اور مد طلب نظروں سے ڈنگا شکھ کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈنگا شکھ نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا "اس کا نام ہتسا ہے۔ اندر اندر شرکی رہنے والی ہے۔" واگور نے اس کے گلے میں بڑی مٹاس بھری ہے۔ جب شکھ کا کمر قلمی گانے کا بول اٹھائی ہے تو یار لوگ کچا پکڑ لیتے ہیں۔ اصل میں میرا یار مت شکھ پر سون جیل سے رہا ہوا ہے۔ اس کی خوشی منانے کے لئے ہم نے اسے بلایا تھا۔ دو اور لڑکیاں بھی ہیں اس کے ساتھ۔"

"ہاں جی۔ بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" میں نے فطریہ لہجے میں براہ راست ہتسا سے پوچھا۔ وہ بولی "میں جی، آپ کو دیکھنے چلی آئی ہوں۔ آپ کا نام سنا ہے۔ مت شکھ نے بتایا کہ ابھی جو دو بندے آئے ہیں ان میں ایک جانی استاد ہے، میں نے سوچا ایک نظر دیکھ لوں آپ کو۔"

میرا دل سرپٹنے کو چاہ رہا تھا۔ میں خود کو جتنا گنام رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اتنی ہی مشہوری ہو رہی تھی اور یہ مشہوری بھی نہیں تھی بدنامی تھی۔ مشہوری تو بے ہوتی جب میں شریف اور باشعور شہریوں کے درمیان ہوتا اور وہ مجھے پہچان کر وابستگی کا اظہار کرتے۔ مجھے پہچانے اور شناسائی کا اظہار کرنے والے تو معاشرے کے مگرے محضے ہندام لوگ تھے۔ اپنی مجبوریوں کے تحت میں ایک عرصہ ان لوگوں کے درمیان آئی جیسا بن کر رہا تھا۔ میں نے مجھو لکھا تھا، شراب پی تھی، مار دھاڑ کی تھی۔ اب وہ ہاتھی میرے گلے کا بار بن رہا تھا۔ شکور جیسے آوارہ گردوں اور ہتسا جیسی طوائفوں نے بھی مجھے پہچانا شروع کر دیا تھا۔ قصور میں یہ آواز گونجنے لگی تھی۔

یہ تو دہی جگہ ہے مگر رے تھے ہم جہاں سے میں نے ہتسا کو ذرا دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ہی استاد جانی ہوں؟ ممکن ہے جانی صاحب وہ ہوں جو سامنے بیٹھے ہیں۔" میں نے شکور کی جانب اشارہ کیا تھا۔

اس نے ایک نظر شکور کی طرف دیکھا اور ہنس دی۔ ہنسنے ہوئے اس کے دند اسار گٹے مسوڑے نمایاں ہو گئے۔ اپنی ہنسی سے اس نے زبان کا کام لیا تھا اور پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔

ڈنگا شکھ بولا "اب دانت کیا نکال رہی ہے حرام

زادی! چل پھٹ میاں سے۔ ہمیں کام کی باتیں کرنے ہیں۔" ہتسا نے ایک بے باک نظر مجھ پر ڈالی اور لڑا کر باہر نکل گئی۔ یہ عام بات ہے کہ پشاور پر غور میں تند مزاج اور غیر جذباتی ہوتی ہیں لیکن یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ ان کا یہ رویہ عام تماشا بیٹوں اور گاہکوں سے ہوتا ہے۔ اگر واسطہ تند و تیز اور مدد رکھنے سے ہو اور طوائف یہ بات جانتی ہو کہ "بڑی عورت" ہونے کے باوجود کسی بھی خوالے سے اس پر حاوی نہیں ہو سکتی تو اس کی فطری نسوانیت جاگ اٹھتی ہے اور بھی کبھی وہ دابو عورت نظر آنے لگتی ہے۔ ہتسا منہ پھٹ اور بازار کی عورت ہونے کے باوجود میرے سامنے شرمائی لائی نظر آتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ جانی استاد کا نام اس کے لئے مرعوب کن تھا۔ پندرہ بیس منٹ کی گفتگو کے دوران میرے اور ڈنگا شکھ کے درمیان ایک بے نام سے اعتماد کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے آدھ پون گھنٹے بعد یہ اعتماد مزید مستحکم ہو گیا۔ میں نے اپنا مائزہ لایا۔ جی۔ میں رکھ لیا۔ ڈنگا شکھ نے اپنے ساتھیوں کو بھی ڈرائنگ روم میں بلایا۔ ان میں چوڑا چکامات شکھ صورت سے ہی ایک خطرناک شخص نظر آتا تھا۔ ڈنگا شکھ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے فخر سے بتایا کہ یہ شخص تین قتل کر چکا ہے۔ تینوں دفعہ جیل گیا ہے لیکن ہر بار دو ڈھائی سال کاٹ کر باہر آیا ہے۔ مت شکھ کے علاوہ ڈنگا شکھ کے دو ساتھیوں کا تعلق مقامی بازار حسن سے تھا۔ انجمن نامی ایک بدعاش امرتسر کا رہنے والا تھا۔ دو سال پہلے تک یہ شخص کبڈی کا زبردست کھلاڑی تھا لیکن پھر بدعاشی میں پڑ گیا اور اب وہ دن رات "قانون" کے ساتھ "کبڈی کبڈی" کرتا تھا۔ اس طرح ایک شکھ لڑکا ہوشیار پور کا تھا۔ وہ وہاں سے ایک کھڑائی کو اغوا کر کے لایا ہوا تھا اور کئی ایک مقدموں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ زبردست نشاے باز ہے۔

یہ سب لوگ مجھے "استاد" کہہ رہے تھے۔ ان کی زبانوں سے یہ لفظ میرے اندر کا شہا جہاں بی اے ایل ایل بی پسینے میں نہا جاتا تھا لیکن میں ان کی زبانیں نہیں پکڑ سکتا تھا، اور پکڑنا بھی کیسے؟ میں جانی استاد تھا۔ پولیس کی فائلیں، اخباروں کی سرخیاں اور انڈیا کی ہٹ لیسٹیں گواہ تھیں کہ میں جانی استاد ہوں۔ ایک دردناک کمائی کا نتیجہ سب کے سامنے تھا لیکن کمائی کا مہل تھی۔ فریہ کوٹ کے وہ بدعاش جو ہاتھ باندھے میرے سامنے بیٹھے تھے، ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اگر میں اپنے طور پر ان کی خدمات حاصل

کرنے کی کوشش کرتا تو کسی شرائط عامہ کرتے اور مراں معاوضہ دیتے لیکن اس وقت وہ بارضاد وقت میرے ساتھ ہر طرح کے تعاون کو تیار تھے۔ یہ بات اب ان میں سے کسی کے لئے اعلیٰ چھٹی نہیں تھی کہ میں ایک پاکستانی ٹرک میں بارضاد بار کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ وہ ٹرک میرے دو ساتھیوں سمیت کسی نامعلوم مقام پر کھڑا ہے اور بہت سے لوگ اس ٹرک تک پہنچنے کے لئے سردھڑکی بازی لگاتے ہوئے ہیں۔ اس ٹرک میں کیا ہے؟ ایک ایسا سوال تھا جو یقیناً ہر ذہن میں موجود تھا لیکن ڈنگا شکھ مت شکھ یا ان کے کسی ساتھی نے مجھ سے یہ سوال پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات جیسے طے شدہ تھی کہ اس ٹرک میں منشیات یا کسی دوسری بیش قیمت جنس کی صورت میں اسٹنگلنگ کا مال ہے۔ اس مال کی مالیت کیا ہوگی؟ یہ دوسرا سوال تھا۔ ظاہر ہے سوچنے والوں نے اس بارے میں بھی اندازے لگائے ہوں گے۔ پندرہ بیس لاکھ سے لے کر تین چار کروڑ تک کی ہند سے ان لوگوں کے ذہن میں ہو سکتے تھے لیکن اس سے زیادہ کی توقع کی جاسکتی تھی نہ کوئی سوچ سکتا تھا۔

میں نے ڈنگا شکھ سے پوچھا "تم مجھ سے کس قسم کا تعاون کر سکتے ہو؟"

وہ بولا "جانی صاحب! تم ہمیں اپنا ہتھیار سمجھ لو اور ہتھیار سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کیا کرے گا؟ بس استعمال کیا جاتا ہے اسے۔"

میں نے کہا "اور کئی موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں ہتھیار کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

وہ بولا "ایسے موقعوں پر ہتھیار کو چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ ہتھیار تو ہتھیار ہوتا ہے۔ کسی بھی موقع پر اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ویسے جانی صاحب! یہ ایسا موقع بھی نہیں ہے کہ تم کو سرے سے ہتھیار کی ضرورت ہی نہ ہو۔ لازمی بات ہے کہ تم واپس ٹرک تک پہنچنا چاہو گے اور اسے ایسی جگہ تک لے جانا چاہو گے جہاں وہ اربے غیرے لوگوں سے محفوظ ہو جائے۔ شکر صاحب جیسے لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ بہت مشکل ہے۔"

مت شکھ بولا "ہمو مانہ بڑی بات ہے جانی صاحب! لیکن میرے دماغ میں یہ بات آ رہی ہے کہ وہ ٹرک اب اس جگہ پر نہیں ہو گا جہاں آپ اسے چھوڑ کر آئے ہیں۔ دیکھیں جی۔ جس طرح اس کی تلاش ہو رہی ہے، وہ وہاں پر ہو ہی نہیں سکتا یا تو وہ پکڑا جا چکا ہو گا یا پھر آپ کے ساتھی اسے

کس اور لے جائے ہیں۔  
مت شک صورت سے اُٹھ نظر آنے کے باوجود کافی سوچہ  
بوجھ رکھتا تھا۔ اس نے میرے دل کی بات کسی بھی نہ  
چوہیں مکتوں سے میں بھی کی سوچ رہا تھا کہ میں ممکن ہے  
اب نرک وہاں نہ ہو جہاں میں اسے مجھ ذکر آتا تھا۔ بہر طور  
اس بات کا امکان میں تمہاری مدد سے زائد نہیں تھا۔ میں  
نے مت شک کی بات میں دلچسپی لینے ہوئے کہا "معرض کیا  
نرک وہاں سے نکل چکا ہے اور اسے تلاش کرنے کے لئے  
مجھے قابل اہم بندوں کی ضرورت پڑی ہے تو تم کتنے بندے  
متیار کر سکتے ہو؟"

مت شک نے کہا۔ "واہ گرو کرے آپ کو یہ سب کچھ نہ  
کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو ہم آپ کی سوچ سے بڑھ کر  
آپ کی مدد کریں گے اب اس سور کے خم افزا ہم سے  
ہماری کملی لڑائی ہے۔"  
ڈنگا نکلے گا۔ "جہانی صاحب! میں تو کہتا ہوں کہ یہ  
بھی واہ گرو کی کہانی ہوتی ہے ہمیں اس کتے کے لیے آپ  
کے خلاف کام نہیں کرنا پڑا۔"

مت شک اپنی پیشانی پر سوچ کی لکیریں بچھا کر بولا۔  
"جہانی صاحب! میرا خیال ہے سب سے پہلے تو آپ کو ایک  
بند گاڑی کی ضرورت ہے جس میں آپ نرک تک پہنچ سکیں  
لیکن جہاں تک میرا داغ کام کرتا ہے اور میں اس شرم کو جانتا  
ہوں اس کام کے لیے دن کا وقت ٹھیک نہیں ہے۔"  
"مگر رات کو تو کفر ہو گا؟" میں نے کہا۔  
"ہو سکتا ہے" آج اٹھایا جائے۔ "مت شک بولا۔  
"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ اٹھایا جائے۔" ڈنگا شک  
نے کہا۔

میں نے مت شک سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں تمہاری  
اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ مجھے رات کے وقت ٹھکانا  
چاہیے اور اس کے لیے بند گاڑی استعمال کرنی چاہیے۔ بند  
گاڑی میرے پاس موجود ہے اور ڈرائیور بھی ہے اگر آج  
رات کفر نہ ہوا تو میں گیارہ بجے کے قریب یہاں سے نکل  
جاؤں گا۔ اس کے بعد دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ  
نرک مجھے مقررہ جگہ پر کھڑا مل جائے اور دوسری یہ کہ نہ  
ملے۔ پہلی صورت میں تو میں دوبارہ تمہیں تکلیف نہیں دوں  
گا لیکن دوسری صورت میں مجھے وہاں یہاں آنا ہوگا۔ اس  
کے بعد ہم اپنا آئندہ پروگرام بنائیں گے۔"

مت شک بولا۔ "جہانی صاحب! میں توڑی سی گستاخی  
کرنا چاہتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ پہلی صورت میں بھی

آپ کو ہماری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ آپ شر کے حالات  
سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ پورے  
فرید کوٹ میں شکاری پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر مشکوک شخص  
اور گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ خاص طور پر نرک یا نرک نما  
گاڑیوں کی تو کم سختی آتی ہوتی ہے۔ میرے نزدیک آپ کا اس  
لوڈر ٹھکانا کسی طور ٹھیک نہیں۔ اس کام کے لیے آپ کو کوئی  
چھوٹی گاڑی یا بند دین وغیرہ استعمال کرنی ہوگی۔ جہاں تک  
لوڈر کا تعلق ہے وہ اس چھوٹی گاڑی کے پیچھے پیچھے جاسکتا  
ہے۔ میں ڈنگا شک یا ہم دونوں اسے چلا کر لے جاسکتے ہیں۔  
بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر آپ ہم بھروسہ کر سکتے ہیں تو پھر کم  
از کم آٹھ دس سبب بندے اپنے ساتھ لے جائیں۔ کسی بھی  
جگہ افزا ہم یا فطر صاحب کے بندوں سے آپ کا کراؤ  
ہو سکتا ہے۔"

مت شک کی یہ بات قابل غور تھی کہ نرک یا نرک نما  
گاڑی بہت جلد خالصین کی نظریں آسکتی ہے۔ غالباً یہی وجہ  
تھی کہ فیکٹری سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی لوڈر کو روک لیا  
گیا تھا۔

ان سارے مسائل پر ہمارے درمیان ڈیڑھ دو گھنٹے  
تک گفتگو ہوئی۔ ڈنگا شک اور مت شک کی باتوں سے  
خیر اندیشی جھلکتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ رات کا انتظار کیا  
جائے اس دوران ڈنگا شک کسی ایسی معقول سواری کا  
انتظام کرے جس پر کم سے کم ریک لے کر شرمیں گھوما  
جاسکے میں نے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ ڈنگا شک کے ایک  
کارندے کے ہاتھ باؤلیات کو پیغام بھجوا دیا کہ میں شرمیں  
ایک محفوظ مقام پر ہوں اور میری طرف سے فہر مند ہونے کی  
ضرورت نہیں۔ میں آج یا کل کسی وقت از خود اس سے رابطہ  
کروں گا۔

سہ ہر تک ایک بار پھر ہمارا سارے کا سارا پروگرام  
دہرا رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ علی الصباح شرمیں نکلنے والے  
جلوس نے گاندھی اسکوئرز میں پہنچ کر ایک بڑے جھوم کی شکل  
اختیار کر لی تھی۔ وہاں ایک مخالف جھوم سے اس جھوم کا  
تصادم ہو گیا۔ اس تصادم میں ایک شخص ہلاک اور کئی زخمی  
ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد شرم کے متاثرہ علاقوں میں ایک  
بار پھر کفر نوٹ کر دیا گیا تھا۔

☆○

رات کے وقت بد معاشوں کے اس ٹولے نے کوئی  
میں خوب سوچ میلہ کیا۔ یہ ایک طرح سے مت شک کا  
"بشن رہائی" تھا۔ وافر مقدار میں پلاؤ زرد اور قرمہ پکایا گیا

تھا۔ ساتھ میں ولایتی شراب کی بوتلیں تھیں جو "پتھو  
امر تریا" ایک بڑی پتی میں بھر کر لایا تھا۔ کمانے بے کے بعد  
ناچ گانے کی محفل پڑھائی۔ یہ کافی وسیع کوئی تھی۔ چاروں  
طرف کشادہ لان تھے۔ کوئی کے اندرون حصے میں ہونے والا  
شور دخل اندازی نہ جاتا تھا۔ میں نے اس محفل میں شرکت  
نہیں کی تاہم مست قہقہے اور سُری آواز میں اس جھومے سے  
بندہ دم تک پہنچ رہی جہاں میں جی بجائے لینا تھا۔ ڈنگا  
شک اور اس کے ساتھی نشے میں فن ہو کر ایک دوسرے کو  
گندی گالیاں دے رہے تھے لگاتار دے رہے تھے اور کبھی  
کبھی شاید تعظیم کرتا بھی ہو جاتے تھے۔ اظہارِ مسرت کا اپنا اپنا  
انداز ہوتا ہے۔ کس فرائض پڑے جاتے ہیں، کس شہرینی  
اپنی جاتی ہے، کس مبارک باد دی جاتی ہے اور دعوت طعام  
ہوتی ہے۔ یہ بد معاشوں کا اظہارِ مسرت تھا۔ وہ ایک  
دوسرے کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔ تعظیم کرتا  
ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ جُرا دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی  
خصوصی نفسیات کے دائرے کے پابند تھے۔ اس "نفسیات"  
میں خوشی اور غم دونوں کیفیات میں امتحان کو پھونکنے کی کوشش  
کی جاتی ہے۔ غم ہو تو اتنا کہ خود کسی کو بھی چاہے یا کسی کو قتل  
کرنے کو۔ اور خوشی ہو تو اتنی کہ بندہ پاگل ہو جائے۔

رات ایک بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔  
میں نے جب تپتہ سارے گاڑی کی موجودگی کا اندازہ کیا اور پھر  
درازہ کھول دیا۔ سامنے ڈنگا شک کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں  
نشے میں سرخ تھیں لیکن لب و لہجہ قابو میں تھا۔ کھنکھنے لگا۔  
"جہانی صاحب! یاد رہے کیا گروہا ہے اس حرامزادی ہتھان  
کو۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔ میں تمہارا نام  
لے لے کر آہیں بھر رہی ہے۔ کتنی ہے آج کی رات جہانی  
صاحب کے لیے ہے۔"

میں نے کہا۔ "اے تا دو کہ یہاں آئی تو جو تے کھائے  
لی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میں نے بھی کہا تھا کہ جہانی صاحب  
کی اور ٹائپ کے بندے لگتے ہیں لیکن وہ تو ہستی ہی کچھ  
ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آئے گی۔ اس سے خوب بات  
لے لیں۔"

میں نے مہر کی غنیمت کی کہ۔ "ڈنگا شک! میں نے کسی  
بات نہیں کہی۔ اسے مت بھیجنا یہاں۔"  
اسے میں پتہ نہیں کی کہ ہم ٹھکانا ہٹ سنا کی دی۔ ڈنگا  
شک کو فرائض انداز میں مسکرا کر بولا۔ "جو جہانی صاحب! اپنی  
مادری میزبان۔ ہمارا تو مزہ کر کر رہی ہو چکا ہے۔ گرو کرے

تمہارا کچھ سنو رہا ہے۔"  
میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔  
چند لمبے بعد ہتھان پچم سے اندر آئی۔ اس کی آنکھوں میں  
ہلکا سا نشہ تھرا رہا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے  
اس کے سوزے نمایاں ہو جاتے تھے لیکن ان سوزوں کے  
سبب اس کی مسکراہٹ بدلتا ہونے کے بجائے دلکش ہو جاتی  
تھی۔ ممکن ہے وہ بہت کھل کر ہنسی ہو تو یہ دلکشی بدلتی  
بدل جاتی ہو۔ فی الحال تو یہ مسکراہٹ جاذبِ نظر تھی۔ شاید  
اسی مسکراہٹ کے سبب اس کا نام ہتھان رکھا گیا تھا یا پھر نام  
ہتھان ہونے کے سبب وہ اس دلنشین مسکراہٹ کی مالک بنی  
تھی۔

خوبصورتی کسی نہ کسی طور انسان پر اثر انداز ہوتی ہے۔  
مجھ پر بھی ہوئی۔ میں جو سخت الفاظ ہتھان کے لیے استعمال کرنا  
چاہتا تھا وہ غیر محسوس طور پر نرم ہو گئے۔ "کیا بات ہے۔ کیا  
لینے آئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا سا وقت۔" وہ اٹھلا کر بولی اور ایک اداس  
کمرے کی اگلی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے سنو نے میں  
کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور اپنی طرف سے سارے تباہ  
کن بھنکاروں سے سبک ہو کر آئی تھی۔

"ڈنگا بولی۔" میں نے نفوس لیے میں کہا۔ "میں اس  
قسم کا بندہ نہیں ہوں جن لوگوں نے تمہیں بلایا ہے ان کے  
پاس جاؤ۔ میری نیند بے ادب مت کرو۔"

"جہانی صاحب! میں آپ کی نیند میں خرابی کب ڈال  
رہی ہوں۔ آپ سو جائے۔ میں آپ کے پاس اس کرسی پر  
بیٹھی رہوں گی۔ میرے لیے یہی بڑی بات ہوئی کہ۔" اس  
نے جان بوجھ کر فخر و ادھر اچھوڑ دیا۔

ایک دم میرا پارا چھ گیا۔ "میں تمہیں شکل سے آلو کا  
چٹا نظر آتا ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "جاؤ! اپنا کام کرو۔  
مجھے آرام کرنے دو۔"

وہ ایک دم مجھ ہی گئی۔ سولہ سنگار، خوبصورت  
مسکراہٹ اور نشی چال کا بھرپور ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں  
میں حیرت آمیز بے چارگی ابھر آئی۔ جیسے خود کو عرش پر بیٹھے  
والا اور دے نہ فرش پر گرے اور دم بخود رہ جائے۔ جیسا کہ  
میں نے بتایا ہے وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کی ساتھی  
لوکیاں بالکل مگر ذری تھیں۔ شاید ان ہی کے سبب وہ خود کو  
اہم سمجھنے لگی تھی۔ اب خوش فہمی کا یہ شیش چٹا چڑ ہو گیا  
تھا۔ بجائے اس منظر نے میرے دل کا کون سا تار جھیز کر میرا  
فصہ جاتا رہا۔ وہ لڑکھائی ہوئی اٹھی تو میں نے کہا۔ "بیٹہ

جاؤ۔

وہ چند لمے ساکت رہی پھر بے جان سی ہو کر بیٹھ گئی۔  
اس کی نگاہیں خالی خالی تھیں۔

میں نے نرمی سے کہا ”پورا نام کیا ہے تمہارا؟“

وہ بولی ”پورا نام ہی ہنس ہے جی۔“

”کہاں کی رہنے والی ہو؟“

”گوروا پور کی۔“

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لگاؤ کی نظروں سے دیکھا ”دیکھو ہنس بانی! خدا انہما خواست تمہاری خوب صورتی اور جوانی میں شک نہیں ہے لیکن میں اس وقت صرف اور صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میری بات سمجھ رہی ہو یا تم؟“

”اے! جہاں صاحب! سمجھ رہی ہوں۔ دراصل۔“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”دراصل کیا۔؟“ میں نے اسے کڑوا چاہا۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی پھر کڑا کر کے بولی ”میں واپس گئی تو وہ پریم اور آشنایا مذاق اڑائیں گی۔“ پریم اور آشنایا اس کی سامتی لڑکیوں کے نام تھے۔

”کیوں مذاق اڑائیں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہیں“ وہ گردن جھکا کر بولی۔

اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ”بڑا بول“ بول کر آئی ہے۔ ممکن تھا کہ بانی لڑکیوں سے اس نے کوئی شرط وغیرہ بھی لگا لی ہو۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا ”تو تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“

”اگر آپ مجھ پر مہربانی نہ کریں تو۔“ وہ کوڑیوں کے مول کینے والی ایک فاحش لڑکی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ ابھی تو وہی دیر پہلے مجھ سے اس کا دل توڑنے کا قصور سرزد ہوا تھا۔ اور دل دل ہی ہوتا ہے چاہے وہ طوائف کا ہو یا شریف زادی کا۔

میں نے کہا ”اچھا اگر یہاں بیٹھنا ہی ہے تو مجھے اپنی کمائی سناؤ۔“

چند اور اُدھر کی ہانکنے کے بعد وہ مجھے اپنی کمائی سنانے لگی۔ اس کمائی میں ایک بھی نئی بات نہیں تھی۔ یہ ایک طوائف کی ”راج الوقت“ دودھ تھی۔ ایک محبت کی بموکی لڑکی، ایک دغا باز لڑکا۔ محلوں کی لڑکش اور محلوں کا دونے اس کمائی کے دوران کسی ساتھ والے کمرے میں ”جیشن“ رہائی جاری رہا۔ نسوانی اور مردانہ آوازیں ایک دوسرے

میں گڈمڈم ہوتی رہیں۔ قہقہے گونجنے رہے اور شیش کھٹکتے رہا۔ ہنس نے ابھی پوری طرح ہار تسلیم نہیں کی تھی۔ منٹک کے دوران گاہے گاہے اس کا جسم بھی بولنے لگتا تھا۔ یہ زہار خاموشی اس نے کئی بار مجھے بھڑکانے اور اکسانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

رات دو بجے کے قریب میں سوئے کے لئے لیٹ گیا۔ ہنس سوئے پر دراز ہو گئی۔ میں کمرے کی جی بجھاتا تو شاید وہ جل اٹھتی لیکن میں نے جی جی رہنے دی تھی اس لئے بجھ گئی۔ اور چونکہ وہ مجھ گئی تھی اس لئے جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ توڑی دیر بعد میں اس کے کدھم خزانے سن رہا تھا۔

اگلی صبح ڈنگ ٹنگ اور اس کے ساتھی دیر تک مدھوڑ پڑے رہے۔ ان کے خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں نے پوری کوشش کی ایک رازندہ لگایا۔ یہ کوششی چمڑوں کا ڈیرا تھوڑا اور اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہاں صرف طوائفوں کا آنا جانا ہے۔ عورت کے قدم سے یہ درودوار محروم ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر یک گونہ نکل ہوئی کہ کوششی کے پورج میں ایک موٹر رکشا موجود ہے۔ یہ رکشا کسی بکن بنانے والی کپڑی کا تھا اور عقب سے بالکل بند تھا۔ رکشے کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ ڈنگ ٹنگ نے میرے ستر کے لئے منگوایا ہے جیسا کہ بعد میں پتا چلا۔ یہ انتظام کل رات کرنے لگنے سے پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے ڈنگ ٹنگ کو بگایا۔ وہ ایک صوفے پر ادھ جا رہا تھا۔ اس کی دھوئی کپس سے گھیر جا رہی تھی اور فرش پر جانی واکر کی خالی بول پڑی تھی۔ ڈرائنگ روم میں مجھے مت شک نہ بھی دکھائی دیا۔ اس کا زیاد تر چہرہ جھانکنا میں چھپا ہوا تھا۔ رخساروں کے پاس ج توڑی سی جگہ خالی تھی وہاں تازے اور لپ اسٹک کے نشان نظر آ رہے تھے۔ نیند میں وہ کسی بیچے کی طرح مصعبہ لگ رہا تھا۔ ”ایسا بچہ جو کسی جیل سے نہیں اسکول سے رہا ہو آیا تھا اور اب اپنی ماں کے زانو پر سر رکھ کر گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ مت شک نہ کی اصل شکل و صورت تھی جس پر اس نے نجانے کون کون سے خول چھما رکھے تھے۔ یہیں پر ایک کونے میں مجھے شکر ادا بھی نظر آیا۔ وہ خود کو اس محفل رنگ و طرب سے دور نہیں رکھ سکا تھا اور تائیں پر مدھوش پڑا تھا۔ ڈنگ ٹنگ کے بعد میں نے شکر کو بیدار کیا اور ان دونوں کو بتا کہ کدھم میں آٹھ سے گیارہ بجے تک کا وقت ہے اور میں ہر صورت میں اس وقت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

جتنی تاخیر ہو چکی تھی وہ کافی تھی۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کو نہایت غیر یقینی حالات میں چھوڑ کر آیا تھا اور اب چھ سات دن گزرنے کے باوجود ان تک واپس نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے ڈنگ ٹنگ پر یہ واضح کر دیا کہ میں یہاں سے اٹھنا چاہتا ہوں۔ شکر اور موٹر رکشا ڈرائیو کر سکتا تھا لہذا مجھے کسی شے ڈرائیو کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہاں میں نے اس بات کا ڈنگ ٹنگ سے وعدہ کیا کہ اپنے ساتھیوں سے میری ملاقات ہو یا نہ ہو میں اس سے دوبارہ وہ رابطہ ضرور قائم کروں گا۔ رکشے میں بیٹھ کر میں ”موجود تھا“ کاغذات بھی مکمل تھے۔ میرے لئے مزید سولت فراہم کرتے ہوئے ڈنگ ٹنگ نے کہیں سے شر کا نشہ بھی حاصل کر لیا تھا۔

ماؤز میرے پاس موجود تھا اس کے باوجود ڈنگ ٹنگ نے موٹر رکشا میں ایک رانٹل اور اس کے ڈیزل سو رانڈ بھی رکھا دیے۔ ٹھیک آٹھ بجے ہم کو کوششی کے پورج سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک مت شک نے اچھا اور ان کے تمام ساتھی سوئے پڑے تھے اور سب لوگوں کے علاوہ لڑکی بھی سو رہی تھی جس نے میرے ساتھ ”رات گزارا“ تھی۔ میرے ساتھ رات گزارنے کو اس نے اپنی آٹا کا مسئلہ بنالیا تھا اور میں نے بھی اس کی آٹا کو نہیں پہنچانے کی خاص ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں کون سا بیس سالہ لڑکا تھا جس کی منگنی ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ میں جہاں استاد تھا اور میری بدنامیوں کی نفرت بہت طویل تھی۔

موٹر رکشا ایک دوڑتی سڑکوں سے گزرنے کے بعد شہر کے بھرے پڑے حصے میں آ گیا۔ کدھم نے نرمی سے ہی لوگ سڑکوں اور بازاروں میں اٹھ آئے تھے۔ رکشے کے بند کہیں ناٹھے میں اگلی جانب ایک جالی سی تھی۔ میں اس جالی کے راستے شکر سے سے مخاطب ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے سب سے پہلے گاندھی چوک چلے کو کہا۔ گاندھی چوک یا گاندھی اسکوائر ہی وہ جگہ تھی جہاں سے میں واپسی کا راستہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ ہم تقریباً دس منٹ میں گاندھی اسکوائر پہنچ گئے۔ راستے میں جگہ جگہ پولیس اور نیم فونی دستے دکھائی دیے۔ گاندھی اسکوائر پہنچ کر میں نے وہ کشادہ سڑک ڈھونڈ لی جہاں سے میں بڑبڑاہی میں یہاں پہنچا تھا۔ شکر میری ہدایات کے مطابق رکشا چلا رہا تھا۔ میں چپکس منٹ میں شہر کی حدود سے باہر نکل آئے۔ اب درختوں سے گھرے ہوئے اس دیران گردوارے تک بہت توڑا سا سفر باقی رہ گیا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی اور میں خود کو

ذہنی و جسمانی طور پر آنے والے حالات کے لئے تیار کر رہا تھا۔ چونکہ مجھے سے دو میل آگے ہم ایک زبردست پولیس ٹاکنے سے تحیرت گزر گئے تو مجھے امید ہو گئی کہ ہم صحیح سلامت حالت میں ٹرک تک پہنچ جائیں گے۔ وہ جے سستی خیز لمحات تھے جب ہمارا رکشا سڑک سے اتر کر گردوارے کے دیران کھنڈر کی طرف گھوما۔ ماؤز میرے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں رکشے کی جالی سے لگی ہوئی تھیں۔ جنت کے گھنے درختوں میں میں نے رکشا کو رانا اور پیدل ہی موٹے کی طرف بڑھا۔ چند لمے بعد میں آنکھیں مجھ پر بھڑک کر اس جگہ کود کر رہا تھا جہاں چند روز پہلے میں ٹرک چھوڑ کر آیا تھا۔ تیل کے دھبوں والی خالی جگہ میرا منہ چڑا رہی تھی۔ نہ ٹرک کہیں نظر آ رہا تھا اور نہ صندوق اور زبردست کل۔ چاروں طرف بھوکا عالم تھا۔ میں نے ذرا جھک کر ان نشانات کا معائنہ کیا جو ٹرک کے پتھروں سے بنے تھے۔ ان نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ٹرک کو اس جگہ سے روانہ ہونے کم از کم اڑنٹالیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔

دھوپ لگتی ہوئی تھی اس کے باوجود سر ہوا درختوں سے سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔ میں نے گرم چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹی اور میں اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا جہاں سات آٹھ دوڑ پہلے میں نے ٹرک پارک کیا تھا۔ بغور معائنے کے باوجود میں کوئی خاص بات نوٹ نہیں کر سکا۔ نہ کہیں دھبے منگنی کے آثار نظر آئے اور نہ کوئی ایسی شہادت ملی جس کی بنا پر کہا جاسکتا کہ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ پہنچی ہے۔ موٹے پر قدموں کے جوڑے گھمٹان موجود تھے انہیں میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ صندوق اور زبردست کل کے نقش پڑے تھے۔ سکرٹ کا ایک خالی پیکٹ نظر آیا۔ یہ صندوق کا براہ تھا۔ اس پیکٹ کے پاس ہی ایک خون آلود پٹی پڑی تھی۔ یہ پٹی غائب ہوا دل بیت کی ران سے اتاری گئی تھی۔ ایک جگہ چند اینٹوں کے درمیان کوئلے وغیرہ پڑے تھے جیسے یہاں چھلٹا رہا کر کے کچھ پکایا گیا ہو۔

میں نے گردوارے کے ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ کہیں کوئی تھپس دکھائی نہیں دیا۔ اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ کیکر کے ایک ٹھنڈ میں ایک سایہ متحرک ہوا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ میرے سامنے زردی گل کھڑا تھا۔ وہ بالکل مختلف لباس میں نظر آ رہا تھا۔ یہ مقامی لباس ڈلی دار شلوار کیس پر مشتمل تھا۔ جو تاجی اس لباس سے ملے لگتا تھا۔ زردی گل کو پہچان کر چادر کے نیچے ماؤز پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ زردی گل تیز لمبے میں ہوا ”چلیں استاد! یہاں سے نکل چلیں۔ بہت خطرہ ہے ادھر۔ ام جان پر کھیل کر آپ کا



انتظار کر رہا تھا۔

”نرک اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ نہیں۔ ام ڈیرے پہنچ کر آپ کو بتاتا ہے۔ زبردست اسٹوری ہے۔ پنجابی فلم کا ماف۔“ وہ مجھے کھینچتا ہوا درختوں میں لے آیا۔

”کون سی سواری ہے تمہارے پاس؟“ میں نے پوچھا۔  
”سواری نہیں پورا سوارا ہے“ زریں گل اپنے مخصوص لمبے میں ہولا ”نرکٹر ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور درختوں میں کھڑا کیا ہے ام نے۔ آپ بس ٹافٹ قدم اٹھائیں۔“

میں نے کہا ”میں ایک موٹر رکشا پر آیا ہوں۔ ایک بندہ بھی ہے میرے ساتھ۔ وہ گردوارے کے چھوڑے کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔“

”رکشے کو گولی ماریں استاد جی! اللہ ام کو رکشے کا کاریہ مریہ معاف کرے گا۔ ام سخت معیت میں ہے اس وقت۔ دیے آپ ٹھہرا کہاں ہوا تھا۔ اتنی دیر لگائی آپ نے؟ ام تو انتظار کر کے انتظار حسین بن گیا۔“

میں نے کہا ”میاں ایک بابو لیاقت ہے۔ بڑے کام کا بندہ ہے اسی کے پاس تھا۔ لیکن۔ تم اتنی جلد بازی مت کرو۔ مجھے کچھ سوچنے دے۔ میرے خیال میں نرکٹر سے تو رکشا بہر حال بچنے ہے۔“ اور۔“

ایک اکی مجھے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ زریں گل بھی جھپکی کی طرح پٹ سے گرا تھا۔ شاٹ گن کے دو فائر ہوئے تھے اور چمڑے سنسناتے ہوئے ہمارے پاس سے گزر گئے تھے۔ زریں گل بڑے متحوش انداز میں گرا تھا۔ فوری طور پر میں یہی سمجھا کہ وہ جلاؤ زندگی میں سرخ ہو گیا ہے لیکن یہ قیافہ غلط لگا۔ مزید فائر ہونے سے پہلے وہ میرے ساتھ ہی اٹھا اور برق رفتاری سے کیکر کے درختوں کی طرف بھاگا۔

”فہرہ۔“ میں نے ایک گرجتی ہوئی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی ایک رائل ٹی ٹال غم کی گھٹی شاخوں سے برآمد ہوئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آواز سے دو فائر کئے۔ رائل ٹی ٹال اوڑھل ہوئی اور کوئی ”وہب“ سے بچی زمین پر گرا۔ میں نے زریں گل کو دیکھا۔ وہ بھی اپنی چادر کے نیچے سے رہا اور برآمد کر چکا تھا۔ یہ زریں گل کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی پھر مجھے درختوں میں ہم ایک دوسرے سے چمڑے گئے۔

”زریں گل۔“ میں نے دو تین بار اسے پکارا لیکن پھر

مجھے احساس ہوا کہ اس طرح پکارنا معیت کو دعوت دینا ہے۔ میں حتی الامکان خاموشی سے آگے بڑھنے لگا تاکہ رکشا تک پہنچ سکوں۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ایک یا دو مسلح افراد درختوں میں موجود ہیں اور ہانگوں کی طرح مجھے کھوج رہے ہیں۔ پھر مجھے اپنے بالکل قریب سے ایک آواز سنائی دی اور میں بے طرح چونک گیا۔ یہ شیطان ابن شیطان، درندہ خصلت شکر شکر کی آواز تھی۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے رائل ٹی ٹال پر تھا۔ شکر شکر سے دو بدو مقابلہ کرنے اور اسے جبریتاً انجام سے دو چار کرنے کی خواہش برسوں سے میرے دل میں موجزن تھی لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ موقع کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ میرا اوٹلین ٹارگٹ یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں تک پہنچوں اور چار پیٹوں پر دوڑنے والے اس قیامت خیز راز کی حفاظت کا بندوبست کروں جس نے فرید کوٹ اور اس کے گرد و نواح میں تھمکے چھاپا ہوا تھا۔

میں بے آواز چلتا ہوا موٹر رکشا تک پہنچ گیا۔ وہ اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شکر شکر نے عقل مند کی مظلما ہوا کیا اور راز ٹیگ سیٹ پر بالکل تیار حالت میں بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ بھی فائرنگ کی آواز سن چکا تھا اور جان چکا تھا کہ ”سب اچھا“ نہیں ہے۔ جھک کر بھاگتا ہوا میں رکشے تک پہنچا۔ ماؤزر میرے ہاتھ میں تھا اور سامنے کی جانب سے سارا لباس مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ”چلو“ میں نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔

شکر شکر نے لیور کو ایک جھٹکے سے بھیجنے کر رکشا اشارت کیا اور تیزی سے یوژن کے لے سوڑک کی طرف بھاگا۔ رکشا ایک ایسی سواری ہے کہ ہوا سڑک پر بھی اچھل کود کے لئے چلتا رہتا ہے اور یہاں تو سرے سے راستہ ہی نہیں تھا بس کئی چھٹی اونچی چھٹی ٹھری زمین تھی۔ رکشا تیز رفتاری سے چلا تو یوں لگا جیسے کوئی ہوائی جہاز رن وے کے بجائے زبر خیر سڑک پر سے ٹیک آف کر رہا ہے۔ ابھی ہم سڑک سے نصف فرلانگ دور تھے کہ ایک زبردست رنگ کی کار درختوں سے نکلی اور دھول کے بادل اڑائی تیزی سے ہماری طرف بڑھی۔ یہ کار چونکہ سڑک کی جانب سے آ رہی تھی لہذا شکر شکر کو موٹر رکشے کا رخ مخالف سمت میں موڑنا پڑا۔ عام ”ڈیلوری رکشا“ کی طرح اس رکشا کا دو انڈہ بھی عقب میں تھا۔ میں نے دو انڈے کی پہنچی چڑھا دی۔ دو سرائٹ ٹھوڑا سا کھول کر میں نے عقب میں آئی ہوئی زرد کار پر اوپر سے کئی فائر کیے لیکن اس کا فائر برٹ نہیں کر سکا۔ ایک تو فاصلہ زیادہ تھا۔

دوسرے رکشا سرکش گھوڑے کی چال چل رہا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد کار اور رکشے کی یہ اندھا دھند بڑا چاکل ختم ہو گئی۔ دوڑ ختم ہونے کا سبب بڑا سیدھا سا ہوا۔ کار سے رکشا پر ٹھیل ٹھیل نوکمن سے فائر کیے گئے۔ ایک گولی رکشا کے ٹائر میں لگی اور وہ جو پہلے ہی پٹلا پڑی کھانے کے بنائے ڈھونڈ رہا تھا۔ سر کے بل ٹوٹا ہوا ایک نشی کھیت میں جا گرا۔ چند لمحوں کے لئے زمین آسمان ایک دوسرے میں گڈمڈم ہو گئے۔ حواس بحال ہوئے تو میں نے شکر شکر کو دیکھا۔ وہ زرد کار میں سے برآمد ہوا تھا اور گرد کے بادل کو بڑھا ہوا مجھ پر بجھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹھیل ٹھیل نوکمن تھی۔ وہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن نشانہ مانتا تو ان سندوقوں تک کیسے پہنچتا جن کی خاطر وہ اور اس کے حواری بے حساب قت اور بے حساب دولت خرچ کر چکے تھے۔ جن کی خاطر انہوں نے دیر انوں کی خاک چھائی تھی اور انسانی خون سے اپنی تکمیل تھی۔

میں رکشے کے کھلے دو انڈے سے باہر گر گیا تھا۔ اور ب تو ریا کے ایک کھیت میں پٹ سے مل پڑا تھا۔ پانچ منٹ کی طوفانی ”ریس“ نے ہمیں آباد زمین سے نیم آباد زمین تک اپنا راہا تھا۔ جس جگہ ہماری دوڑ کو کل اسباب لگا تھا وہاں اکا کاکیت نظر آ رہے تھے اور قریب ہی ایک ٹوکسوں یا ٹوب بل کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ شکر شکر نے مجھ پر جست کی اور رائل ٹیگ سمیت پورے وزن سے مجھ پر گرا۔ میں جو کھٹے کی کوشش میں زمین سے بلند ہو چکا تھا ایک بار پھر جست دیا۔ رکشا کے ٹوکسوں پر ضرب آئی تھی اور دردی ٹپٹپٹ ٹھہ رہی تھیں لیکن جو مٹی شکر شکر کے نفرت انگیز لمس کا حاس ہوا، ساری جسمانی تکلیف اور دگ وپے کی ساری ات غیظ و غضب میں ڈھل گئی۔ جو مٹی شکر میرے اوپر آیا، اس نے مجھے کی ایک شدید ضرب اس کی پیلیوں میں لگائی اور ٹھیل کر باتیں طرف پھینک دیا۔ اسی وقت مجھے یہ احساس ملا کہ رکشا سے گرتے وقت ماؤزر میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ میں نے پٹ کی شکر کے اوپر آئے کی کوشش کی لیکن وہ لگی معمولی ضرب نہیں تھا۔ اس کی طاقت سے بھی بڑھ کر کی کی قیامی اور چستی خیریت تھی۔ اس نے اپنے لیے اپنے لٹی سے رائل ٹیگ کا آہنی گڈا میرے چہرے پر مارا۔ اس رپ نے میرے بالائی دانت ہلا دیے اور منہ میں خون کا کین ڈال دیا۔ میں نے پیچھے کی طرف گرتے ہوئے ٹھک چلائی اور میرے پاؤں کی بھر پور ٹھوکر نے شکر کے ہاتھ سے رائل ٹیگ صاف نکال دی۔ میں نے رائل ٹیگ کو کھیت کی نرم

زمین پر گرتے دیکھا اور اس منظر کے ”میں منظر“ میں مجھے کھیت مزدوروں کے ہولے دکھائی دیے جو بھاگے ہوئے ہزاری طرف آ رہے تھے۔

تو ریا کے اس کھیت میں لعلاتے پودوں کے درمیان چھپنے سورج تھے دو تین منٹ تک میرے اور شکر کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی، پھر اچانک میری گردن اس کے آہنی بازوؤں کے گھٹنے میں آ گئی۔ یہ اس داؤ سے ملتا جلتا داؤ تھا جو میں اکثر اپنے حریفوں پر استعمال کیا کرتا تھا۔ میں یہ داؤ ایک بازو سے لگا تھا لیکن شکر نے اس کے لئے دونوں بازو استعمال کیے تھے۔ میرا سر اس کے پیٹ سے دب گیا تھا اور اس کی ٹھوڑی میری گھر پر چھ رہی تھی۔ بڑی جان لیوا گرفت تھی یہ۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں جانتا تھا ”زیادہ زور لگانے کی صورت میں میری گردن کو ناقابل طاقی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حوصلہ شکنی کی بات یہ تھی کہ شکر شکر میرے آخری حربے سے آگاہ تھا۔ اسے معلوم تھا، میری ہڈی سے ہر دقت رام پوری خیر ایک خاص ٹھنک کے ساتھ بندھا رہتا ہے۔ جو کسی میں نے اپنا ہاتھ جھنکری طرف بڑھانے کی کوشش کی شکر نے گردن کو بے رحمی سے کھینچ کر مجھے اس حرکت سے روک لیا۔

ہمارے گرداب پندرہ بیس افراد اٹھنے ہو چکے تھے پہلے تو انہوں نے جھڑنے کی کوشش کی لیکن جب شکر شکر نے انہیں خطرناک لمبے میں دھمکیاں دیں تو وہ تماشائی بن کر رہ گئے۔ میری گردن اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ میں صرف اپنے بائیں ہاتھ کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اٹھنے کے لئے رکشے کا منظر نظر آیا۔ چند دستانی افراد تقریباً اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ کوئی شخص رکشے سے دبا ہوا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ رکشے میں میرے علاوہ صرف شکر اور تھا اور شکر اور رکشے سے باہر آچکا تھا۔ میں نے اسے صرف دس قدم کی دوری پر دیکھا۔ اس کی پٹھانی دیکھی جو ڈنگا کھٹے نے احتیاطاً رکشے میں رکھوا دی تھی۔ رائل ٹیگ کا رخ شکر شکر کی طرف تھا لیکن مجھے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ شکر اور اس رائل سے شکر کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔ معلوم نہیں یہ شکر شکر کے نام کی بدبخت تھی یا شکر شکر نے کبھی کسی پر ٹھیل چلائی ہی نہیں تھی۔ کسی کو گولی مارنے کا دعویٰ کرنے اور واقعی گولی مارنے میں بہت فرق ہوتا ہے میں نے اندازہ لگا لیا کہ شکر اور شکر کو صرف دھمکانا چاہتا ہے۔ وہ بیانی لہجے میں ہولا ”چھوڑو شکر صاحب! پیچھے



لوگ تھے، اتنی ہمت ان میں نہیں تھی کہ زمین پر پڑی دو راتوں میں سے کوئی ایک رات نکل اٹھا کر شکر شہر پر تان لیتے یا سب مل کر اس پر بل پڑتے۔ میری آنکھوں میں ستارے سے پائے شروع ہو گئے تھے اور لگتا تھا کسی بھی لمحے میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاؤں گا۔ اس طرح کے ملک داؤ میں مجس جانے کا احوال کچھ انہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جو اس تجربے سے گزرے ہیں۔ ہمارے ہاں جو دیکھی سختیاں ہوتی ہیں ان میں کبھی کبھار ایسی صورت حال پیش آجاتی ہے ایسی سختیوں میں راؤ بڑا دقت و فیوہ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ کسی خطرناک داؤ میں مجس جانے والا چٹوان کلکت سے بچنے کے لیے تار اپنی جان پر عذاب جمیلتا رہتا ہے اور بعض اوقات موت کی سرمد کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

بے شک میں شکر کے چنگل میں بڑی طرح مجس گیا تھا لیکن مدافعت سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ میں مسلسل اس ناک میں تھا کہ اپنے پیچھے لگتے ہوئے ہاتھوں سے شکر کے زیریں جسم پر ضرب لگا سکوں۔ شکر بھی اسی بات کو سمجھتا تھا اور وہ اپنی آنکھیں مجھ سے دور رکھتے ہوئے تھا۔ برہم حال مجھے امید تھی کہ وہ جلد یا بدیر غلطی کرے گا۔ میری ہر لم دھندلاتی ہوئی آنکھیں اس غلطی کے انتظار میں تھیں۔

آخر میری امید بر آئی۔ مجھے زمین سے اٹھانے کی کوشش میں شکر کا زیریں جسم میرے قریب آگیا۔ میں نے اپنا بازو لہا کر اور بڑی محی طاقت بن کر کے ایک بھر پور ضرب شکر کے جسم کے نازک حصے پر لگائی۔ وہ بڑی طرح خراب ایک ساعت کے لیے میری گردن پر اس کی آہنی گرفت نرم پڑی میں نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑائی اور شکر کو کچل دیا۔ ہوا دھول سے اٹنے راستے پر گرا۔ مجھ پر بھی خون سوار ہوا تھا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میرے گئے بازو تو شکر کے چہرے پر برس رہے تھے۔ وہ بھی جوانی میں لگا تھا لیکن میرا با واضح طور پر بھاری تھا۔ اس نے بھاگ کر راتقل تک چاہا۔ میں نے جست لگا کر اسے راستے میں روکا چاروں طرف ہوا کسی کڑ بجھے لے گیا۔ اب ہم کونوں کے بالکل قریب تھے۔ شکر کے ایک طرفانی کونے سے اپنا چہرہ چا کر میں۔ پنڈلی سے بھر کھینچا اور بے دریغ شکر پر حملہ کیا۔ شکر نے رواجی پھرتی سے یہ دار بھجا لیکن اس کی جری نہیں بنی اور سینے کی بالائی جلد بھجری نوک نے چہرہ رکھ دی۔ وہ دھچکانے کی کوشش میں چند قدم اور بچھے گیا تھا۔ میں

بٹ جاؤ۔ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔ وہ قدم قدم شکر کی طرف ہٹتا رہا تھا۔ یہ اس کی دوسری بے وفائی تھی۔ اگر وہ کوئی نہیں چلا سکتا تھا تو پھر دور ہی کھڑا رہتا۔ پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اپنے حریف کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن شکر ابے خبر تھا کہ وہ کس معیت کو دعوت دے رہا ہے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ذکر تھا۔ جب شکر راتقل کے زخم میں خطرناک حد تک قریب آگیا تو شکر نے میری گردن پر گرفت ڈھکی لے کر میرے شکر کے کواک

شدید ضرب لگائی۔ اس کی ہانگ نے کرائے کی "راؤ بڑا دوسرے کلک" کے انداز میں حرکت کی اور وزنی ٹوٹ کی ضرب شکر کے کے جڑے پر پڑی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں نے بڑی ٹوٹنے کی آواز صاف سن۔ ہوی ویٹ باسکر کا گھوٹا لگانے والے بے نصیب کی طرح شکر راتقل کھڑا اور کھٹے ہوئے شہر کی طرح کھیت میں گر گیا۔ یہ ایک ضرب ہی اس کے لئے کافی شافی ثابت ہوئی تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹے تک میں نے اس کے بدن کو دوبارہ جینش کرتے نہیں دیکھا۔

میری بے بسی اور شکر کے انجام دیکھ کر لوگ ہر اماں ہو گئے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ شکر شکر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اسی طرح میری گردن دبائے رکھے گا۔ یہاں تک کہ میں سب کے سامنے دم توڑ جاؤں گا۔ اور واقعی میری حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ دم سمٹ کر آنکھوں میں آنکھ تھار اور کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آئندہ کیا پیش آئے گا۔ اگر میرے اور شکر کے درمیان فزی اسٹائل کشتی ہو رہی ہوتی تو یقیناً اس موقع پر میں رنگ کے قریش پر ہاتھ مار کر اپنی پسائی کا اعلان کر دیتا لیکن یہ کشتی نہیں زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ شکر مجھ پر پوری طرح قابو پائے ہوئے تھا لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اب میرا کیا کرے۔ شاید وہ اس انتظار میں مجھے جکڑے ہوئے تھا کہ اس کے سامنے یہاں آئیں اور مجھے سنبھال لیں۔

زور آزمائی کے دوران میں اور شکر زمین پر گر گئے۔ تاہم شکر نے اپنی گرفت برقرار رکھی۔ "مصور حال" طول کھینچتی جارہی تھی۔ ایک ہمدرد بزرگ آگے بڑھا اور شکر کو مخاطب کر کے لاپتہ سے بولا۔ "چھوڑ دے پتھر بس کہ اس طرح گردن ٹوٹ جاتی ہے بندے کی۔"

شکر باہمی کانپتی ہوئی فیر انسانی آواز میں فرمایا۔ "بیچے ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں بیچے ہٹ جاؤ۔" دو اور دیباہوں نے میری سفارش کرنا چاہی لیکن شکر

ضرورت یہ تھی کہ مجھے بھر کوئی ڈنڈری دین یا ڈنڈری رکشا جیسی سواری میرے آگے جس کے ساتھ ایک قابل اعتماد ڈنڈری ہو کر مجھے اور شکر کے کوڈنگ شکر کی کوٹھی تک پہنچا دے۔ اچانک مجھے کار مزک کے کنارے روکنا پڑی۔ بائیں جانب ایک نرسٹ اسپتال کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑا سا آہنی گیت تھا جس کے اندر دور تک سڑک کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گیت کے پاس ہی دو بڑے بڑے شینڈلے جن کے پیچے گاڑیاں اور موٹرسائیکلیں دھیر دھیر کھڑی تھیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ شکر کے کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آدھ یون گھٹنے کے اندر اندر اس کا چوٹو جھک رہا ہوتا شروع ہو گیا تھا اور تھنوں سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ بڑی تباہ کن چوٹ لگائی تھی اسے شکر شکر نے اس کے جڑے کی بڑی ٹوٹ چلی تھی اور مٹ عجیب سے انداز میں ٹیزھا ہو چکا تھا۔ اسپتال کا بورڈ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ شکر کے کو اندر لے جاؤں۔ اسے امیر جی میں داخل کرا کے میں اس کی طرف سے فارغ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد اسپتال ہی سے کسی مناسب گاڑی کا انتظام بھی ہو سکتا تھا۔

○●○

اسپتال میں مجھے میری توقع سے زیادہ وقت لگا بھر یہ بھی ہوا کہ اسپتال کی پارکنگ سے مجھے کوئی حسب حال گاڑی نہ مل سکی۔ ایک چوکس چوکیدار بھی وہاں موجود تھا جس کی موجودگی میں کوئی پیش چلنا مشکل تھی۔ اسی دوران کرٹوں میں دقت ختم ہو گیا۔ اب میں کم از کم شام چوبیس بجے تک کے لیے اسپتال میں مقیم ہو چکا تھا۔

گیارہ بجے سے شام چوبیس بجے تک سات گھنٹے میں نے اسپتال کے باغیچے میں بیٹھ کر اور کپینٹین کے ارد گرد گھوم کر گزارے۔ ذہن بار بار ذہنیں گل ہے ہونے والی مختصر ملاقات کی طرف جا رہا تھا۔ ذہنیں گل نے حوصلہ افزا اطلاعات دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ ٹرک محفوظ ہے اور صفدر اور دلچیت بھرت ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ میں کچھ پوچھ سکا تھا نہ وہ بتا سکا تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ کس جگہ تھے اور انہیں "کھنڈر گردوارے" سے نکلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ جہاں تک شکر شکر کا تعلق ہے، اس کی کھنڈر میں موجودگی کو تب خیر نہیں تھی۔ کم از کم میں تو اس کی موجودگی پر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے دف تک پہنچنے کی خدا داد صلاحیت رکھتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے میری سوچ سے بھی زیادہ تیز رفتار سے حرکت کی تھی اور کسی ایسے اہم مقام پر پایا گیا تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے

آواز کے ساتھ میں فٹ مگرے کونوں میں جا کر۔ اس کے مگرے سے دو آوازیں پیدا ہوئی تھیں۔ پہلی آواز کونوں کی آہنی بندوں (پانی ٹانگے والے ڈبے) سے ٹکرانے کی تھی۔ دوسری چپا کے سے پانی میں گرنے کی۔ میں آج شکر کا قصہ پاک کر دیتا چاہتا تھا۔ میں ان راتوں کی طرف دوڑا جو کھیت میں گر گئی تھیں۔ دو فوجیوں نے آگے بڑھ کر مجھے روکنا چاہا لیکن میں انہیں دھکیلا ہوا کھیت میں آیا وہاں اب کوئی راتقل نہیں تھی۔ موقع پر موجود "سیانوں" نے "دانا کی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں راتقلیں موقع سے ہٹا دی تھیں۔

"راتقل کہاں ہے؟" میں نے ایک شخص کو گریبان سے جھنجھوڑ پوچھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ تماشائی خوفزدہ انداز میں چادوں طرف منتشر ہو رہے تھے۔ اچانک دور قافلے پر قریب میں مجھے گاڑیوں کی آوازیں ہونے لگیں نظر آئی۔ کچھ نامعلوم لوگ موقع کی مست پھر بڑھ رہے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ شکر شکر کے سامنے ہوں گے۔ ان کا یہاں پہنچ جانا میرے لیے کسی طرح مہمند نہیں تھا۔

میں نے بے ہوش شکر کے کندھے پر لاد کر شکر کی زور گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ میں نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اندازے سے سڑک کی جانب دوڑا نہ ہو گیا۔ جب میں کونوں کے پاس سے گزرا تو مجھے اس کی آہنی بندیں پانی کھینچنے والے ڈبے زور و شور سے پلٹے نظر آئے۔ (یہ ڈبے ایک بیڑی چکر کی صورت میں کونوں کے اندر لگے رہتے ہیں) صاف پتہ چل رہا تھا کہ شکر ان ڈبوں سے لگ کر کونوں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کونوں کے ارد گرد کوئی شخص موجود نہیں تھا سوائے دو عدد بیلوں کے جو اس ہنگامہ خیز صورت حال سے قطعی لائق تھے۔ سر جھکے کھڑے تھے۔ مجھے اپنے غیر مسلح ہونے کا زندگی میں کبھی اتنا افسوس نہیں ہوا تھا اس وقت ہوا۔

سڑک تک پہنچنے سے پہلے مجھے قریب ایک میل کا دشار گزارا راستہ طے کرنا پڑا۔ سڑک پر پہنچ کر میری رفتار تیز ہو جاتی چاہیے تھی۔ لیکن نہیں ہوئی۔ تیز رفتاری کے لیے راستے کی ہمواری یا گاڑی کی سبک دہی اتنی اہم چیز نہیں ہوتی جتنا کہ "سنبھال کا تین" ہوتا ہے۔ اور میں ابھی تک یہ تین نہیں کر سکا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ یہ شکر کی گاڑی تھی۔ میں داہیں شکر کی طرف جاتا تو شاید پہلے چوراہے پر ہی پہچان لیا جاتا۔ اور ڈنگا شکر کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے مجھے درجنوں چوراہوں سے گزرنے پڑے۔ میری سب سے اہم

دیکر لوگ تادیر سر پٹے رہے تھے۔  
شام پانچ بجے کے قریب مجھے اسپتال میں ایک شناسا چو نظر آیا۔ یہ وہی دراز قد محافظ فریان علی تھا جس سے باپو لیاقت کی بیشک میں ملاقات ہوئی تھی۔ فریان بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تاہم سمجھ واری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس وقت تک مجھ سے لا تعلق رہا جب تک میں نے اسے خود قریب آنے کا اشارہ نہیں کیا۔ مورچک کے ایک پھیلے ہوئے پودے کے پیچھے چھپ کر پانچ برسہہ دونوں کے درمیان مکالمہ ہوا۔ فریان نے بتایا کہ ڈنگاٹھ کی کوٹھی سے میں نے کل جو پیغام بھیجا تھا وہ باپو لیاقت کو مل گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہنگاموں کے سبب باپو صاحب نے تمام ملازموں کو پھٹی دے کر فیکٹری کو عارضی طور پر بند کر دیا ہے اور وہ خود کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہو گئے ہیں۔ فریان علی کی باتوں سے مجھے یہ اشارہ بھی ملا کہ اگر چند بانو کے نکل جانے کے بعد سے باپو لیاقت سخت پریشان ہے۔

فریان علی یہاں اپنے ایک زخمی ساتھی کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ یہ شخص باپو لیاقت کی بیشک میں ہونے والی فائرنگ میں زخمی ہوا تھا۔ فریان علی سے مل کر میرا سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ فریان علی ایک ہمکن کار میں یہاں آیا تھا۔ یہ ڈکی والی کار تھی۔ میں ڈکی میں چھپ کر آسانی ڈنگاٹھ کے ڈیرے تک پہنچ سکتا تھا۔ بس ضرورت اس امر کی تھی کہ اپنے تعاقب سے ہوشیار رہا جائے۔

جونہی گرفت میں وقت شروع ہوا ہم اسپتال سے ڈزائنل آئے۔ اسپتال سے ڈیڑھ دو فرلاک دور اگر فریان علی نے گاڑی روکی اور اپنا کوٹ بھٹل مع تین عدد میگزین کے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے ڈکی کو ملی اور سٹ سٹا کر اس میں لیٹ گیا۔ قریباً پانچ گھنٹہ جو سڑ پرے کے بعد کار ایک جگہ رک گئی۔ چندے بعد ڈکی کے آٹے میں چالی گولی اور فریان نے دھنکا اوپر اٹھا دیا۔

شام کے سات بجے والے تھے چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ رہائشی علاقے کی ایک تنگ سی سڑک تھی۔ پچاس ساٹھ گز دور ایک دم سی اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ میں نے دیکھا کہ فریان کے چہرے پر پہچان کے آثار ہیں۔

”کیا بات ہے؟ یہاں کیوں رک گئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
فریان کانپتی آواز میں بولا۔ ”غضب ہو گیا جانی صاحب۔ بہت بڑی خبر ہے ہمارے لیے۔“

”کچھ بوجھی۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔  
”ڈنگاٹھ مت غم نہ کرو اور ان کے تمام ساتھی قتل ہو گئے ہیں۔“ فریان نے دھماکا خیز اعلان کیا۔ میں سمجھنے کی کیفیت میں اس کی طرف دھنکا چلا گیا۔ فریان نے کہا۔ ”ڈنگاٹھ کی کوٹھی کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہیں۔ پولیس کی دو بڑی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔ میرے سامنے اندر سے دو لاشیں باہر لائی گئی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ دو بندے گردوارا اشاپ کے قریب بھی مارے گئے ہیں۔“

مجھے سیاہ بادلوں میں بجلی کا کونڈا لپکتا ہے۔ میرے ذہن میں شکر شکر کا نام چکا اور تین دن میں شیلے بھڑک اٹھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شکر شکر کا کام ہے۔ میں نے فریان سے پوچھا۔ ”کتنی دور ہے کوٹھی یہاں سے؟“  
وہ بولا۔ ”ہم کوٹھی کے ساتھ والی گلی میں کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ سامنے جو اسٹریٹ لائٹ ہے اس کے پاس سے راستہ نکلے گا۔“

فریان نے ایک کھیل نما چادر مجھے اسپتال میں ہی مٹیا کر دی تھی۔ میں نے اس چادر کو سر کے اوپر سے گزار کر اس طرح لپیٹا کہ نصف چو چھپ کر رہ گیا۔ پھر ہوا کوٹ بھٹل میرے کوٹ کی جیب میں تھا۔ گاڑی کو لاک کر کے میں اور فریان علی کوٹھی کی طرف بڑھے۔ سر ہوا گلی کو چوں میں فرانے بھر دی تھی اور اعلان کر دی تھی کہ فریڈ کوٹ ایک اور طویل اور بے ست شب کے پچھل میں پہنچنے والا ہے۔ تین چار منٹ میں ہم اس کوٹھی کے سامنے پہنچے جہاں کل صبح مجھے اور شکورے کو پولیس والے حفاظت کی غرض سے لائے تھے اور جہاں کل رات ڈنگاٹھ اور اس کے ساتھیوں نے ”جیشن رہائی“ منایا تھا۔ آج اس کوٹھی کے سامنے بیسیوں افراد نظر آ رہے تھے۔ ہر چہرے پر سسٹنی اور حیرانی تھی۔ ہمارے ہتھیاری ایک ایسپورٹس سائٹن بھائی نمودار ہوئی اور کوٹھی کے گیت میں داخل ہو گئی۔ تماشائی کوٹھی کے اندر تک موجود تھے۔ ہم بھی دھم بھل کر کے اندر پہنچ گئے۔ پورچ میں راکٹل بدوار سیاہی بکھرتے تھے اور لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے۔ پورچ کی روشنی میں مجھے جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آئے۔ یہ دھبے واقعی دواڑے کی بیڑیوں اور پورچ کے فرش پر زیادہ نمایاں تھے۔ ہمارے سامنے ہی مت غم کی لاش باہر لائی گئی۔ لاش ہسٹری چادر میں لپی ہوئی تھی۔ مت غم کے چہرے پر گولیوں کے کئی نشان تھے۔ یہ وہی مت غم تھا جو کل رات بڑے جوش و خروش سے مجھے مشورے دے رہا تھا اور پھر تین تھاکہ فریڈ کوٹ میں شکر اور اس کے

ساتھیوں کو گھٹ فاش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ چند روز پہلے جیل سے رہا ہوا تھا اور آج ”زندگی“ سے رہا ہو گیا تھا۔ انسان زنتی کی منازل طے کر کے بہت دور تک دیکھنے لگا ہے لیکن مستقبل کا وہ اس کی نگاہ سے اسی طرح اوجھل ہے جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو تاکہ شکر میری طرف سے باپس ہونے کے بعد ڈنگاٹھ و فیوہر چھ دوڑے گا تو میں اسے کوٹھی میں گر کر مار فرار کیوں اختیار کرتا۔

مت غم کی لاش دیکھ کر میری نگاہوں میں ڈنگاٹھ اور اس کے دیگر ساتھیوں کے چہرے گھوم گئے۔ ہتھے مسکراتے چہرے جو کل تک مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلارہے تھے، آج گولیوں سے چھلنی ہو کر پولیس سرجن کے تیز دھار شکاری زخمی آگئے تھے۔ بلاشبہ وہ بدعاش لوگ تھے۔ انہوں نے اپنے بڑے سبکی طرح کے کام کیے تھے لیکن انہیں جو سزا دی گئی تھی وہ بدعاشی کی نہیں میری حمایت کرنے کی سزا تھی۔ اور سزا دینے والا منصف نہیں وہ بدترین مجرم تھا جو ایک عرصے سے خود کو خدائی فویدار سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ اس ناؤہ زخم نے میرے ایک اور نیم ناؤہ زخم سے بھی کھریڑا مار دیا۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کی خونچکان لاشیں میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ذوئے شت کے اس دیرالے میں گئے والا ”موت میلہ“ اپنی پوری ج دج کے ساتھ میرے تصور کی زینت بن گیا۔ اور وہ معصوم بچہ وہ نو عمر بھارت جسے ذہریلے دھوئیں سے بھری ہوئی ٹرینک میں ایک سانس کے لئے ترسایا گیا۔ اس کی سوال پوچھتی تھی تھی آجکس ذہر اور آکھوند کی طرح میرے کانٹ سر میں بہت ہو گئیں۔ مجھے سیاد تھا۔ میں کچھ بھولا نہیں تھا۔ دشمنی کے رجسٹر علم اور انتقام کے کماؤں میں جو کچھ لکھا تھا وہ اب میرے حائفے میں تھا۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ شکر کی طرف سے مجھ پر بہت سا قرض چھ گیا ہے۔ اب حساب بے باقی کرنا ضروری تھا۔ بہت ضروری تھا۔

میرا زیادہ دیر مونتے پر رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے فریان علی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ”میں واپس گاڑی میں جا رہا ہوں۔ تم تفصیل معلوم کر کے آؤ۔“ اس نے اٹات میں سر ہلایا اور گاڑی کی چالی میرے حوالے کر دی۔ ”ماتے چہرے پر چادر درست کی اور کوٹھی سے نکل کر گاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

نیم تاہیک گلی میں مجھے تقریباً نصف گھنٹہ کار میں بیٹھا پلا۔ آخر کار فریان علی پہنچ گیا اور دواڑہ کھول کر ڈرائیونگ

سیٹ پر آ بیٹھا۔ وہ سر دی اور جذباتی کیفیت کے سبب کھپا رہا تھا۔ اس نے کہا ”جناب! حالات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ شکر صاحب کا کام ہے اور حملہ کرنے والوں میں شکر صاحب خود بھی شامل تھے۔ حملہ پانچ بجے کے لگ بھگ ہوا ہے۔ حملہ آور دو گاڑیوں میں سوار یہاں پہنچے تھے۔ ایک انشیش وین تھی اور دوسری پک آپ۔ دونوں گاڑیاں مقامی اسپتال کی عین اور پتا چلا ہے کہ انہیں بڑے ڈاک خانے کے پاس سے چھینا گیا تھا۔ حملہ آور خود کار راکٹوں سے مسلح تھے اور ان میں سے اکثر نے چہرے چھپا رکھے تھے۔ حملے والوں نے جو بیان دیے ہیں ان کے مطابق حملہ آور گیت بھاند کر اندر داخل ہوئے اور پھر چنہی لگے بعد فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سلسلہ مشکل سے تین چار منٹ تک جاری رہا۔ پھر حملہ آور دو افراد کو مارے اور دھکے دیتے ہوئے باہر لائے اور انہیں ساتھ لے کر گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ لیکن گردوارا اشاپ کے قریب ان دونوں افراد نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ ایک ٹرینک گھٹل پر وہ ایک ساتھ گاڑی سے کوڑے اور اشاپ کی طرف بھاگے مگر انہیں چندہ میں قدم ہی دوڑ گئے ہوں گے کہ راکٹل کے ایک ہی برست نے ان دونوں کو زمین کر دیا۔ اس فائرنگ میں ایک راہ گیر بھی شدید زخمی ہوا ہے۔“

میں نے آزدہہ لیے میں پوچھا۔ ”ڈنگاٹھ کے ساتھیوں میں سے کوئی بچا بھی ہے یا نہیں؟“  
وہ بولا ”نیک کٹھ لڑکا ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ حملہ کرنے والے شکر اور اس کے ساتھی ہیں۔ یہ بیان اس نے پولیس کے سامنے نہیں ”عام لوگوں کے سامنے دیا ہے۔ اب پولیس اسے دعوٰی پھر رہی ہے لیکن وہ مونتے سے غائب ہو چکا ہے۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ شکر کو میرے اور ڈنگاٹھ کے تعلق کی خبر اس موثر رکشا سے ہوئی ہے جس میں شکر اور میں گردوارے پہنچے تھے اور جو بعد میں تاثر برت ہونے سے الٹ گیا تھا لیکن بعد میں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میں اس بارے میں تفصیل آگے چل کر بیان کروں گا۔ بہ طور صورت حال یوں بنی تھی کہ میرے ہاتھوں زک اٹھانے کے بعد شکر دیوانہ ہو رہا تھا۔ جونہی اسے میرے اور ڈنگاٹھ کے تعلق کا علم ہوا وہ آتش فشاں کی طرح کھول اٹھا تھا۔ اس نے میری تلاش میں فوراً ڈنگاٹھ کی کوٹھی پر چڑھائی کر دی تھی۔ اسپتال میں رک جانے کے سبب میں تو کوٹھی میں نہیں پہنچ سکا تھا وہاں باپو لائی لوگ موجود تھے۔ لہذا وہ شکر کے بدنام

زمانہ قرد غضب کا نشانہ بنے تھے شکر نے اس خیال کے تحت کہ ڈنگا ٹکھ کے ساتھیوں میں سے کوئی میرے بارے میں اہم اطلاع دے سکتا ہے، دو افراد کو زندہ پکڑ لیا تھا اور اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ ان دو افراد نے شکر کی دہشت کے سبب نکل بھاگنے کی کوشش کی اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

میں نے سگیت کا آخری سہلے کر کھڑا کھڑی سے باہر پھینکا۔ میری گردن سوج چکی تھی اور اسے پھرنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ میں نے بائیں طرف ان علی کی طرف رخ کیا اور اس سے کہا کہ وہ ڈی کھولے، وہ سوائے نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا: "مجھے بابولیات کے پاس لے چلو۔" وہ بولا: "بابولیات تو اس وقت گھر پر ہوں گے اور مجھے گھر جانے کی اجازت نہیں۔" پھر ذرا رک کر بولا "میں کیا"۔ بیٹنگ میں رہنے والا کوئی بھی ملازم ان کے گھر نہیں جاسکتا۔

"لیکن میرا باپو سے ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

فرمان علی میرے چہرے پر غضب کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ بابولیات جیسے جماندہ شخص کا نوا کر رہا تھا۔ بات کی یہ تک پہنچ گیا۔ لرزاں آواز میں بولا "ہلک۔۔۔ کس۔۔۔ آپ شکر صاحب کی طرف توجہ جانیں چاہتے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چند لمحے گم سم رہا پھر کہنے لگا۔ "آپ کا اس جگہ جانا ٹھیک نہیں۔"

اس نے یہ بات جس انداز سے کہی تھی وہ انداز مجھے سمجھا گیا کہ فرمان علی شکر کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ اس کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دیتا۔ میں نے پہلے اسے زری سے سمجھا یا کہ وہ مجھے شکر تک لے پٹے لیکن جب اس نے اپنے مالک یعنی بابولیات کے خوف سے پلہ چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے اسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ مجھے ہر صورت ہر قیمت پر شکر شراک پہنچانا ہے اور اسی وقت پہنچنا ہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا نہ کہوں گا۔

میرے ارادے کی پہنچ اور لمبے کی سختی نے فرمان علی کو سمجھا دیا کہ اگلے پانچ دن منٹ میں میں اس کی گردن پر ہتھول بھی رکھ سکتا ہوں اور پیش میں اگر ہتھول چلا بھی سکتا ہوں۔ کسی نے جگہ کہا ہے کہ "بے وقوف بھی دی کرنا ہے جو عقل مند کرنا ہے لیکن مٹی ٹھوکریں کھانے اور بہت سا وقت ضائع

کرنے کے بعد۔" فرمان علی عقل مند تھا لہذا اس نے غرابی بسیار سے پہلے ہی سیدھا راستہ پکڑ لیا اور مجھے ناک کی سیدھ میں شکر کے ٹھکانے پر لے گیا۔ کرفو کا وقت ختم ہو چکا تھا لیکن ہم چونکہ ایسے علاقے میں سڑکوں پر تھے جہاں کرفو نہیں تھا۔ لہذا راستے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میرے لئے ڈکی میں سڑک کنارے تھیں اس اندیشے سے کہ فرمان علی کوئی گزبوند کرے، میں کار کے اندر بی رہا۔

شہر کے مضافات میں پہنچ کر کار ایک درمیانے ساڑکی عمارت کے سامنے رکھی۔ یہ کوئی سرکاری عمارت نظر آتی تھی۔ پشانی پر ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا "مصالحی عدالت نمبر دو" نیچے لکھا تھا "نچ وچ سینٹر جوں کو خفا خفیئے مفت لگوائیں" فرمان علی نے کہا "یہ دفتر ابواباش کا ٹھکانہ کارکنوں کا آڑا ہے۔ سینٹر کی آڑ میں بت سی بدعاشیاں یہاں ہوتی رہی ہیں۔ آج کل شکر اور اس کے ساتھی یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ پولیس کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے۔"

فرمان علی نے کار "سینٹر" سے تقریباً سو قدم کی دوری پر روک لی تھی۔ وہ کافی ہراساں نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا "فرمان علی! میں تمہیں بابولیات کو اس معاملے میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔ جو تعاون تم نے کیا ہے اس کے لئے شکریہ۔ اب تم واپس جاسکتے ہو۔"

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر بولا "میں، جہانی صاحب! آپ بابو صاحب کے مہمان ہیں تو ہم سب کے مہمان ہیں۔ میں آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں یہاں گاڑی میں آپ کا انتظار کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم آپ اندر کیا کرنے جا رہے ہیں لیکن ایک بات میں آپ سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شکر صاحب بہت خطرناک شخص ہے۔ آپ کو تو تنہا اس کے آڑے رہنا نہیں چاہنا چاہئے۔"

یہ بات فرمان علی پہنچے آدھے گھنٹے میں ہی بار بار کہہ چکا تھا لہذا میں نے اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ کوٹ کی جب سے مشہور زمانہ کرٹ 45 نکال کر میں نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کے دو فالتو میگزین میرے کوٹ کی بائیں جب میں موجود تھے میں نے گرم چادر اتار کر کار کی نشست پر رکھ دی اور "سینٹر" کی طرف چل پڑا۔

یہ آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ تیرہ ہوابدل سمجھ کر لے آئی تھی اور آسمان گھناؤن تاریکی میں چھپ چکا تھا۔ سینٹر کے ارد گرد کافی فاصلے تک سڑک خالی تھی۔ اس کے بعد ایک دوکانوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ سینٹر کا آہنی گیٹ بند

تھا۔ میں نے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے سُن گئی۔ اندر کہیں ٹپ وٹن چل رہا تھا۔ چند کھڑکیوں اور دروازوں میں گیٹ کے سوا تمام عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ احاطے میں رکھوائی کا کتا بھی موجود ہے لیکن چونکہ کمروں میں بند تھے لہذا یہاں ممکن تھا کہ کتا کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔

احتیاط کا قاضی تھا کہ میں کتے کے ہونے یا نہ ہونے کا یقین کر لوں لیکن میرے سینے میں جو ہلک روشن تھی وہ مجھے ایک لمحہ تاخیر کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ بیکراں وحشت ایک تھکے ہوئے کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور مجھے اڑانے لے جا رہی تھی۔ میں نے جست لگا کر چھ فٹ اونچی باؤنڈری وال چھلانگی اور احاطے میں پہنچ گیا۔ میرا تیز قدم درست لگتا۔ احاطے میں کتا موجود تھا۔ وہ گھٹے بالوں والا بیٹہ برنارڈ کسی شیر سی کی طرح جسم تھا۔ وہ گیٹ کے قریب بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ بالکل چھریلے جسم کی طرح۔ مجھے دیکھنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بے حس رہا جیسے حیران ہو کہ اس کی موجودگی میں کس کو یہ جرات ہوئی کہ دیوار بھانڈ کر اندر چلا آئے پھر وہ آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی دم نے دھیرے دھیرے حرکت شروع کی اور حلق سے ایک دھیمی مسلسل غراہٹ برآمد ہونے لگی۔ اب وہ کبھی بھی مجھے نہ بھترست کرنے والا تھا۔

وہ ایک شاندار کتا تھا۔ اس کے سر میں دو گولیاں اتار کر مجھے افسوس ہوا، دھماکوں سے شب کا سکوت چٹنا چور ہو گیا۔ کتا دو فٹ اوپر اچھلا اور بت سے گر کر ساکت ہو گیا۔ میں دوڑا ہوا عمارت کے داخلی دروازے پر پہنچا۔ یہ جالی دار دروازہ تھا۔ نیم روشن راہداری میں مجھے ایک شخص دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی اسلحہ نہ تھا تھی اور وہ بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں داخلی دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا اور گھوم کر عمارت کے پہلو میں پہنچا۔ یہاں ایک بند دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بند تھا لیکن جب ساتھ والی روش کوئی گودھیلیا تو وہ کھل گئی۔ ایک مٹری بیچ سنائی دی۔ اس بیچ کی گونج ختم ہونے تک میں چونکٹ پاؤں رکھ کر اندر گودھ چکا تھا۔

چھوٹے بلب کی روشنی میں ایک بہتر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ محل کے کمرے نیلے لٹاف میں ایک اجلا چوہا اُڑا۔ دوسری چوہو گئی اور چوہا پھر لٹاف میں غائب ہو گیا۔ میں شدید رہ گیا۔ یہ ہستان کا چوہا تھا۔ وہی جیلے دانٹوں اور خوب صورت مسوڑوں والی مہاں جو صرف ایک دن پہلے پوری رات میرے کمرے میں رہی تھی۔ اس

وقت وہ ڈنگا ٹکھ کی محبت سے تھی، آج ڈنگا ٹکھ کے قاتل شکر کے ذریعے پر بھی۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کے بعد ہستان پھر لٹاف میں غوطہ زن ہو گئی تھی۔ اب صرف اس کی چپٹیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ بیانی انداز میں چیخ رہی تھی اور چیخ جاری تھی۔ اس کی چیخوں کا یہ اثر ہوا کہ محقق ہاتھ دھو کا دروازہ دھاکے سے کھلا اور ایک سردار صاحب یوں اندر داخل ہوئے کہ انہوں نے الٹی بنیان پہن رکھی تھی اور دھوٹی بھی پوری طرح باندھی نہیں تھی۔ غالباً وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ہاتھ دھو رہے تھے کہ یہ افتاد آن پڑی تھی۔ پہلے انہوں نے میرے پھسل کے دو فائر سے تھے اور پھر ہستان کی چیخوں نے انہیں بیوزی ڈال دی تھی۔ جو نہ وہ دھوپ میں ٹپکے والی پگڈنڈ کی طرح چھڑچھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے، میں نے پھسل کی سردال ان کے سر سے لگا دی۔ سردار صاحب یکے میں رہ گئے۔ انہوں نے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور کتے سے بغیر ہی دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

سردار صاحب کے باہر نکلے اور بیٹنڈا پ ہونے میں جو وقت صرف ہوا اس مختصر وقت سے ہستان نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لٹاف سمیت بہتر سے اٹھی اور ہاتھ دھو رہے تھے کہ اندر سے کڑی چڑھائی۔

میرے نشانے پر آنے والا سردار اچھا خاصا جیم اور خطرناک صورت والا شخص تھا لیکن مجھے بچانے کے بعد قہر قہر کانٹے لگا تھا۔ اتنے میں دروازے پر زور دار دھک ہوئی۔ پھر ایک شخص کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "گواہ صاحب! کچھ لوگ اندر گھس آئے ہیں۔" انہوں نے کتا بھی مار دیا ہے۔ گواہ صاحب۔ گواہ صاحب۔"

میں نے پھسل کی ٹال بے دردی سے گواہ ٹکھ کی گردن میں دھناتی اور سرگوشی میں کہا "کتے کی طرح تو بھی مرے گا۔ ورنہ جو کہہ رہا ہوں وہ کہ۔"

"ہلک۔ کیا کروں۔" وہ منہ بولا۔ "اے بندے کو آواز دے کہ تم ابھی آرہے ہو۔" گواہ ٹکھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر کھٹکار کر کھاساف کیا اور بولا "میں ابھی آتا ہوں۔"

دروازے کے قریب سے مجھے قدموں کی آوازیں آئیں جن سے اندازہ ہوا کہ گواہ ٹکھ کو پکارنے والے وہاں سے چلے گئے ہیں۔ ہاتھ دھو کے اندر ہستان کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے صرف اس کا چوہا دیکھا تھا لیکن کمرے میں اس کا کھرا ہوا لباس دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ محلی

لطف ہی اس کا اور صحتا تھا اور وہی پتاؤ۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہٹل کی ٹال اتنی زور سے گواہانگہ کی گردن میں ٹھیکڑوں کہ وہ جلد چار کرش رگ میں گھس جائے اور گواہانگہ ایک کرناک جج کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچے لیکن اپنی ضرورت کے لئے میں اسے زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔ اس مختصر وقت میں یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی چکا تھا کہ شکر شکر اس عمارت میں موجود نہیں ہے اور اس وقت یہ گواہانگہ ہی یہاں کا کارنا وحرنا ہے یہ ایک اتفاق تھا کہ عمارت میں داخل ہونے کے بعد میرے ہاتھوں سب سے پہلے گواہانگہ کے ”غیب“ ہی نکلے تھے۔

میں نے ہاتھ دوم کے دوازے کو باہر سے بھی کُنڈی چڑھا دی اور ہٹل کی ٹال سے گواہانگہ کو دھکیل کر بستر پر پھینک دیا۔

”شکر کہاں ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔  
”وہ وہ یہاں نہیں ہے۔“  
”دو صاحب کے ساتھ فٹنگ لگے ہیں۔“  
میرے لیے یہ اہم اطلاع تھی کہ قادر زماں بھی یہیں پایا جاتا ہے۔ میں نے ہٹل کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا ”کب آئیں گے وہ؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا جانی صاحب۔ م۔“  
میرا خیال ہے کہ وہ ایک دو گھنٹے میں۔“

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ صرف تین گھنٹے پہلے شکر فرید کوٹ میں تھا اور اس نے ڈنگاٹنگ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا تھا۔ اگر وہ باجھو جج کے بعد فرید کوٹ سے روانہ ہوا تھا تو جج سے پہلے واپس نہیں آسکتا تھا۔ یا تو وہ فٹنگ لگایا ہی نہیں تھا یا اسے جج واپس آنا تھا۔

میں نے گواہانگہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”دیکھو گواہ“ میری بات بڑے غور سے سنو۔ مجھ پر خون سوار ہے میں تمہیں قہقہے دلاتا ہوں کہ اس چار دیواری میں موجود ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا“ اور تم بھی ان میں شامل ہو لیکن ایک صورت۔ صرف ایک صورت میں میں نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔“

”کیسے؟“ گواہانگہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ لگتا۔ میرا لہجہ اسے پتا نہ چلے دے رہا تھا اور وہی وجہ تھا جو بے حد سنگین لمحات میں میری ”قوت“ میں جایا کرتا تھا۔  
میں نے سکرٹنگ سٹگتے ہوئے کہا ”تمہارا نام گواہانگہ ہے نا تم سلطان گواہانگہ بن جاؤ۔“

”ک۔ کیا مطلب؟“

”جو میں پوچھتا ہوں بتاتے جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ دوں گا۔“ گواہانگہ نے غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس نگاہ میں موت کی دہشت اور زندگی کی طلب تھی۔ گواہانگہ زندہ رہتا چاہتا تھا۔ کسی بھی شرط اور کسی بھی قیمت پر۔ ابھی نیلگوں لطف تلے اسے کچھ اور رسمی لمحات درکار تھے۔ ابھی وہ مزید شراب پینا چاہتا تھا۔ فرید کوٹ کی گلیوں میں کچھ عرصہ اور دنگٹانا چاہتا تھا۔ ابھی رنگین مٹھلوں، دل پسند فراخوں اور سنگین ہنگاموں کے حوالے سے اس کی ہجوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ہجر نگاہ کوٹ 45 کی خوف ناک سیاہ ٹال پر بھی تھی اور جسم کا ایک ایک جج رہا تھا کہ وہ زندہ رہتا چاہتا ہے۔ وہ یہ زبان خاموشی کہ رہا تھا، جانی استاد! بے شک مجھ سے جرم سرزد ہوا ہے۔ میں نے شکر صاحب کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھیوں کو مارا ہے“ ان کے جسم گولوں سے جھٹکی کیے ہیں۔ لیکن۔ اس پنج رات کے سنان اندر میرے میں شکر میری جان بچانے کے لئے موجود نہیں ہے۔ میں اس کا وقار دہوں لیکن وقار داری کیسی بھی ہو زندگی سے بڑھ کر قیمتی نہیں اور میری زندگی تمہارے رحم و کرم پر ہے۔ مجھے زندگی کی خاطر شک حرام“ غدار اور بے حریت بننا منظور ہے۔ تم مجھے ”سلطانی گواہ“ کہو گے تو یہ تمہارا ضمن کلام ہوگا۔ بہر طور تم جو کچھ پوچھو گے وہ میں بتاؤں گا“ تم جو کہو گے وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر خشک تر زبان پھیری اور مینڈک جیسی نرانی ہوئی آواز میں بولا ”جانی صاحب! آپ ہسپتال جب میں رکھ لیں۔“ میں آپ کو دشوار دلاتا ہوں کہ۔ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔“

گواہانگہ کے اندر مزاحمت کی دیوار گر چکی تھی اور اس دیوار کے لیے سے یہ فقرہ دھول کے مانند اُڑ کر اس کی زبان تک آیا تھا۔ میں نے ہٹل کی ٹال جھکا لی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ باہر سے ابھی تک ہلکا دھڑکی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند لمبے بعد پھر کوئی شخص دوازے پر دستک دینے لگا۔ میں نے ایک صوفے کی آڑے کر گواہانگہ کو نشانے پر رکھ لیا اور اس سے کہا کہ وہ کھڑکی کھول کر اپنے ساتھی کو کھلی کرادے اور اسے کہے کہ وہ ابھی باہر نہیں آسکتا۔ گواہانگہ یہ ہدایت جاری کرنے سے پہلے میں نے نہ کرے کی جی بھی بھجادی تھی۔

گواہانگہ نے میری ہدایت پر من و عن عمل کیا۔ وہ جانتا

تھا کہ میرا نشانہ جو کے گا نہیں اور نہ ہی میں گولی چلانے میں ایک لمبے کی تاخیر کروں گا۔ معلوم نہیں کھڑکی میں آکر گواہانگہ سے بات کرنے والا مطمئن ہوا یا نہیں لیکن واپس چلا گیا۔ میں نے کھڑکی دھکا بند کر دیا۔

”اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ شکر اور قادر زماں کہاں ہیں اور کب تک آئیں گے؟“ میں نے گواہانگہ سے پوچھا۔

اس نے کہا ”وہ فٹنگ لگے ہیں جی! لیکن ان کی واپسی کے بارے میں میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ آٹھ بجے ہے کہ وہ کل دوسرے پہلے نہیں لوٹیں گے۔“

میں نے پوچھا ”اس بلڈنگ میں کتنے بندے ہیں اور کیا کیا اسلحہ ہے ان کے پاس؟“

گواہانگہ کی اطلاع کے مطابق عمارت میں ہتیاں سمیت نکل آتھ نفوس تھے۔ اسلحہ کے بارے میں بھی تفصیل اس نے بتا دی۔

میں نے کہا ”ہسپتال کی وہ گاڑیاں کہاں ہیں جن پر واردات کی گئی ہے؟“

”پچھلے اعلیٰ میں کھڑکی ہیں جی۔“ گواہانگہ نے اعتراف کیا ”ایک بڑی دین ہے اور دو سری یک آپ۔“

”تم وہاں میں تھے یا یک آپ میں؟“ میں نے پوچھا۔  
”وہاں میں“ گواہانگہ نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی تسلیم کر لیا کہ وہ فٹنگوں میں شامل تھا۔

میں نے پوچھا ”تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ ڈنگاٹنگ سے میرا رابطہ ہے؟“

گواہانگہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے لیکن جواب تو اسے دینا ہی پڑا۔ سلطانی گواہانگہ جو تھا۔ اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ بولا ”یہ اطلاع ہتیاں لے کر آئی تھی۔ وہ پیسے کی بھوک ہے۔ جہاں سے اور جیسے بھی پیسے ملے لیتی ہے۔“

”کتنے پیسے ملے تھے اسے شکر ہے؟“  
”مجھے صرف پانچ ہزار کا پتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شکر قادر صاحب نے بعد میں بھی دیے ہوں۔“

میں نے پوچھا ”ہسپتال کی چرائی ہوئی گاڑیوں کے علاوہ بھی یہاں کوئی گاڑی موجود ہے؟“

”سینئر ایک گاڑی ہے لیکن اس میں بیٹریول نہیں۔“  
میں نے سکرٹنگ کا ایک طویل تنٹس لیتے ہوئے کہا ”گواہانگہ تم سب سے پہلا کام یہ کہو کہ ہتیاں کو غسل خانے سے باہر نکالو۔ اور اسے قتل کر دو۔“

”قی۔ قتل۔“ وہ ہلکا کوئی گولہ سا جیسے اس کے

مقل میں پھنس گیا تھا۔

میں نے کہا ”تا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ قتل کرنا تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں، ابھی چار گھنٹے پہلے تم نے پانچ جج قتل کیے ہیں۔“

”لیکن۔ میرا مطلب ہے۔ کیونکہ۔“  
”کوئی“ ”جو نہ چنانچہ نہیں“ میں نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اگر تم میرے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتے تو تمہیں اس لڑکی کو اپنے ہاتھوں مارنا ہوگا۔“ چلو شاباش جلدی کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ کل شب ہتیاں کا کھانا چودہ گھنٹے کے کمرے میں اس کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا لیکن آج پورے دن کے ساتھ ساتھ اس گوشے میں بھی نفرت بھری ہوئی تھی۔

میں نے کوٹ ہٹل ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا۔ گواہانگہ کے چہرے پر شدید تذبذب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ چند لمبے بعد وہ مری مری آواز میں بولا ”لیکن وہ باہر کیسے نکلے گی۔“

”اس کا تو باپ بھی نکلے گا۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”تم بیٹھے بیٹھے میرے لیے میرے بلاؤ گے تو کیوں نہ آئے گی۔“

اسے بتاؤ کہ جانی استاد کو قتل کر لیا گیا ہے۔ اب کوئی زخمی نہیں۔ وہ آئے اور لطف کو روک دیتے۔

ہم یہ باتیں سرگوشیوں میں کر رہے تھے۔ ویسے بھی ہاتھ دوم کا دروازہ فاصلے پر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری آوازیں ہتیاں کے کانوں تک نہیں پہنچ رہیں۔ میرے تئیرور کے کرکواہانگہ کو اغوا پڑا۔ میں نے دھمکے لیے میں کہا ”خبردار کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی چاہئے۔ بس گھگھوٹنا اور قہقہہ تمام کرو۔“

گواہانگہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر اٹھا کر ایک ابھر آیا۔ مجھے لگا کہ وہ ہتیاں کھینچنے کے لئے رحم کی درخواست کرنا چاہتا ہے لیکن میری آنکھوں میں آٹل ارادے کی جھلک دیکھ کر اسے دوازے پر دستک دینا پڑی۔ اندر ہتیاں دوڑ رہی تھیں۔ گواہانگہ نے پہلے اسے چُپ کرایا اور ہٹلا ہٹلا کر دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں ایک دیوار گیر پردے کی اوٹ میں تھا اور گواہانگہ مسلسل میرے ہٹل کی زد میں تھا۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن جب ہاتھ دوم کا دروازہ کھلا تو جلیبی سی روشنی پھیل گئی۔ ہتیاں کی پنڈلیاں نکلی تھیں اور وہ ایک بیسی مروانہ قہقہے میں تھی۔ یقیناً گواہانگہ کی قہقہے تھیں۔ اس کے لیے بال شانوں پر بکھرے تھے اور وہ قہقہہ کا کھنکھہ رہا تھی۔

”کیسے پکڑا تم نے اسے؟“ وہ لرزاں آواز میں بولی۔

جواب میں گواہانگہ نے ہتیاں کا گھارو چارو اسے لیے

ہوئے فرش پر گرا۔ چند لمحوں کے لئے وہ دونوں بڑی اوٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے مجھے صرف ہٹاں کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ تڑپتے پھلتے اور اٹھتے ہوئے پاؤں۔ وہ پاؤں جو کل شب دعوت گمانا لے کر میرے کمرے میں پہنچے تھے، رات بھر بے سندھ ایک صوفے پر پڑے رہے تھے اور پھر آج کسی وقت لالچ کی دُور میں بندھ کر اس ہیلتھ سینٹر میں چلے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد پاؤں ساکت ہو گئے وہ ہلکی سی خرخراہٹ اور پھر ہلکا سا مسموم ہو گئے جو ہٹاں کے عالم نزع کی علامت تھی۔ بڑی اوٹ سے گواہا سنگھ پر آمد ہوا۔ الٹی بنیان کے نیچے اس کا سینہ بڑی طرح پھول پھٹک رہا تھا۔ اس نے اپنی دھڑکنے والی پلورٹ کیے اور داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے لگا۔

میں نے اسے کہا کہ وہ ہٹاں کی لاش محبت کر ہاتھ دھو کر دال دے۔ اس نے فوراً عمل کیا۔ ہٹاں کا منتشر لباس بھی سمیت کر ہاتھ دھو کر رکھ دیا۔ پانی کا قفل کھول کر دواخانہ بند کر دیا گیا۔ ہٹاں کے اونچی اڑی ہوئی والے سرخ سینڈل دواخانے کے سامنے جو ڈھلے گئے تھے اب کھولے میں ادا ہوئے والا کوئی نیا شخص بھی سمجھتا کہ ”سینڈل والی“ اشیاں کرنے میں مصروف ہے۔

میں نے گواہا یعنی ”سلطان گواہا سنگھ“ سے پوچھا کہ اس کے بانی چند بنوں میں سے کتنے مسلح ہیں۔ وہ بولا ”تین مسلح ہیں۔ اور باقی بھی ضرورت پڑنے پر مسلح ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا ”جو مسلح نہیں ہیں ان کے نام؟“ گواہا سنگھ نے نام گنوا دیے۔ میں نے حکم دیا کہ ان تینوں کو اندر بلاؤ۔ گواہا سنگھ نے کمری کھول کر گواہا نامی ایک شخص کو پکارا۔ وہ آیا تو گواہا سنگھ بولا ”سیکٹ اور بالے کو لے آؤ میرے پاس فوراً۔“

گواہا واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں افراد کو کمرے میں لے آیا۔ میں دوا خانہ گہرے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ تینوں افراد شکل سے جراثیم پیش نظر آتے تھے وہ کمرے میں آگئے اور گواہا نے گنڈی اندر سے بند کر دی تو میں سامنے گیا۔ شکر کے کارندوں نے میری صورت میں جیسے موت کا فرش دیکھ لیا۔ ان کے چہروں سے خون پھڑکیا اور آنکھیں پٹی رہ گئیں۔

”اوندھے لیٹ جاؤ۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ان تینوں نے ایک ساتھ اپنے انچارج گواہا سنگھ کا دھکا ہوا چہرہ دیکھا اور ان کا خوف عجیب پر پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ

کے میدان کا پُراشار تھا اور ان پُراشار کا ”چاند“ گواہا سنگھ تھا۔ میں شاید گواہا سنگھ کی صحیح تصویر پیش کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ وہ ایک ایسا شخص تھا کہ اسے غصے میں دیکھ کر کسی بھی عام آدمی کی مٹکی بندھ سکتی تھی لیکن مجھے اس کمرے میں دیکھ کر اسے اپنی موت اتنی جیتی نظر آنے لگی تھی کہ وہ کئی موقوفوں پر ذات خود لرزے کے بخار کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ یہ سب اس نیلی آگ کا کرشمہ تھا جو میرے سینے میں روشن تھی اور جس کی پیش میرے لمبے کے راستے میرے دلیوں کے جسم میں اتری تھی اور ان کا لٹو خٹک کر مٹی تھی۔

گواہا سنگھ کے بیان کے عین مطابق عمارت کے بجوازے سرکاری اسپتال کی مسروقہ گاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ایک دین نما گاڑی عکس صحت کے مرکز کی بھی تھی۔ میں نے گاڑی کا معائنہ کیا تو اندر سے خوشبو اندلی محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ مرکز کے کتا دھرتا اس گاڑی کو برپائے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے نظروں میں مریضوں کے بجائے یہ سرکاری گاڑی مرنشان عشق کے استعمال میں رہتی تھی۔ عجب نشیستوں پر کچھ ڈاکٹری آلات بے ترتیب پڑے تھے غالباً ڈچنگ کے کسی ہنگامی کیس میں استعمال ہوئے تھے اور یہاں پھینک دیے گئے تھے۔ فرش پر گتے کے کچھ ڈبے رکھے تھے ان میں حفاظتی ٹیکوں کی بیگنوں شیشیاں تھیں۔ انیس بے دردی سے یہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اس لیے بہت سی ٹوٹ پھٹی تھیں۔ میں نے فرمان علی سے کہا کہ وہ کوئی پاپ ڈھونڈے اور اپنی گاڑی کا کچھ پٹرول اس گاڑی میں منتقل کر دے۔

جس دوران فرمان نے اپنی کار سے دین میں پٹرول منتقل کیا میں نے گرفتار شدگان کو کمرے سے گاڑی میں منتقل کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم عکس صحت کی اس عمارت کو ”دوانہ“ میں پہنچے۔ فیکٹری کی اہم چالیاں فرمان علی کے پاس موجود تھیں۔ اگر فیکٹری مکمل طور پر بند تھی تو بھی ہم وہاں داخل ہو سکتے تھے۔ فیکٹری کی طرف جانے میں خطرہ موجود تھا تاہم اس بات کا بھی روشن امکان تھا کہ یہ صرف ہمارا خیال ہو۔ گاڑی تارک سنیٹن سڑک پر بھاگے لگی اور میرا ذہن مختلف سوچوں سے الجھنے لگا۔ وہ وہ گزرتوں گل کا خیال بھی آ رہا تھا۔ معلوم نہیں میرے بعد اس پر کیا کڑی تھی۔ وہ بیچ نکلا تھا یا قابو کیا تھا اور اگر بیچ نکلا تھا تو وہ اور صندوق اب کجا۔ تھیں؟

خروس منٹ کے سڑک کے بعد بغیر کسی خاص رکاوٹ

کے ہم فیکٹری پہنچ گئے۔ فیکٹری مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ چونکہ ار تک نظر نہیں آ رہا تھا تاہم جب ہماری گاڑیاں گیٹ پر پہنچیں تو ایک چھوٹے سے کین میں روشنی ہوئی اور چونکہ ار تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرمان علی والی کار آگے تھی۔ چونکہ ار کار کی کمری میں جھکا اور فرمان علی سے چند باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ فیکٹری میں چلا گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ آتے ہی اس نے وسیع و عریض گیٹ کھول دیا۔ ہم گاڑیوں کو آگے لیتے چلے گئے۔

صرف فیکٹری کے وسطی حصے میں زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ یہ دیہی کھوٹنے والی سٹریٹ نہایت شہین تھیں جو ہر وقت حرکت میں رہتی تھیں۔ ان کے اندر پھر اور اسی قسم کا دیگر میزبل ٹوٹکا رہتا تھا اور ایک پُر شور آواز پیدا ہوتی تھی۔ اگر ان مٹیوں کی گڑگڑاہٹ نہ ہوتی تو یہ تارک ایک اور سنسان فیکٹری کی قبرستان کا منظر پیش کر رہی ہوتی۔ ہم ان مٹیوں کے قریب سے گزرے۔ وہاں کوئی گران یا آپریشنر دکھائی نہیں دیا۔

ہم نے گاڑیاں اندرونی حصے میں روکیں۔ فرمان علی کار سے باہر نکلا اور اس نے چابیوں کی مدد سے چند کمروں کے آگے کھول دیے۔ ہم دونوں نے گرفتار شدہ غنڈوں کو اپنے کندھوں پر لا کر اندر پہنچانا شروع کیا۔ یہ ایک لمبوترال تھا۔ کمرہ تھا اور مینٹک روم کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ چھان چونکہ ار ہماری مصروفیت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ شہر کے مانے ہوئے غنڈے بے بسی کی حالت میں ننگے فرش پر پڑے تھے اور ہماری گالیاں سن رہے تھے۔ خاص طور پر بونے باڑی گاڑی کے دیدار پر چونکہ ار کو حیرت زدہ کیا۔ وہ جال میں جکڑے کسی خوشخوار جانور کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

میں نے سرگوشی کے لہجے میں فرمان علی سے پوچھا ”چونکہ ار نے گیٹ کھولنے میں اتنا وقت کیوں لگایا؟“ اس نے باوجود جی کو ٹیل فون کیا تھا ”اجازت لینے کے لئے“ فرمان علی نے جواب دیا۔

میں نے فرمان علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے ٹیل فون کیا کیا تھا؟“ ”کیا مطلب؟“ فرمان علی نے پوچھا۔

”کیس باؤ فیکٹری میں ہی تو موجود نہیں؟“ فرمان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ بہت دھیمی آواز میں بولا ”میں نہیں سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سہرا حال جو کچھ ہے ابھی سامنے آ جاتا ہے۔“

اور پھر وہی کچھ سامنے آیا جس کی میں نے توقع کی تھی۔

بابو لیاقت فیکٹری میں ہی موجود تھا لیکن اس کی موجودگی کے بارے میں صرف چند افراد کو پتا تھا۔ وہ حسب سابق پانچاگرہ گزٹ اور صدری پہنچے ہوئے تھا۔ تاہم آج اس کی بشارت اور خوش دلی کیس نظر نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں میں رت چکا تھا اور ہونٹ سگریٹ نوشی سے سیاہ ہو رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اس کی پریشانیوں کا سبب میں اور صرف میں تھا۔

میں نے کہا۔ ”لیاقت صاحب! مجھے تو فرمان نے بتایا تھا کہ آپ کسی نامعلوم مقام پر شفٹ ہو گئے ہیں۔“  
”جی ہاں وہ نامعلوم مقام۔“ بابو لیاقت نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میرے خیال میں آپ کا یہاں رہنا خطرناک ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”آپ کا یہاں آنا بھی تو خطرناک ہے۔ بلکہ ان لوگوں کا اصل نشانہ تو آپ ہی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ڈنگا سنگھ وغیرہ کے بارے میں پتا چلا آپ کو؟“

اس نے افسردگی سے ”ہاں“ میں جواب دیا اور بولا۔ ”حالات بڑتے جا رہے ہیں۔ پانچ افراد کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کل تک پورے ضلع کی پولیس حرکت میں آجائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”پانچ نہیں سات کہتے۔ صرف ایک گھنٹا پہلے دلاشیں میرے ہاتھوں پر چکی ہیں۔ وہ شکر بھارتی کے ساتھی تھے اور جو بائی بیچے ہیں وہ یہ آپ کے سامنے فرش پر پڑے ہیں۔“

”اوہائی گاڈ۔“ بابو لیاقت کے ہونٹ انتہائی تشویش کے انداز میں سکڑ گئے۔ مجھے لگا کہ وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا ہے جب میں اس کی بینک میں پہنچا تھا اور اس نے فراخ دلی سے میرے ساتھ تعاون کرنے کی پامی بھری تھی۔ وہ ہاتھ پیر چاکر کام کرنے والا سیاسی مزاج شخص تھا۔ میری ”مہربانیوں“ سے ایک ہی ہفتے میں اس کی ”ریپوئیشن“ کے کڑا کے نکل گئے تھے۔ پہلے بینک کے فونی بنگے میں دو افراد ہلاک ہوئے۔ پھر ارچند جیسی خطرناک عورت چمکا دے کر فیکٹری سے بھاگی اور اب میں دو جیتے جاگتے انسانوں کو لاشوں کے قالب میں ڈھال کر چھ عدد منویوں کے ساتھ یہاں آدھکا تھا۔ وہ کچھ دیر فرش پر الٹے سیدھے پڑے خطرناک غنڈوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور مجھ سے بولا۔ ”جہانی صاحب! میرے ساتھ آئیں“ میں آپ

سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“  
میں نے فرمان علی سے کہا کہ وہ دین میں سے مگر فار شدگان کی چاندنی راتیں نکال لائے اور یہاں ہال کمرے میں ٹھہر کر سو جائے۔ ان غنڈوں کا پورا دھڑا میں نے فرمان اور چوکیدار کو خاص طور پر بونے کی طرف سے ہوشیار کیا اور کہا کہ وہ ہر گھڑی اس پر نگاہ رکھیں۔

بابو لیاقت مجھے اپنے سجے سجائے دفتر میں لے آیا۔ یہاں ایٹش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا انبار لگا تھا۔ بابو لیاقت اپنی ریوالونگ چیز پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ایٹش ٹرے کو گھورتا رہا پھر ایک نیا سگریٹ نکال کر اس نے چند طویل کش لیے اور بولا۔ ”جہانی صاحب! میرا پیشہ وکالت ہے۔ اس پیشے میں بڑے کھاگ قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑی بڑی الٹی کھوڑی کی عورتیں دیکھی ہیں لیکن یہ حرام زادی ارچند بانو اپنی طرح کی ایک ہی نقل ہے۔ آپ جانتے نہیں جہانی صاحب! پالا سنگھ کتنا وقادار اور قابل مجھو سا شخص تھا۔ کبھی کبھی تو اس کی وقاداری خطہ کی حد کو چھو جاتی تھی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ وہ میرے ایک اشارے پر جان دے سکتا تھا“ اور۔ اور اب بھی دے سکتا ہے لیکن اس جاودگرنی نے اسے بھی شیشے میں اتار لیا۔ میں شاید اس صدمے کو عمر بھر فراموش نہ کر سکوں۔“

”پالا سنگھ اب کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”وہ چلا گیا، بیشک کے لیے“ اب کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی صورت نہیں دکھائے گا مجھے۔“  
”لگ۔ کیا مطلب؟“ میں نے انجانے اندیشے کے تحت پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ وہ زندہ ہے۔“ بابو لیاقت نے وضاحت کی۔ پھر سگریٹ کا کھلے لے کر بولا۔ ”پرسوں صبح اس نے ہماری مقدار میں نیلا توہ تھا کھالیا تھا۔ بس سانس باقی تھے جو بچ گیا۔“ مسلسل رو رہا تھا۔ کتنا تھا، میں اپنا جیون ختم کر لوں گا“ میں نے اپنے بابو کو دھوکا دیا ہے۔ میں نے گاؤں سے اس کے والدین کو بلایا اور انہیں کہا کہ وہ اسے سمجھائیں۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا اب وہ خود کشی کا تمنا شا کر میرے لیے نئی مصیبت کھڑی نہ کرے۔ والدہ کے سمجھانے بھانے سے وہ کچھ سمجھ گیا اور پرسوں شام ان کے ساتھ گاؤں واپس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے پاگل پن سے باز آ گیا ہے لیکن آج دوپہر اس کے گاؤں کا ایک شخص میرے ڈرائیور کو یہ لفاظی دے گیا ہے۔“

بابو لیاقت نے میر کے نیچے کسی دراز میں ہاتھ ڈال کر موٹے خاکی کاندہ کا ایک لٹافہ باہر نکال لیا۔ اس لٹافے میں کوئی دھنسی سی شے تھی۔ میں نے لٹافہ کھولا تو اندر ایک شاہنگ بیگ میں بولیاں سی نظر آئیں۔ میں نے شاہنگ بیگ باہر نکال کر دھنسی کی جانب کیا اور سمجھنے میں رہ گیا۔ خدا کی قسم یہ خون میں تھری ہوئی انسانی انگلیاں تھیں۔ انہیں کسی متین نر کے پاؤں سے آڑے وغیرہ سے کاٹا گیا تھا۔ یہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تھیں۔ ان میں انگوٹھے شامل نہیں تھے۔ میں نے شاہنگ بیگ واپس لٹافے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔

بابو بولا۔ ”دیکھا آپ نے؟ کیسا جنونیوں والا کام کیا ہے اس پالے سب۔ اور یہ دیکھیے؟ یہ خط بھی ملا ہے اس کی طرف سے۔“

بابو نے ایک بڑا ہوا کاندہ جیب سے نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ بالا اُن بڑھ مزور تھا۔ ظاہر ہے یہ خط اس نے کسی اور سے لکھوایا تھا۔ عین ممکن تھا اسی شخص سے لکھوایا ہو جو یہ خاکی لٹافہ بابو کے ڈرائیور کو دے کر گیا تھا۔ چند سطروں میں اس خط کا مضمون یہ تھا۔

”بابو صاحب! آپ چاہے مجھے شاگردوں میں لیکن اپنے آپ کو شاہنگ کر سکتا۔ خبر نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ کاش میں اس ”منک حرامی“ سے پہلے مر جاتا۔ آپ نے مجھے زندہ رہنے کا حکم دیا ہے میں زندہ رہنے پر مجبور ہوں لیکن میں نے سوکند کھائی ہے کہ جیون بھر آپ کو اپنی مخصوص صورت نہیں دکھاؤں گا۔ میں آج ہی فرید کوٹ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں نے خود کو ایک چھوٹی سی سزا دی ہے۔ اس لٹافے میں میری کٹی ہوئی انگلیاں ہیں۔ یہ انہی بد بخت ہاتھوں کی انگلیاں ہیں جنہوں نے آپ کے لٹافے ہوئے تالے کھولے تھے اور اس خوبصورت بلا کو کمرے سے باہر نکالا تھا۔ داہرہ گردو سے رات دن یہی پرارتنا ہے کہ مجھ پر کاری بدکاری کے سبب آپ پر کوئی بڑی مصیبت نہ آجائے“ اگر ایسا ہوا تو میں آپ کا آخری قسم تالے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ آپ کا بھرم پالا شک۔“

میں نے خط پڑھ کر بابو لیاقت کو اہل کڑیا۔ بابو لیاقت سگریٹ کا دھواں نفا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”یقین مانئے جانی صاحب! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ بالا شک نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ کچھ عجیب سا رشتہ قائم تھا میرے اور اس کے درمیان۔ یہ صدمہ ہی میرے لیے ناقابل برداشت تھا لیکن اس عورت نے اسی پر بس نہیں کی

ہے۔ چاہے اس نے میاں سے نکلنے کے بعد سب سے سلا کام کیا کیا ہے؟“ میں سوالیہ نظروں سے بابو لیاقت کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹپک لگا کر دھنسی لہجے میں بولا۔ ”اس نے میری ایک عزیزہ کو اغوا کر دیا ہے اور اب نون پر مجھے دھمکیاں دے رہی ہے۔“

میں خائے میں رہ گیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ ارشد بانو اس فیکٹری سے نکلنے کے بعد غلطی نہیں بیٹھے کی لیکن وہ جوانی کا ردوائی کے طور پر کسی عورت کو اغوا کر لے گی یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ میں نے بابو لیاقت سے پوچھا۔ ”کب ہوا یہ واقعہ؟“

وہ بولا۔ ”پرسوں دوپہر۔ میاں سے نکلنے کے صرف چار گھنٹے بعد اس نے یہ کام دکھا دیا۔ رحمان میری بیٹی تو نہیں ہے لیکن میں اسے بیٹیوں کی طرح ہی سمجھتا ہوں۔ ایک شیم بے آسرا لڑکی ہے وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔ بد شکل چودہ سال کی ہوگی۔ آنکھوں میں پڑھ رہی ہے۔ اسے اسکول سے واپسی پر اٹھایا گیا ہے۔ پرسوں ہاف ڈے تھا۔ اسے بارہ بجے گھر پہنچا جانا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ ساڑھے بارہ بجے ایک ٹیلی فون آیا۔ یہ ارشد بانو کی طرف سے تھا۔ یہ کال میرے فیبر جیڈ رائے سے تھی۔ ارشد بانو نے بتایا کہ لڑکی رحمان اس کی تحویل میں ہے اور اگرچہ مجھنے کے اندر اندر اس کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”آپ کو حوالے کرنے کا۔“ بابو نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ ”وہ مجھے نیم باگل ہو رہی تھی۔ فون پر چچ کر دو دھمکیاں دے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی رحمان کو صرف وارنٹ کے لیے اغوا کیا ہے۔ اس کے بعد میرے بال بچوں کی باری آسکتی ہے اور ان کے ساتھ وہی کچھ ہو سکتا ہے جس کا کسی نے تصور نہ کیا ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ جانی صاحب میرے پاس سے جا چکے ہیں اور اب مجھے ان کا کچھ پتا نہیں۔ لیکن وہ میری بہنات رو کر رہی تھی۔ میں نے اس سے ایک روز کی سہلت مانگی۔ کل دو بجے یہ سہلت ختم ہو گئی۔ ارشد بانو فون پر پہنچنے چکھاڑنے لگی۔ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ وہ عورت اس معاملے میں کتنی جذباتی ہے۔ وہ اپنی عزت تک اس پکر میں لٹا چکی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔ میں نے اسے باتوں میں الجھا کر مزید ایک دن کے لیے ٹالا ہے۔ ابھی تک میرے اور فیبر جیڈ کے سوا اس واقعے کی کسی کو خبر نہیں۔ میں نے اپنی بیوی تک کو نہیں بتایا۔ وہ بھی دیگر گھروالوں کی طرح یہی سمجھتی ہے کہ امر تشریں رحمان کے

کسی رشتے دار کا سراغ ملا ہے اور وہ فیبر جیڈ کے ساتھ وہاں مٹی ہے۔“

میں نے بابو لیاقت کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان بڑی بڑی ذہن اور خوبصورت آنکھوں میں اخلاص کی چمک تھی۔ اس شخص کو ایک نظردیکھ کر میں نے جان لیا تھا کہ لوگ یوں ہی اس کی عزت نہیں کرتے۔ کچھ گن ہیں اس میں جن کے سبب وہ بڑے علاقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ایک معمولی جان بچان والے شخص کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ میں اس کے لیے معمولی جان بچان والا شخص ہی تو تھا۔ میری وجہ سے اس کے گھر کا ایک فرزند اغوا ہو چکا تھا اور دیگر اہل خانہ کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن وہ میرا دفاع کر رہا تھا۔ اسے پرسوں دوپہر سے معلوم تھا کہ میں ڈنگا شک کے پاس ہوں۔ وہ ارشد کو میرے بارے میں بتا کر اپنی ہر مشکل آسان کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی زبان بند رکھتے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی ضرور تھی لیکن کسی طرح کا خوف نہیں تھا۔ ان لحاات میں وہ مجھے ایک شریف الطبع لیکن بہت ببادور اور مشکل پسند شخص نظر آیا۔ ایسا شخص جو مشکلات اور مسائل کو زندگی کا حصہ سمجھتا ہے۔ ان سے آنکھیں نہیں چڑھتا، مزاح و اراں کا مقابلہ کرتا ہے اور ہار جیت کے لیے اپنے سینے کو کشادہ رکھتا ہے۔

میں نے اس کے سگریٹ سے سگریٹ ملگاتے ہوئے کہا۔ ”بھرا ب کیا پروگرام ہے۔ کچھ کھوج دو ج ملا اس کتیا کے ٹھکانے کا۔“

”کھوج تو نہیں ملا۔“ بابو لیاقت نے بڑسوج لہجے میں کہا۔ ”لیکن ابھی ایک دو گھنٹے میں سستی سے ایک شخص پہنچے والا ہے میاں۔ معلوم ہوا ہے کہ ارشد بانو اس کی کوئی بات نہیں مانتی۔ میں جانتا ہوں کہ اب ارشد بانو کا فون آئے تو میرے بجائے وہ شخص اس سے بات کرے۔ شاید بھڑکی کوئی صورت نکل آئے۔ ورنہ پھر۔ جو کچھ ہم سے بن پڑا کریں گے ہم۔“

”نوں شخص ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک مجذوب ہے۔ لوگ اسی سائیں عالی کے نام سے پکارتے ہیں۔ پچھلے پچیس تیس برس سے اسٹیشن کے علاقے میں ایک ریلوے ہل کے نیچے رہا ہے۔ عقیدت مند بڑی بڑی کاہلوں میں اس تک پہنچتے ہیں اور اس کے چرنوں کی خاک ماتھے پر لگاتے ہیں۔ خاص طور پر قلمی دنیا کے لوگ اس کے بڑے مداح ہیں۔ سنا ہے آدھی رات کے بعد بڑے بڑے

قلم ساز، ہدایت کار اور چوٹی کے ایکٹر عام لوگوں کے ہمیں میں سائیں عالی کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کے نیاز حاصل کرتے ہیں۔“

”ارشد بانو کا اس سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”بہر اور مریدی کا۔“ بابو نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو بھی پتا ہوگا کہ ارشد بانو کا اصل نام سروج ہے۔ اس کا تعلق بھی بمبئی کی قلم نگری سے ہے۔ آج سے ڈھائی تین برس پہلے تک اس پر فلموں میں کام کرنے کا بھوت سوار تھا۔ ہدایت کاروں اور فلم سازوں سے اس کے مراسم تھے۔ شکل لاکھوں میں ایک تھی اور جوانی بھی ٹوٹ کر بری تھی لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ جس لڑکی میں ایک ہیروئن کی ساری خوبیاں موجود ہوں وہ ہیروئن بھی بن جائے۔ ”ہیروئن“ کی منزل پانے کے لیے اور خاص طور پر ہندی فلم کی ہیروئن بننے کے لیے بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں میں سے کوئی ایک یہ ”عالی مرتبہ“ حاصل کر پاتی ہے لیکن اس کے بعد بھی کئی مراحل ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم مرحلہ پبلک کی پسند و ناپسند ہے۔ ارشد بانو بھی اُن بہت جینا میں اس راستے کے تاریک پنج و خم میں بھٹک کر رہ جاتی ہیں۔ ارشد بانو نے پاکستانی جاگیردار افراتیم کی بیوی بننے سے پہلے اپنی منزل پانے کے لیے بہت کٹھن کیے تھے اسی دور پر آشوب میں وہ سائیں عالی کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئی تھی۔ اسے اور اس کی سرپرست خالہ کو اکثر سائیں کے آستانے پر دیکھا جاتا تھا۔ یہ دونوں عورتیں مینے میں ایک آدھ بار سائیں کو اپنے گھر بھی لے جاتی تھیں۔“

میں نے بابو لیاقت سے کہا۔ ”جہاں تک میرا اندازہ ہے ڈیڑھ دو پہنچنے تک سروج عرف ارشد بانو آپ کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ پھر اتنی ڈھیر ساری معلومات آپ کو کیسے حاصل ہو سکیں۔“

”ضرورت ایجاد کی ماں ہے جی۔“ وہ بولا۔ ”رحمان کے اغوا کے بعد میں نے فیبر جیڈ کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ اس عورت کے بارے میں ہنگامی طور پر افکار میں حاصل کرے۔ میںیں فرید کوٹ سے ایک ایسا شخص دستیاب ہو گیا جس نے پورا ”ڈاٹا“ فراہم کر دیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ ارشد بانو سائیں عالی کو خدا اور بھگوان کا درجہ دیتی ہے۔ سائیں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس حکم سے روگردانی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ شخص آپ کے آدمیوں کے ساتھ یہاں فرید کوٹ آجائے گا؟“

بابو لیاقت بولا۔ ”مجبور مجید بہت سمجھ دار شخص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح لے آئے گا۔ میں نے اسے کل سویرے ہی روانہ کر دیا تھا۔ آٹھ بجے والی فلاٹ سے گیا تھا۔ امید ہے دس بجے تک پہنچ گیا ہوگا۔ میں نے اسے فون کرنے کو کہا تھا۔ اس نے فون تو نہیں کیا لیکن شام کو گھر کے پتے پر ٹیلی گرام آیا ہے کہ کام ہو گیا ہے۔ وہ شین فلاٹ سے جندی گڑھ آئے گا۔ وہاں سے ذریعہ کار یہاں پہنچے گا۔“

اس نے اپنی کافی کی گھڑی پر نظر دوڑائی اور بولا۔ ”مجھے سچ کئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گا۔“

بابو لیاقت جہانزیہ اور معاملہ فہم شخص تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ سائیں عالی کے آنے سے معاملہ سدھ جائے گا۔ اگر نہ سدھ رہا تو وہ پھر دوسرا طریقہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ وہ مار دھاڑ کرنے والا شخص نہیں تھا لیکن اس کے اشارے پر سردھڑکی بازی لگانے والے افراد موجود تھے۔ وہ ایک بااثر شخص تھا اور یہ اس کا اپنا علاقہ تھا۔ وہ ارجند بانو اور اس کے بچے بچے خندوں کو ناکوں پر چڑھا سکتا تھا لیکن ایک ہوشیار ڈیپٹ کی طرح وہ یہ معاملہ پہلے بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہماری کنگھو کے دوران ہی فرمان علی چائے اور ڈرائی فروٹس لے آیا اور ہمیں اس کی آدھر خابوش ہوتا ہوا۔ غم و غصے میں میری بھوک تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک قند تک اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ چائے اور اس کے لوازمات دیکھ کر مت شکر کی خوشگلاش میرے تصور میں گھومتی لگی۔ ابھی چند گھنٹے پہلے تک مت شکر زندہ تھا اور وہ تمام لوگ زندہ تھے جنہوں نے کل میرے ساتھ شکر شکر کے خلاف اتحاد کیا تھا۔ لے چوڑے منصوبے بنائے تھے اور دسے واریاں باقی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میرے سینے پر ایک بت پڑا ہو جہ ہے۔ یہ ڈنگا شکر اور اس کے ساتھیوں کی ہنگامی موت کا بوجھ تھا۔ میں جب تک ان کے خون کا حساب نہ چکا رہتا، مکمل کر سانس لے سکتا تھا۔ نہ کوئی شے اپنے ملحق سے اٹار سکتا تھا۔

قل و عارت گری مجھے کبھی پسند نہیں رہی لیکن مجھے بیش اس پر مجبور کیا گیا۔ میں خوش رنگ شاموں، اُبلے سو روں، پھولوں اور فغوں کا پرستار تھا لیکن میرے ہاتھ میں ملک ہتھار تھا کہ مجھے زندہ جہوں کو چھٹی کرنے پر مجبور کیا

گیا۔ اور ایسا کرنے والا کون تھا؟ وہی شکر شکر۔ ایلیس اعظم جو انسان کا روپ دھارے ہستی ہستی قریہ قریہ قہوم رہا تھا۔

بابو لیاقت نے میرے چہرے سے میری سوچوں کو بھانپ لیا۔ چائے کے برتن ایک جانب ہٹا کر اس نے ڈرائی فروٹس کو رکالی سے ڈھانچا دیا اور سگریٹ الٹش ٹرے میں مسل کر بولا۔ ”ڈنگا شکر و دیو کی موت کا سن کر مجھے بھی زہدست شاک لگا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرانی اس بات پر ہوئی ہے کہ آپ نے اتنی جلدی بدل چکیا اور شکر کے پورے ٹینگ کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔“

”مجھے خود معلوم نہیں میں یہ سب کیسے کر سکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مت شکر کی لاش دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے کچھ نہ کیا تو میرے دماغ کی نیس پٹ جائیں گی اور میں اسی جگہ کر قہم ہو جاؤں گا۔“

”حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں۔“ بابو لیاقت تشویش ناک انداز میں بیڑایا۔ ”غالبا اس کا دھیان ان دولاٹوں کی طرف چلا گیا تھا جو میں زچہ پچہ سینٹر میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک وکیل اور قانون پسند شہری کی حیثیت سے اسے یقیناً میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بے لیبے میں صرف اتنا بولا۔ ”آپ ان ہائی افراد کا کیا کرتا ہے؟“

میرے اندر سفاکی کی ایک لہر اٹھی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میں نے سگریٹ کا دھواں فغاں میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”سچ بتاؤں لیاقت صاحب؟“

”مجھے آپ سے چھوٹ کی توقع نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں ان سب کو قتل کر دوں گا۔“ میں نے ایک ایک

نظر پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحوں کے لیے ثنائے میں رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر گہری تشویش بھی اٹھ آئی۔ شاید اس کے ذہن میں آیا کہ میں ان چھ افراد کو قتل کرنے کے لیے ہی یہاں لایا ہوں۔ میں نے کہا۔ ”بہر حال آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس فیکٹری میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ پر حرف آئے۔ میں پہلے ہی بہت ناجائز فائدہ اٹھا چکا ہوں آپ کی مرہنوں سے اور جی بات ہے کہ آپ سے بہت شرمندہ بھی ہوں۔“

میری رضاحت سننے کے بعد بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑنے کے لیے میں بولا۔ ”میں آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”میں بابو لیاقت۔“ میں نے غصے لیبے میں کہا۔ ”

شکر شکر کے سرگرم ساتھی ہیں۔ بہت بے گناہوں کا خون ہے ان کی گردنوں پر۔ اب بھی اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو سمجھو علم اور دردی کا ساتھ دوں گا۔ سوچا ہوں کاش میں یہ کام کچھ عرصہ پہلے کر گزرا ہوتا۔ ان ہی لوگوں نے جو آپ کے سینک ہال میں بندھے پڑے ہیں چند ماہ پہلے پاکستان کے قبائلی علاقے میں میرے دو ساتھیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ دونوں پولیس ملازم تھے۔ شکر شکر نے انہیں پکڑا تھا اور چاند باری کے میدان میں ان کے سروں پر برف رکھ کر نشانہ بازی کی مشق کی تھی۔ اس وقت میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اس درندگی کے ذمے دار افراد کو اسی انداز میں موت کے گھاٹ اتار دوں گا لیکن پھر نجانے کیا ہوا تھا۔ میری مصروفیات تھیں۔ یا پھر دقت گزرنے کے ساتھ میرے جذبات ماند پڑ گئے تھے۔ میں اس بات کو ٹال چلا گیا۔ یہاں تک کہ ذمے شکت کی ایک ہستی میں شکر کے ان ہر کاروں نے ایک بار پھر موت کا بازار گرم کیا۔ وہ ایک دہشتناک قتل عام تھا۔ آج تک اس خونخوار قتل گاہ کا ہر منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔ قتل ہونے والے ایک جشن منا رہے تھے۔ جرم کی زندگی سے تاب ہو کر انہوں نے ”مٹیور“ کے سامنے ہتھار ڈال دیے تھے اور ایک نئے سفر کا آغاز کر رہے تھے لیکن ان کے سارے ارادے اور وعدے ان کے ساتھ ہی خاک و خون میں لوٹ گئے تھے۔ اس وقت میں نے ایک باز پھر اپنے عمد کی تجدید کی تھی اور قسم کھائی تھی کہ شکر سے اس قتل عام کا بدلہ لوں گا لیکن پھر میں اس بزرگ والے معاملے میں الجھ گیا اور افراجم و دیو سے بچنے کی کوشش میں، کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ میں سمجھتا ہوں میری انہی کو تباہوں کا نتیجہ ڈنگا شکر اور اس کے ساتھیوں کی موت کی صورت میں نکلا ہے۔“

بابو لیاقت کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ بولا۔ ”میں خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتا کہ آپ کو مشورہ دوں لیکن یہ بات آپ بھی تسلیم کریں گے کہ فی الحال ان لوگوں کو قتل کیا گیا تو مجھے ہونے والی حالات اور بکر جائیں گے۔“

میں نے اپنی سترم گردن سلائے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا ہے تاکہ آپ بے فکر رہیں۔ میں ان کو اتنی جلدی مارنے والا نہیں ہوں۔ بڑے اہتمام اور تسلی سے قتل کروں گا انہیں۔ ان کے ساتھ وہی مکمل کھلا جائے گا جو وہ دونوں سے لیتے رہے ہیں۔ میں انہیں کسی سنان مقام پر لے جاؤں گا۔ لائن میں کھڑا کر کے ان پر نشانہ پختہ کیا جائے گا۔“

اور۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں انہیں پاکستان لے جاؤں اور ان قاتلوں کے حوالے کروں جن کے عزیزوں کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے۔ مجھنا تھا اور ایک تاریک شہرک میں بند کر کے ذہنی ٹیس سے مارا تھا۔“

وہ شخص جس کا میں انتظار تھا ہماری توقع سے آدھ گھنٹہ پہلے آن پہنچا۔ میرا مطلب سائیں عالی سے ہے۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بابو لیاقت کے فیجر مجید نے اطلاع دی کہ دس پندرہ منٹ کے اندر وہ لوگ فیکٹری پہنچ رہے ہیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد فیجر مجید ایک دہلے پتلے بارش فوجان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ فوجان کے بال تیل میں چڑے ہوئے تھے اور وہ وضع قطع سے کسی خاتہ کا ستلی لگتا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر فیجر مجید سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ کوئی مویا عورت جس نے کوئی زور دھک کا پڑا نہیں رکھا ہو یا اوڑھ رکھا ہو“ اندر داخل نہ ہو۔“

فیجر مجید نے بابو لیاقت کو ایک طرف لے جا کر تھوڑی سی کھسک بھسکی اور پھر بارش فوجان کو لے کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں سائیں عالی کو لے کر اندر داخل ہوئے۔ سائیں عالی ایک سترائی سالہ شخص تھا۔ اس کی لمبی جٹائیں شانوں پر جمول رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی بے ترتیب تھی اور سفیدی بالکل گھنی بھروس تھے انہیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ سائیں عالی کے جسم پر ایک لمبا سا چوڑا تھا۔ پنڈلیاں اور پائیں گئے تھے اور مکمل پٹیل سے سیاہ ہو رہے تھے۔ سائیں کے کندھوں پر نہایت غلط اور پٹنا پرانا مکمل دیکھ کر مجھے انک بیل کے جوڑے بھرے مکمل یاد آئے اور یوں لگا کہ سائیں بھٹی کی روپ گھڑی سے نہیں سیدھا انک بیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ سائیں کے گلے میں سب سے نمایاں اور قابل ذکر چیز ایک زخم کا نشان تھا۔ یہ نشان اس کی نصف پیشانی سے شروع ہو کر بائیں کبھی تک چلا گیا تھا۔ جیسے کھنڈر سے عمارت کی مقلد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نشان سے زخم کی سنگینی اور گہرائی کا پتا چلتا تھا۔

بابو لیاقت نے جلدی سے ایک کرسی سائیں کو پیش کرنا چاہی لیکن فیجر مجید نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور بتایا کہ سائیں عالی زخموں پر بیٹھیں گے۔ بارش فوجان کے کندھے پر ایک صاف ناک پڑا تھا۔ اس کپڑے کے ساتھ اس نے جلدی سے قالین کی گرد بھاری اور بیٹھنے میں قرعہ اندام سائیں کی مدد کی۔ سائیں اس وقت دی آبی تھا اور ہم سب



ہاتھ باندھے اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔ غیر مجید اور بارش  
نوجوان سرکشوں میں بائیں کر رہے تھے۔ سروی کا زور کم  
کرنے کے لیے سامنے کے قریب ایک الیکٹرک بیڑ لگا دیا  
گیا۔ بچے کے لیے گرم دودھ ایک پالہ نما ڈنگے میں لایا  
گیا۔ سامنے نے چند گھونٹ لیے اور ڈونگا ایک طرف رکھ  
دیا۔ وہ اپنے ارد گرد کے ہر شخص سے قطعی لائق نظر آ رہا  
تھا۔ کبھی مسکراتا تھا اور کبھی ہڑانے لگتا تھا۔ میں اور بابو  
لیاقت کر کے کے ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ غیر مجید  
ہمارے قریب آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ مدت رفت سے سامنے  
کو یہاں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سامنے نے جازکی  
نشت پر بیٹھے سے انکار کر دیا تھا۔ گاڑی میں بھی وہ نشت  
پر نہیں بیٹھا اور اسے دو نشتوں کے درمیان خالی جگہ میں  
بٹھا کر لانا پڑا۔ غیر مجید نے کہا۔ ”اس داڑھی والے لڑکے کا  
نام جانی شاہ ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سکھا دیا ہے۔  
سامنے عالی سے جو بات کہی ہے وہ خود ہی کر لے گا۔“

ہم نے دیکھا کہ جانی شاہ سامنے عالی کے سامنے دو زانو  
بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں دواتے ہوئے آگے پیچھے جھولنے لگا۔  
ساتھ ساتھ وہ ہولنا بھی جا رہا تھا۔ پہلے اس کی آواز موسیقی تھی  
پھر بلند ہو گئی۔ ”سامنے جی! یہ جی کا معاملہ ہے۔ معصوم جی کا  
اگر کچھ نہ کیا گیا تو وہ مر جائے گی۔ آپ کے دو لفظ بولنے سے  
اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ابھی تو وہی دیر میں ارشد لی بی کا  
ٹیلی فون آئے گا۔ آپ اس سے بات کریں۔ اسے یہاں بلا  
لیں۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹال سکتی۔“

سامنے عالی جیسے کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا ہاتھ  
چوڑے کی جیب میں ڈالتا اور خروڑے یا تروڑے کے خنک ج  
نکال کر چبانے لگتا۔ تو وہی دیر بعد غیر مجید بھی یہ آسکتی اس  
کے قریب جا بیٹھا۔ وہ منت ساجت کے مختلف مراحل میں  
جائی کی مدد کرنے لگا۔

”کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ کچھ نہیں ہے۔“ اچانک  
سامنے کی بھاری بھر کم آواز کر کے میں کو بگڑی۔ ”جاؤ۔  
چھوڑ دو میرا بیٹا۔ چھوڑ دو۔ جو کچھ تھوہہ شفیق محمد لے گیا  
شفیق محمد۔ کچھ نہیں ہے اب۔“

وہ بڑی بے پروائی سے اٹھا اور کر کے کے ایک کونے  
میں جا کر بیٹھ گیا۔ انداز چچا چھڑانے والا ہی تھا۔ جانی شاہ  
اور غیر مجید ہیک ہیکوں کی طرح پھر اس کے پیچھے گئے اور  
پاؤں کی طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سامنے اچانک بھڑک  
اٹھا۔ گرج کر بولا۔ ”کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ دغ ہو جاؤ۔  
دغ ہو جاؤ۔ شفیق محمد لے گیا ہے سب کچھ۔ اس نے اردن

میں سونے کا ہاڑ لایا ہے، جاؤ۔ میں کتا ہوں جاؤ۔“  
وہ ٹکٹاؤس کے انہیں مارنے کے لیے بھاگا۔ جانی اور  
غیر مجید اٹھے پاؤں پیچھے بٹھے۔ بڑا مسکھ خیر مسکھ تھا۔ سامنے  
کچھ دیر انہیں گھورتا رہا اور منہ میں بیڑا تار رہا۔ پھر وہ تیزی  
سے میری طرف آیا۔ اس کے جسم سے بڑے بھگے اٹھ رہے  
تھے۔ اپنے غلغلہ ہاتھ سے اس نے میرا کندھا چاٹا اور جھنجھوڑ  
کر بولا۔ ”ہاشم خاں! تو تو میرے ساتھ تھا۔ تو نے تو شفیق محمد کو  
دیکھا تھا۔ تو ان حرامی کتوں کو بتانا کیوں نہیں کہ وہ سب کچھ  
لے گیا ہے۔ بتانا کیوں نہیں ان کو؟ جاؤ۔“

سامنے نے مجھے جانی اور غیر مجید کی طرف دکھایا۔ میں  
سامنے کے کہنے پر غیر اور جانی کی طرف چلا گیا۔ جانی سرکشی  
میں بولا۔ ”جیسے جیسے یہ کہہ رہے ہیں کرتے جائیں۔ اگر زیادہ  
بھڑک اٹھے تو کوئی بات نہیں مانیں گے۔“

”میں نے پوچھا۔ لیکن یہ شفیق محمد ہے کون؟“  
جانی بولا۔ ”یہ آج تک کسی کو پتا نہیں چلا۔“  
”پھر بھی کچھ تو بتاتے ہوں گے؟“

وہ وہی آواز میں بولا۔ ”مجھے کہتے ہیں کہ یہ میانوالی کا  
ایک جن ہے۔ اس نے شیخوہ میں ہرن مینار کے پاس ایک  
بست بڑی مسجد بنا رکھی ہے۔ مجھے بتاتے ہیں کہ یہ میرا بیٹا  
ہے۔ جو آٹھ ہزار فوج کے ساتھ مل کر یہاں لڑتا رہا ہے۔ بس  
اسی طرح کی انٹرنیشنل باتیں کرتے ہیں۔“

ہماری کھسر پھر کے دوران ہی سامنے عالی ہمارے قریب  
پہنچ گیا۔ جانی غیر مجید کو لے کر کر کے سے باہر نکل گیا۔

سامنے نے میرے سینے پر ہاتھ پھیلا دیا۔ ”ہاشم خاں! تو مجھے بڑا  
اچھا لگتا ہے۔“

”اس لیے کہ تو ہاشم خاں نہیں، پھر بھی ہاشم خاں  
ہے۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ میرا کندھا

چھتاہٹا جا رہا تھا۔ ”شاہباش! بہت خوب۔ تم جیسے فرماؤ اور  
بچے مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ شاہباش۔“

اچانک میری نظر سامنے عالی کے گلے میں جموٹی رنگ  
برنگی ملاؤں پر پڑی اور میں بڑی طرح چونک گیا۔ ان ملاؤں

کے پیچھے دو تعویذ بھی تھے۔ ایک تعویذ تو چھڑے میں منڈھا ہوا  
تھا لیکن دوسرا چاندی میں تھا۔ میری نگاہ اس دوسرے

تعویذ پر جم کر رہ گئی۔ ذہن میں زبردست دھماکے ہونے  
لگے تھے۔ یہ تعویذ قدرے چھوٹے ہونے کے باوجود وہ ہوسا

شکل کا تھا جس شکل کے تعویذ میں نے چنے پل کی حویلی میں  
دیکھے تھے کھدائی سے برآمد ہونے والی تانبے کی بھاری بھڑ

۔ بیڑوں کے ساتھ ایسے ہی دو تعویذ جھول رہے تھے۔  
میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ مجھے احساس  
ہونے لگا کہ چنے پل کی حویلی سے برآمد ہونے والی دولت جس  
ذبحہ سے منسلک ہے اس ذبحہ کی کچھ کڑیاں آپس میں ملنے  
والی ہیں۔

مجھے شاہباش دینے کے بعد سامنے عالی ایک بار پھر ہر چیز  
سے لائق نظر آنے لگا تھا۔ وہ بیڑے کے پاس آتی پانی مار کر  
پینہ پیا اور چند منٹ بعد شان ہے نیازی سے وہیں پر لٹ گیا۔  
کچھ دیر بعد جانی شاہ دے پاؤں کہے میں آیا اور اس کے قریب  
پینہ کر ادب کے ساتھ پینے لیا۔ وہ پینہ منٹ بعد  
غیر مجید نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ جانی شامت ساجت  
کے انداز میں دھیرے دھیرے کچھ بولنا بھی جا رہا تھا۔

ایک ایک فون کی گھنٹی بجی اٹھی۔ بابو لیاقت نے لپک کر  
ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو۔“ وہ کرزاں آواز میں بولا۔

دوسری طرف ارشد بانو ہی تھی۔ بابو لیاقت کے چہرے

پر رنگ سا اتر کر رہ گیا۔ ”ہاں۔“ ہاں میں بابو بول رہا

ہوں۔ ہاں مجھے معلوم تھا۔ کون؟ نہیں۔

نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ ساتھ ہی اس نے غیر مجید کو

اشارہ کیا کہ وہ سامنے عالی کو اٹھا کر بٹھائیں۔ فون کا تار لپکا

تھا۔ بابو لیاقت سیٹ ہاتھ میں لے کر سامنے عالی کے پاس پہنچ

گیا۔ جانی نے سامنے کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور منت

کرنے لگا کہ وہ فون پر چند لفظ بول دے۔ سامنے آنکھیں بند

کیے خاموش لیٹا رہا پھر اچانک تجائے اس کے دل میں کیا آئی

کہ اس نے اٹھ کر بابو کے ہاتھوں سے ریسیور چھینا اور چپ کر

بولا۔

”او کئے کی جی، حرام زادی! تو نے کیا مصیبت ڈال دی رکھی

ہے اپنے باپ کو۔ کہاں سے بھونکتی ہے کہاں ہے تو؟ مجھے تو

مجھے ہے کہ شفیق محمد سب کچھ لے گیا ہے۔ پھر مجھ پر باز نہیں آئی

ہے۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر کرجا۔ ”تو اس بند

کہ جلدی آ میری طرف۔ جلدی آ نہیں تو۔“

اس نے آخر میں ارشد بانو کو ایک شاہکار گالی دی اور

ریسیور کھٹک کر بابو لیاقت کے قدموں میں پھینک دیا۔ بابو

لیاقت نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو۔“ میں بابو بول

رہا ہوں۔ سامنے جی یہاں ہمارے پاس ٹیکسٹر میں ہیں۔ وہ

واپس کر رہے ہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ

سکتا۔ تم یہاں آؤ گی تو پتا چلے گا۔“ اس کے ساتھ ہی بابو

لیاقت نے فون بند کر دیا۔

ٹھیک نصف گھنٹے کے بعد جب گھڑی کی سوئیاں چم کے

ہندسے کے آس پاس مل رہی تھیں، قربان علی بھاگا ہوا اندر  
داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ ارشد بانو پہنچ گئی ہے۔ بابو  
لیاقت باہر گیا اور ارشد بانو کو اپنے ساتھ اندر لے آیا۔  
ارشد بانو نے جانی تک ٹیپ چکا ہوا تھا۔ یہ اس ذمہ کی  
نشانی تھی جو چند روز پہلے اسے بابو کی بیٹھک میں لگا تھا۔ میں

نے فور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ میرے تصور میں خود بخود پالا

تھک کا بد بیٹ چو گیا۔ کس قدر تضاد تھا ان دونوں چہروں

میں۔ ایک خوبصورتی کی مسراج، دوسرا بد صورتی کی انتہا۔

لیکن دو طرفہ مجبوری دونوں چہروں کو ایک دوسرے کے قریب

لے آئی تھی اور پھر اندھیرے کی آنکھ نے وہ تماشا بھی دیکھا

تھا کہ خوبصورتی اور بد صورتی کے درمیان ہر فاصلہ مٹ گیا

تھا۔ حرم و دمع کی قربان گاہ ایک بہت بڑی بیٹھ چڑھائی

تھی ارشد بانو نے لیکن اس بیٹھ کے صلے میں اسے کیا ملا

تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ حالات کے تحت دھارے میں اس کا ہر

ارادہ ٹکے کی سرسبز کیا تھا اور صرف تین دن بعد آج وہ پھر

اس مقام پر کھائی جا رہی تھی۔ وہ انہی جگہ پر

ارشد بانو کے چہرے پر ڈھلے کی کیفیت تھی۔

ہوٹ خشک۔ بے تھوے اور آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔

”کہاں ہیں سر بی بی؟“ اس نے پوچھا۔

پھر اس نے لگا کر کے کے کونے میں سٹے ہوئے ”سامنے

جی“ پر پڑی۔ بڑی حرارت میں وہ بیٹھے بیٹھے ٹیک لگا کر سو گیا

تھا۔ جانی شانے اس کا سیلا پھیلا پاؤں دبا کر اسے بگایا اور

کہا۔ ”سامنے عالی لی بی! آگئی ہے۔“

ارشد بانو کو دیکھ کر سامنے عالی نے اپنی آنکھیں پوری

کھول دیں۔ ان اپنے آسن میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسی

طرح دو بار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ارشد بانو اس کے

قریب پہنچ کر دو زانو بیٹھ گئی۔ اس کے بال حسب معمول

شاٹوں پر بٹھے تھے۔ وہ ایک اسکرٹ نما لباس میں تھی اور

قمر قمر کا رنگ۔ پھر ہم نے ایک حیرت انگیز تماشا

دیکھا۔ سامنے عالی نے بڑی منت سے ہاتھ بڑھا کر جانی کے

ایک پاؤں۔ ”تو آگئی ہے۔ اور تیرا رنگی جوئے ارشد بانو

کے سر پر۔“ وہ اسی طرح بیٹھی رہی اس کے شیشو

سے دھلے تھے۔ ”لوں میں جوئے کی خاک بھر گئی تھی۔ جوئے رسید کرنے

کے بعد سامنے عالی چلا۔ ”کہاں ہے بی بی؟ ان کے حوالے

کے جلدی کی موت مرے گی۔“

”وہ“ نے کچھ پر ہے۔“ ارشد بانو بھلائی۔

”اسے لے کر آؤ ان فوراً نہیں تو بد بختی چٹ جائے گی

تھ سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تیرے ایک کوڑی نہیں لے گی۔

”میں ابھی اسے منگواتی ہوں سائیں جی۔ بس دیکھنے کی سہولت دے دیں۔“

”دیکھنے؟“ سائیں عالی گرجا۔ ”دیکھنے میں تو شیخ محمد تیرے بخت کو آڑا کر لیں ایسب سے بھی آگے لے جائے گا۔ دیکھنے نہیں، بالکل نہیں۔“

”آجھا۔۔۔ صرف ایک گھنٹا، صرف ایک گھنٹا دے دیں۔“

”جا جلدی کر، رفع ہو جا۔“

ارجمند بانو ڈنگائی ہوئی اٹھی۔ ”نصیب“ سائیں عالی نے اس کے اسکرٹ کا کنارہ کھینچا۔ وہ ایک بار پھر بھینکی۔ ”وہ دیکھ۔ اس بندے کو دیکھ۔“ سائیں عالی نے براہ راست میری طرف اشارہ کیا۔ ”میں اس کے ساتھ لگ جا۔ اس کے ساتھ چٹ جا۔ وہ تیرا نصیب ہے تیری خوش قسمتی ہے اس کے پاس۔ جب دے گا وہی دے گا جب دے گا وہی دے گا۔“

”س۔۔۔ سائیں جی! آپ نے جیسا بھی۔“

”بس چپ ہو جا۔“ سائیں عالی نے گرج کر اس کی بات کاٹی۔ ”جا۔۔۔ جو میں نے کہا ہے وہ کہہ کر ایک گھنٹے کے اندر پہنچ کر یہاں لے آ۔“

ارجمند بانو اٹھی۔ اس کی آنکھیں شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ جوئے کی خاک ابھی تک اس کے سر میں تھی لیکن اس کے چہرے پر نہ دامت یا شرمندگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلے۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے آواز دی۔ ”جلال۔۔۔ جلال۔۔۔“

ایک کونے میں حرکت ہوئی اور جلال سامنے آیا۔ اس کے ایک بازو پر پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ اس بازیگر سے میری آخری ملاقات پینچل ہوٹل کی چھت پر ہوئی تھی۔ میں نے اسے دو منزلہ عمارت سے نیچے گرا دیا تھا۔ اس ”حادی کے نشانیاں“ ابھی تک جلال کے جسم پر موجود تھیں۔ سخت جان تھا کہ اتنی جلدی ہسپتال سے نکل آیا تھا۔ (اخباری خبروں پر جانا تو خود کو تین چار ماہ تک محرومی بھگتا۔)

ارجمند بانو بولی ”جلال جاؤ اور اس لڑکی کو لے آؤ۔“

”او کے میٹھ۔“ جلال نے سر جھکا اور مجھے خشکیں نظروں سے گھورتا ہوا دوڑانے کی طرف بڑھ گیا۔

ارجمند بانو نے محوم کر ہمارے طرف دیکھا۔ میں ’بابو لیا‘ت‘ فرمان علی‘ سب اس کی طرف حوجہ تھے ایک دم

اس کے چہرے پر سرخی سی لپک گئی۔ وہ کسی بھی تھی مہربان ایک عورت تھی۔ تین دن پہلے اس نے جو ”کارنامہ“ انجام دیا تھا وہ ہم سب کے ذہنوں میں تازہ تھا۔ ہم نہیں بھولے تھے تو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ ہم سے گناہیں نہیں ملا سکتی تھی اس لیے رنج بھیر کر تیزی سے ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ بابو لیا‘ت‘ نے نفرت سے ایک طرف تھکا اور بیڑیا۔ ”مہربان“ عام سنگار کرنے کے قابل ہے یہ عورت۔“

فرمان علی ہمارے پاس آیا اور ادب سے بولا ”بابوئی دس بجے تک کمرے میں وقفہ ہے۔ اگر آپ کہیں تو کمرے میں آتے آؤں۔“

”نہیں۔“ بابو لیا‘ت‘ نے دو ٹوک لہجے میں کہا ”فیکٹری سے باہر کسی کو پتا نہیں کہ میں یہاں ہوں اور نہ ابھی پتا چاہئے۔“

میری وقت تھا جب ٹائٹس شور وغل نے ہمیں اپنی طرف حوجہ کر لیا۔ یہ شور فیکٹری کے مین گیٹ کی طرف سے بلند ہوا تھا۔ میرا ہاتھ خود بخود پینچل کی طرف بڑھ گیا۔ فرما علی نے بھی راتھل کندھے سے اٹار لی۔ بابو لیا‘ت‘ حیرت قدموں سے ٹکے اٹھنے کی طرف گیا۔ وہاں سے اسے گیٹ منظر صاف نظر آنے لگا اور وہ دونوں ہاتھ کھولیں پر رکھ کر محویت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ کوئی تخمینہ نوعیت کا معاملہ نہیں ہے۔ میں بھی دس پندرہ قدم تھل کر بابو لیا‘ت‘ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ فیکٹری کے تیز چار ملازم ایک شخص سے اٹھے ہوئے تھے وہ شخص زور زور سے پلا رہا تھا لیکن کھونٹے والی مشینوں کے شور میں اس کی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ اچانک میں بڑی طرح چونک گیا۔ وہ زہریں گل تھا۔

گل بیچ نو بجے سے میں زہریں گل کے بارے میں تیسویں مرتبہ سوچ چکا تھا لیکن یہ بات ایک بار بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ وہ یوں اس طرح بابو لیا‘ت‘ کی فیکٹری میں جا جائے گا۔ میں دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا۔ ایک خوند مند نے زہریں گل کو عتب سے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ افراد اسے سامنے سے قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندھاوند ٹانگیں چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ بول رہا تھا ”جڑائی کا اولاد“ تم کام کو باپ کا گالی دیتا ہے ام تمہارا چچا بڑے گا۔ زندہ نہیں چھوڑے گا تم کو۔“

وہ بار بار اپنے سینے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا لیکن جکڑنے والے نے اس کے بازوؤں کو بھی جکڑ رکھا تھا سامنے والے دو افراد بھی مجھے تھے کہ خان کے سینے

کوئی شے ہے۔ وہ اس کا ہینڈ دیکھنے کے لیے بار بار جھینے تھے لیکن وہ ہاتھ چلا کر انہیں پیچھے ہٹا رہا تھا۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے زہریں گل اور اسے دھپنے والا سکھ ملازم دونوں زمین ہوس ہو گئے۔

میں نے کار کر کہا۔ ”چھوڑو۔۔۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

مجھے دیکھ کر وہ افراد تو پیچھے ہٹ گئے لیکن زہریں گل اور سکھ بدستور محکم تھا رہے۔

میں نے ان دونوں کو بمشکل جدا کیا۔ اس دوران بابو لیا‘ت‘ اور فرمان علی بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر زہریں گل کا غصہ کم ہونے کے بجائے اور تیز ہو گیا تھا۔ دوسری طرف سکھ بھی آخر ”سکھ“ تھا۔ وہ پیچھے تو ہٹ گیا تھا لیکن بدستور اپنے سینے کی طرح زہریں گل کو گھور رہا تھا۔

زہریں گل دہانزا۔ ”مولا کا بیٹا ہے تو اکیلا آؤ امارے سامنے تمہارا ہاتھیں چیر کر ہاتھ میں نہ دے دے تو کتنا۔“ دہانزا سکھ گرجا۔ ”جو کچھ کھرا نکال جا کہ چندگی تھی جو کچھ کیا پورہ ابھی منکا تو زہریں تیرا۔“

زہریں گل نے بدتر سے کے انداز میں کندھوں کو حرکت دی اور جوش کھا کر پھر سینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں پہلے سے تیار تھا لہذا اس کی گھائی دھچک لی۔ دوسری طرف بابو لیا‘ت‘ نے بھی ڈانٹ ڈپٹ کر سکھ ملازم کو پیچھے ہٹا دیا۔ ”کیا بات ہوئی ہے؟“ اس نے تھکانہ لہجے میں سکھ ملازم سے پوچھا۔

وہ مالک سے بیٹے والا خون پر نچھ کر بولا۔ ”یہ پچھلے دس پندرہ منٹ سے فیکٹری کے آگے دو الے محوم رہا تھا جی۔ پھر میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ کسی کی فیکٹری ہے مالک کہاں ہے؟ مجھے اس کی نیت کھاب لگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ وہ کون ہے۔ بس اتنی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ میرا جک (جک) اور جیادہ ہو گیا۔ میں نے کرم الٹی کو آواز دی۔ اس کے آنے تک یہ مجھے سے محکم تھا ہو چکا تھا۔“

زہریں گل نے تیز پیچھے میں تردید کی اور کہا کہ اسے گالی دی گئی تھی۔ بہر حال بابو لیا‘ت‘ اور دیگر لوگ جان بچے تھے کہ زہریں گل میرا کوئی جاننے والا ہے۔ انہوں نے سکھ ملازم کو ڈانٹ ڈپٹ کر گیٹ کی طرف بھیجا۔ میں زہریں گل کو لے کر بابو کے دفتری طرف بڑھا۔ اس موقع پر ایک اور تماشا ہوتے ہوئے رہ گیا۔ مجھوب سائیں عالی بھی بنگا سے کی آواز سن کر باہر نکل آیا تھا۔ وہ بال ٹاکر کے سامنے کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جو بھی ہم اس کے پاس سے گزرے ”اچانک اسے نچانے کیا ہوا۔ اس نے ایک دم گنا

کنا اور زہریں گل کو مارنے دوڑا۔ ابھی اس نے دو چار ہی قدم اٹھائے تھے کہ بارش فوجان جانی شاہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ بڑی دھیرے سے سائیں عالی سے بھل کر ہو گیا اور اسے پیچھے کی طرف دھکیلے گا۔ سائیں عالی نے شور مچانے والے انداز میں کہا۔ ”کیسی ہے۔۔۔ کیسی ہے شیخ محمد کو حویلی سے بلاؤ۔ شیخ محمد۔ شیخ محمد۔“ پتا نہیں وہ کیا کچھ کر رہا تھا لیکن اس کے تمام الفاظ مجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

زہریں گل نے فوری طور پر یہی سمجھا کہ گیٹ سے شروع ہونے والا ہنگامہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور اس پر جھینے والا شخص سکھ چوکیدار کا بھی کوئی ساتھی ہے۔ انکی اکیلا زہریں گل کا چوبیس سرخ ہو گیا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر سینے کی طرف پڑنے لگا تھا۔ میں اسے دھکیل کر تیزی کرے میں لے گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میرا دھیان زہریں گل کی ٹھیس کی طرف گیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ اسے دیکھ کر سائیں عالی آگے سے باہر کیوں ہوا ہے۔ شوئی قسمت زہریں گل کی ٹھیس کمرے زد رنگ کی تھی۔ وہ ہانپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”استاد جی! امارے ہاتھوں سے کوئی نقل مسئل نہ ہو جائے ام کو تو لگتا ہے یہاں کا سب لوگ ایک دم پاگل ہے پہلے اس حرای نے ام کو گالی دیا ”اب۔۔۔“

”میں سب دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم خود کو پریشان مت کرو۔ یہاں آرام سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ کہاں سے آئے ہو اور یہاں کا پتا تمہیں کیسے چلا؟“

اس نے چند گہری سائیں لے کر اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”استاد جی! آپ نے خود ہی تو ہم کو بتایا تھا کہ آپ فرید کوٹ کے بابو لیا‘ت‘ کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ام سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی مشہور بندہ ہے۔ بس ام نے پتا چلا لیا۔“

اب مجھے یاد آیا کہ مضافاتی کر دور اسے میں غازیگ ہونے سے پہلے میں نے زہریں گل کو بتایا تھا کہ میں بابو لیا‘ت‘ نامی شخص کے پاس ٹھہرا ہوں۔ زہریں گل نے ایک نظر اپنی کند سال دست داج پر ڈالی اور ہانپے لہجے میں بولا۔ ”استاد جی! ام امیر مکی میں یہاں تک آیا ہے۔ ابھی دوڑھائی گھنٹا پہلے صبح صاحب نے ام سے فون پر بات کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے بھی ہو ام دس بجے سے پہلے پہلے آپ کو لے کر اس کے پاس پہنچ جائے۔“

میں نے پوچھا۔ ”ممنور کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”گزک کے پاس۔ اور زک کنڈا اور پور کے

قارم پر کھڑا ہے۔ وہ نمودار عشرت کا قارم ہے۔ اور اسے عشرت قارم کہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو زریں گل۔ مجھے شروع سے بتاؤ۔ ورنہ نہ تم کچھ بتا سکو گے نہ میں سمجھ سکوں گا۔“

زریں گل اور میں آمنے سامنے کر سیں پر بیٹھ گئے۔ زریں گل نے کہا۔ ”مگر دو اور اسے سے بھانا پر دیکھا تھا۔ اس کی وجہ آپ کو مصدر صاحب ہی بتائے گا۔ ام اس وقت بڑی نسر کے پار گنڈا را پر گاؤں میں ہے۔ وہاں کے نمودار عشرت نے ام کو اپنے پاس پناہ دیا ہے۔ وہ بڑا عجیب و غریب بندہ ہے۔ آپ اس سے مل کر حیران ہو گا۔ کل گروارے کے پاس فانگڑک کے بعد آپ غائب ہو گیا۔ ام بھی کسی نہ کسی طرح واپس گنڈا را پر گاؤں پہنچ گیا۔ مصدر صاحب نے ام کو آرزو دیا کہ ام شہر جا کر باقیات کا چٹا چلائے تاکہ آپ تک پہنچا جاسکے۔ ام فوراً قارم سے شہر آیا۔ کئی علاقوں میں کرفو نہیں تھا لیکن جس علاقے میں باقیات کا چٹا تک پہنچا ہے وہاں کرفو تھا۔ جب شام کو کرفو میں وقت ہوا۔ ام باہر کی پیشک پر پہنچا۔ وہاں سے اندازہ ہوا کہ آپ یہاں نہیں آیا۔ واپس گنڈا را پر جانے کے بجائے ام کل رات شہر میں ہی ٹھہر گیا۔ اسیشن کے پاس ایک بڑے محلے مانس خان صاحب کا ہوٹل ہے۔ ماہرہ ہوٹل۔ ام نے وہاں ایک کمرہ لیا۔ گنڈا را اور کے عشرت قارم میں ملی فون ہے۔ ام نے مصدر صاحب کو فون پر بتا دیا کہ ام ماہرہ ہوٹل میں ہے اور صبح پھر استاد صاحب کا کونج لگانے نکلے گا۔ لیکن آج صبح سویرے ام کو آنا فانا گنا دیکھا۔“ زریں گل نے ایک بار پھر دست و پاچ پر نگہ دوڑائی اور بولا۔ ”مجھ بچ کر میں منٹ پر مصدر صاحب نے ام کو عشرت قارم سے ملی فون کیا تھا۔ وہ کچھ گھبرا ہوا لگتا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ جیسے بھی ہو ام آپ کو ڈھونڈے اور دس بجے سے پہلے آپ کو لے کر گنڈا را پر پہنچ جائے۔ ام نے اس کو بتایا کہ شہر سے باہر باقیات باہر کا ایک ٹیکسٹری ہے۔ ام اب وہاں جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے بات بین جائے۔ وہ بولا فوراً نکل جاؤ۔ دیر ہوا تو برا مسئلہ بن جائے گا۔“

”کوئی خطرے والی بات تو نہیں تھی۔“ میں نے پوچھا۔ ”ام نے پوچھا تھا، لیکن وہ بولا۔“ ایسا کوئی بات نہیں۔ ام اور دلپیت خیریت سے ہے۔ تم بس جلدی آنے کا کوشش کرنا۔“

میں نے کہا۔ ”کچھ اندازہ تو لگایا ہو گا تم نے؟“ وہ بولا۔ ”مارا اندازہ ہے کہ نمودار عشرت صاحب نے

اپنا کوئی مجبوری ظاہر کیا ہو گا اور مصدر صاحب چاہتا ہے کہ ام نرک کو وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔“

میں نے گھڑی پر نگہ ڈالی۔ ”غزالہ کی گھڑی پر۔ ٹھیک فونج رہے تھے۔ میں نے کہا۔“ زریں گل اس حساب سے قیمت تو مذاقت رہ گیا ہے۔ ہمیں جلد لگنا ہو گا۔“

پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ دس بجتے ہی کرفو دوبارہ لاگو ہو جائے گا۔ میں دو ازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ ”کیا ہوا گی۔“ زریں گل نے پوچھا۔

”بڑی گزیدہ ہے۔ بار۔“ میں نے دوبارہ کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو زریں گل میں کرفو میں وقت ختم ہو جائے گا۔ ہم راستے میں دو چر لے جائیں گے۔“

زریں گل کا نہ لگ گیا۔ اسی دوران مجھے یاد آیا کہ ملی فون تو یہاں بھی ہے۔ مصدر سے عشرت قارم میں بات کی جاسکتی ہے۔ میں نے جوشیلے لیے جس میں کہا۔ ”مصدر کا فون نمبر کہاں ہے۔“

”کہیں بھی نہیں ہے۔ ام۔“ ام کو ذہنی یاد ہے۔ ڈبل ٹو بٹا۔ ”میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور فوراً باقیات کے آفس میں پہنچا۔ زریں گل کو مطلوبہ نمبر لانے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ دوسری طرف سے کوئی ملازم ٹاپ ٹھس بولا تھا۔ زریں گل نے اس سے کہا کہ نرک والے وچن سنگھ کو بلا دو۔ وچن سنگھ سے اس کی مراد مصدر ہی تھا۔

چند لمبے بعد زریں گل سے مصدر کی ”ہیلو ہیلو“ ہوئی اور پھر زریں نے ریسپو رنچے تمھارا۔“ ہیلو شاہ جہاں صاحب۔“ مصدر کی جانی بچانی آواز ابھری۔ اس کے لیے میں جوش تھا لیکن ایک طرح کی احتیاط بھی تھی۔ یہ احتیاط اس خدشے کے سبب تھی کہ کہیں فون ٹپ نہ کیا جا رہا ہو۔

”کہاں ہو بھائی، کسی گزر رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”لیکن جو بھی بتاؤ را احتیاط سے۔“

”میں بھی ہی عرض کرتے والا تھا۔“ مصدر نے کہا۔ پھر کھنکھار کر بولا۔ ”آپ کو ٹھکانے کا پتہ چل ہی گیا ہو گا۔ دوسرا پیغام جو بھیجا ہے وہ بھی مل گیا ہو گا۔“ (مصدر کا مطلب دس بجے تک پہنچ جانے سے تھا۔)

میں نے کہا۔ ”پیغام تو مل گیا ہے لیکن اس کے مطابق عمل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ تمہیں علم ہی ہو گا شہر کے بیشتر علاقوں میں کرفو ہے۔ جگہ جگہ چیکنگ بھی ہو رہی ہے۔“

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر بت ضروری ہے تو میں کوشش کرنا

خوبی سے مدد ہوئے تھے۔ یہ سائیں عالی پچھلے تھیں برس سے بمبئی ریلوے اسیشن کے ایک تاریک گوشے میں بڑا سرار زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے اس کی زبان سے پرانی خوبی، سونے کا ہاڑ اور قل ایب جیسے ہسم الفاظ سنے تھے لیکن مجھے ان الفاظ میں ایک خاص طرح کا ربط محسوس ہو رہا تھا۔ یہ الفاظ اپنے اصل معنی کے بجائے کسی اور معنی میں بولے جا رہے تھے۔ بولنے والا اپنے حواس میں نہیں تھا لیکن یہ لفظ اس کی زبان سے بے وجہ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

اچانک مجھے کسی ساتھ والے کمرے سے کرناک جج سنائی دی۔ یہ اریمنڈ بانو کی جج تھی۔ وہ فونج ہونے والی بکری کی طرح چلائی تھی۔ اور اس نے صرف ایک جج پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ وہ ججی چلی جا رہی تھی۔ یہ اتنی بلند ججیں

## ایم اے راحت

### کا ایک خوبصورت ناول



قیمت ۱۸۰/- روپے

ناشر

## علی میاں پبلی کیشنز

۲۰ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۴۳۴۷۱۲

ہوں۔ یہ کوئی ایسا نہ ہونے والا کام بھی نہیں ہے۔“

مصدر نے کہا۔ ”نہیں۔ پھر آپ رہنے دیں۔“ اتنا زیادہ رسک لینے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی اب آپ بشکل پانچ پر پہنچ چکے ہیں۔ ایسا کہتے ہیں کہ شام کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔ دوسرے کا وقت ہو گا۔ اس میں با آسانی سب کچھ ہو سکے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔ لیکن میں اب بھی تیار ہوں۔“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آپ یہ کریں کہ شام کو میں نہ کریں۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ ”چند ”ٹوٹکی“ چھیں۔“ باتیں کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

زریں گل میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے عجب سے مٹی میں تھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ مٹی جھاڑی۔ زریں گل دو ازے سے باہر اعلیٰ پر ٹاپیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ بولا۔ ”خیر یہ کٹہ خراب کا بچہ چرنے والا کون ہے؟“ اس کا اشارہ سائیں عالی کی طرف تھا۔ جو اب دھوپ پینے کے لیے باہر بیٹھوں کے پاس آن بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ ”وہ خانہ خراب نہیں۔“ مجھ پر ہمدردی تھی۔ یہ زود تعین دیکھ کر ہرگز اٹھا تھا۔ اب اس کے سامنے جانے سے پہلے کسی چادر وغیرہ کی بھل مار لیتا۔

”بس ہے کوئی بات۔“ میں نے کہا۔ پھر اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے زریں گل سے پوچھا۔ ”پانڈی کے وہ تعویذ کہاں ہیں جو بیٹیوں سے اتارے تھے؟“

زریں گل بولا۔ ”مارے پاس ہی ہے۔“

واپس بائیں دیکھ کر اس نے اپنی کمر ٹوٹی اتاری۔ ٹوٹی کا اندرونی کپڑا اڑھن کر اس نے دونوں تعویذ ٹوٹی میں گھسا رکھے تھے۔ فربہ کوٹ پہنچتے تک یہ تعویذ میرے پاس ہی رہے تھے لیکن پھر میں نے زریں گل کو دے دیے تھے۔ زریں نے ٹوٹی سے نکال کر تعویذ میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں نے بھور دیکھا۔ ان تعویذوں اور سائیں عالی کے گلے میں تعویذوں میں ساز کے سوا قطعی کوئی فرق نہیں تھا۔ تین تعویذوں کی ڈوری بھی خاص تاریکی رنگ کی تھی۔

”کئی سوچیں پیلا کر کے آئیں اور میرے ذہن میں اُدھم مچائے لگیں۔ سائیں عالی اریمنڈ بانو کا مٹھنہ تھا۔ اس کے گلے میں ہو بودیا ہی تعویذ تھیں جیسے تعویذ چنے پل کی

جنس کے مشینوں کی مرکز اہم کے باوجود نفا کو چرتی جاری

میں دوڑنا ہوا آواز کی ست گیا۔ زریں گل میرے پیچھے آ رہا تھا۔ ہم اس آفس میں سے گزرے جہاں میں نے بونے باؤی گاڑوسیت چھ افراد کو باندھ کر فرش پر ڈال رکھا تھا۔ یہ سارے افراد خطر شکار کے ساتھی تھے اور زچہ پچہ سینفروالی کو بھی سے پکڑے گئے تھے میں نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور بری طرح چونک گیا۔ بونا باؤی گاڑوان میں موجود نہیں تھا۔ ایک بار پھر ارجند کی کرناک چیخ فضا میں ابھری اور دھماکا مٹی کی آوازیں آئیں۔ میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو ایک لڑکھیز منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ خونخوار بونا پھر عسیر پاکی طرح ارجند کی پشت پر سوار تھا۔ اس کی سڈول ٹائٹیں ارجند کی کمرے لگی ہوئی تھیں اور بازوؤں نے اس کی گردن کے گرد حلقہ بنا رکھا تھا۔ بونے کے دانت ارجند کی گردن کے عقبی حصے میں پھوست تھے۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مجھے اپنے پیٹ کا ٹینگوں ابھار یاد آ گیا۔ یہ ابھار بھی ایسے ہی ایک بونے کے بے رحم دانتوں کی یادگار تھا اور کئی دن گزرنے کے باوجود ابھی تک پوری طرح معدوم نہیں ہوا تھا۔

کمرے کے فرش پر قالین نمادری پھچی تھی اور درزی پر شیشے کے بت سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔ یہ ٹکڑے غالباً ایک سنگار میز کے شیشے کے تھے۔ ارجند چلا رہی تھی اور بونے کو اپنی پشت سے جھٹکے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اپنا پستول سونت کر دو قدم آگے بڑھا اور پھر مجھے وہ چمکدار شے نظر آئی جو بونے نے ارجند کی گردن سے پھوست کر رکھی تھی۔ وہ دیکھنے میں خنجر لگتا تھا لیکن خنجر نہیں تھا۔ خنجر کے پھل جیسا وہ سوئے شیشے کا لہسا سا گڑا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لئے بونے کی زرد آنکھوں میں جھانکا اور اندر سے لرز گیا۔ ان آنکھوں میں غیر انسانی چمک تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ایک قدم بھی بڑھایا تو یہ عجیب الحلقہ دردندہ ارجند کی جان لے لے گا۔

اس سوئے پر زریں گل ہوشیاری دکھا گیا۔ بڑی بھرتی سے وہ پیچھے جھکا اور اس نے وہ قالین نمادری ایک جھٹکے سے کھینچ لی جس پر ارجند کھڑی تھی۔ ایک چمک کے ساتھ ارجند پشت کے بل فرش پر گری۔ ظاہر ہے بونا بھی اس کے ساتھ ہی گر گیا تھا۔ اس کا سر سنگار میز کے کونے سے ٹکرایا اور پھر وہ تپ کر ارجند سے علیحدہ ہو گیا۔ میں اس سوئے کو ہاتھ سے کیسے جانتے رہا؟ میں نے ہست نگاہی اور بونے کو چھاپ

لیا۔ وہ کسی گھٹے ہوئے درندے کی طرح طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ میں اسے کوئی موقع دیتا تو یہ بڑی غلطی ہوتی۔ میں نے اسے پہلی ضرب ہی تسلی بخش لگا دی۔ پستول کا بھاری بھر کم دست بونے کی پیشانی پر لگا اور سیاہ جلد کے نیچے سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ بونے کا وہ ہاتھ جس میں شیشہ دبا ہوا تھا میرے پائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اس وقت میری نگاہ بونے کے ہونٹوں کی طرف گئی اور میں ششدر رہ گیا۔ مجھے اس کے دانتوں میں سفید سفید گوشت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ بلاشبہ یہ ارجند بانو کی گردن کا گوشت تھا۔

میں ارجند بانو کو اس کمرے میں لے آیا جو بابو لیاقت کے آفس کی عقبی جانب واقع تھا۔ وہ دروازے کے بل حال ہو رہی تھی۔ اس کی گردن کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی بولی نکل گئی تھی۔ وہ یہ منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ درندہ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی۔ میں نے بابو لیاقت کے ساتھ مل کر اسے ابتدائی طبی امداد فراہم کی۔ خون بند کرنے کے بعد زخم پر روٹی رکھ کر پٹی باندھ دی گئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے بھٹ گیا تھا اور گردن کے سامنے والے حصے پر بھی خراشیں تھیں۔ تاہم یہ خراشیں ایسی نہیں تھیں کہ اس کی خوبصورتی کو مجروح کرتیں۔ اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ "میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک دم وہ کھڑکی سے کود کر اندر آیا اور میری پشت پر گرا۔ میں نے بت کوشش کی کہ اس کو اوپر سے جھٹک سکوں لیکن وہ کسی ٹیکڑے کی طرح مجھ سے چپٹ گیا تھا۔"

اسی دوران زریں گل اندر آ گیا۔ کہنے لگا "ساتری! وہ بن مانس کا کچھ تو بے ہوش بڑا ہے۔ بت ساخون نکل گیا ہے اس کے سر سے" زریں گل کا اشارہ قادر زماں کے بونے باؤی گاڑو کی طرف تھا۔ اس کی پیشانی پر بت زوردار چوٹ لگی تھی اور میں نے دائیں ابدو کے اوپر سے خون کی پچکاریاں چھوئے دیکھی تھیں۔

زریں گل بولا "اگر اسے اسپتال نہ پہنچایا تو خانہ خراب ادھر ہی مر جائے گا"

میں نے کہا "مرنے دو۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

میرے سر لہجے نے زریں گل کو متعجب کیا۔ ابھی زریں گل کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ بونا اور اس کے دیگر بانی ساتھی چودہ بندہ تھے پہلے تھے عین جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ ان لوگوں نے ڈنگا ٹکھ اور اس کے ساتھیوں کو میرے ساتھ قتل کرنے کی پاداش میں بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اب ان کے لئے میرے دل میں رحم کی کوئی رفق نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد زریں گل اور بابو لیاقت باہر چلے گئے تو میں ارجند کے ساتھ کمرے میں تھرا گیا۔ وہ اب اپنے حواس میں آچکی تھی اور فکڑ فکڑ آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسکرٹ نمالباس کے اندر اس کا جسم خلیب و فزاسے آرام سے نظر آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آسوائی رہے تھے۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے ہاتھ سے لگ کر کھینچنے لگی۔ اس کی یہ حرکت جتنی اچانک تھی اتنی ہی حیرت انگیز بھی تھی۔ میں اس وقت کرسی پر بیٹھا تھا۔ ارجند نے اپنے کھینچے فرش پر ٹپک دیے تھے اور بے جذباتی انداز میں مجھ پر گری گئی تھی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ ٹھوکر آواز میں بولی "استاد جان! مجھے خود سے دور مت کرو۔ تم نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا ہے۔ سائیں جی نے کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں اور تمہارے کپے پر عمل کروں۔ میں اب تمہارے قدموں سے دور نہیں ہوں گی۔"

میں اس اچانک افتاد پر بوکھلا سا گیا تھا۔ ارجند بانو کا انداز اچانک ہی عسیر بھاری جیسا ہو گیا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے۔ لیکن کرسی سے کھڑا ہو گیا تو ارجند بانو عرفان کی چچی نے لالچ میرے پاؤں قہاں لیے۔ "مجھے دھکا کرنا مت استاد بابو! اوشواس کرو کہ تم نے ایسا کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی"

میں نے یہ آہستگی اپنے پاؤں اس کی گرفت سے ہٹائے اور دو اونے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر میں غصے شانوں سے قہاں کر اٹھا یا اور صوفے پر بٹھا دیا۔

"یہ سائیں عالی ہے کون؟" میں نے اس پر چھا "یہ میرے پیرو مرشد ہیں" ارجند بانو بلا جھجک بولی "میں ان کے گوانف جانتا چاہا رہا ہوں"

ارجند بانو نے ایک گرمی سانس لی اور بولی "استاد سائیں جی کے حکم کے بعد میں اب تم سے کچھ بھی نہ مانگیں چاہتی۔ اگر چھاپاس کی تو اپنے آپ پر غلم کروں۔ تم جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو پوچھ سکتے ہو"

میں نے کہا "کیا یہ بستر نہیں کہ تم بغیر پوچھتے ہی سب کچھ"

اس نے مروج انداز میں انگلیاں اپنے بالوں میں مٹے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ بیکائیر کے رہنے والے ہیں۔ ابلا عام مدھو متا تھا۔ میں نے لی ایس کی سر کرکھا ہے۔ اکرے پاجی تھی۔ وہ ایک سفید پوش اور کام سے کام

رکھنے والے شخص تھے جو نیز کرک بھرتی ہو کر وہ میں سال کے عرصے میں بیڈ کرک کے عہدے تک پہنچے۔ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ ہمیں پانچ اور بھائی صرف ایک۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ماما پاپا کی ان تھک پر ارتقا کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام دیپک ہے اور ابھی چند ماہ پہلے اس نے ساتویں کلاس کا امتحان دیا ہے۔ ہمارا بچپن تنگ دستی اور مسرت سے عمارت تھا۔ اکثر قانون تک فوت آجاتی تھی۔ جس گھر میں بھوک نے ڈیرا ڈال رکھا ہو وہاں عموں بیماری کی آمد و رفت بھی ہو جاتی ہے۔ میری والدہ بھی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ان کے سارے مسائل خربانہ تھے لیکن بیماری امیروں والی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھیں۔ ان کے دل کا ایک حصہ ٹھوہرہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر بتاتے تھے کہ اس کا علاج انگلینڈ میں ممکن نہیں۔ ہماری رسائی تو روٹی تک مشکل سے ہوتی تھی۔ آسٹریا اور امریکا تک کیسے ہوتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری ماں مر گئی۔ اس وقت میں صرف دس سال کی تھی اور میں ہی سب سے بڑی تھی۔ صرف دس سال کی عمر میں ایک پچھ میری گود میں آ گیا تھا اور یہ میرا نہیں میرا بھائی دیپک تھا۔

والدین ترکے میں اولاد کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میری والدہ بھی ایک چیز چھوڑ گئی اور وہ تھی دل کی بیماری۔ میرا بھائی دیپک جب تین سال کا ہوا تو پتا چلا کہ اسے بھی دل کا عارضہ لاحق ہے۔ پہلے ڈاکٹروں نے اس کے دل میں سوراخ بتایا پھر معلوم ہوا کہ یہ دل کے پتوں کی کوئی بیماری ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا دیپک سب سے چھوٹا تھا اور ہم کو پورا بھی بت تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں ہماری آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک تھا۔ والد تو اس کی معصومیت کے دیوانے تھے ہی، ہم سب ہمیں بھی اسے دیکھ کر جیتی تھیں۔ اس کی بیماری کا جان کر کچھ نہ پوچھنے کیا حال ہوا ہمارا لیکن یہ انتہا نہیں ابتدا تھی۔ کے بعد دھڑکے میری دو چھوٹی بہنوں کے ہارے میں بھی یہی انکشاف ہوا۔ وہ بھی دل کے عارضے میں مبتلا تھیں۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ گزرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تکلیف بڑھتی جائے گی اور پچیس سال تک کسی بھی وقت ان کی زندگیوں کے چراغ گل ہو سکتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج بیرون ملک میں ممکن تھا لیکن اس کے لئے انھوں ملکہ شاید کروڑوں روپے، درکار تھے۔ جب بیماری اور خانہ کے درمیان اتنے زیادہ فاصلے ہوں تو عموں نوٹ نوٹوں تعویذ کنڈوں اور عطیات کے سارے لئے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی یہی کچھ کیا۔ اور کسی نہ کسی طور اب تک گزر رہے

تیب۔ لڑپن کی عمر کو پہنچتے تک میرے اندر یہ خواہش بچتے ہو چکی تھی کہ میں اپنے گھرانے کے چرے سے غربت اور بے بسی کی سیاسی دھواؤں کی۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ہارٹ سپیشلسٹ لیکن ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم ٹٹکے انٹر کے امتحان میں صرف چھ نمبروں کی کمی سے میری زندگی کا رخ بدل گیا۔ میں ڈاکٹر نہ بن سکی اور ایک بڑی فنکارہ بننے کے شوق میں پہنچ گئی۔ تم دیکھ رہے ہو؟ میں اب بھی خوب صورت ہوں۔ اس وقت نوخیز اور کنواری بھی تھی۔ میرے لیے بہت ہی درندوں سے بھرا ہوا ایک جنگل تھا۔ میں اندھ می ہوتی کی طرح اس جنگل میں ٹھس آتی تھی۔ بہت سی قلم نگری کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ میں اپنے مضبوط ارادوں کے سارے اپنی اور اپنے آدرشوں کی حفاظت کر سکوں گی۔ کسی نے بچ کا سے کہ کناروں سے بھاؤ کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بہت سی مری معلومات اور توقعات سے بڑھ کر خوفناک شہر نکلا۔ وہاں میرے ساتھ کیا کچھ ہوا؟ میں بتانے لگوں تو شاید کئی راتیں اس بزار داستان کی نذر ہو جائیں۔ بس یوں سمجھو کہ ہر مرد نے مجھ سے میرے عورت ہونے کا خراج وصول کیا اور ہر ٹوٹنے والے نے مجھے حسب استطاعت لوٹا۔ میرے جسم پر ہسلا ڈاکا ڈالنے والا ایک چوکیدار تھا۔ وہ ایک معمولی سا شخص تھا۔ ایسے لوگ اب میرے کون کو رات ڈالتے ہیں۔ وہ گرمیوں کی جس زدہ راتیں تھیں۔ صرف ایک روز پہلے میں نے خود کو ایک فلمی صحافی کے پتے ہوس سے بچایا تھا۔ (اس صحافی نے میرا نام سرجو رکھا تھا) اس نام نہاد صحافی کے گھر سے مجھے اس کی ماں کا بستر ہی وسیعہ برقع مل گیا تھا۔ وہ برقع کپتے میں رات گئے تک شرمیں گھومتی رہی۔ آخر کوئی ٹھکانا بنا کر اور تھک پار کر ایک دکان کے سامنے بیٹھ گئی۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ دکان بند تھی۔ شکر ہوا تھا۔ میں شرے نیک لگا کر اٹھ گئی۔ میری طرح چند اور فن پائے بھی نٹے میں چڑا کر اٹھ کر ٹھکے ہوئے تھے۔ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے، مجھے بھی آتی۔ نیند میں وہ ٹوٹی والا برقع میرے چہرے سے سرک گیا۔ مجھے اس وقت چوکیدار نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ چوڑے چٹکے سینے والا ایک بندو کاٹی تھا۔ میں جاگی تو وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی بوس نظر آتی جو مجھے بہت قلم نگری میں ہر مرد کی آنکھ میں دکھائی دی تھی۔ اس نے ایک دم میری کلائی پکڑ لی اور غرا کر بولا۔ ”میں کیا کر رہی ہوں؟“

میں نے کہا ”بے آسرا ہوں۔ صبح کا انتظار کر رہی ہوں مجھے اسٹیشن چاہتا ہے اور وہاں سے بیکانیر والی گاڑی میں بیٹھ رہی ہے۔“

اس نے مجھے پیشور عورت ہونے کی گالی دی اور بولا ”میں تمہیں حوالہ پولیس کدوں گا“

میں نے کہا ”میں بری عورت ہوتی تو یہاں اس وقت فٹ پاتھ پر نہ پڑی ہوتی“

وہ مجھ سے کئی لمحوں میں نہیں تھا۔ اس نے سنی بجا کر اپنے ایک بھوپائی ساتھی کو بھی بلالیا۔ اس سے کہنے لگا ”تجربہ یہاں گا بک بھانس رہی ہے۔“

مجھے ڈرا دھکا کے وہ ایک قریبی کوارٹس لے آئے میرے پاس ایک طلائی انگوٹھی اور تھوڑی سی نقدی تھی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے میں نے یہ پونجی ان کے حوالے کر دی، مگر یہ کوشش بھی بے کار رہی۔ کالی چوکیدار نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک ”پدکار“ کی تحویل میں آتی ہوئی لاوارث عورت کا مقدر ہوتا ہے۔ اس شب چوکیدار ڈاکو بن گیا اور میری عزت کا شیشہ پکنا پڑا ہو گیا۔ اگلے روز میں بیکانیر کی گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے آؤ مشہور فلمی صحافی کے پاس پہنچ گئی جس نے مجھے فلمی دنیا میں متعارف کرائے کی پیشکش کی تھی اور بعد میں اپنی پیشکش عملہ میرے جسم سے وصول کرنا چاہا تھا۔ اب میرے پاس بچانے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے میرے اندر ایک خام قسم کی جرات پیدا ہو چکی تھی۔ وہ فلمی صحافی میری زندگی میں آئے والا دوسرا مرد تھا۔ میں کئی روز اس کے پاس رہی۔ اس کے رسالے کے سروق پر میری رنگین تصویریں چھپنا شروع ہو گئیں۔ مجھے ایک اچھوتے ہوئے آناک ستارے کا نام دیا گیا۔ میرے حسن کے قہیدے لکھے گئے تھے۔ میں اس وقت اداکاری کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی لیکن اس فلم صحافی نے میرے فن کا موازنہ مینا گاری اور نرگس سے کر ڈالا۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا۔ جب میرے شرعیہ اس کی دلچسپی کم ہو گئی تو اس کا قلم بھی اٹھنے لگا۔ اس بعد ایک معاون ہدایتکار کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک بار پھر وہ کھیل شروع ہو گیا جس میں فلمی دنیا کی چمک دکھائی دے لڑکیوں کو اندھا کیا جاتا ہے اور ان کو تاریک راستوں میں بھٹکا جاتا ہے۔ میں نے گمانا کہ یہ ایک بہت طویل کما ہے۔ کبھی موقع ملا تو اس حوالے سے ایک زیروست کتاب لکھوں گی۔ استاد جہاںی ان کے کھیلے دل سے یہ تسلیم کرتی ہوں کہ دولت حاصل کرنے کی خواہش میرا دین و دھرم بن گئی

بہ اس کی خاطر میں نے بہت باز پٹیلے ہیں اور اب بھی تپ رہی ہوں۔ پچھلے چھ برسوں پر نگاروں والی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ان برسوں کا ایک ایک لمبے میں نے اس مقصد کے پیچھے بھاگتے گزرا رہا ہے۔ مجھے جانتے والے ”میری حرص“ ت تو آگاہ ہیں لیکن ان محرومیوں سے بے خبر ہیں جن کے سبب یہ حرص میرے خون میں شامل ہوئی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بھوک، تنگ اور بیماری کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جو زندگی باقی رہ گئی ہے، وہ بھی انہی مہینوں میں گزرے۔ میں اس اعتراف کرتی ہوں کہ میں گناہ ثواب اور نیکی بدی کے تصورات سے آگے نکل چکی ہوں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ ہے دولت اور شاہانہ زندگی۔ ایک ایسی لائف جس میں کوئی بھی کام پیسے کی وجہ سے نہیں رکھتا اور بعض اوقات تو زندگی بھی پیسے کے زور پر خریدی جاتی ہے۔ میں نے ابھی پچھلے دنوں ”وی آنا“ کی ایک ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ میری بہنوں اور بھائی کی زندگی کے لئے خطرات بتدریج بڑھ رہے ہیں۔ ان پر کسی بھی وقت احکام بیماری کا شدید حملہ ہو سکتا ہے ان کے علاج کے لیے لاکھوں ڈالر درکار ہیں۔ شاید تم یقین نہ کیاؤ؟ صرف ایک مریض کا کچھ مہینے کا علاج کرایا جائے تو قریباً تین لاکھ امریکی ڈالر لگتے آتی ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے علاج مشکل اور مہنگا ہوتا جا رہا ہے اور زندگی کے امکانات معدوم ہو رہے ہیں۔“

ارجنند کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے وہ جذباتی انداز میں بولی ”ہاں میں بھوکے ہوں پیسے کی مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے بھی اور اپنے ماں جانیوں کے لیے بھی۔ عمر بھر غریبی کاٹنا اور اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا میرا مقدر نہیں ہے۔“

میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے بولا ”بہت قلم نگری میں قسمت آزمائے تم نے افزائیم سے شادی کیسے کر لی؟“

وہ آنسو پونچھ کر بولی ”صرف دولت کے لئے مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میں نے افزائیم سے کبھی محبت نہیں کی۔ لیکن میں اس دھوکا دی والی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ شادی ایک طرح سے ایک معاہدہ تھی، اور اس معاہدہ کی تمام شرائط سے افزائیم بھی آگاہ تھا۔“

”کیسا معاہدہ؟“

”وہ پچیس برس بعد صندوق تلاش کرنے کا معاہدہ جو کچھ روز پہلے تم نے پتے پل والی حویلی سے نکالے ہیں۔ میں جانتی تھی

کہ وہ صندوق جنگ کے گرد و نواح میں کسی دفن ہیں اور پرانی حویلیوں اور کنڈرات وغیرہ کی کھدائی کر کے ان کا کھنڈ لگایا جاسکتا ہے۔ میں بھارتی تھی اور میرے لئے جنگ اور وہاں کی پرانی حویلیاں بہت دور تھیں۔ اس درمیان کا فاصلہ کو پانے کے لئے میں نے افزائیم سے شادی کی۔ وہ نہ صرف ایک باغ و میندار تھا بلکہ جنگ ہی کا رہنے والا بھی تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھے اپنی ہی طرح طالع آزمنا اور ہم جو نظر آیا۔ میں نے سارے حقائق کھول کر اس کے سامنے رکھے اور پھر اس سے شادی کر لی۔ شادی سے پہلے میں نے اسلام قبول کر لیا اور مولوی صاحب نے میرا نام ارجنند بانو رکھا۔“

بتدریج گمشدہ کڑیاں مل رہی تھیں۔ ایک تصویر سی لگا ہوں کے سامنے کھل ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ارجنند بانو سے پوچھا ”تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ گمشدہ صندوق جنگ میں کس دفن ہیں؟“

ارجنند نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”تم نے سائیس عالی کو دیکھا ہے؟“

”بالکل دیکھا ہے“

”وہ تمہیں کیسا لگا؟“

”جیسے عام محبوب ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ایک تنگ وغیرہ نہیں کر رہا۔ جیسا ہے ویسا ہی نظر آ رہا ہے۔“

”لیکن وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اس کی ذہنی حالت کا سبب اس کی پیشانی کی خوفناک چوٹ ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ چوٹ نے اس کے سر کے ایک حصے کو کس طرح پکا کر رکھ دیا ہے۔ یہ چوٹ اسے کافی عرصے پہلے لگی تھی۔ غالباً تیس پچیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن شروع شروع میں اس کی ذہنی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ وہ بھی بھلا ہوش کی باتیں بھی کہنے لگتا تھا۔ جو لوگ اس زمانے میں سائیس عالی سے ملے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی گمشدہ دولت کی باتیں کرتا تھا۔ اسے جہاں کس زمین میں جھوٹا بڑا کھانا نظر آتا تھا اسے فوراً مٹی سے پُر کرنے لگتا تھا اور کہتا تھا ”نہ نہ“ شفیق محمد کو پتا چل جائے گا۔ یہ ساری دولت میرے بیٹے کی امانت ہے۔ اس پر مٹی ڈال دو۔ کس کوئی دیکھ نہ لے“ ”لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ وہ کیا چھپا رہا ہے۔ وہ کہتا تھا ”صندوق چھپا رہا ہوں۔ بہت بڑے بڑے صندوق ہیں۔ سونے چاندی سے بھرے ہوتے“

”جہاں کوئی شخص کھدائی کرتا نظر آتا تھا سائیس عالی اس پر پل پڑتا تھا۔ ایسے ہی اس نے ایک دفعہ ٹھکانے ٹیلیفون کے

ایک ملازم کو اتنی سسرے سے مار مار کر جان سے مار دیا تھا۔ بعد میں وہ تین سال بستی کے پاگل خانے میں رہا۔ پاگل خانے میں بھی وہ مجب و غریب فرشتی کرتا رہا۔ اس نے سر اور داڑھی کے بال لیے چموز ڈھپے تھے پاگل خانے کے قاعدے کے مطابق جب بھی اس کے بال موڑنے کی کوشش کی گئی اس نے زبردست ہنگامہ مچایا اور یہ کوشش بھی ناکام بنادی۔ بعد ازاں مینٹل اسپتال کا ایک اعلیٰ افسر اس کا مرید بن گیا اور اس نے سائنس عالی کو مینٹل اسپتال سے رہا کرایا۔ یہ کوئی میں برس پہلے کی بات ہے مینٹل اسپتال سے رہا ہونے کے بعد سائنس عالی نجائے کس طرح پاکستان پہنچ گیا پاکستان اگر اس نے جنگ کا رخ کیا وہاں وہ چھ سات ماہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کی یادداشت بالکل ختم ہو چکی تھی جنگ کے کئی کچوں کو وہ پہچانتا تھا۔ جن لوگوں نے سائنس کو جنگ کے کئی کچوں میں ٹھوسے دیکھا دیتا ہے کہ وہ بار بار چند گھنٹوں میں سے ہو کر شرکی مشرقی جانب ایک سر راہ پر پہنچتا تھا اور وہاں جا کر رک جاتا تھا جیسے آگے جانے کا راستہ نہ پابار ہو۔ چھ سات ماہ بعد وہی اعلیٰ افسر جس نے سائنس عالی کو پاگل خانے سے چھڑایا تھا پاکستان پہنچا اور اسے اپنے ساتھ واپس بھی لے گیا۔ بعد میں یہ اعلیٰ افسر ریٹائر ہو کر قلم لائن میں آگیا۔ اس شخص کے توسط سے قلم لائن میں سائنس عالی کا چرچا ہوا اور بڑے بڑے لوگ اس کے چرن چھوٹے بھی اسٹیشن پہنچنے لگے۔

انہی دنوں میں اداکار بادشاہ راجہ آنند کی ایک بڑی پروڈکشن میں اسپرنگ رول حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دن ان کے بھٹے سے کناک میں سائنس عالی کے نیاز حاصل کر دیے۔ میں نے پہلے بھی سائنس عالی کا مشہور سنا تھا۔ ایک شب برق اونڈھ کر میں ٹیکسی میں بیٹھی اور بمبئی ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ بمبئی اسٹیشن کے ایک کنڈ سال پل کے نیچے ایک کھلی نما تاریک عمارت میں چھوٹی سی لائٹیں جل رہی تھیں۔ یہاں کاٹھ کیاڑ اور بوسیدہ پتھروں کے درمیان مجھے دو آنکھیں چمکن دکھائی دیں۔ یہ اس شخص کی آنکھیں تھیں جس کے پاؤں چھوٹے اور جھڑکیاں کھانے کے لئے بڑے بڑے لوگ ہتھوں یہاں کے چکر کاٹتے تھے۔ میں ڈرتی ڈرتی سائنس عالی کے قریب پہنچی۔ اس نے مجھے دیکھ کر حسبِ ادب ترہی برہی کا احوال نہیں کیا۔ حالات سازگار دیکھ کر میں مزید آگے بڑھی اور اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ یہ سائنس عالی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کئی برس تک کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ میں نے بمبئی میں موجود ہونے کے

باد جو د سائنس عالی کا دیدار نہ کیا ہو۔ سائنس عالی میرے ساتھ خاص مہربانی سے پیش آتا تھا۔ کتنا تھا تو ابھی عورت بن جا میں تجھے اپنی بویا لوں گا۔ وہ اکثر میری چوٹی اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیتا اور ہولے ہولے جھٹکے دیتا رہتا۔ اس کے ساتھ وہ مجب و غریب باتیں بھی کرتا تھا۔ ان باتوں میں کبھی سونے کے پھاڑ کا ذکر آتا بھی شیخ محمد کاکسین ان لوگوں کا جو سفید کپڑے پہن کر ہوا میں اڑتے پھرتے تھے اور سائنس کے پاس دور دراز کی خبریں لاتے تھے۔

سائنس کے ساتھ طویل رفائیت کے بعد مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی موجود ہے جو گمشدہ دولت اور سائنس عالی کے حوالے سے کسی نئی جاتی ہیں۔ میں نے ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے بار بار کوشش کی کہ سائنس کی زبان سے کوئی کام کی بات کھلو اسکو یا کوئی مفید اشارہ مجھے مل جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اب تو شاید سائنس کے حافظے سے جنگ کا لفظ بھی اتر چکا ہے۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ سائنس عالی نے بمبئی میں اپنے اوتھیں دن بمبئی بازار اور محمد علی جناح روڈ کے علاقے میں گزارے ہیں۔ میں کھوج لگاتے ہوئے بمبئی بازار پہنچی اور وہاں کے بڑے بوزھوں سے ملی۔ ایسے ہی ایک مرمر سیدہ خانچہ فروش سے مجھے پتا چلا کہ شروع شروع میں سائنس عالی کی ذہنی حالت اتنی خراب تھیں تھیں اور وہ بھی کبھی سائون بھی باتیں کرتے لگتا تھا۔ مگر اس کی یادداشت قریباً قریباً ختم ہو چکی تھی۔ نہ اسے اپنا نام یاد تھا نہ یہ پتا تھا کہ کہاں سے آیا ہے۔ ان دنوں وہ چند قہرے بار بار کناکرتا تھا۔ پرانی حویلی کے فرش میں صندوق ہیں۔ سونے چاندی سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ سارے کے سارے میرے بیچے کے ہیں۔ سارے کے سارے میرے بیچے کے ہیں۔

لوگ اس سے پوچھتے کون سی پرانی حویلی؟ وہ کہتا "ہا نہیں" لوگ پوچھتے وہ حویلی کس شہر میں ہے۔ وہ کہتا "پتا نہیں" کبھی وہ ہوا میں اشارے کرتا اور ناقابل فہم الفاظ لکھتا۔ زیادہ تر لوگ اس کی باتوں کو دیوانے کا خواب سمجھتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ہر دقت اس کی خدمت حمزادی میں لگے رہتے اور امید رکھتے کہ وہ انہیں کسی بہت اہم راز سے آگاہ کرے گا۔

یہ صورت حال کوئی ڈیڑھ سال برقرار رہی پھر سائنس عالی بیمار پڑا اور اس کی ذہنی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد اس پر ٹھکانے لینٹون سے ایک کبیل میں کو قتل کرنے کا کسین بن گیا اور وہاں پہنچا۔ خانے پہنچ گیا۔

میں نے ارجمند بانو سے پوچھا "تمہارا سائنس عالی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بولی "میں سمجھتی ہوں کہ قدرت نے اس سے ہوش و حواس پہن کر روحانیت دے دی ہے۔ اس کی نگاہ بہت دور تک دیکھ سکتی ہے اور کبھی بھی اس کے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ہے جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوتی ہے۔ قلم لائن والے اسے گرد گرد چار دیتے ہیں اور قلم والے ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ اس کے نیاز حاصل کرنے کے لیے دور دراز سے بمبئی کا رخ کرتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے صنعت کار و زمیندار اور سیاست دان شامل ہیں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب نہیں سمجھی۔ میں پوچھتا چاہتا ہوں کہ ان صندوقوں والے معاملے سے سائنس عالی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"کوئی بہت گہرا تعلق" ارجمند نے بلاتا خیر جواب دیا۔

"میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ ان گت راتوں کی نیند حرام کی ہے۔ اب تو خیر سب کچھ سامنے آچکا ہے۔ اس وقت بھی جب کسی کے سامان دکان میں بھی نہ تھا کہ سائنس کا کما چ ثابت ہوگا۔ میرا ایمان تھا کہ سائنس سچ کہہ رہا ہے۔ کسین نہ کسین کسی نہ کسی جگہ وہ صندوق موجود ہیں جن کا ذکر بار بار سائنس کی زبان پر آیا ہے۔ تمہاری طرح میں نے بھی بہت سوچا تھا کہ سائنس کا ان صندوقوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس سوال کے ٹیکڑوں مکتہ جو بات تھے لیکن نجائے کیوں ایک بہت میرے ذہن میں بالکل واضح تھی۔ اور اتنے برس گزرنے کے بعد آج بھی واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ سائنس عالی کے چہرے پر نظر آنے والی چوٹ کا ان ۲۵ صندوقوں سے براہِ راست تعلق ہے۔" ایک لمبے کے وقفے سے وہ بولی "کیا تمہارے ذہن میں اس سے ملتی جلتی بات نہیں آتی؟"

ارجمند نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سائنس عالی کے چہرے پر زخم کا گہرا نشان دیکھ کر آپ یہ بات دل میں بیٹھ جاتی تھی کہ سائنس کی ذہنی کیفیت کا ذمہ دار کی زخم ہے اور اس زخم کے دانڈے کسین ان صندوقوں سے جاتے ہیں جو بچے بلی والی حویلی سے برآمد ہوتے ہیں۔ عین۔ ممکن تھا کہ پچیس تیس سال پہلے ان صندوقوں کے سلسلے میں ہونے والی کوئی ہنگامہ آرائی ہی اس چوٹ کا سبب بنی ہو۔

میں نے ارجمند سے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے سائنس عالی تم سے خطاب ہو کر میرے بارے میں کہہ رہا تھا یہ تمہارا معتقد ہے تمہارا انصیب ہے اس سے چوٹ جاؤ اس کے ساتھ رہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں کچھ میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

وہ بولی "سائنس کی اکثر باتیں سمجھ میں نہیں آتیں لیکن

ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اب دیکھ لو۔ وہ تمہیں جانتا نہیں۔ تمہارے نام سے واقف نہیں۔ نہ ہی اسے یہ معلوم ہے کہ تم وہ صندوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہو جن کے لئے نجائے کون کون لوگ کہاں کہاں کی خاک چھان چکے ہیں۔ صرف تمہارا چہرہ دیکھ کر اس نے نصیحت کر دی ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں اور تمہاری ہدایات پر عمل کروں۔ میرا من گواہی دیتا ہے کہ سائنس لوگوں کے اندر بہت دور تک دیکھ لیتا ہے۔ وہ چہوں سے دل کی کیفیت بھانپ لیتا ہے اور جب کبھی موج میں ہوتا تو اپنی اس آگاہی کا احوال بھی کرتا ہے۔ وہ میرے من میں بھی بھانپ چکا ہے۔ اسے میری خواہشات کا علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ پیہ میری زندگی کی پہلی اور آخری ضرورت بن چکا ہے۔"

ایک دم ارجمند پھر ٹھیکین نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کئی تھی بولی "استاد جانی! میں تم سے کچھ بھی چھپائیں رہی ہوں۔ وہ سب کچھ بھی کہہ رہی ہوں جو انسان صرف اپنے آپ سے کہتا ہے۔ غرت کی کڑی دھوپ دیکھنے کے بعد اب میں خوشامی کی کھٹی چھاؤں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس خوشامی کی خاطر میں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ سب سے پہلی قربانی تو کھٹی تھی کہ میں نے درختوں حسین اور دوستد نوجوانوں کو ٹھکرا کر افزائیم جیسے لالچی مردے شادی کی۔ اس شادی کی خاطر اپنا کپڑا پہنا دیا۔ اپنا دھرم تبدیل کیا۔ اپنے دلش کو خیرباد کہا اور پھر دو برس جنگ کے دیر انوں کی خاک چھائی۔ جنگ میں بڑی میٹیس جھیلی ہیں ہم نے میں تفصیل بتانے بیٹھ گئی تو شاید پوری رات گزر جائے۔ جنگ کے ارد گرد ہم نے مجموعی طور پر ٹھنڈوں اور حویلیوں کی شکل میں قریباً چوبیس ایکڑ زمین خریدی اور اس میں کھدائی کر دی۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ کتنا کھن اور صبر آزماء کام تھا۔ اور ہمیں صرف "کھام" ہی نہیں کرنا تھا۔ خود کو کچھ تادیہ خطرات سے بھی بچانا تھا۔ تم خود سوچو ہمیں شکر ادا اور عیسیٰ جان جیسے خطرناک لوگوں کو گراں ترین معاوضوں پر بھرتی کرنا پڑا اور انہیں کشین وغیرہ کا لالچ دینا پڑا۔ آخر کوئی توجہ ہوئی کہ ہم نے یہ کڑی گولیاں حلق سے اٹا دیں۔ مجھے دشواری ہے کہ اگر ہم ان لوگوں کا تعاون حاصل نہ کرتے تو ہماری لائیں کب کی مٹی کا رزق بن گئی ہوتیں۔"

میں نے کہا "تم کہنا کیا چاہ رہی ہو کہ تمہارے علاوہ بھی کچھ لوگ اس دینے کی تلاش میں تھے؟"

"یقیناً یہی بات ہے" اور وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شکر شکاری تھا جو ان سے شیشے میں

کامیاب رہا۔ ان لوگوں کے ساتھ ہونے والی عظیم کشف میں ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ میں اور افرامیم اپنی زندگی کی طرف سے قطعی ناامید ہو گئے تھے لیکن پھر تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا اور شکر شکر اور عینی جان نے بروقت پہنچ کر حالات کو سنبھال لیا۔ شکر واقعی ایک کارآمد شخص ہے لیکن اس کی سب سے بڑی غای یہ ہے کہ وہ قابلِ بھروسہ نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مثال ایک خطرناک ہتھیار کی سی ہے۔ یہ ہتھیار حفاظت کا خاص ہوتا ہے لیکن جب دشمن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے تو موت بن جاتا ہے۔

”جیسے اب یہ ہتھیار افرامیم کے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے قسم دیا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو“ ارجند نے تائید کی۔

میں نے پوچھا ”افرامیم سے تمہاری دوری کی وجہ کیا تھی؟“

وہ بولی ”افرامیم کی خود غرضی۔ میں سچ کہتی ہوں“ افرامیم سے شادی کے بعد میرے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔ میں نے اسے دل سے اپنا شوہر مان لیا تھا اور سوچا تھا کہ جیون کا سفر ہم اکٹھے طے کریں گے لیکن وہ مجھے اپنے مقصد کے لئے بیڑی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ میں بتدریج اس کے قریب آ رہی تھی اور وہ بتدریج مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہم نے حویلیوں کو ڈیکورٹ کر کے بیچنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ افرامیم اس کا دوبارہ مالکوں بنا رہا تھا۔ میں اس کی یاد نہ تھی لیکن اس نے مجھے کبھی حساب کتاب سے آگاہ نہیں کیا۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے“

حلاش کے آخری مراحل میں اس نے کسی طرح مجھ سے دھوکا کیا۔ اس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ پنے دل والی حویلی میں کام ختم کر دیا گیا ہے لیکن دونوں خاندان اس نے کھدائی جاری رکھی اور مجھے اس وقت پتا چلا جب سب کچھ افرامیم کے ہاتھ سے بھی نکل چکا تھا“

میں نے کہا ”لیکن وہ تو کہتا ہے کہ تمہاری اور اس کی دوری کا سبب یہ جلال نامی شخص ہے جو بلی کے خانے میں کھدائی کے دوران اس نے شراب پی لی اور اپنی پائیوٹ لائف کے بارے میں دیر تک بولا رہا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ جلال تمہارا دیرینہ شناسا ہے اور صرف تمہاری قیمت کی خاطر وہ ہمیں سے جنگ پہنچا تھا۔“

ارجند کے چہرے پر رنگ سالر گیا۔ وہ بولی ”شناسائی تک تو تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس سے آگے افرامیم نے جو کچھ دیا تھا یا تم سوچ رہے ہو وہ بالکل غلط ہے جلال میرا

پسندیدہ خدنگار ہے لیکن میں نے اسے کبھی ”محبوب“ کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔“

ارجند اور میرے درمیان اس موضوع پر کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر انسان اندر سے غمزہ ہے۔ بقول بابائیک دیکھا ب سنار۔ ہر سینے میں محرومیوں کے انبار لگے ہیں اور ہر دل خوشحال انسانوں کا دفن ہے۔ ارجند کا مقصد حیات دولت تھا اور وہ اس کے حصول کے لئے بہت اذیتیں برداشت کر چکی تھی۔ اپنا کیریئر اپنی جوانی اور جمع پونجی وہ سب کچھ اس مہم جوئی پر خرچ کر چکی تھی۔ اب طرہ تماشا یہ تھا کہ اس کی تمام کاوشوں کا صلہ کچھ ایسے لوگوں کو مل گیا تھا جو اس کیل میں قطعی نو وارد تھے۔ (یعنی ہم) عارضی طور پر سہی لیکن اس وقت وہ بے مبادیہ ہماری ملکیت تھا جس کی خاطر ارجند نے اور پھر اس کے ساتھ افرامیم نے بھی اُن مکت راتوں کی نیند اور دنوں کا سکون برباد کیا تھا۔ سامنے خواب دیکھے تھے اور حسین و جمیل منصوبے بنائے تھے۔

میں نے اپنی شکست رست و اوج کی طرف دیکھا، گیارہ بج چکے تھے۔ ”اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟“ میں نے ارجند سے پوچھا۔

وہ فوراً بولی ”اب میرا کوئی ارادہ نہیں۔ سائیں عالی کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے اور میں اس حکم سے سرٹائی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میں وہی کروں گی جو تم کو کہو گے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”ارجند بانو، جو تمہارا دل چاہے کہ لیکن ایک بات ذہن نشین رکھنا، میں یہی نہیں ہوں جو مجبور کا ہاتھ تمام کریمات سر کرتا ہے۔ میں بہت بدنام شخص ہوں“ اور لوگ یونی بدنام نہیں ہوا کرتے؟

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، سامنے تین گل تھا۔ وہ بولا ”وہ بونا بازی گاڑ مر گیا ہے۔“

”خس کم جہاں پاک“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”خوسے وہ بابو لیاقت صاحب سخت پریشانی میں ہے۔ وہ آپ کو بلا رہا ہے۔“

میں ارجند بانو سے معذرت کر کے زس گل کے ساتھ باہر گیا۔ بابو لیاقت باہر ٹھل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں نے کہا ”مجھے افسوس ہے لیاقت صاحب میری وجہ سے آپ کی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ بابو لیاقت نے پوچھا۔

”میں کہ یہ فیکٹری آپ کی روزی کا اڈا ہے میری وجہ سے اب یہاں بھی خون خرابہ شروع ہو گیا ہے۔“

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جہانی صاحب“ بابو مسکرا کر بولا۔ ”مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں دوستوں کا دوست ہوں اور ساتھ بھانے کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ مول لے لیتا ہوں۔ اگر آپ کو میں شکر نظر آ رہا ہوں تو اس کا وہ سب نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا سبب ہے؟“

بابو لیاقت نے گراکش لیتے ہوئے کہا ”آپ نے مجھ پر جو زے داری ڈالی ہے میں اس سے عمدہ برا ہونے کا سوچ رہا ہوں۔ جو ٹرک آپ یہاں لے کر آئے ہیں“ اس کے پیچھے بہت سے خطرناک لوگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹرک یا اس کا سامان جلد از جلد واپس پاکستان پہنچ جائے۔“

”پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟“

”میں سوچ سے زیادہ عمل کا قائل ہوں۔ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جا کر کچھ دکھانا چاہتا ہوں لیکن ہمیں توہوئی پر انتظار کرنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ارجند کے آدمی غویہ ٹی کو لے آئیں اور میں اسے دیکھ لوں تو پھر یہاں سے ہوں۔“

ابھی بابو لیاقت نے بات ختم کی تھی کہ فیکٹری کے مین برٹ پر کسی گاڑی کا ہارن ستائی دیا اور چند لمحوں بعد میں نے ال کو ایک سفید ٹیوٹا گاڑ پر اندر آتے دیکھا۔ کار نے چند گز راستہ طے کیا اور پارکنگ میں ٹکر رک گئی۔ کار کی پچھلی سٹ پر ایک لڑکی موجود تھی۔ اس کی عمر قریباً چودہ سال ماہوگی۔ وہ بہت ڈری سہی بیٹھی تھی۔ میں نے وہ بے گناہ بچی اندھنی سے تین روز پہلے ارجند نے بابو لیاقت پر دباؤ لے کے لے آغا کیا تھا۔ کار کے نیچے بیٹی باہر نکل آئی۔ وہ ایک اسکول یونیفارم میں تھی۔ بابو لیاقت بھاگ کر گیا اس نے بچی کو گلے سے لگالیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر نے گئی۔ فرمان علی سمیت بابو کے دیگر ملازمین بھی ان کے اکٹھے ہو گئے۔ بابو نے فرمان سے کہا کہ وہ فوراً گھر میں لے آئے۔ اس کے بعد وہ بچی کو لے کر ساتھ والے کمرے لگایا۔

اس کی واپس قریباً دس منٹ بعد ہوئی۔ اب وہ بہت مایوس اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بچی ڈالی کے بعد ایک بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہے۔

”جہانی صاحب! ہمیں شہر سے باہر جانا ہے۔“

”ہے کہ تین چار گھنٹے تک گنگ جاسیں۔ آپ ایک بار

اپنے قیدیوں کی بندشیں وغیرہ اچھی طرح دیکھ لیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے بعد پھر کوئی بنگامہ کھڑا ہو جائے۔“

میں نے کہا ”آپ بے فکر رہیں۔ اب ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ ہاں بونے بازی گاڑ کی لاش کا مسئلہ ہے میں چاہتا ہوں جانے سے پہلے اسے کیس ٹھکانے لگا جاؤں۔“

وہ بولا ”بے فکر رہیں۔ سمجھیں ٹھکانے لگ گئی ہے لاش“ اس نے توہوئی دور واقع بڑی بڑی بھینوں کی طرف اشارہ کیا اور جیسے لمبے لمبے کہنے لگا ”ان میں سے ایک بھٹی ہم توہوئی دیر میں دیکھا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بھٹی مرنے والے کے لئے اچھی قربانت ہوگی۔“

میں نے چونک کر بابو لیاقت کی طرف دیکھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک ہی دار شخص نظر آیا، جو ظاہر ہر مرد مزاج نظر آتا ہے لیکن وقت بڑنے پر خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور ہر شخص کام کر گزرتا ہے میں نے کہا ”نہیں لیاقت صاحب! میں آپ کو مزید احتیاج میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بلکہ آپ ان معاملات میں اور ملوث نہ ہوں۔“

اس نے سنی اُن سنی کرتے ہوئے میرا بازو تھما اور مجھے لے کر اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔ کہنے لگا۔ ”شہا جہاں صاحب! ہمیں توہوئی سی مہم جوئی کرنا پڑے گی۔ ہمیں بارڈر کی طرف جانا ہے ظاہر ہے اصل مسئلے میں ہم نہیں جاسکتے۔ وہ سامنے ریسٹریٹ زالی دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ مٹی ڈھونے والی ٹرائل ہے۔ فیکٹری میں استعمال کے لئے خاص قسم کی مٹی مجھے دور دور سے منگوانا پڑتی ہے۔ یہ ٹرائل پرسوں قانٹلا کی طرف سے مٹی لے کر آئی تھی۔ دوبارہ کٹو لٹنے کی وجہ سے ہمیں کھڑی رہ گئی۔ ایک ڈرائیور اور تین مزدور بھی ٹرائل کے ساتھ ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ ہم اپنے ”میشین“ سے ٹھوسا سا بیچے اتر کر اس ٹرائل میں سفر کریں تو بڑی آسانی رہے گی۔ میرا مطلب ہے کہ مزدوروں کے ہمیں

میں نے کہا ”میرا امینس تو خیر پہلے بھی کچھ ایسا بلند نہیں۔ ہاں آپ کی بات اور ہے۔“

وہ ہنسنے لگا ”آپ کا رنگ گورا ہے دھوپ میں مٹی کھودنے اور ڈھونے والے ڈرا سناٹو لے ہو جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے“ آپ ڈرائیور ہی بن جائیں تو بہتر ہے۔“

”لیکن اگر راستے میں پوچھ کچھ ہوئی تو ڈرائیور سے سی ہوگی“ میں نے نکتہ اٹھایا۔

بابو لیاقت نے میرے اس نکتہ کو حلیم کر لیا اور اقرار کر لیا۔

میں نے کہا ”آپ بے فکر رہیں۔ اب ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ ہاں بونے بازی گاڑ کی لاش کا مسئلہ ہے میں چاہتا ہوں جانے سے پہلے اسے کیس ٹھکانے لگا جاؤں۔“

وہ بولا ”بے فکر رہیں۔ سمجھیں ٹھکانے لگ گئی ہے لاش“ اس نے توہوئی دور واقع بڑی بڑی بھینوں کی طرف اشارہ کیا اور جیسے لمبے لمبے کہنے لگا ”ان میں سے ایک بھٹی ہم توہوئی دیر میں دیکھا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بھٹی مرنے والے کے لئے اچھی قربانت ہوگی۔“

میں نے چونک کر بابو لیاقت کی طرف دیکھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک ہی دار شخص نظر آیا، جو ظاہر ہر مرد مزاج نظر آتا ہے لیکن وقت بڑنے پر خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور ہر شخص کام کر گزرتا ہے میں نے کہا ”نہیں لیاقت صاحب! میں آپ کو مزید احتیاج میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بلکہ آپ ان معاملات میں اور ملوث نہ ہوں۔“

اس نے سنی اُن سنی کرتے ہوئے میرا بازو تھما اور مجھے لے کر اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔ کہنے لگا۔ ”شہا جہاں صاحب! ہمیں توہوئی سی مہم جوئی کرنا پڑے گی۔ ہمیں بارڈر کی طرف جانا ہے ظاہر ہے اصل مسئلے میں ہم نہیں جاسکتے۔ وہ سامنے ریسٹریٹ زالی دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ مٹی ڈھونے والی ٹرائل ہے۔ فیکٹری میں استعمال کے لئے خاص قسم کی مٹی مجھے دور دور سے منگوانا پڑتی ہے۔ یہ ٹرائل پرسوں قانٹلا کی طرف سے مٹی لے کر آئی تھی۔ دوبارہ کٹو لٹنے کی وجہ سے ہمیں کھڑی رہ گئی۔ ایک ڈرائیور اور تین مزدور بھی ٹرائل کے ساتھ ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ ہم اپنے ”میشین“ سے ٹھوسا سا بیچے اتر کر اس ٹرائل میں سفر کریں تو بڑی آسانی رہے گی۔ میرا مطلب ہے کہ مزدوروں کے ہمیں



ہم اس وقت آفس کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ بابولیات نے آگے بڑھ کر ریسپور انٹایا۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز سن کر اس کا رنگ بدل گیا۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا "آپ ہی کا فون ہے۔ دیہن صاحب ہیں۔ گنڈارا پور گاؤں سے" اس کے ساتھ ہی اس نے ریسپور مجھے تھما دیا۔ "ہیلو" دوسری جانب سے صفدر کی آواز صاف پہچانی جا رہی تھی۔

"ہاں بھئی" میں منال بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔" صفدر کے لیے میں اس بار کافی سنجیدگی تھی "بس آپ کو ایک اطلاع دینی تھی" "ہاں۔" کو" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ پر وگرام کے مطابق چھ سات بجے پہنچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ واہ مگر نے چاہا تو پہنچ رہے ہیں" وہ بولا "بس یہ یاد دہانی کرا تا تھی۔ دراصل ہم زیادہ دیر سامان یہاں نہیں رکھ سکتے۔ چہ بچے تک ہمیں ٹھکانا خالی کرنا ہو گا۔ بلکہ اچھا ہے آپ تھوڑی دیر پہلے ہی آجائیں" "ٹھیک ہے" میں کو تشکر کر کے دلیہ خیریت تو ہے

"نا"

"پاکل خیریت ہے استاد پریشانی کی کوئی بات نہیں" "کوئی اور بات؟"

"بس میں انتظار کروں گا" رب راکھا" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بابولیات میرے پاس ہی کھڑا ہی تنگوس رہا تھا۔ لگتا "اب تو ہمارا جلدی ڈھانڈا اور بھی ضروری ہو گیا ہے"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ قیدی بندھے پڑے تھے۔ ان پر اپنی ہی نگاہ ڈالتے ہوئے ہم آفس سے گزرے اور ساتھ والے کمرے میں آگے۔ یہاں صوفے پر مکمل پھیل اور پیسے میں بیٹے ہوئے چند بوسیدہ کپڑے پڑے تھے۔ یہی وہ لباس تھا جسے ہمیں کریم مزدوروں کے ہمیں میں زالی پر سوار ہو سکتے تھے۔ دو ذلی دار دھوئیاں دو عدد بنائیں "دو قمیص" ایک کپل نما چادر اور ایک دھنسا۔

فصیحہ المعروف بابو جی، خست حال مزدور کے ہمیں میرے ساتھ مٹی سے لٹری ہوئی زالی میں بیٹھے والا تھا وہ ایک ایسے علاقے کی طرف جا رہا تھا جہاں ہمارے لئے قدم پر خطرات موجود تھے۔ سینکڑوں ہزاروں ہجے میں بات میرے ذہن میں آئی کہ وہ اس کام کی اہمیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ جس ٹرک کے لئے استاد جہاں شکر شکرا! ارجمند باؤ اور افراہیم جیسے لوگ سرحد کی بازو لگائے ہوئے ہیں وہ کوئی بہت اہم ٹرک ہے۔ میں نے پہلی بات تفتیشی نگاہوں سے بابولیات کی طرف دیکھا۔ اس کی جگہ یہ نگاہیں فوراً میرا انداز مہاجرت گئیں۔ پوچھنے لگا۔ "بات ہے شاہ جہاں صاحب! برا غور کر رہے ہیں" میں نے اپنی دوزم زدہ گردن کو سسلاتے ہوئے کہا "نہیں کر رہا" حیران ہو رہا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا آپ میرے لئے اتنا کچھ کر کر رہے ہیں؟"

وہ بولا "اور میرے اتنا کچھ کر کرنے نے آپ کو ٹرک میں جتلا کر دیا ہے کہ میں آپ کو اور آپ کے ٹرک کو بر زیادہ اہمیت دے رہا ہوں"

"بلاشبہ" میں نے بھی صاف گوی سے جواب دیا۔ وہ بڑی آہستگی سے مسکرایا "میرا خیال ہے" اب ان دونوں کے درمیان سے یہ روہ بھی اٹھ جانا چاہئے" میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بوسیدہ کپل۔ شانوں پر سنبھالتے ہوئے بولا "شاہجہاں صاحب! معلوما حاصل کرنے کے میرے اپنے ذرائع ہیں اور یہ سلسلہ سر پار تک پھیلا ہوا ہے" یہ نظام کچھ ایسا ہے کہ میں نے چاہوں تو معلومات مجھے تک پہنچتی رہتی ہیں۔ اب یہی ذرا والا معاملہ لے لیجئے یقین جانتے تھے اس معاملے کی فتنہ میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس "عدم دلچسپی" کی بڑی وجہ یہ تھی تھا کہ آپ جلد یا بدیر خود ہی مجھے سب کچھ بتا دیں گے۔ کچھ معلومات اندر خود مجھ تک پہنچ گئیں اور میرا خیال ہے کہ معلومات ٹھیک ہی ہیں"

"کچھ بتانا پسند کریں گے آپ؟"

گردلوں کے ہندسوں سے تجاوز کر کے ایک ارب کے ہندسے کو چھوٹی ہو"

بابولیات کے آخری الفاظ ایک سنسناہٹ کی طرح کمرے میں گونج رہے تھے۔ میں ایک ٹنگ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جو کچھ بتا رہا تھا اپنی مرضی سے بتا رہا تھا اور اس کا یہ رضا کارانہ فیصلہ اس امر کا غماز تھا کہ وہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مجھ سے غفلت ہے۔

بابولیات کی سوالیہ نظرس مجھ پر جمی تھیں "کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" اس نے مختصر سوال کیا۔

"ہاں" میں نے مختصر ترین جواب دیا۔ چند لمبے ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ خاموشی زبان ہنگامی تھی اور یہ زبان اعتماد اور ہم آہنگی کی ایسی فضا پران پڑھا رہی تھی جو ہمیں بھی برسوں کی رفاقت کے بعد بھی میسر نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے اٹارے ہوئے لباس میں سے ہٹل نکال کر بوسیدہ چادر کے نیچے چھپا لیا۔ بابولیات نے بھی ایک دراز سے اپنا ریو الوور نکال لیا۔ چندی لمبے بعد ہم کمرے سے نکل کر مٹی والی زالی کی طرف جا رہے تھے۔

وہ ایک روشن دن تھا۔ موسم اچانک ہی بدل گیا تھا۔ دھوپ میں خاصی تمازت محسوس ہو رہی تھی۔ کرنوں میں وقفہ شروع ہو چکا تھا لہذا ہمیں فیکٹری سے نکلے اور شہر سے باہر جانے والی ٹرک تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ ٹریکٹر زالی کا یہ سفر زندگی کا انوکھا تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ مٹی اڑھونے والے مزدوروں کی طرح ہم دونوں نے اپنے چہرے اور ہاتھ پاؤں خوب لٹیر لے لیے تھے۔ لباس پہلے ہی لٹیرا ہوا تھا لہذا بالکل بھوت بن گئے تھے۔ ہم بابولیات کی فرسات کی دوا دینے کوئی چاہا۔ اس نے سفر کے لئے مٹی اڑھونے والی زالی استعمال کر کے خود کو اور مجھے بہت سے خطرات سے بچایا۔ ہم تھکے ہارے مزدوروں کی طرح زالی کے وسط میں لیٹے تھے۔ قریب ہی دو کنسیاں اور نو کنسیاں پڑی تھیں۔ ٹریکٹر اسے والے سکھ ڈرائیور نے ایک کھانا پیس دیکھا تو رپہ ٹی آواز میں قلمی گانے لگا رکھے تھے۔ انڈین فلم ہیرا پھڑا گاتا تھا۔ یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں "مردانہ آواز" لیکن پیس سے اتنی باریک نکل رہی تھی کہ لگتا تھا جگر گارہی ہے۔ ہمارے دونوں اطراف ہرے بھرے تھے کہیں کہیں کسان اپنے روز حو کے کاموں میں وقف نظر آتے تھے یا پھر خوب دلی کا شفاف پانی کیے اوس میں دوڑا دکھائی دیتا تھا۔ یہ سارے مناظر دیکھ کر شیطان ابن شیطان سے اپنی آخری زالی یاد آئی۔ جہاں

اپنی گردن چھڑانے کے بعد میں نے شکر شکرا کو کنوئیں میں پھینکا تھا وہ بھی ایسی ہی جگہ تھی۔ انسان آنے والے لحاظ سے کتنا دور ہوتا ہے اگر مجھے اس وقت پتا چل جاتا کہ شکر اس کنوئیں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے میرے پی خواہوں ڈنگا تھ اور مت شک نہ دیکھو کہ خون میں منڈائے گا یہ یقیناً میں شدید خطرے میں گھرا ہونے کے باوجود اسے زندہ چھوڑ کر نہ جاتا۔

ٹریکٹر زالی اپنی مخصوص رفتار سے ٹرک پر دوڑتی رہی۔ فدا زہد فرید کوٹ پہنچے ہو گیا اور ہر قسم کے ہنگاموں سے بے نیاز دلی علاقہ ایک سرسبز چادری طرح ہماری نگاہوں کے سامنے کھلا چلا گیا۔ ہم فاشلا کی جانب جا رہے تھے یہ دلی ٹرک تھی جس پر چند روز پہلے ہم ٹرک پر سوار گزرے تھے۔ جس مقام پر ہمارے ٹرک کو چیکنگ کے لئے روکا گیا تھا وہ اب بھی ٹاکا لگا ہوا تھا۔ زالی چند لمحوں کے لئے ٹاکے پر اور پھر فرحت بخش جھکوں کے ساتھ آگے نکل چلی۔ پولیس والوں نے ٹریکٹر ڈرائیور سے زیادہ پوچھ کچھ نہیں تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ٹریکٹر ڈرائیور بھی ہ اسلیٹ سے بے خبر تھا۔ اس کے نزدیک ہم مزدور ہی جنہوں نے فیکٹری کے حکم پر پہلے تھے مزدوروں کی جاک تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ٹاکے پر کسی طرح گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا تھا اور دو تین کے مطابق کر کے آگے نکل آیا تھا۔ روپ بھرنے کے لئے جہاں شیہ لباس تبدیل کرنا پڑا تھا وہاں دو اہم اشیاء سے عموماً برواشت کرنا پڑتی تھی۔ یہ دو اشیاء خنجر اور دوسری گھڑی صبر رام پوری خنجر جو ایک خلاف میں بند بھد دقت میری پنہ سے بندھا رہا تھا۔ مجھے فیکٹری ہی میں چھوڑنا پڑا تھا۔ وجہ دھرتی تھی جو میں نے باندھی تھی۔ یہ دھرتی اتنی مختصر تھی تھنوں سے کچھ ہی پہنچے آتی تھی۔ ظاہر ہے ایک زالی مز کی حیثیت میں میں وہ گھڑی بھی نہیں بن سکتا تھا جو غ نے مجھے تھے میں دی تھی اور جس کی قیمت میرے انداز کے مطابق آٹھ دس ہزار سے کم نہیں تھی۔ جس طرح کلائی پر گھڑی کی جگہ ایک سفید نشان تھا اس طرح ہڈی ایک نشان بن چکا تھا۔ جو چیزیں مستقل ہمارے جسم رہتی ہیں وہ جہاں بھی ہو جائیں تو جسم پر اپنی کوئی نہ کوئی چھوڑ جاتی ہیں۔ شاید دل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ دل میں بیٹنے والے جہاں بھی جائیں تو ان کے نقش دل کے نمائندوں میں جھوکا گئے رہتے ہیں۔



لنہڑی ہوئی پنڈلی کو کچھ اور تھڑا لیا اور اسی طرح کلائی کا نشان بھی بچھوڑا مٹی سے ڈھانپ دیا۔ ٹرائی کے بے سرنے نیپ پر لوانائی رفتار سے گانا بچ رہا تھا۔ پردے میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ۔ فید کوٹ سے فائلا شکر کا راستہ کار پر ایک گھنٹے میں طے کیا جاسکتا ہے لیکن ٹریکٹر ٹرائی جس رفتار سے جاری تھی بے غنیمت تھی کہ ہم دو ڈھائی گھنٹے میں بھی فائلا کے آس پاس پہنچ سکیں گے۔ بابو لیاقت نے ابھی تک بتایا نہیں تھا کہ انساں جا رہے ہیں اور ہمیں وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟ میں نے اس کی خاموشی کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دوسرے 11 میں میں نے عارضی طور پر اسے رہنا تسلیم کر کے پنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ یہی بقول شاعر "ہم تو چلے مر چلے رستہ۔"

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرائی نے پختہ سڑک موڑ دی اور بل کھاتے ہوئے ایک کچے راستے پر ہوئی۔ یہ بالاصل دیہی علاقہ تھا، کہیں کہیں بے آباد زمینیں بھی نظر آرہی تھیں۔ بابو لیاقت نے بتایا کہ بارڈر یہاں سے صرف دس کلو میٹر کی دوری پر ہے۔ پندرہ میں منٹ بعد ہم کچے مکاؤں والے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ ایک بہت بڑے جوڑے کے کنارے ادھورے لباس والی بیگنی بیگنی عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی "محل" گنگے پتے شرم و حیا سے بے نیاز مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔ چارے سے لدی ہوئی ایک بیل گاڑی ان کے پاس سے گزر رہی تھی اور گاڑی کے عقب میں ایک عورت گدھے پر دو بٹکے رکھے لے جا رہی تھی۔ وہی قدیم دور کے بٹکے وہی بیل گاڑی، وہی عرائشی صدیاں جیسے اس منظر کو چھوئے بغیر گزرتی تھیں۔ ہر ایک ایک شخص کھاد کے کھیت سے نکلا اور ٹرائی کے سامنے آگیا۔ اسے زود میں دیکھ کر ٹریکٹر ڈرائیور کو بریک لگانا پڑا۔ اس سے پہلے کہ سکھ ڈرائیور غیث پٹھانی میں اسے کوئی کراری سی گالی دیتا وہ شخص محکوم کر ٹرائی کے عقب میں آگیا اور ہاتھ اٹھا کر بابو لیاقت کو سلام کیا۔ بابو لیاقت نے سلام کا جواب دیا۔ وہ دونوں شناسا نظر آ رہے تھے۔

ڈرائیور نے شک کر پوچھا "وہ کون ہے؟ تو آتما پتیا کرنی ہے تو جاؤ اور بارڈر کی طرف جا کر کوئی کھالے" بابو لیاقت نے دھیمے لہجے میں ڈرائیور کو سمجھایا کہ اپنا ہی بندہ ہے۔ ٹھیکیدار کا پیغام لے کر آیا ہے۔ بابو کی بات ڈرائیور کی سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن وہ ٹھنڈا ضرور پڑا۔ میں نوادہ کو پہچان گیا۔ یہ بابو لیاقت ہی کا ایک ملازم تھا۔ وہ سرکوشی میں بولا کہ کام ہو گیا ہے بابو جی۔ تین سو میں طے ہوا

ہے۔ بندہ بھی مجھ سے کا ہے۔" پھر اس نے کھیت کی طرف رخ کر کے زور زور سے آوازیں دیں "باغ علی اوبان علی" چند لمحوں بعد ایک دھلا پتلا اومیز عمر شخص درختوں کے عقب میں برآمد ہوا۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ شاید سلام کرنا چاہتا تھا لیکن ہمارے نکلنے کے لیے اس نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ "نکتے جانور ہیں تمہارے پاس؟" بابو لیاقت نے اس سے پوچھا۔

"چالیس کے قریب ہیں۔ چار باج ٹچر بھی ہیں" باغ علی نے جواب دیا۔ "کیا خیال ہے؟ اسنے میں کام بن جائے گا؟" بابو نے اپنے ملازم سے پوچھا "بنا جائے گی۔ نہ بھی بنا تو باغ علی مزید جانور اپنے بھائی سے لے لے گا"

دو تین منٹ یہ گفتگو جاری رہی پھر بابو کا ملازم اور باغ علی نامی شخص واپس چلے گئے سکھ ڈرائیور نے ٹرائی آگے بڑھادی۔

قریباً تین چار فرلانگ چلے کے بعد ٹرائی رک گئی۔ رک کیا مٹی روکنی پڑی۔ آگے راستہ اتنا ناموار اور دشوار تھا کہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یہاں قریب ہی کچھ توں میں ہمیں ایک دو فوجی گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ بھارتی فوجی پتلیوں اور بغا میں پنے جنگی بیروں سے یہ توڑ پے تھے آثار بتا رہے تھے کہ ہم بارڈر سے کلائی نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ جھوٹ کا اپنا ایک ریشہ ہوتا ہے۔ ہم وہ نہیں تھے جو خود کو ظاہر کر رہے تھے اس لئے دھڑکنیں خواہ خواہ تیز ہو رہی تھیں۔ میں تو خرابا رہا ایسے مراحل سے گزر چکا تھا لیکن بابو لیاقت کے لئے اس طرح کی مہم جوئی شاید بالکل نئی بات تھی۔ وہ مجھے خود یہاں لے کر آیا تھا لیکن اب خود ہی نزوس نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی اچھا پٹ دور کرنے کے لئے ایک گھنٹی اپنے کندھے سے نکالی اور دوسری اس کے کندھے پر رکھ دی۔ بابو نے کچھ دیر ذہنی طور پر تیار ہونے میں لگائی لیکن جب وہ ایک بار تیار ہو گیا تو پھر اس نے مکمل طور پر ایک مزدور کی چال ڈھال اختیار کر لی۔

ہم تھکے ماندے لیکن بے فکرے مزدوروں کے انداز میں چلتے فوجیوں کے قریب سے گزر گئے۔ فضا میں مخصوص دھماکی خوبرو رہی ہی تھی۔ کہیں قریب ہی کسی ڈیلر ایجنٹ کو "کو کو" گونج رہی تھی۔ ایک دھماکا سکھ سائیکل کے کیریئر برف کی سہل رگے اڑا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کہیں قریب ہی کوئی گاؤں موجود ہے۔ ہم فوجیوں سے کلا

دور نکل آئے تو بابو لیاقت کیکر کے ایک درخت تلے رک گیا۔ طویل سفر نے کلائی تھکا دیا تھا۔ شفاف پانی سے بھرے ہوئے کھالے کے کنارے نرم گھاس پر بیٹھا اچھا لگا۔

بابو لیاقت نے انکشاف کرنے والے لہجے میں کہا۔ "شاہ جہاں صاحب! آپ کا سامان سرحد پار پہنچانے کا تو بے فیصد انتظام ہو چکا ہے۔ جو دس فیصد رہ گیا ہے وہ بھی ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا"

میں نے کہا "کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گے آپ؟" اس نے پہلے کیلے کرتے میں سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس کی پتی ٹھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ پتی کی پچھلی جانب چند کیرس کھینچ کر ایک نقشہ سامنے لایا گیا تھا۔ بابو لیاقت نے ایک مقام پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم جس گاؤں میں ٹھہرے تھے وہ یہ ہے۔ اس کا نام باج پور ہے۔ باج پور تک ہم اپنا "سامان" کسی بھی گاڑی پر لاسکتے ہیں لیکن اس سے آگے گاڑی لانا خطرناک ہے۔ ایک تو راستے بے حد دشوار ہیں دوسرے چٹنگ کا شدید خطرہ ہے۔ اس مسئلے کا حل باربرداری کے لئے استعمال ہونے والے گدھے ہیں۔ ایسے لٹو گدھوں اور فوجیوں کے مالکان آج کل اچھی خاصی دسماڑی لگا رہے ہیں۔ کسی مقامی ٹھیکیدار نے فوجیوں کو یہیں ہزار پوری رست کی بھر کھیتی ہے۔ یہ رست قریب دیک تالے سے نکال کر باج پور پہنچائی جاتی ہے۔ باربرداری کا یہ کام پورا دن جاری رہتا ہے۔ باغ علی نامی جس شخص سے ہم نے بات کی ہے وہ بھی باربرداری کا کام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ طے ہو گیا ہے۔ وہ ہمارا سامان بڑے محفوظ طریقے سے بارڈر تک پہنچا دے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟ آپ اوپر رست اور نیچے سامان۔ ہمیں سامان کھولنے اور بار کرنے میں کچھ محنت تو کرنا پڑے گی لیکن یہی محفوظ ترین طریقہ ہے جو اس موقع پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس معاملے پر بہت سوچ بچار کی ہے۔ شاید آپ کو یہ بات عجیب سی لگے کہ ہم صند دھوکا کا تمام سامان نکال کر گدھوں اور فوجیوں کے ہاتھوں میں رکھیں پھر ان پر رست ڈالیں اور پھر انہیں باج پور بارڈر کی طرف لے جایا جائے لیکن آپ یقین رکھیں کہ یہ سب کچھ قابل عمل ہے اور اس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں"

میں نے کہا "یہ گدھے اور خچر بغیر دے کے سرحد کیسے پار کریں گے؟" وہ میرے لفظوں میں چپے ہوئے طنز کو نظر انداز کر کے "یہ لٹو جانور سرحد پار نہیں جائیں گے ان کی منزل

ایک سرحدی بستی ہوگی جسے نیکر کہا جاتا ہے۔ دیکھئے۔" نیکر "اس نے پتی پر رہنے ہوئے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "نیکر" کے ساتھ ہی بارڈر کی طرف یہ ایک سر بڑا باغ ہے۔ اسے نوشاد کا باغ کہتے ہیں۔ یہاں نوشاد کا ڈیر بھی ہے۔ نوشاد علاقے کا نامی گرامی خاندان ہے لیکن مزے کا بات یہ ہے کہ وہ بیچارا ہے۔ لوگ کمزور اور کم حوصلہ شخص بیچارے کا لطف دیتے ہیں لیکن آپ نوشاد کو دیکھیں گے تو تسلیم کر لیں گے کہ دلیری اور بے خوفی صرف مردوں سے تو خاص نہیں ہے۔ یہی نوشاد ہمارے منصوبے کا کلیدی کردار ہے۔ اگر ہم نے اپنا سامان نوشاد کے ڈیرے تک پہنچا دیا تو سمجھیں کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ گیا۔"

"یہ نوشاد کوئی اسمگلر قسم کی چیز ہوگا" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "اسمگلر بھی کہہ سکتے ہیں آپ لیکن اس کے علاوہ بھی وہ ہر طرح کے جرائم میں ملوث رہا ہے۔ اس میں ایک خاص بات ہے جو اسے اپنے ہم عصر مد معاشوں سے ممتاز کرتی ہے۔ "وہ کیا؟" میں نے پوچھا

بابو نے سگریٹ کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا "آپ نے اکثر جرائم پیشہ افراد کی زبان سے سنا ہوگا کہ ہم برا کام کرتے ہیں لیکن ایماندار سے کرتے ہیں۔ نوشاد بھی یہی کہتا ہے لیکن اس کے کہنے اور دوسروں کے کہنے میں بہت فرق ہے۔ وہ واقعی قول نبھانے کے لئے سروھڑکی بازی لگاتا ہے۔ میں ایک چھوٹی سی مثال آپ کو دیتا ہوں۔ سال ڈیڑھ سال پہلے نوشاد نے ایک شخص سے دس ہزار روپے پکڑا۔ اس رقم کے عوض اس نے ایک ایسی لڑکی کو اغوا کر لیا تھا جس کا بیادہ دس پندرہ روز بعد ہو رہا تھا۔ یہ ایک دیرینہ عادات کا شاخسانہ تھا۔ رقم پکڑنے کے چند روز بعد اچانک نوشاد کا رویہ بدل گیا۔ وہ اس کام سے کچھ بچپانے لگا اور رقم دینے والے کو احساس ہوا کہ وہ لڑکی اغوا کرنے کے بجائے مخالف پارٹی سے اس کی صلح کرانے کے چکر میں ہے۔ یہ واقعات ایک دوست کے ذریعے میرے علم میں بھی آئے۔ جو شخص لڑکی اغوا کر رہا تھا وہ لڑکی سے عشق کر رہا تھا۔ بلکہ یہ دو طرفہ عشق تھا۔ چند روز بعد مجھے پتا چلا کہ نوشاد نے سادھو پور گاؤں سے لڑکی کو اغوا کر لیا ہے اور اس واردات کے دوران ہونے والی اندھا دھند فائرنگ سے چند افراد زخمی بھی ہوئے ہیں۔ اس بات کا علم واردات کے بعد ہوا کہ اغوا ہونے والی لڑکی کی شادی نوشاد کے گھر کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ اس قسم کے کئی واقعات ہیں جو علاقے کے لوگ بیان کرتے ہیں اور جو پولیس کے

ریکارڈ میں بھی موجود ہیں۔“  
میں نے کہا ”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے  
دستیاب لوگوں میں سے بہترین شخص کا انتخاب کیا ہے“  
وہ مسکرایا ”بس کوشش کی ہے۔ اب جو اللہ کرے۔“

مفتگو کے دوران ہی ہم کیکر کے پیچے سے اٹھ کر چل  
دیے تھے۔ دھول سے اٹے ہوئے راستے پر ننگے پاؤں چلنا  
اور ہوا سے پڑ پڑاتی مختصر سی دھوٹی کو بار بار سنبھالنا ایک  
انوکھا تجربہ تھا۔ اٹھ دس گھنٹے پہلے میں سوچ بھی نہیں  
سکتا تھا کہ مجھے لیاقت بابو کے ہمراہ کسی ایسے تجربے سے گزرنا پڑے  
گا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ آگے ہمیں کنکریٹ کے بنے ہوئے چند  
فوجی دمے نظر آئے۔ یہاں لوڈر کھڑا تھا اور خیم چار فوجی  
کیونکہ اس نے پیچھے گھمے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک فوجی  
ٹانور دو برین لیے ایک بلند وبالاد رخت پر چڑھا بیٹھا تھا اور  
کسی نواحی کھیت میں مریچیں توڑتی ہوئی سکھ میاروں کو تاڑ رہا  
تھا۔ ساتھ ساتھ ”سہرے“ بھی کرتا جا رہا تھا“۔ لمبی والی سور  
دی پتہ بڑی گوری ہڈ۔ بالکل کچی گرمی۔ میجر صاحب کے  
ہستے چڑھ جاتے تو دو منٹ میں کچھر کچر کر کے کھا جائیں ساری۔  
اور لال دوپٹے والی تو بالکل اپنے ہان (قد کاٹھ) کی ہے۔ بڑا  
سوتا جوڑا بنایا ہے۔ واہ گردنے۔ پرچ میں فاصلہ بڑا ڈال دیا  
ہے۔ پندرہ بیس ٹھیکوں کی دوری ہے۔ ہائے ہائے ہائے  
مجبوری۔ یہ موسم اور یہ دوری“

نرک کے پیچے سے ایک لانس ٹائیک نے آواز لگائی ”اور  
وہ تیری بھالی بھی آئی ہے کہ نہیں آج“  
درخت پر بیٹھا ہوا فوجی تنک کر بولا ”اوئے! اوہ میری کوئی  
بھالی شانی نہیں۔ ایک ہی تو ذرا کھلی ڈنی کڑی ہے اور تو اسے  
بھی میری بھالی بنا رہا ہے۔ اتنا تو ہوشیار نہ بن۔ پوری بیس  
گولیاں گزاردوں گا اندر سے“  
اتنے میں ایک کالے کلونے فوجی کی نگاہ ہم پر پڑ گئی۔  
اس نے تیز نظروں سے ہمیں گھورا پھر بلا تکلف ہم دونوں کو  
مشترکہ گالی دے کر بولا ”اے۔۔۔ اُدھر آؤ دونوں۔“ یہ  
نازک لمحات تھے۔ بہر حال ہم نے ثابت قدمی دکھائی اور  
فوجیوں کے نزدیک پیچھے ہٹنے وہ اب لوڈر کے پیچے سے نکل  
آئے تھے اور بوٹ وغیرہ بند کر رہے تھے۔ کالا کلونا فوجی جو  
غالباً گروپ کمانڈر تھا کھڑے سے لمبے میں بولا ”یہ تمہاری دیدی  
ذرا اڑی مڑی گھڑت ہے۔ اس کو ہمارے تنک بو کر ذرا دھکا  
شکاں گا کوئی“ یعنی یہ تمہاری باقی (کاڑی) اشارت نہیں ہو رہی  
ہے۔ ہمارے ساتھ مل کر اس کو دھکا وغیرہ لگاؤ۔ حکم حاکم  
مرگب منافات کے مصداق ہم نے فوجیوں کے ساتھ مل کر

نرک نما لوڈر کو دھکا لگانا شروع کیا۔ دھکا لگاتے ہوئے ہر لمحہ یہ  
دھڑکا لگا رہا کہ کہیں چادر کندھوں سے کھٹک نہ جائے ایسا  
ہو جاتا تو پھسل غار ہو جاتا اور ہم ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر  
دھر لے جاتے۔

قریباً ایک فرلانگ تک دھکا لگانے کے بعد گاڑی  
اشارت ہوئی تو ہماری جان چھوٹی اور ہم اپنا سفر جاری رکھنے  
کے ”مجاز“ ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر ایک بار پھر رنجبڑ اور  
فوجیوں سے ہمارا سامنا ہوا۔ تاہم نہ انہوں نے ہمیں چھیننے  
کی کوشش کی اور نہ ہم نے کوئی ایسی غلطی کی جس کے سبب  
وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ آخر ہم اس چھوٹی سی بستی میں  
پہنچے جسے ”نکرا“ کہا جاتا تھا۔ یہ بستی ذرا بلندی پر واقع تھی۔  
وہاں سے ہمیں نوشاد کا ڈیرا نظر آنے لگا۔ تین چار ایکڑ میں  
ایک باغ تھا۔ باغ کے پتوں بیچ ایک حویلی نامانک بنا ہوا تھا۔  
یہی نوشاد کا ڈیرا تھا۔

دس پندرہ منٹ کے پیدل سفر کے بعد ہم اس ڈیرے پر  
پہنچ گئے۔ دھوپ میں کافی پیش آچکی تھی لیکن ڈیرے کے  
ارد گرد امروہ اور بیری کے گھنے درخت کی دچ سے خاصی  
ٹھنڈک تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں بھی ہمارے پیچھے سے  
پہلے ہی ہماری خبر پہنچ چکی ہے۔ جو نسیم ڈیرے کے احاطے  
میں داخل ہوئے اللہ دین کے جن کی طرح بابو لیاقت کا ایک  
ملازم یہاں بھی آ حاضر ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر بابو کے کان  
میں کچھ کھسر پھسر کی اور ہمیں لے کر اندر داخل ہو گیا۔ بڑی  
بے ڈھنگی سی عمارت تھی۔ ہر طرف تنک و تار یک کرے بنے  
ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں چھوٹے چھوٹے بالوں والے  
قوی پیکل ٹھنڈے سے ملاقات ہوئی۔ اس کے کالوں میں سونے  
کی بالیاں آنکھوں میں سرمہ اور انگلیوں میں جڑاؤ انگشتیاں  
تھیں۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال رکھی تھی اور بڑے  
تھمتے سے رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے  
عقب میں چلی ہوئی موٹھوں والا ایک نال غنڈا خود کار  
را نقل تھا۔ کھڑا تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ چارپائی پر  
بیٹھا نوشاد بیٹھا ہے۔ وہ ہماری ہیستہ کڈائی دیکھ کر پہلے تو  
مسکرایا، پھر بھاری بھر کم جسم کو حرکت دے کر کھڑا ہو گیا اور  
ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

اس کی آواز بیٹریوں کی طرح چھٹی چھٹی تھی۔ کہنے لگا  
”آؤ آؤ! بھکوان کی کیا ہے کہ مجھ غمانی کے گھر میں اتنی اونچا  
ہستیاں آئی ہیں۔ میں تو سمجھ نہیں پا رہی کہ کس طرح سواکت  
کروں آپ کا۔“  
اس کے باخلاق لمبے میں طنز اور خود پسندی کی بلکی سی لہ

موجود تھی۔ وہ بابو کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس کے ساتھ تو بات قدرہ لگے گا اور بڑی عزت سے بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ میرے ساتھ بھی اس کا عاتبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ بڑی ادا سے بولا "آپ کا نام پہلے بھی سن چکی ہوں میں۔ اچھا ہے کہ آج تک یہ بھی لیا۔"

وہ اپنے بھاری بھرکم خٹے اور خالص مصلوہ خندو خال کے باوجود اپنے لئے مونث کا صیغہ استعمال کرتا تھا تو بڑا عجیب لگتا تھا۔ چند رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد بابو لیاقت اصل موضوع کی طرف آیا۔ اس نے کہا "نوشاد جی! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ شام سات بجے سے پہلے پہلے ہمیں ٹرید کوٹ واپس پہنچنا ہے۔ میں صرف انتظام دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔"

وہ بولا "انتظام ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ آپ بالکل سنبھلے رہیں۔ بس آپ ٹائم پر مال میاں پہنچا دیں پھر آپ کی یہ داسی نوشاد جانے اور اس کا کام ہے۔"

بابو نے کہا "دوسری طرف کیا انتظام ہے؟"

وہ بولا "صدے جاؤں! کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میں جو کبھی ہوں بس تمہارا کام مال میاں پہنچانا ہے۔ اس کے بعد بارڈر سے آگے دس بارہ میل تک جہاں کو گئے ڈیویری دے دوں گی۔" اس کے منہ سے انگریزی کا لفظ سن کر بڑا لطف آیا۔

نوشاد کی بھوری آنکھوں میں اعتماد کی بے پناہ چمک تھی۔ اس کے طور طریقے گواہی دے رہے تھے کہ وہ ایک بے حد گمراہ اور خطرناک شخص ہے۔ اب تک بابو لیاقت نے یا خود نوشاد نے مجھے اپنے طریقہ واردات کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن نوشاد کا انداز گفتگو اور اس ڈیرے کا عمل وقوع دیکھنے کے بعد میرے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا کہ یہ کوئی سُرکب وغیرہ کا چکر ہے۔ بارڈر ایریا کی زندگی بڑی جنگامہ خیز اور بڑا سردار ہوتی ہے۔ عام طور پر سیدھے سادے بننے والے لوگ بارڈر کے نزدیک رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بارڈر کے نزدیک زمینیں بہت سستی مل جاتی ہیں۔ اسلحہ اور دیگر جرائم پیشہ لوگ یہاں وسیع قطعات اراضی حاصل کر کے سن مانی سرگرمیاں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بات دشمنی چھپی نہیں کہ بارڈر کے نزدیک وایع حلیوں اور ڈیروں میں بعض لوگوں نے سُرکس بنا رکھی ہیں اور ان کے ذریعے اسلحہ کا مال ادھر سے ادھر کیا جاتا ہے۔ سُرکوں کے علاوہ بھی کئی ایک طریقے ہیں جن کے ذریعے کامیابی سے یہ کام جاری رکھا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد نوشاد نے اٹھ کر بابو لیاقت کے گلے میں اپنا بازو ڈالا اور اسے کمرے کے ایک گوشے میں لے گیا۔ دونوں پانچ دس منٹ رازداری سے باتیں کرتے رہے۔ نوشاد کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ ہاتھ پچھانچا کر بڑے منوثر انداز میں بابو کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ بابو مسلسل اقرار میں سر ہلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جیسے سب کچھ طے ہو گیا۔ بابو لیاقت نے واپس آکر کہا "چلیں جہاں صاحب! اب نکل چلیں۔"

"ہائے ہائے اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" نوشاد ہاتھ نچا کر بولا "اتنی دور سے آئے ہو چائے پانی پینے بغیر نہیں جانے دوں گی میں۔" پھر وہ اپنی چھٹی ہوئی آواز میں زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ "او ہمارے! دشیر تھکے۔"

چند لمحوں بعد ایک بھٹی دروازہ کھلا اور بڑی بڑی مونچھوں والا ایک نہایت ہٹا کتا شخص اندر آیا۔ وہ شکل سے ہی خونی قاتل اور ذہنیت نظر آتا تھا لیکن اس وقت وہ گھڑلو ملازم کے معمولی لباس میں تھا اور بیچرے نوشاد کے سامنے بالکل بیگنی بیٹھا کھڑا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر نوشاد کے رُعب و دہد بے کا اندازہ ہوتا تھا اور اس دہشت کا سراغ لگتا تھا جو اس کی بابت دوسرے لوگوں کے دلوں میں موجود تھی۔

"ہمسائوں کے لئے چائے کا انتظام کرو" نوشاد نے نادر شاہی حکم جاری کیا۔ قوی بیکل ملازم عاجز رہا۔ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ کہیں قریب سے برتنوں کے سرائے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر چائے پورے لوازمات کے ساتھ ہمارے سامنے آن موجود ہوئی۔ چائے لانے والے ملازم دوسرے تھے وہ بھی پہلوان نما غنڈے تھے۔ ان کے چہروں پر سب سے نمایاں چیز ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں لیکن یوں لگتا تھا کہ نوشاد کی جھڑکیاں سن کر یہ مونچھیں آخوندیچے رنگ مٹی ہیں۔ چائے پینے کے دوران نوشاد نے بابو لیاقت سے کہا "صدے جاؤں! ایک بیچو سا کام آج بھی ہمارا کروں۔"

"تم حکم کرو" بابو لیاقت نے کہا۔

نوشاد نے ملازموں سے کہہ کر ایک ادیز عمر فز اندام شخص اور ایک دہلی پتلی عورت کو اندر بلا لیا۔ دونوں خستہ حال لباس میں تھے اور لٹے پٹے نظر آتے تھے۔ عورت نے ایک موٹی اور مٹی سے منہ سُر صاحب رکھا تھا۔ ادیز عمر شخص اس کا کھروالا نظر آتا تھا۔ اس کے پاس میں ٹوٹی پھوٹی نچل بھی اور بال گرد سے اُٹے ہوئے تھے۔

نوشاد اٹھا کر بولا "ان دونوں مسکینوں کو آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور ہر کے تو پختہ سُرک پر پہنچ کر فیروز پور

جانے والی بس پر سوار کرادیں۔"

"کیا ان کو راستہ نہیں آتا؟" بابو لیاقت نے پوچھا۔ "راستہ تو آتا ہے لیکن یہ بارڈر ایریا ہے۔ دینے بھی ان دنوں میاں رازبڑوں اور ذہنیوں نے طوفان مچا رکھا ہے۔ سبے چارے راستے میں لٹنے لگے ہیں۔"

"ان کے پاس لانے کے لئے کیا رکھا ہے؟" بابو لیاقت نے آہستہ سے کہا۔ "صدے جاؤں! بہت کچھ ہے۔" نوشاد نے دہلی آواز میں کہا "جانتے ہو یہ بڑا کون ہے؟" بابو اور میں سوائے نظروں سے نوشاد کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ بولا "قائمشکا کی فروٹ منڈی کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ یہ کوئی بچی شخص ہے۔ یہ ڈیرہ دو لاکھ روپیہ تو اب بھی اس کے پاس ہوگا۔"

ہم دونوں حیران نظروں سے ادیز عمر شخص کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ہماری سرگوشیوں کا موضوع جان چکا تھا۔ ہندو ستیخوں کے مخصوص انداز میں اس نے دانت نکالے اور ہاتھ جوڑ کر ہمیں نمسے کیا۔ اس کی جتنی آدھا کھونٹ نکالے خاموش کھڑی رہی۔

نوشاد بولا "یہ جتنی میاں سے چند میل دور ایک گاؤں میں کسی کے ہاؤس پر آئے تھے۔ واپس جارہے تھے کہ چند دارو اتوں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ گھوڑیوں پر سوار تھے۔ پیچھا کر کے انہوں نے گاڑی بیچھنی اور ڈرائیور کو پکڑ لیا۔ رگونا تھ اور اس کی جتنی کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب یہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میرے ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بہت ڈرے ہوئے ہیں اور اکیلے واپس جانا نہیں چاہتے۔ یہ پناہ پرانا لباس انہوں نے میرے کہنے پر ہی پہتا ہے۔ میں انہیں اپنے ملازم کرنا نہ لگے کہ ساتھ واپس بھیجے گا سوچ رہی تھی۔ اب استاد جہاں آیا ہے تو کرنا کر گھٹکی کیا ضرورت ہے۔"

آخری الفاظ کہنے کے بعد نوشاد نے سوائے نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک نگاہ بابو لیاقت کے چہرے پر الٹ۔ اس کی آنکھوں میں رضامندی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "میں تو میاں بالکل اجنبی ہوں۔ خود بھی لیاقت صاحب کے پیچھے پیچھے چل کر آیا ہوں۔ اب جس طرح لیاقت صاحب کہتے ہیں اسی طرح کر لیتے ہیں۔"

لیاقت اور نوشاد نے تھوڑی دیر اس بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کوئی بچی خستہ حال جوڑا ہمارے ہاتھ پختہ سُرک تک جانے گا اور وہاں ہم انہیں کسی بس پر وار کرادیں گے۔ نقدی اور گھنٹوں کی صورت میں آڑھنی

رگونا تھ کے پاس قریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھا۔ یہ اشیائے پزیرے کے تحفے میں لپیٹ کر رگونا تھ کی جتنی نے اپنے لباس میں چھپائیں۔ چار بجے کے قریب نوشاد سے رخصت ہو کر ہم نے واپس کا سفر شروع کر دیا۔ نوشاد اور بابو لیاقت کے درمیان طے ہوا تھا کہ علی الصبح چار بجے کے درمیان ہال ڈیرے پر پہنچنا شروع ہو جائے گا۔ نوشاد کا بنانا ملازم شیر گھ ہمیں "ٹیکرا" گاؤں کی حدود تک چھوڑنے آیا۔ اپنے خدو خال کے باوجود وہ بالکل اللہ میاں کی گائے نظر آ رہا تھا۔ میں نے دے دے لے لے میں بابو لیاقت سے کہا "یوں لگتا ہے کہ اپنے احساس برتری کو بڑھاوا دینے کے لئے نوشاد نے ان چوڑے چٹکے زور آور مردوں کو معمولی کاموں پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ ورنہ ڈیرے پر جو کام یہ لوگ کر رہے ہیں کوئی بھی عام شخص کر سکتا ہے۔"

بابو لیاقت نے سرگوشی میں کہا "ایک بات شاید آپ کو معلوم نہیں۔ نوشاد کے ڈیرے پر گھڑلو کام کرنے والے کئی ملازم مردانہ صفات سے محروم ہیں۔ اور یہ عروہ قدرتی نہیں نوشاد کی سفاکی کا نتیجہ ہے۔"

ہم نوشاد کے ڈیرے سے روانہ ہوئے تو چار بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں ہر صورت سات بجے تک صفدر گئے پاس گذرنا اور پور گاؤں پہنچنا تھا۔ اس کا مطلب تھا ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت تھا۔

ہم نے زکفر زلمی بان پور گاؤں کے قریب چھوڑی تھی۔ اب بان پور گاؤں تک ڈیڑھ دو کلومیٹر کا فاصلہ ہمیں پیدل طے کرنا تھا۔ ہم ایک گھنٹہ بڑی تیزی سے قدم اٹھاتے جارہے تھے۔ سب سے آگے بابو لیاقت تھا۔ اس کے پیچھے آڑھنی رگونا تھ اور اس کی جتنی اور آخر میں رگونا تھ کی جتنی گورگونا تھ سے بھی عمر رسیدہ نظر آتی تھی لیکن اس کی چال میں دو شیرازوں جیسا لوچ اور حرکات و سکنات میں تیزی تھی۔ غالباً اس کا ایک سبب اس کا چھریا جسم بھی تھا۔ وہ اپنے بوسیدہ لباس میں ڈیڑھ لاکھ کے لئے اور نقدی کے چھپائے ہوئے تھی۔ بیچرے نوشاد نے ہم پر کھل بھروسہ کرتے ہوئے اس جتنی کو ہمارے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔

راستے میں رگونا تھ نے ہم سے بہت کم گفتگو کی۔ ہم نے بھی اسے کریدنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہر طور ایک سوال رو رہ کر ذہن میں آ رہا تھا کہ رگونا تھ میاں کسی شادی میں آیا تھا تو اسے اپنے ساتھ آٹھ دس ہزار روپیہ نقد لانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر اتنے گئے؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک دور دراز گاؤں میں جا رہا ہے اور وہاں سفر کے

حالات اسنے اچھے نہیں ہیں۔ کم از کم رگوں کا تھک جیسے گھاگ بننے سے ایسا ہے پروائی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے کھٹکے کے دوران محسوس کیا تھا کہ نوشاد بھی رگوں کا تھک کی گمانی سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں لیکن وہ تعلق داری کے سبب حقائق سے چشم پوشی کر رہا ہے۔

قربان یون کھٹنے کے پیدل سفر کے بعد ہم ٹرائی تک پہنچ گئے۔ راستے میں ایک دو مقام پر فوجی پھولداریاں نظر آئیں لیکن کسی فوجی سے ملہ بھی نہیں ہوئی۔ پروگرام کے مطابق ٹرائی کا رخ موڑا جانا تھا اور ڈرائیور ٹرائی کے اندر ہی چادر اوڑھے بخواب تھا۔ ہم نے اسے جگایا اور اچھی طرح "بگائے" کے بعد ڈرائیور تک سیٹ پر بٹھا دیا۔

ٹرائی ہمیں لے کر واپس روانہ ہو گئی۔ لیکن ابھی دو تین فرلانگ ہی گئی ہوئی کہ ٹریک کا انجنی گڑگڑا کر خاموش ہو گیا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ اور تشویش ناک ہوتی گئی۔ بعد کوشش دوڑھائی کھٹنے میں انجن کی خرابی دور کی جا سکی۔ جب ہم دوبارہ سفر روانہ ہوئے تو چادروں طرف گہری تاریکی پھیل چکی تھی اور شام سے درختوں پر چھپاتے پرندے خاموشی آؤدھ کر سو چکے تھے۔ باج پور سے آگے راستہ بالکل تاریک اور سنسان تھا۔ ٹھری زمین کی وجہ سے قرب و جوار میں کیت بھی نظر آ رہے تھے۔ اچانک مجھے گھوڑوں کی ٹانگیں سنائی دیں۔ پھر کسی کی لگاکاری ہوئی آواز گونجی اور تاریکی میں دور تک گونج گئی۔

رگوں کا تھک کے ملنے سے ڈری ڈری آواز لگی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اسی دوران اوپر تلے کئی فائر ہوئے۔ غالباً یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ میرا ہاتھ خود بخود اپنے بالکل تک پہنچ گیا۔ بابو لیاقت بھی پوری طرح چونکا ہو گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گھڑسوار درختوں سے نمودار ہو گئے۔ وہ سب کے سب مسلح نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں بارے میں بھی تھیں۔ ٹریک کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ گھڑسوار با آسانی اسے "اور ٹیک" کر گئے اور پھر راستہ مسدود کر کے انہوں نے ٹریک کو روکنے پر مجبور کر دیا۔

ٹریک کی آگلی دو شیوں میں گھڑسواروں کے ٹکے نمایاں ہو گئے تھے۔ انہوں نے چوں پر چادروں اور پکڑیوں کے ڈھانے لگا رکھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو جانا تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ایک لمبا ترنگا ٹھنڈا چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی سیون ایم ایم رائفل کی نال سے رگوں کا تھک کو زوردار ٹھوکا دیا۔

"حرام کے بنے! ہم سے بھانکا ہے۔ اپنی ماما کے پیٹ میں واپس بھی چلا گیا تو وہاں ہی بھی نکال لائیں گے۔ جب چلے گئے تو بھری اولاد" ساتھ ہی اس نے رگوں کا تھک کے چلی دار رخسار پر اٹلے ہاتھ کا تجھڑ مارا۔ چٹاخی آواز سے ویرانہ گونج اٹھا۔ رگوں کا تھک کی جتنی پچھلے حصے میں کھڑی تھی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچے چھلانگ لگائی۔ ٹھنڈوں کے بل گری اور اٹھ کر درختوں کی طرف بھاگی لیکن اپنی کوشش میں اسے ناکامی ہوئی۔ ایک ڈھانٹا پوش ٹرائی کے پلو سے لکل کر ٹپکی کی طرح اس پر چھٹا اور اسے چھاپ لیا۔

"حرام چادری! اٹھ پر کی چڑیا کی یہ مجال کہ سردار لالی کے ہاتھوں سے نکلے" وہ دانت چس کر غرایا اور عورت کی چٹیا سے پکڑ کر ایسا جھٹکا کہ وہ لمرانی ہوئی ٹریک کے دیوڑنگل پہنچے کے پاس گری۔

سردار لالی کا نام سن کر میرا ہاتھ غٹکا۔ یہ نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ ایک دم میری نگاہوں میں تیرھ تھک گاؤں اور اپنی بوٹا گھ کے گھر کے مناظر محسوس گئے۔ سردار لالی وہ نام تھا جس نے اس علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ میں نے کئی افراد کی زبان سے لالی کا نام سنا تھا اور کئی دیوڑنگل پر اس کے حق میں پرجوش نعرے لگے دیکھے تھے۔ چند لمبے پٹیلے تک میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس تاریک راستے پر ٹیکر اور چشمے کے درختوں سے یوں اچانک سردار لالی کے جتنے سے ملاقات ہو جائے گی۔

رگوں کا تھک کی جتنی مسلسل چٹ چٹ تھی۔ ایک گھڑسوار نے رگوں کا تھک کو کھینچ کر ٹرائی سے پیچے اتار لیا تھا اور اب اس کی پھولی ہوئی ٹونڈ پر اپنے کھٹنے کی ضربیں لگا رہا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر پیچے اترا اور رگوں کا تھک کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میری بات سنو" میں نے مارنے والے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "تم میں سردار لالی کون ہے؟"

ڈھانٹا پوش کو شاید مجھے جیسے خستہ حال "مزدور" سے اس لب و لہجے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ٹپس آئیز جرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "کون ہے تو؟" ایک ٹھنڈے کڑک کر پوچھا۔

"میں۔ میں مسمان ہوں سردار لالی کا۔ مجھے فرید کوٹ سے بابو لیاقت صاحب نے بھیجا ہے" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

چوڑے چٹکے ڈھانٹا پوش نے مجھے سر ہاتھ گھور کر کہا "تم سردار لالی کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔ شکل سے نہیں جانتا" میں نے جواب دیا۔

"بابو لیاقت سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟"

"تمت گمراہ واسطہ ہے لیکن میں اس کی تفصیل سردار لالی کو ہی بتاؤں گا"

"لیکن سردار لالی تو یہاں نہیں ہے" ایک نانے قد کے گھڑسوار نے جواب دیا "تیر چھوٹا سردار ہے یہاں۔ اس سے بات کرلو" نانے قد کے گھڑسوار کا اشارہ چوڑے چٹکے گھڑسوار کی طرف تھا۔ یہی بارے ب گھڑسوار تھا جس کے دائیں ہاتھ میں سیون ایم ایم تھی اور بائیں ہاتھ میں آڑھتی رگوں کا تھک کا گریبان۔

"لیکن مجھے پدایت ہے کہ صرف سردار ہی سے بات کروں" میں نے جواب دیا۔

میرا لہجہ بالاعتدال اور دھڑے لکھوں جیسا تھا۔ گھڑسواروں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میں وہ نہیں ہوں جو کھٹے سے نظر آ رہا ہوں۔ وہ سب میرے گرد اٹھنے ہوئے گئے۔ ان کی تعداد دس سے کم نہیں تھی۔ میں رگوں کا تھک کو مار پیٹ سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اچانک اس نے ایک ایسی حرکت کی جس کے سبب سارے کھٹے دھڑے پانی پھر گیا۔

رگوں کا تھک میں دولت مند بیوں والی مخصوص عیاری موجود تھی۔ چادروں طرف سے گھرا ہونے کے باوجود اس نے چالاکیا دکھائی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور ڈھانٹا پوش کو دھکا دے کر درختوں کی طرف بھاگا۔ ٹرائی سے درختوں کا درمیانی فاصلہ بالکل بدل گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا رگوں کا تھک درختوں تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تاریک مٹھان جھاڑیوں میں گھس جاتا تو خود کو بچانے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا لیکن بالکل آخری لمبے میں خود کار رائفل کی "تڑ تڑ" گونجی اور رگوں کا تھک اچھل کر ایک خشیب میں گر گیا۔ فائرنگ کرنے والا نانے قد کا ٹھنڈا تھا۔ رگوں کا تھک کی جتنی چٹ چٹ ہوئی اتنی اور فائرنگ کرنے والے پر مجھ پڑی۔ فائرنگ کرنے والا سے اپنی رائفل سے پیچھے دھکیلتے لگا۔ اسی کشش میں رائفل بردار کا ڈھانٹا بھی کل گیا۔ میرے سامنے بوٹا گھ کھڑا تھا۔ اہلی بوٹا گھ جس نے چند روز پہلے تیرھ گاؤں کے ایک دیران مکان میں نہیں "الوداع" کہا تھا۔

اس نے عورت کے سر پر رائفل کے کندے سے پکلی سی ضرب لگائی اور اس کے دو ساتھیوں نے عورت کو کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا۔

سب اس خشیب کی طرف لپکے جہاں رگوں کا تھک زخمی ہو کر لگا تھا۔ جب کہ بوٹا گھ ایک گھوڑے کی طرف لپکا۔ یہ گھوڑا بھی فائرنگ کی زد میں آیا تھا اور اب زخمی ہو کر اچھل

کود کر رہا تھا۔ خشیب میں رگوں کا تھک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دو ٹارچوں کی روشنی بیک وقت اس کے جسم پر پڑی۔ اس کی پشت پر گولیوں کے کم از کم چھ سوراخ تھے۔ ایک گولی سر کے عقبی حصے میں گئی تھی اور منڈیا پر نکل آیا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے خشیب سڑک بائیں کے خون سے تر ہو گیا۔ میں اور بابو لیاقت کھٹے کی کیفیت میں کھڑے تھے۔ نوشاد نے رگوں کا تھک اور اس کی جتنی کو ہماری حفاظت میں دیا تھا اور حفاظت میں دے جانے کے صرف چند گھنٹے بعد رگوں کا تھک کا چھلنی جسم اس دیران گھڑے میں پڑا تھا لیکن میرے خیال میں اس واقعے کی زیادہ ذمہ داری خود مرنے والے پر آتی تھی۔ اس نے اپنی حماقت اور جلد بازی سے کام خراب کیا تھا۔

بوٹا گھ اب زخمی گھوڑے کو قابو میں کر چکا تھا۔ گھوڑے کی ران میں گولی لگی تھی اور پوری ٹانگ خون میں نہائی ہوئی نظر آتی تھی۔ بوٹا گھ نے چہرے پر دوبارہ پکڑی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے ناراض لہجے میں اس سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کیا ہے اس نے کیا ہے۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔" بوٹا گھ نے باریک آواز میں جواب دیا۔ "سردار لالی اسے تیار تیار کر مارنا چاہتا تھا۔ اسے بھکوان کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اتنی سوکھی (آسان) موت مرا ہے۔"

"سردار لالی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سردار لالی۔ سردار لالی ہے اور کون ہے؟ وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔" بوٹا گھ نے روکھائی سے جواب دیا۔

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

چوڑا چٹکا ٹھنڈا گرج کر بولا۔ "تم جیادہ سوال جواب مت کرو۔ سوال جواب ہم کریں گے تم سے۔" پھر وہ بوٹا گھ سے مخاطب ہوا۔ "ہوئے! ہم جانتے ہو ان کو؟"

"ہاں۔" بوٹے نے کہا۔ "یہ پاکستانی ہے۔ گیر قانونی طور پر بازار پار کر کے آیا ہوا ہے۔ لی ایس ایف والے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کچھ دن پہلے دو راتیں میرے گھر بھی گجاری تھیں اس نے۔"

"یہ سردار لالی کے بارے میں بھی جانتا ہے؟" چوڑے چٹکے ٹھنڈے نے بولنے سے پوچھا۔

"ہاں۔" اوہرا دھڑے نام سن کر رکھا ہے اس نے۔ کتا تھا میں سردار سے ملنا چاہتا ہوں۔"

چڑا چلا غصے یعنی جھوٹا سردار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اب کہاں سے آ رہے ہو تم؟“ اس مرتبہ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

میں نے کہا۔ ”بارڈر کی طرف گئے تھے وہاں نوشاد بیچوڑے سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے کہا کہ یہ پتی جی میرے سامان ہیں۔ انہیں بھی سڑک تک پہنچا دو۔ بس ہم نے ساتھ لے لیا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔“

جھوٹا سردار بولا۔ ”معلوم کرنا چاہئے تھا تمہیں۔ شکل سے تو کچھ اڑھلکتے ہو پھر اتنی آسانی سے کیسے مان گئے تم؟“  
 ہونا سکھ معاملے کو سمجھتا ہوں تو بولا۔ ”وہ اگر وہاں کا شرک کہو کہ اس حرامی ہندو سیٹھ کے ساتھ تمہیں بھی گولی شلی نہیں لگ گئی۔ یہ بدلا جانہ بندہ ہے۔ بہت روج سے ہم اس کے پیچھے تھے۔ بہت بگاڑا ہے ہمارے آگے آگے لیکن کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔“

ہونا سکھ اس وقت بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ وہ لڑکھائی آواز میں بولنے والا بھول سا نوجوان جو تیرھ گھنٹوں کے لیے مکان میں ہمیں آلو بھون بھون کر کھانا کھا رہا تھا اب ہونا سکھ کے اندر رکشیں بگڑائی میں چھپ چکا تھا۔ مجھے پہلے سے شبہ تھا کہ ہونا سکھ جو دکھائی دیتا ہے اور عین ممکن ہے کہ الائی کے گروہ سے اس کا تعلق ہو۔ یا پھر وہ خود ہی الائی ہو۔ اب کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ الائی کے گروہ سے اس کا تعلق ہے۔ وہ الائی کے جیسے کے ساتھ تھا اور ایک ڈاکو کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔

جھوٹے سردار کا نام زرنجن سکھ تھا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”رگونا تھ کے پاس زیور اور نقدی کی شکل میں کافی مال تھا۔ اس کے کپڑوں کی تلاشی میں کچھ نہیں ملا۔ کہاں ہے وہ سب کچھ؟“

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ نوشاد نے یہ ضرور بتایا تھا کہ فلاں کی فروٹ منڈی میں رگونا تھ آڑھت کا کام کرتا ہے اور خاصا امیر غصے ہے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس وقت بھی اس کے پاس رقم ہے؟“

جھوٹا سردار زرنجن سکھ مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں ٹوٹا رہا پھر اس نے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ ”عورت کی تلاشی لو۔“

عورت ایک بار پھر چیخنے چلانے لگی لیکن وہ ایک دیرانے میں تھی اور جن کے قبضے میں تھی وہ خطرناک ڈاکو تھے۔ اس کی پیچ و پکار بے سود رہی۔ ایک شخص نے اڑھٹا لگا

کر اسے نیچے گرادیا اور دوسرا بڑی ”آزادی“ سے اس کی تلاشی لینے لگا۔ چند ہی لمحے بعد وہ سوئی تھیلہ برآمد ہو گیا جس میں نقدی اور زیورات تھیں۔ زرنجن سکھ نے تاریخ کی روشنی میں تھیلے کا جائزہ لینے کے بعد اسے اپنے جینڈ کی ڈب میں اڑس لیا پھر اس نے بالوں سے پکڑ کر عورت کو کھینچا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ ”حرا جادی! فریب کرتی ہے۔ اپنے مخصوص کو دھوکا دیتی ہے۔ ابھی تیری ساری اینٹنگ نکال لوں۔“

اس کی تاریخ کا دوشن دانہ عورت کے چہرے پر تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر بھرپور کے آثار تھے اور بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ زرنجن سکھ نے گرج کر ہونا سکھ سے کہا۔ ”اوئے بونے! نکال جا شراب میرے پیچھے۔“

ہونا سکھ اپنی پل پلنگی ناگوں سے چلا ایک مٹھی گھوڑے کی طرف گیا اور اس کے ساتھ لٹے ہوئے تھیلے میں سے شراب کی بوتل نکال لایا۔ یہ دلا جی شراب تھی۔ زرنجن سکھ نے عورت کے بال تو پہلے ہی مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ اب دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن بھی پکڑ لی۔ ہونا سکھ نے سردار کے حکم پر شراب چلوں میں بھر بھر کر اس عورت کا منہ دھوا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے عورت کا سانولا رنگ جھریوں سمیت غائب ہو گیا۔ اب گھرے گھرے رنگ والی ایک جوان عورت ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ صرف اس کے بالوں میں چاندی جھلک رہی تھی۔ یقیناً یہ چاندی بھی مصنوعی تھی۔ غالباً رنگ وغیرہ لگایا گیا تھا۔ کالک یا اس قسم کی کسی چیز سے رنگ سانولا کر لیتا اور انڈے کے خلل سے جلد پر جھریاں ڈال لیتا زیادہ مشکل کام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر روپ بدلنے والی عورت ہو اور اسے اوزھنی کا سارا بھی میرو تو وہ اپنی شناخت چھپانے کی کامیاب کوشش کر سکتی ہے۔ یہ بھی کوئی نوجوان لڑکی تھی جس نے بھوپ بھر رکھا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ عورت کی چال ڈھال سے شباب کیوں جھلکتا تھا۔

زرنجن سکھ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”دیکھ رہے ہو اس کا اصلی چہرہ۔ تھی تو یہ رگونا تھ کی جتنی ہی پتلی نہیں تیری۔ ابھی تین مہینے پہلے چھنایا تھا اس حرامی نے اسے۔ پیسے کے لالچ میں جینڈ کی برباد کر لی اس حرا جادی نے۔ دھرم بھی گیا اور دنیا بھی۔“

زرنجن سکھ اور اس کے ساتھی روتی جتنی لڑکی کو کھینچتے ہوئے درختوں کے پاس لے گئے۔ ہونا سکھ بھی وہاں چلا گیا۔ پانچ دس منٹ وہ وہاں کھڑے آہیں میں بائیں کرتے رہے۔ وہ ہماری طرف سے بالکل غافل ہو گئے تھے۔ اگر ہم چاہتے تو

اس وقت اپنے ہتھیار برآمد کر کے انہیں آڑے ہاتھوں سے لے سکتے تھے لیکن میرے خیال میں اس مہم جوئی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہونا سکھ کا رویہ ہم سے دوستانہ تھا اور اس کے ساتھیوں نے بھی یہ جاننے کے بعد کہ ہم پاکستانی ہیں اور ہونا سکھ ہمیں پہچانتا ہے، ہم سے نرم رویہ اختیار کر لیا تھا۔

زخمی گھوڑا ایک درخت سے بندھا تھا اور اس کی مسلسل ہشناٹ سے بے قراری کا اظہار ہو رہا تھا۔ گھوڑے کے قریب یہ وہ خشب تھا جہاں رگونا تھ کی لاش پڑی تھی۔ قہوڑی دیر پہلے کا جیتا جاگتا انسان اب خونچکا لاش کی صورت اختیار کرنے کے بعد ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

گھڑسواروں کے درمیان ہونے والے تبادلہ خیال میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ وہ رگونا تھ کی لاش کو اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔ اس کے مڑوہ جسم کو ایک بڑی چادر میں لپیٹ کر ایک گھوڑے کی پشت پر ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھتے گئے۔ یہ منظر بھی اور بابو لیاقت کو ایک بار پھر بے قرار کر گیا۔ کچھ بھی تھا ہر حال یہ عورت اور اس کا خاندان ہماری تحویل میں دیے گئے تھے۔ اب ہمارے سامنے اس نوجوان لڑکی کو سسٹا افراتپے ساتھ لے جا رہے تھے۔ میں نے ہونا سکھ کو پاس بلا کر اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ وہ زپر لب مسکرا کر بولا۔ ”بادشاہو اس لڑکی کے بارے میں فکر مند ہونے کی جلدورت نہیں۔ بالکل محفوظ رہے گی۔“

میں نے کہا۔ ”لگت تو نہیں۔“  
 ”کیا مطلب؟“ ہونا سکھ نے کہا۔

”مطلب یہ کہ وہ ہندو ہے اور ہندو عورت تمہارے لئے قابلِ معافی نہیں۔ میں نے تمہارے گھر میں ہندو ایکڑیوں کی تصویریں دیکھی ہیں جن سے تم انتقام ”محنت“ کرتے ہو۔ اب تو جیتنی جاتی عورت تم لوگوں کے قبضے میں آگئی ہے۔ اگر بے جیسے تم ہو ویسے ہی تمہارے یہ ساتھی بھی ہوں گے۔“

وہ بڑے غصے سے بولے لیجے میں بولا۔ ”یہ گھڑبات ہے لہجے سے گناہوں سے بدلے چکاتے ہیں۔ ہاں۔ جو قصور رہو گا وہ مرد ہو یا عورت۔ ہندو ہو یا اور کسی دھرم کا، ہم ل کو چھوڑیں گے نہیں۔“

”تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ عورت قصور وار نہیں؟“  
 ”ہاں۔ یہی کہنا چاہتا ہوں۔ یہ قصور دار نہیں اور ہندو ل نہیں۔ یہ سکھ لڑکی ہے۔ گوردھپ کو نام ہے اس کا۔“

بس بے وقوف لالچ میں آکر اس بڑے کے تلے سے بندھ گئی۔ اب جینڈی بھر بیٹھ کر کسی ایسے رشتے کو دیکھ گئی۔ میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”اب کیا کرو گے تم لوگ اس سکھ لڑکی کا؟“

”اس کے مانا پچا کے حوالے کریں گے“ اور کیا کریں گے؟“

”کیا اس لڑکی کے لئے تم لوگ رگونا تھ کا بیچا کر رہے تھے؟“

”نہیں۔ یہ ایک اور پکڑ ہے۔ ابھی ان لوگوں کو جانے دو پھر تمہیں بتانا ہوں۔“ اس کا اشارہ اپنے ساتھیوں کی طرف تھا۔

”تم ان لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ جو گھوڑا جتنی ہوا ہے۔ میرا ہی ہے۔ میں اسے آہستہ آہستہ چلا کر ساتھ والے گاؤں میں لے جاؤں گا۔ وہاں ایک جڑا ہے۔ اگر حرام کا خم گاؤں میں ہی ہو تو کوئی نکال دے گا اس کی۔“

میں ابھی بولنے سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن زرنجن سکھ نے اسے آواز دے دی اور وہ اپنی رانی رانگل سنہٹا ہوا اس کی طرف چلا گیا۔ اس کی ٹانگ پر ابھی تک میلی کپڑی تھی۔ بنڈی بھی تھی لیکن ننگراہٹ اب نہ ہونے کے برابر نہ تھی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ہونا سکھ کے تمام ساتھی رگونا تھ کی لاش اور لڑکی سمیت گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں لڑکی کے حوالے سے مجھے ہونا سکھ کی بات پر یقین آ گیا تھا اور یہ توقع تھی کہ وہ بغضات اپنے وارثوں تک پہنچ جائے گی۔ قریب دو چار ایک بار پھر اسی طرح خاموش ہو گئے۔ جس طرح آدھ گھٹنا پہلے تھے۔ گہری خاموشی میں بس کبھی کبھی گھوڑے کی منطرب آواز گونج جاتی تھی۔ زرنجن لڑائی اسی جگہ ساکت کھڑی تھی جہاں رگونا تھ کی موت سے پہلے گھڑسواروں نے اسے روکا تھا۔

ایکا یک مجھے احساس ہوا کہ زرنجن لڑائی رانی نشت پر موجود نہیں۔ میں نے اس کی تلاش میں اوپر اور ہنگامہ دوڑائی۔ بابو لیاقت میری آنکھیں بھانپ کر بولا۔ ”وہ رگونا تھ پر گولی چلتے ہی غائب ہو گیا تھا۔ شاید اب تک کسی بس پر بھی سوار ہو چکا ہو۔“

ایکا ایک یونٹیں بڑے گھٹیں۔ ہم نے ایک ساتھ آسمان کی طرف دیکھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں بادل چپے سے آسمان کو گھیر لیتے ہیں۔ ہم بیٹھتے

سے بچنے کے لئے درختوں کے آہٹھے بونا سکھ بھی دیں آ گیا۔ وہ بابو لیاقت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کئے لگے۔ "جہاں تک میرا اندازا ہے۔ یہ بھرائی آپ کے ساتھیوں میں تو نہیں تھے۔"

"نہیں۔ ان سے بعد میں ملاقات ہوئی ہے۔"

"کہاں؟"

"بابو لیاقت کی جینک میں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ "ہاں یاد آیا۔ بابو لیاقت سے بھی ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "میری تو ہوئی۔ تم بتاؤ تم بھی کبھی ملے ہو؟"

"جس ایک بار ایک جیلے میں دیکھا تھا۔ آئے سانسے کبھی گل بات نہیں ہوئی۔ ویسے ان کے بارے میں مجھے پتا سب کچھ ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آج تمہاری ملاقات بھی کرا دی؟"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "میں سمجھا نہیں؟" اس نے کہا۔

میں نے بابو لیاقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بابو لیاقت صاحب تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔"

وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کی تاریخ کا روشن دائرہ خود بخود بابو لیاقت کے چہرے پر چمکیا تھا۔ چند لمحے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے جلدی سے تاریخ نیچے چمکائی۔

"ہاں بونا سکھ۔ میں ہی لیاقت ہوں۔" بابو لیاقت نے تاکید کی۔ بونا سکھ کے ہاتھ خود بخود نمٹنے کے لئے اٹھ گئے۔

بابو لیاقت نے بھی ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ وہ دونوں چہرے لگے۔

تک رہی کلمات کا تبادلہ کرتے رہے۔ بونا سکھ بابو لیاقت کو اس کٹنے میں اور اس جگہ دیکھ کر سخت حیران تھا۔ وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ ہم کسی خاص پتھر میں یہاں پہنچے ہیں۔ ہر حال اس نے ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے دن سے شہر تھا بونا سکھ کہ تم بہت گھرے بندے ہو۔ آج تمہیں جتنے داروں کے ساتھ دیکھ کر اس بات کا ثبوت مل گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "تھوڑی سی چندگی میں بڑے دکھ اٹھائے ہیں بھرائی۔ اتنے بجم کھا کر بندہ یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر کسی اٹلے پٹلے راستے پر چل پڑتا ہے۔ مہمانی اور ماں کی موت نے مجھے نیم پاگل کر دیا تھا۔ سوئند کھاتا ہوں کہ کبھی کبھی تو مجھے گنتا تھا کہ میرا دم گھٹ جائے گا پھر بتائیں کس طرح میرے ہاتھوں میں آپوں آپ ہندوؤں آئی اور میں رات کے تیرے

میں گھوڑے پر چڑھ کر ادھر ادھر جانے لگا۔"

بابو لیاقت نے پوچھا۔ "سراور لالی کو دیکھا ہے تم نے؟"

"بہت دفعہ۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"یہاں نام سن رکھا ہے اس کا۔ ملاقات ہو سکتی ہے اس سے؟"

"بڑی مشکل ہے بابو۔ آج کل وہ کسی سے نہیں مل رہا۔ بہت دنوں سے گھوڑے پر بھی نہیں چڑھا۔"

"کیوں خیریت ہے؟"

"کچھ بہت ہے۔ بس اس کے موڑ کی بات ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چچا چھوڑا اس بات کو۔ تم رگو تاتھ کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

بابو سکھ نے ایک گہری سانس لے کر تاریخ زمین پر رکھ دی۔ وہ بدستور روشن تھی۔ اس کی روشنی ایک خاص زاویے سے ہونے کے مدقون چہرے پر پڑ رہی تھی۔ بڑا سراور لگ رہا تھا وہ اس منظر میں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ بولا۔ "رگو تاتھ پولیس کا بھرتہ تھا۔ اس راجہ کے ایک مہینہ پہلے بڑا نقصان پہنچایا ہے ہمیں۔ بابو لیاقت صاحب بھی یہاں بیٹھے ہیں۔ ان کو پتا ہی ہے کہ کھالستان کی تحریک کس طرح گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم بھی کھالستان کے لئے کام کرتے ہیں اور وہاں گروئے چاہا تو کرتے رہیں گے۔ فابلا کے گلی گلوں میں ہمارے نوجوان اکثر چنچا وغیرہ بھی جمع کرتے ہیں۔ یہ پیرہ ہتھیار کھریدنے کے کام آتے ہیں اور اس سے ان لوگوں کی مدد بھی کی جاتی ہے جو تحریک کھالستان کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ پچھلے چھ مہینوں میں ہمارے کارکنوں نے فضا اکٹھا کرنے میں بڑی محنت کی تھی۔ آٹھ آٹھ آنے دوپہ دوپہ جوڑ کر انہوں نے کوئی چالیس ہزار جمع کر لے تھا۔ کوئی تیس ہزار دوپہ فیروز پور اور آٹھ آنے دوپہ کی کیٹیوں نے جمع کر کے رکھا تھا۔ یہ ساری رقم ہمارے ایک (ایڈر) گوبال سکھ کالیوالا کے پاس تھی۔ کالیوالا فابلا میں رہتا ہے۔"

ایک رات پولیس کالیوالا اور اس کی بیوی بچوں کو پکڑ کر لے گئی۔ اگر کالیوالا کی اپنی بات ہوئی تو وہ پولیس اور سیکیورٹی فورس کو ایک گھنٹہ نہ بتا تا مگر اس کی جتنی اتنا جیاد حوصلہ نہ کر سکی۔ جب اس کے سامنے اس کے بچے کی روداد ٹانگیں توڑی گئیں اور اسے بٹاکر کے اٹا دکایا گیا تو اس نے سب کچھ بتا دیا۔ پولیس نے چھاپا مار کر سارا فضا اپنے جیبے میں لے لیا اور ہمارے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ دو تین دن بعد ہمیں پتا چلا کہ پولیس نے یہ کارروائی فروٹ مارکیٹ۔

ازمعی رگو تاتھ کی بخری پر کی تھی۔ دوسری طرف رگو تاتھ کو می پتا چل گیا کہ اس کی بخری کا راج کل گیا ہے۔ اسے اپنی بان کا کھنڈہ بڑا تو وہ فابلا سے بھاگ نکلا۔ ہمارے ہندوں نے اس کا پیچھا کیا۔ ایک موقع پر اسے گھر بھی لایا گیا تھا لیکن وہ اپنی گاڑی اور ڈرائیور چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ ہمیں پتا تھا کہ ہاڑ کی طرف گیا ہے۔ ہم رات دن اس کی فوہ میں تھے۔ ارے جتنے کے سارے جوانوں نے پانچ یا دلوں کی سوگند لگائی ہوئی تھی کہ رگو تاتھ کو پار کر کے دم لیں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارے خزانچی کالیوالا کا کیا تھا؟"

وہ ذرا افسردگی سے بولا۔ "جینا گیا تھا۔ ایک مہینے سے جیل میں پڑا ہے۔ بیوی بچے رو رہا۔ بھگ رہے ہیں۔ اصل بھرائی! ہم لوگوں میں حوصلے کی کمی نہیں ہے۔ ہم رف ہتھیاروں اور پیسے کی وجہ سے مار کھا رہے ہیں۔ بنیاد ل غریب ہیں۔ ان میں بہت قوت ہے مگر بیٹ میں روئی ہے نہ ہاتھ میں ہتھیار۔ وہ کھالستان کے لئے جان "دیوتا" ہے ہیں لیکن جان "جانی" کرنا نہیں چاہتے۔"

بابو سکھ ان ضمن حالات کا ذکر کر رہا تھا جن میں لعلتان کے سرگرم حامی اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ بتا رہا تھا کہ فابلا کے گروہ فوٹوں میں یہ تحریک خاطر اور پکڑ سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تحریک چلانے والوں لباس واساں ہوں۔"

نجانے میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے کہا۔ "بونا سکھ! ہزار کے بدلے اگر تمہیں سترائی لاکھ یا اس سے بھی زیادہ نقد مل جائیں تو کیا رہے؟"

وہ غیر یقینی انداز میں مسکراتے لگے۔ "کون دے گا اتنا؟"

"ہم دے گے اور کون دے گا۔"

"شاید تم بھان کر رہے ہو۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"تو پھر لاد۔ پتے کے کام میں اتنی دہری کیوں؟" وہ ہنسا۔

میں نے کہا۔ "زیادہ دہری بھی نہیں ہوگی۔ سمجھو ایک دن کی بات ہے۔"

بابو سکھ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "بھت کھی معاف۔ لیکن بات جورو کوں کا بھرائی۔ ہم منشیات کا پیرہ اس کام میں لگاتے۔"

بابو لیاقت بولا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو پاکستان سے یہاں پہنچا ہے منشیات قسم کی چیز لے کر "بیر"۔"

"میں نے کہنے والا کون ہوتا ہوں گی! لیکن اگر منشیات نہیں تو اور کھتی ہے کیا ہوگی اس میں؟"

"منشیات کے علاوہ کبھی بہت سی جتنی چیزیں ہیں اس دنیا میں۔" میں نے کہا۔ "کبھی نوادرات کے بارے میں سنا ہے؟"

"تو نوادرات؟ کیا جینے ہوتی ہے؟" بونا سکھ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ "وہ بہت پرانی اشیا جو کھنڈروں وغیرہ سے برآمد ہوتی ہیں اور عجیب گھروں میں رکھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں بے حد قیمتی ہوتی ہیں۔"

اب بات بونا سکھ کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ بولا۔ "تو تمہارے رنگ میں اس قسم کا سامان ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ بونا سکھ کی آنکھوں میں ایک خوشگوار سی کیفیت نظر آنے لگی۔ اس نے مجھ سے رنگ کے سامان کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے جن کے میں نے گول مول لیکن تسلی بخش جواب دیے۔ بونا سکھ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بلا ذہین تھا۔ جو بات بتائی جاتی تھی وہ تو سمجھتا ہی تھا۔ جو چھپائی جاتی تھی وہ بھی جان لیتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ہمارے رنگ کا سامان "غیر معمولی" ہے اور وہ اتنا قیمتی ہے کہ اگر ہم اس میں سے سترائی لاکھ کی اشیا بونا سکھ کو دے بھی دیں تو وہ کلاب سے چلو بھرائی نکالنے والی بات ہو گی۔"

میں نے بونا سکھ سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ فرید کوٹ چلے۔ معمولی پس و پیش کے بعد وہ تار ہو گیا۔ اس کا مسئلہ زمین گھوڑے کا تھا۔ ہم نے مل جل کر گھوڑے کو زراں پر چڑھا لیا اور اس مقام سے روانہ ہو گئے جہاں تھوڑی دیر پہلے ایک خونی بنگامہ ہوا تھا۔ بونا سکھ نے فیصلہ کیا کہ وہ گھوڑے کو راستے میں اپنے ایک ساتھی کے حوالے کر دے گا۔ بونا

پانڈی اب رگ گمنی تھی۔ بابو لیاقت کو راستوں سے سبکی تھی اس لئے اس نے ٹرکسٹری ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گھناؤں اندھیرے میں ہمارا سفر بھر شروع ہو گیا۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ پہلے فرید کوٹ جاتے تو مینڈارا پور گاؤں رات بارہ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ لہذا فیصلہ ہوا کہ ہم بڑا راستہ گنڈارا پور جائیں۔ وقت کی بچت کے علاوہ بھی اس میں کئی فائدے تھے۔ فرید کوٹ کی شہری حدود میں کئی جگہ پولیس ٹاکے موجود تھے اور ہم ان ٹاکوں سے حتی الامکان بچنا چاہتے تھے پھر یہ غلط بھی! حق تھا کہ ٹیکڑی ہمارے دشمنوں کی نظر میں ہوگی۔ ہم گنڈارا پور

جانے کے لئے ٹکنری سے روانہ ہوتے تو ہمارے لئے تعاقب کے خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔

فرید کوٹ سے دس بارہ میل ادھر ہی ایک سڑک نمر کے ساتھ ساتھ مسافعاتی علاقے کی طرف جاتی تھی۔ ہم اس سڑک پر سڑک کے کنارے گاؤں جا سکتے تھے۔ گنڈارا اور گاؤں جہاں کسی حوالی میں مصدر اور ولایت ہمارا انتظار کر رہے تھے اور چار پتوں پر حرکت کرنے والا حیرت انگیز راز تاریکی کی چادر اوڑھے جو خواب تھا۔

یوٹا سٹک نے اپنی خود کار راکٹ اور میں نے اپنا پٹل ٹرائی میں ہی ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیے تھے۔ اب ہم چادریں لپیٹے تھے ماندے مزدوروں کی طرح ٹرائی کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ پچھلے چند دنوں میں موسم کی خشکی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ رات کے اس پہر بھی معمولی کپڑوں میں ہمیں کچھ زیادہ سڑی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سڑک کاٹنے کے لئے مینٹکو ایک منڈر حیر ہے۔ ہم بھی مینٹکو کرنے لگے۔ یوٹا سٹک نے ایک بار پھر اپنی زندگی کے سب سے بڑے سانحے کا ذکر چھیڑ دیا۔ اپنی بھالی اور ماں کے وحشیانہ قتل کا بدلہ لینے کے لئے وہ ہمہ وقت ہتھیار بند رہتا تھا۔ اس کی اکثر اسلحہ گھر سے باہر گزرتی تھیں۔ سارا دن گھر میں کھیاں مارنے والا اور نشتے میں دھت ہو کر رہنے والا یوٹا سٹک رات ہوتے ہی ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا، تاریک راستے تپاتا۔ اپنے نشتے داروں کے ساتھ "کاردارائیوں" پر نکلتا۔ پولیس سے آگے چلی کھیلتا اور وہ سب کچھ کرتا جو بھارتی حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کرنے والے سکھ نوجوان کر رہے تھے۔ قانون نافذ کرنے والے تو رہے ایک طرف تیرھ گھنٹہ گاؤں کے رہنے والوں کو بھی ابھی تک خبر نہیں ہوئی تھی کہ بڑوں کا ڈھانچا یہ زرد رو دہوش لڑکا کئے اہلی کہا جاتا ہے، حقیقت میں کیا ہے۔ اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت ہی کہہ سکتا تھا کہ اتنی جلدی مجھے ہونے کی اصلیت کا علم ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی یہ "ظلم" مکمل نہیں تھا۔ نجانے کیوں بار بار کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا کہ ابھی ہونے کے بارے میں میری جانکاری نامکمل ہے۔ وہ جو کچھ نظر آ رہا ہے اس سے بڑھ کر ہے۔ میں نے مینٹکو کا رخ سردار لالی کی طرف موڑ دیا۔ جو سنی ایسا ہوا یوٹا سٹک مضطرب نظر آنے لگا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے یہ موضوع پسند نہیں۔ میں نے ذرا مزاحیہ انداز میں کہا۔ "یار سنا ہے" لالی کی شکل بہت کم لوگوں نے دیکھی ہے، کیسے تم خود ہی تو لالی نہیں ہو؟"

وہ ایک دم قنبحہ مار کر ہنس دیا۔ میرے مزاحیہ انداز کو اب اس نے مزاحیہ انداز سے ہی دیا تھا۔ اگر یہ ادا کا تھی تو لا جواب تھی اور اگر اس نے اپنے کسی اندرون ہی کو چھپانے کی کوشش کی تھی تو یہ حد کا سیلاب کوڑھی تھی۔ ہنسنے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارے دماغ میں یہ بات آئی۔ کیا کہی مجھ جیسا کوئی سردار یا چوہدری دیکھا ہے ہے؟"

میں نے کہا۔ "بچپن میں ہم مار دھاڑے، بھر پور پڑھا کرتے تھے۔ ان میں ایک جاسوسی کہانی عمران سیرز نام سے ہوتی تھی۔ یہ بڑا عجیب کردار تھا۔ دیکھنے میں اے بے کار اور ٹمکا تھا مگر حقیقت میں سیکرٹ سروس کا چیف اپنے ساتھیوں کے درمیان رہتا تھا لیکن اس کے سامنے نہیں جانتے تھے کہ ان کا بھی اس حق سامنے وہ چیف آف جس کے خوف سے ان کی دوشیں ہٹا ہوتی ہیں۔"

وہ بولا۔ "نادلوں اور فلوں کی باتیں اور طرح کی ہیں جی۔ یہ جو جنگی ہے یہ نادلوں سے بہت زیادہ سخت۔ میرے جیسا بندہ تو ہر روز مکر جیتا ہے۔ نادلوں اور فلوں میں ان لوگوں کے ٹمکا ہٹا دکھائے جاتے ہیں جو پولیس قانون سے متعلق لگاتے ہیں۔ ان کا وہ خشر نشتر نہیں دکھایا جو پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ آپ اس چارے کا لیلو لاکو ہی دیکھ لیں۔ ان جالوں نے پہلے ان ٹانگیں توڑیں اور پھر پاؤں سے رتی باندھ کر پھٹتے پھٹتے انکا وہ چھری تلے آنے والے بکسے کی طرح چپٹا چلا اور اس کی چٹی بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر جب اس پانی مانگا تو مٹی کے لوٹے میں پیشاب بھر کر اس کے منہ دیا گیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ ایسا فلوں اور نا میں نہیں ہوتا لیکن جو فلوں اور نادلوں میں ہوتا ہے وہ آج ہوا ہے۔ آج تم نے اس شخص کو جان سے مار ڈالا۔ تمہارے سامنے کا لیلو لاکو زلت اور تکلیف کا سبب بنا ہوا سکتا ہے کسی روز اسی طرح وہ تمہارا ایک راکہ رہا۔ تمہاری داڑھ کے نیچے آجائے جس نے تمہاری بھالی اور کو قتل کیا تھا اور جس کی مرہاتوں سے تمہارا بھائی بیل سڑ رہا ہے۔"

یوٹا سٹک خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھوم گیا۔ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا تو تجربہ ہے یوٹا سٹک کہ کمائیوں اور فلوں میں ہی نہیں حقیقی زندگی میں بھی انگیز اور محب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ میں

خونوں میں اس کا عملی ثبوت بھی تمہیں پیش کروں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں اور تمہارے خالعات کو دیکھ کر اس کی کہ وہ بڑی سنجیدگی سے کی ہے۔ مغرب میں ایک بہت بڑا فنانڈلے والا ہے۔ ستراتی لاکھ روپیہ کوئی ملٹی رلم نہیں ہوتی۔ اس سے تم کم از کم فنانڈلے میں اپنے بہت مضبوطی سے جمانے ہو۔ رائے عامہ ہمارا کر سکتے۔ ہتھیار خرید سکتے ہو رضا کاروں کو تربیت دے سکتے ہو اور سب کچھ کر سکتے ہو جو خالعاتان کے لئے کرنا چاہتے ہو۔ بین رلم فراہم کرنا میرا ذاتی اقدام ہے اور اگر میرے اس فی اقدام سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچا تو میں ذاتی طور پر ایک بڑی خوشی حاصل کروں گا۔"

اندھیرے کے سبب میں یوٹا سٹک کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں دیکھیں ہی روشن ہو رہی ہیں۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "ستراتی لاکھ واقعی چھوٹی رقم نہیں ہے اگر اکتا پیڑہ نہیں جائے تو وہ گرو کی سو گند فنانڈلے میں ہم کا گھر کسی سرکار کو یا کوڑھ یا دوا دلا دیں لیکن۔"

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جیسے تمہیں کیوں دوں گے؟"

"اس لئے کہ تم لوگ جو جدوجہد کر رہے ہو میں اس کے میں ہوں اور تمہارے ساتھ مالی تعاون کرنا چاہتا ہوں۔"

یوٹا سٹک نے گہری سانس لی۔ "واہ گرو کہہ کر جو تم کہہ ہو وہ پورا ہو جائے لیکن بھاری بجی اور کوئی بات یہ نہیں آگئی تھی کہ اس گھبر کو نیم (ہنسن) نہیں کر سکتا۔ چنا کہ کچھ بڑی بے یامیرا باجہ چھوڑا ہے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اتنے میں ٹریکٹر کا کارڈر بلند آواز سے بچنے لگا۔ وہ آدھ پون گھنٹے سے گھر کے باقیات فیم موسیقی چھوڑ رہا تھا۔ اب چالیک کوئی بڑا بڑا تھا اور وہ زور و شور سے بیچا تھا۔ بایلیات سے بند کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اس طرح وہ ٹریکٹر ال کے کل پڑوں سے برآمد ہونے والی تانپندہ یہ اسے پیچھا پیچھا کرنا چاہتا تھا۔ پیندہ یہ آواز تو خیر اس ابھی نہیں تھی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بڑی برائی کے میں چھوٹی برائی قبول کر لی جاتی ہے بایلیات نے بھی اسے گہری موسیقی سننے کا حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔ کوئی فانی کا بیج رہا تھا۔ یہ سو ساک تھا مگر گھٹا تھا کہ میں کا یا کیا ہے اور گانے وائوں میں اشرف المخلوقات

کے علاوہ دیگر مخلوقات بھی شامل ہے۔

میرا ذہن خیالات کے آنے پانے میں الجھنے لگا۔ حالات نے مجھ پر حاشا دکھایا تھا۔ میں جو چند ماہ پہلے لاہور سے خشر شکر کا کھوج لگانے نکلا تھا، ایک ایسے دہلیے تک جا پہنچا تھا جس کی تلاش گزشتہ کئی برسوں سے جاری تھی۔ یہ کمزور روپے کے اثاثہ جات تھے اور ان نوادرات کی قیمت کا تخمینہ بھی لگایا جاتا جو اس سامان میں شامل تھے تو معلوم نہیں اس دہلیے کی مالیت کہاں تک جا پہنچی۔ یہ بیش قیمت سامان کئی عرصے پہلے رحیم یار خان کے گرد و نواح سے اس علاقے میں بھیجا گیا تھا جو اب بھارت میں شامل ہے۔ نامعلوم مرحلوں سے گزر کر یہ سامان جنگ کی بچنے پلے والی حوالی میں جا پہنچا تھا۔ اس سامان کے اصل مالکان نجانے اب کہاں تھے۔ ان میں سے کتنے زندہ تھے اور کتنے مر چکے تھے۔ ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ امریا ان انڈیا کی اولادیں ابھی تک اپنے گمشدہ اثاثوں کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہوں۔ بہر طور ان واقعات کو اب ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ گمان غالب یہی تھا کہ اس سامان کے اصل مالکان مر چکے ہیں اور جو چند ایک حیات ہیں وہ بہت پار کر چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بے شمار دولت لاوارث تھی۔ ایسی دولت پر "فریڈری ایکٹ" کے تحت دریافت کرنے والے کا حق ہوتا ہے لیکن اگر زمین کسی اور شخص کی ہو اور زمین کوئی دوسرا شخص دریافت کرے تو اس کے لئے الگ قانونی تشکیں ہوتی ہیں۔ ایسی دولت میں سے گورنمنٹ بھی اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔ بعض ممالک میں یہ حصہ دو تہائی تک ہوتا ہے۔ بعض یورپی ممالک برطانیہ، فرانس وغیرہ میں ایسے زمینوں کے حوالے سے مفصل قوانین بنائے گئے ہیں۔ (حصول تعلیم کے دوران اس نوع کی معلومات اکثر میری نظر سے گزرتی رہتی تھیں)

میں جانتا تھا کہ اس بے شمار دولت کی حیثیت اور ملکیت کے حوالے سے کئی پیچیدہ سوال سامنے آنے والے ہیں لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ اس وقت اہم سوال جو بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا یہ تھا کہ یہ سامان سرحد پار کسی محفوظ مقام تک کیسے پہنچے۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ ہم ٹریکٹر زائی پر گنڈارا پور کے عشرت فارم پہنچیں۔ وہاں سے ٹرک کا سارا سامان اس زائی پر یا کسی دوسری گاڑی میں منتقل کریں اور بائیں پور نانی اس گاؤں تک پہنچ جائیں جہاں ہم زائی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ گاؤں میں کسار باغ علی میدان محل میں گود پڑے۔ ہم اس کے ساتھ مل کر صندوقوں کا تمام تر سامان گدھوں اور بھالوں پر لاد دیا۔

ازان جانوروں کے بالانوں پر کپڑے یا ٹاٹ وغیرہ کے ٹکڑے رکھ کر اوپر دیت بھردی جاسکے یہ ”ریت“ یا ”ڈارے“ کے پڑھنے پر غلطی سے سر کرنے کے بعد بھڑے نوشاد کے ڈیرے پر پہنچ جاسکے

لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ مجھ پر واضح نہیں تھا۔ خود بابو لیاقت کو بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا کہ نوشاد کے ڈیرے میں سرنگ موجود ہے یا وہ کسی اور ڈیرے سے مال کو سرحد پار پہنچائے گا۔ (ا پھر وہ مجھ سے چپانے کی کوشش کر رہا تھا) بہر طور ایک بات میرے دل میں طے تھی کہ بابو لیاقت مجھ سے غلط ہے اور جو کچھ کر رہا ہے پوری نیک نیتی اور بے غرضی سے کر رہا ہے۔ لاشعوری طور پر اس نے میری پریشانی کو اپنی پریشانی بنالیا تھا۔ جو فیسے داری میرے کندھوں پر تھی وہ اس نے پڑی بھت اور ملاحت سے اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لی تھی اور اب پوری تندی کے ساتھ اس سے عمدہ براہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح کسی کے درد کو اپنا بنا لیتے ہیں۔

نرالی اب گنڈا اور اوپر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پختہ اینٹوں کی یہ سڑک بمشکل پندرہ فٹ چوڑی ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ سڑک کی دونوں جانب بھیتوں کے لاشعوری شہب کی تھیں جن میں کچھ تھیں امید تھی کہ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہم اس ٹرک کے دوہو ہوں گے جس نے کئی روز سے فائنٹا اور فید کوٹ کے گرد و نواح میں تسلسلہ چا رکھا تھا۔ اس ٹرک میں دولت تھی اور اس دولت کو چاہتے وہاں بھی بہت تھے۔ لیکن ”مستقبل“ ہر آنکھ سے پوشیدہ تھا۔ اور چند بانو کے بقول اس نے اس دولت تک پہنچنے کے لئے بڑے دشمن راستے طے کئے تھے اور بے شمار مصائب اٹھائے تھے اور یہی بات یہ ہے کہ ان تشدد مندوں کو تلاش کرنے میں مرکزی کردار اترند بانو نے ہی ادا کیا تھا۔ اس کے اندر دولت کی بھوک تو شاید بچپن سے ہی تھی لیکن بھائی بنوں کی جان لیوا بیماری اور دیگر حالات نے اس بھوک کو چکا کر اتنا تک پہنچا دیا تھا۔

کسی ایسے صاحب جائیداد کی طرح جو لب گور ہونے کے سبب دنیا میں اپنی دلچسپی کھودتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ اپنے ورثا میں سے کس کو کیا دے گا، میں بھی بزم خود ”دولت مند بابا“ بن کر بیٹھ گیا تھا اور سوچ بچار میں مصروف ہو گیا تھا کہ اس دینے میں سے کس کو کیا دینا چاہئے میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر ہم اس دولت کو محفوظ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے اور بھی اس کی تقسیم

کا مرحلہ آیا تو اترند بانو عرف انوکھی پنچھی کو مناسب حصہ جانے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کچھ فیصلے کر لئے تھے مثلاً بابو لیاقت عرف خدا کی خدمت گار کے لئے میرے میں ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ اپنے مسلمان بھائیوں خاص طور پر پاکستانی پریسبیوں کے لئے بابو کے اندر تعاون خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کا حسن سلو صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ پندرہ برس سے بھی کچھ کر رہا تھا اور امید تھی کہ آئندہ گرتا رہے گا۔ اسی طرح ہوتا سکتا تھا۔ نجائے کیوں بار میرے ذہن میں یہ سنسنی خیز خیال آتا تھا کہ ہوتا سکتا ہی ہر لائی ہے خیر۔ وہ لائی تھا یا نہیں۔ میں اس کے بارے ایک دو نوک فیصلہ کر چکا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ باج پور کو پہنچ کر جب ہم رحیم یار خان کے سونگ باشی ساہوکاروں صندوق کھولیں اور سامان بار برداری کے جانوروں پر بلا تو میں ہوتا سکتا ہے کیا ہوا وعدہ پورا کر دوں۔ مجھے یقین تھا صدر اور زریں گل بھی (جو میرے ساتھ اس دینے ”موتی“ بنے ہوئے تھے) ہوتا سکتا ہے مالی تعاون پر اعتراض نہیں کریں گے۔

زریں گل کے بارے میں بھی میرے ذہن میں کچھ ہی ”ٹنک“ خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ زریں گل لالچہ حریفوں تو نہیں تھا لیکن میری اور صدر کی طرح اتنا بے دہی بھی نہیں تھا کہ دولت پانے کی خواہش اس کے دل میں ہوتی۔ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ اتنی ڈھیر ساری د کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں حسین خواب لگی ہیں۔ خوشحال اور مطمئن زندگی کے خواب۔ پڑ آہ شب و روز کے سہنے وہ ان تنگ دست لوگوں میں۔ جنہیں پانی پینے کے لئے روز کوئوں کھودنا پڑا ہے اور وہ علاقے کی سنگناخ زمین میں کوئیں کھودتے کھودتے تھا تھا۔

گنڈا اور اوپر کی طرف ہمارا سفر جاری رہا اور نرالی ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی سفر رہا۔ میں آئندہ کے مختلف پلان ترتیب دیتا رہا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ایک لڑکھڑاتے ہوئے نرالی کی رفتار ایک دم کم ہو گئی۔ میں نے کروٹ دیکھا۔ بھیتوں سے دو افراد نکلیں گرتا نرالی کے سامنے تھے۔ وہ عام دھماکی لباس میں تھے اور ان میں سے ایک ہاتھ میں دو نالی راتھل تھی۔ میں اور ہوتا سکتا جس ”بابو لیاقت“ نے نرالی روک دی۔ کیونکہ راتھل بردار نرالی سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ راتھل بردار کا سامنے

موجھوں والا ایک فریہ اندام سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تارچ تھی۔ اس نے تارچ کی روشنی بڑی بد نظمی سے بابو لیاقت پر اور پھر دونوں پر بھیگی۔ راتھل بردار بابو لیاقت سے بولا۔ ”کہاں سے آئے ہو جوان؟“

بابو لیاقت نے کہا۔ ”یہ سوال تو پولیس والے پوچھتے ہیں یا ڈاکو۔ تم کون ہو؟“

بابو کے رعب دار سنے نے راتھل بردار کو گڑبڑا دیا۔ وہ بولا۔ ”ہمارا رض ہونے کی ضرورت نہیں جوان۔ ہم کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم میں سے کوئی نہال سکتا ہے بابو لیاقت تو نہیں ہے؟“

سرحد پار کرنے کے بعد میں نے ہی نہال سکتا کا نام اختیار کیا تھا۔ لہذا راتھل بردار جن دو افراد کے بارے میں پوچھ رہا تھا وہ میں اور بابو لیاقت تھے۔ بابو نے راتھل بردار سے کہا۔ ”اگر بابو لیاقت میری ہی نام ہو تو؟“

راتھل بردار بولا۔ ”ہم عشرت فارم سے آئے ہیں۔ نروار عشرت صاحب نے بھیج کر کہا ہے ہمیں۔ شام چوبیس سے یہاں کھڑے ہیں۔ ہمیں نہال سکتا اور بابو لیاقت نام کے دو سامان کو فارم پر لے جانا ہے۔“

اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ نروار عشرت کی کاہنہ تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ بابو لیاقت بھی ہے اور یہ کہ ہم نرکار نرالی پر آ رہے ہیں۔

راتھل بردار نے کہا۔ ”میرا نام محمد خاں ہے۔ شام پانچ بجے عشرت صاحب نے بابو لیاقت کو فیکٹری میں فون کیا تھا۔ ہاں سے پتا چلا کہ بابو لیاقت اور نہال صاحب گیارہ بجے لگے ہوئے ہیں اور ابھی تک وہاں نہیں آئے ہو سکتا ہے لہذا وہاں گئے ہیں وہاں سے سیدھے عشرت فارم ہی آئیں۔“

صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ ہم نے اپنے دونوں زبانوں کو نرکار نرالی پر سوار کر لیا۔ وہ ہمارے گھٹنے دیکھ کر ان ہونے لگے لیکن ہماری بول چال سے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم نے ہمیں بدل دیا ہے۔ محمد خاں نے ہم سے ہانچ کر ہم نے اتنی دیر کیوں گادی ہے۔ میں نے اسے نرکار ”نرکاری“ کے بارے میں بتایا۔ جس جگہ ہمیں روکا گیا تھا اس نے عشرت فارم دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا لیکن محمد فارم دو شاد کٹ استعمال کر کے ہمیں صرف پانچ منٹ فارم پر لے گئے۔ دوسری سے ہمیں فارم کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں ایک چمچل فارم تھا جو کم از کم میں ایکڑ رہے میں

بھیلا ہوا تھا۔ ایک ایک ایکڑ رہے کے قریب اندر تالاب تھے جن کے درمیان کشادہ راستے بنا کر ڈنگے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ فارم کی حد بندی بالسی اور بابو لڑ کے پودوں کی گئی تھی۔ بڑا لگاؤ، نواز منظر تھا لیکن تاریکی کے سبب ہم اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ فارم کی حد بندی کے ساتھ چھوٹے کھائی ہماری نرالی ایک بلند چار دیواری کے سامنے پہنچی۔ یہاں ایک بڑا آہنی گیٹ لگا تھا۔ یہی نروار عشرت کا ڈیرا تھا۔ فارم کے برعکس ڈیرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ راتھل بردار محمد خاں نے نرکار سے اتر کر آہنی گیٹ پر دستک دی۔ دستک کے باوجود گیٹ نہیں کھلا تو محمد خاں نے

جب سے چالی نکال کر ایک چھوٹا دروازہ کھولا اور اس کے راستے اندر جا کر گیٹ کھول دیا۔ ہم نرالی اندر لیتے چلے گئے۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا جس کے مختلف حصوں میں سبزیاں، پھول اور پھل وغیرہ کاشت کئے گئے تھے۔ قریب ہی ایک پختہ شینڈلے ایک چپ اور دوئی نرکار کھڑا تھا۔ یقیناً یہ دو نرکار تھا جس پر چند دو پہلے ڈس گل پرانے گرد و اسے آیا تھا۔ ڈیرا ایک کرا سرا ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ احاطے کے علاوہ اندر کی عمارت میں بھی کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔

یہ بے شمار محرمی دونوں والی دو منزلہ عمارت تھی۔ تاریکی میں اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ شہری طرز کی عمارت ہے، دھماکی طرز کی یا دونوں طرز کی۔ اچانک موجھوں والے کی نواز نے ہمیں بڑی طرح چونکا دیا۔ وہ محمد خاں سے پوچھ رہا تھا۔ ”ٹرک کہاں گیا چاچا؟“ یہ معمولی سا سوال ہمارے لئے کسی بڑے دھماکے سے کم نہیں تھا۔

محمد خاں اٹھے ہوئے لیجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے پچھواڑے کھڑا کر دیا گیا ہو گا۔“

پھر وہ تیز قدموں سے عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ عمارت کا کلاوا کاٹ کر وہ پچھواڑے کی طرف گیا اور زیادہ تیز قدموں سے واپس آگیا۔ ”تیر سکتا! لڑک تو وہاں بھی نہیں ہے۔“ اس نے موجھوں والے کو اطلاع دی۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں پریشانی تھی۔

میں ہوتا سکتا اور بابو لیاقت چلتا تھیں لگا کر نرالی سے اترے۔ ”کہاں کھڑا تھا ٹرک؟“ میں نے محمد خاں سے پوچھا۔ ”وہ سامنے پھولاری کی پرلی طرف۔“

”عشرت صاحب اور دو بچن سکتا وغیرہ کہاں ہیں؟“

”ابھی تو کسی نے ملاقات نہیں ہوئی۔“

پھر وہ عمارت کی طرف رخ کر کے کسی کا کھٹکے کو آوازیں دینے لگا۔ ”کاٹا سکتا۔ او کاٹا سکتا۔ کہاں چلے گئے



ہو غم سب

جب جواب نہیں آیا تو وہ کچھ اور گھبرا گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”منہاں صاحب! اچھے لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ منہدار صاحب کی نئی گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ نہ ہی چوکیدار کا کچھ پتا ہے۔“

یوٹاٹھ دوڑ کر زانی کی طرف گیا اور اپنی خود کار رائلٹ نکال لایا۔ میں اپنا پستول پہلے ہی نکال چکا تھا۔ مونچھ بردار بتر سنگھ نے آگے بڑھ کر عمارت کے بیرونی حصوں میں لائٹس آن کیں اور پھر ہم سب کو چوکنڈا پڑا۔ عمارت کے داخلی دروازے کے عین سامنے کوئی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ ایک جال میں پلٹا ہوا تھا اور کسی بڑی چھلی کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر محمد خاں چچا۔ ”ماٹھے۔ ماٹھے۔“

وہ دوڑ کر اس کی طرف گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے لپکے۔ کمرے ہوئے شخص کو سیدھا کیا گیا۔ اس کے ماتھے پر کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ مضبوط کوندہ دیکھ کر جرت ہوتی تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن اس کی سانس چل رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے اس پر جال پھینک کر نیچے گرایا گیا تھا پھر وارکر کے زخمی کر دیا گیا تھا۔

جو بھی ہم برآمدے سے گزر کر اندرونی حصے میں پہنچے ایک جالی دار دروازے کے پاس ایک اہل میشن کتے کی نیم نیم لاش نظر آئی۔ اس کتے کی گردن قریب ہونے والے کمرے کی طرح تکی ہوئی تھی۔ کتے کے جڑے میں کسی سرخ پتے کی دھجی تھی اور اس کی شہ رگ سے بننے والا خون اچھی جاتھانہ ہی سیای مائل ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے ابھی توڑی دیر پہلے ہوا ہے۔ تیس چالیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا پہلے۔ محمد خاں چچا نے یزیدوں کی طرف بھاگا۔ ”منہدار صاحب جی۔ منہدار صاحب۔“

”رک جاؤ محمد خاں! میں نے بلند آواز سے کہا۔ وہ ٹھنک کر رک گیا۔ اس کا یوں اندھا بھند یزیدوں پر چڑھنا دیکھنا تھا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔ ”اوپر جانے کا اور کون سا راستہ ہے؟“

وہ بولا۔ ”پچھلی جانب چھوٹی سیڑھیاں ہیں۔“ ”تو میرے ساتھ۔“ میں نے اس کا بازو تھاما۔ بابو لیاقت بھی میرے پیچھے آیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے یوٹاٹھ دوڑ کر موٹھوں والے بتر سنگھ سے کہا کہ وہ دونوں سیڑھوں کی پوزیشن لے لیں۔ کوئی اس طرف بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے روکیں۔ اگر کوئی ایسی ہو تو بے

ٹھک گئی چلا دیں۔ میں اور محمد خاں بڑی احتیاط لیکن تیز سے عمارت کے پنجواڑے پہنچے۔ یہ عمارت شہری اور دروازے پر طعیر کا گلا ٹھاننا نہ تھی۔ بالکل جیسے دھوئی کے اوپر کوہ پستال ہو اور ٹائی کے ساتھ ساتھ سر پہنچی بھی باندھی ہو۔ جاگیر دارانہ ماحول میں ایسی عمارتیں اکثر دیکھنے میں آتیں۔ ہم معنی دینے پر پہنچے۔

”کوئی ہے!“ محمد خاں نے دو تین مرتبہ بلند آواز۔

کہا۔ کہیں آہٹ ہوئی نہ کوئی آواز آئی۔ چار سو گھر خاموشی تھی۔ جیسے فارم کی اس عمارت میں بھی پھیلیاں رہتی ہوں جو نہ بولتی ہیں اور نہ پانی کے نیچے حرکت کرتی آتی ہیں۔ میں نے احتیاط سے زینے چڑھنے شروع کیے میرے عقب میں محمد خاں اور اس کے پہلو میں بابو لیاقت تھا۔ ہم تینوں مسخ تھے ابھی نصف زینے ہی طے ہوئے۔ کہ میری پچھلی حس ایک اہم اعلان کرنے لگی۔ عمارت بالائی منزل پر کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ میں نے باقی زینے خاصی تیزی سے عبور کیے اور اوپر پہنچا۔ یہاں تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں مجھے ہوئے گوشت کی مسک تھام محمد خاں نے آگے بڑھ کر سوچ تلاش کیا اور لاش روشن دی۔ ہم ایک بال نما کمرے میں کمرے تھے۔ فرش پر قاتین بچا تھا اور دسترخوان لگا ہوا تھا۔ چھلی کا سالن، قور تکی ہوئی چھلی، چاول، گتے کے رس کی کھیر اور معلوم نہیں کچھ نظر آ رہا تھا مگر سب کچھ بری طرح اڑا پڑا تھا! لگتا تھا کہ اس دسترخوان پر انسانوں نے نہیں چاندروں کھایا ہے۔ روٹیوں کی چیر چاڑ، سلاڈ کی بے رحمی، سائز ضیاع، برتنوں کی توڑ پھوڑ، ہرے ہوئی یہاں نظر آ رہی تھی۔ میں نے چائے کی ایک کیتلی کو چھوا۔ وہ ابھی نیم تھی۔

ہم اس بال نما کمرے سے آگے بڑھے تو عمارت نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ یہاں بھی قاتین بچا تھا اور گاؤں لگے تھے۔ اس کمرے کی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ رقص و سرور کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہوں گی۔ کمرے کی شیشے کی ایک بڑی الماری تھی۔ اس میں شراب اور پتے بوتلیں اور تنباکے شیشے والے جام رکھے تھے۔ الماری ایک برا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے شراب بوتلیں نکالی گئی ہیں۔ اس ٹوٹ چوٹ کے سوا کمرے میں اور کڑبڑ نہیں تھی لیکن ایک چیز دیکھ کر میں بڑی طرح حیرت میں آیا۔ یہاں میرے علاوہ بابو لیاقت اور محمد خاں بھی چڑھے

گئے وہ چیز ایسی تھی۔ شیشے کی الماری کے پاس پلائی ووڈ کے ایک دروازے میں تھوڑا سا پتہ تھا۔ پلائی ووڈ کے دروازے اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ لہذا تیر کی الٹی آریا ہو گئی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کوئی اور قاتلی ذکر نہ نظر میں آئی۔ اسی دوران پہنچے سے موٹھوں والے بتر سنگھ نے زور زور سے چٹخا شروع کر دیا۔ وہ محمد خاں کو آوازیں دے رہا تھا۔ ہم نے نشست گاہ اور طعام گاہ کے دروازے باہر سے بند کر دیے اور سامنے والے بڑے زخموں سے اتر کر بیٹھے۔ بتر سنگھ یزیدوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ قحط تھا اور ہاتھ منبوطی سے ایک رائلٹ پر تھے۔ محمد خاں کو دیکھتے ہی اس نے بائیں جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ”چاپا! ہمیں وہاں بندھی بڑی ہے۔“

ہم محمد خاں اور بتر سنگھ کے پیچھے ایک اندرونی کمرے میں پہنچے اور لرز کر رہ گئے۔ بتر سنگھ نے بے وقوفی کی تھی۔ اس نے ایک لڑکی کو بالکل بے پردہ حالت میں دیکھا تھا اور اب ہم کو بھی یہ منظر دکھانے لے آیا تھا۔ وہ چاہتا تو کسی کپڑے یا چادر سے اس بے ہوش لڑکی کو ڈھانپ سکتا تھا۔ اس لڑکی کو بڑی بے دردی سے ایک چارپائی کی اوڑاس سے باندھ کر ایک بستر پر ڈالا گیا تھا۔ خون ٹھہرنے سے بے چاری کے ہاتھ پاؤں نیلے ہو رہے تھے۔ اس کے جسم پر بچا ہوا دند کی نشانات تھے۔ یوں لگا جیسے میں ایک اور اڑا پڑا دسترخوان دیکھ رہا ہوں۔ جیسے دسترخوان پر نیدوں کی طرح حملہ کیا گیا تھا۔ اس انسانی جسم کو بھی دو شیانہ انداز میں منبوطا کیا تھا۔ میں نے بستر کی چادر سے بے ہوش لڑکی کو ڈھانپ دیا۔ محمد خاں کہتے ہوئے بولا۔ ”یہ گوشتی ہے۔ منہدار صاحب کے سب سے پرانے ملازم شریف بابا کی بیٹی ہے۔“

کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ ایک دو منٹ میں لڑکی وحش میں آئی۔ وہ ہراساں لگا ہوں سے ایک ایک کا چوہہ کچھ بیٹھی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے زخمی ہونٹ لرز رہے ہیں، پیٹ میں ایک علامت پر ہاتھ تھا۔ وہ کچھ کتا چاہتی تھی لیکن کمرے میں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت دوہرے ہوئے تو دونوں مایوس تھیں۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کچھ تو بتا۔ کہاں گئے منہدار صاحب! اور وہ صمان۔ اور باقی سب لوگ؟“

بتر سنگھ کے ہونٹ لرز رہے۔ اس کی آنکھوں میں سوؤں کی چمک تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک بندھے

تھے اور ہم میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ چادر ہٹا کر اس کی بندشیں کھول دیتے۔ اس میں اس کی نگاہ بتر سنگھ پر پڑی۔ وہ خاں کے پیچھے کھڑا تھا۔ بتر سنگھ کو دیکھتے ہی ہتھوڑے جڑے جیسے موت کی زردی لہرائی۔ وہ نہ کھول کر اسے دلدوز انداز میں چینی کے دو دیوار کا پتہ لگے۔ اس پر جیسے بیٹھ گیا کہ وہ رہ گیا تھا۔ ایک دم اس نے بستر سے اٹھنے اور اترنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے روک کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ پچھلے لئے تڑپتی چلتی رہی پھر اس کی آنکھیں الٹ گئیں اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔

میں نے بتر سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ پیکا پڑ گیا تھا۔ میں نے محمد خاں سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

وہ بولا۔ ”م۔ میرے دوست کا بیٹا ہے۔ میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ فارم پر کام بھی کرتا ہے۔“

یوٹاٹھ اور بابو لیاقت نے بھی وہ سب کچھ دیکھا تھا جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ وہ دونوں بھی بتر سنگھ کی طرف سے چوکس ہو گئے تھے۔

یہ واقعات جس عمارت میں ہوئے تھے وہ منڈارا پور کی اصل آبادی سے کوئی چار فرلانگ دور تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پائی تھی۔ میں نے یوٹاٹھ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”ہوئے! تمہیں رتبہ۔ بتر سنگھ پر خاص نگاہ رکھو۔ اس کو یہاں سے کھٹکے نہیں دیتا۔ کسی بھی صورت۔“

یوٹاٹھ نے طبیعی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے بابو لیاقت کو ساتھ لیا اور دوڑتا ہوا مین گیٹ کی طرف آیا۔ مین گیٹ کے پاس ہی دو پختہ شیشے تھا جہاں زیکٹر اور جب کھڑی تھی۔ میں نے جب کے دروازوں پر کوشش کی۔ خوش قسمتی سے ایک دروازہ کھلا مل گیا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے تاریں جوڑ کر میں نے جب کے نشانات کر لے۔ اس میں کافی پتھریل موجود تھا۔ میں نے جب کو تیزی سے موزا اور عسرت فارم کی عمارت سے نکل آیا۔

تمام شواہد بتا رہے تھے کہ اس ڈیرے پر جو کچھ ہوا ہے

تھے ان نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ترک کا سرخ جنوبی  
سمت میں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتا چلتا تھا کہ ترک کے  
آگے یا پیچھے ایک اور گاڑی بھی ڈیرے سے لٹکی ہے۔ ڈیرہ  
دور فلانگ تھا۔ ہم ان نشانات کے سارے چلتے رہے پھر نیم  
پنٹر راستے پر نشانات ہم سے جدا ہو گئے۔

شاید میری زندگی کی تیز ترین ڈرائیونگ تھی۔ انتہائی  
خراب راہ پر ہم نے انتہائی رفتار سے جب دوڑائی اور  
دور تک گیا لیکن ترک کے آگے نظر نہیں آئے۔ بالولیات  
نے کہا۔ ”نہا، جہاں صاحب! یہاں پاس ہی میرے ایک  
گجراتی دوست کا رست باؤس ہے۔ وہ سامنے کیٹ نظر آ رہا  
ہے اس کا یہاں ٹیلیفون بھی موجود ہے۔ میں اپنے آدمیوں  
کو کال کرتا ہوں۔ یہ وقت بے حد قیمتی ہے۔ ہمیں اپنا پوری  
طاقت سے ترک کو تلاش کرنا ہوگا۔“

بالولیات نے مناسب بات کی تھی۔ میں نے اسے  
رست باؤس کے سامنے اتار دیا اور خود جب لے کر آگے  
بڑھ گیا۔ جنوبی سمت میں پناہ گم رہنے کے بعد میں نے دیگر  
اطراف میں نشست آزمائی کا فیصلہ کیا۔ میں پنٹر راستے سے  
اتر آیا اور ان کچے کچے راستوں کو کھٹکاتے لگا جو گزرا اور  
کے چاروں طرف جال کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ

رک کر میسرانوں اور راہ گیروں سے پوچھتا بھی رہا۔ ایک  
گھڑ سوار کسان نے مجھے ترک کا سراغ بھی دیا لیکن یہ سراغ  
نتیجہ خیر نہ تھا۔ نہیں ہو سکا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں میں نے قریب  
ایسی کھلی میڑ چھپ چلائی۔ قرب و جوار کے کئی گاؤں دیکھے۔

کھیتوں کے درمیان واقع ڈیروں پر نگاہ دوڑائی اور ہراس  
جگہ پہنچا جہاں ایک ترک نظر سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ یہ تمام  
کوششیں رائگاں چکیں اور رات کوئی ایک بجے میں عسرت  
فارم میں اچس پہنچ گیا۔ واپس کے راستے میں مجھے دو تین  
گاڑیاں بھی ملیں۔ ان میں سے ایک جیب کو میں بچان گیا۔  
وہ بالولیات کی ٹیکڈری سے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ باو  
لیاقت کے کاندے بھی ترک کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔

عسرت فارم میں چائے دوچند بوٹا تنگ بوئے حوصلے سے  
ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ بالولیات ابھی تک  
واپس نہیں آیا۔ بوٹا تنگ نے ہوشیاری دکھائی تھی اور تیرنگھ  
کو محمد خاں سمیت ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا  
دیا تھا۔ اس کے پاس ہمارے لئے ایک بڑی اطلاع بھی تھی۔  
”اطلاع“ ایک لاش کی صورت برآمدے کے نزدیک  
گھر سے میں پڑی تھی۔ یہ اس چوکیدار کی لاش تھی جس کی  
پیشانی پر تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ ہر وقت ملتی امداد نہ

ملنے سے وہ جاں بحق ہو گیا تھا۔ لیکن شاید ملتی امداد مل بھی  
جاتی تو وہ جانبر نہ ہو سکتا۔ اس کا زخم عام زخم نہیں تھا۔ میں وہ  
ٹھکانا دیکھ کر ہی شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب میں نے ایک  
بار پھر روشنی میں اچھی طرح زخم کا معائنہ کیا۔ زخم کے  
اورد گرد جلد کا رنگ نیلگوں ہو چکا تھا اور زخم کے کنارے سفید  
پڑ رہے تھے۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ مقتول کو جس  
ٹھکانے یا برتے وغیرہ سے زخمی کیا گیا ہے وہ وہیں ہی بچا ہوا  
تھا۔ ایسے زہرا کا جستیار کا معمولی کٹ بھی جان لیوا ثابت ہو  
سکتا ہے۔ یہ تو اچھا بھلا ٹھکانہ تھا۔ اہل سیشن کتے کا زخم بھی  
ایسے ہی شاہد پیش کر رہا تھا۔ پھر وہ تیر جو بالائی منزل کے  
دروازے میں پوسٹ تھا۔ کچھ عجیب سی نشانیاں چھوڑ گئے  
تھے اس فارم میں کھٹنے والے اور اس انتہائی اہم واقعے کی  
شاہد وہ بد نصیب لڑکی تھی جس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی  
تھی۔

مجھے صندوق کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے بار بار  
تاکید کی تھی کہ ہم شک فارم میں پہنچ جائیں۔ شاید اس  
تاکید کے پیچھے کوئی خوف یا اندیشہ تھا پھر صندوق کا ایک فقرہ  
میری ساعت میں گونج اٹھا۔ ”نجانے کیوں یہ فقرہ میرے ذہن  
میں اب تک اٹکا ہوا تھا۔ اس فقرے میں صندوق نے میرے  
لے پہلی بار ایک ناقب استعمال کیا تھا۔ میں نے صندوق سے  
پوچھا تھا کہ اس نے دوسری بار ٹیلیفون کیوں کیا ہے۔ گزرا  
نور میں سب ٹھیک تو ہے؟“ صندوق نے جواب دیا تھا۔ ”آپ  
بالکل بے فکر رہیں استاد جی سب ٹھیک ہے۔“

اس نے اب تک کی رفاقت میں مجھے شاہ جہاں کے نام  
سے پکارا تھا۔ اس کی زبان سے ”استاد جی“ کا لقب مجھے  
عجب لگا تھا۔ کہیں اس نے یہ لقب استعمال کر کے اپنے قتل  
بخش فقرے کی نفی تو نہیں کی تھی؟ میں ممکن تھا کہ اس لقب  
کے ذریعے اس نے مجھے سرخ جی دکھانے کی کوشش کی ہو۔  
میں جتنا سوچ رہا تھا اتنی ہی الجھ رہا تھا۔ یہ سوچنا بھی سوانہ  
روح تھا کہ نامعلوم لوگ ترک ہمارے ہاتھوں سے نکال کر  
لے گئے ہیں لیکن سوچنا پڑ رہا تھا۔ آٹھ بند کر لینے کے باوجود  
ہمارا اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور حقیقت جھٹلانے سے افسان  
نہیں بن جاتی۔ بہت سے سوال ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ آخر  
کون تھے وہ لوگ جنہوں نے یہ شب خون مارا تھا۔ شام چو  
بجے سے رات دس بجے کے درمیان اس ڈیرے میں کیا واقعہ  
رونا ہوا تھا جس کے بعد مسمان اور ان کا سامان اس ڈیرے  
سے غائب ہو گیا بلکہ میدان بھی نڈا رو تھے سب سے بڑ  
مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ایک قتل بھی ہو چکا تھا۔ چوکیدار کی موت

زیادہ دور راز نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دن چڑھنے  
سے پہلے ہی فہرور عسرت کا کوئی ملازم یا عزیز پولیس لے کر  
یہاں پہنچ جاتا۔ ضروری تھا کہ ہم جتنی دیر اس فارم میں رہیں  
پوری طرح چوس کر دیں اور صبح ہونے سے پہلے یہاں سے  
نکل جائیں۔

ہماری نگاہ میں تیرنگھ نامی نوجوان مشیر ٹھہر چکا تھا۔  
اسے دیکھ کر جس طرح بد نصیب لڑکی نے چچیں ماری تھیں  
اور ہوش کھوئے تھے وہ منظر نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔  
میں نے بوٹا تنگ کو ساتھ لیا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں محمد  
خاں اور تیرنگھ کو بند کیا گیا تھا۔ وہ دونوں غیر مسلح تھے جب کہ  
ہم دونوں مسلح تھے۔ میں نے تیرنگھ کو بوٹا تنگ کی عمرانی میں  
باہر بھیج دیا اور محمد خاں سے پوچھ بچھ شروع کی۔ محمد خاں نے  
بتایا کہ شام چھ بجے کے قریب وہ اور تیرنگھ ڈیرے سے روانہ  
ہوئے تھے۔ اس وقت تک گتوں والا ترک ڈیرے پر موجود  
تھا۔ ترک کے پاس ہی لان میں فہرور صاحب اور دین  
صاحب کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتے  
تھے۔ فہرور صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ ہم پہلے پہنچ جائیں  
اور جھٹی ٹرنکٹر ٹرائی یا کسی دوسری گاڑی پر مسمان آئیں  
انہیں لے کر ڈیرے پر پہنچ جائیں۔

میں نے پوچھا۔ ”تم نے مسمانوں کو شناخت کیسے کرنا  
تھا؟“

”اس طرف بہت کم گاڑیاں آتی ہیں۔“ محمد خاں نے  
کہا۔ ”شام چھ بجے سے رات دس بجے تک صرف دوڑا لیاں  
اور تین دوسری گاڑیاں پہلے پر سے گزری تھیں۔ ہم ہر ایک کو  
روک کر نام پتا پوچھ لیتے تھے۔ دس بجے کے قریب ہم باؤس  
ہو کر واپس لوٹنے والے تھے جب آپ کی ٹرنکٹر ٹرائی نظر  
آئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”شام چھ اور دس کے درمیان تیرنگھ  
کیس گیا تھا؟“

محمد خاں کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ بولا۔ ”میں  
مبھوت نہیں ہوں گا۔ ساڑھے آٹھ نو بجے کے قریب تیر  
نگھ صرف دس پندرہ منٹ کے لئے تیرنگھ میں گیا تھا۔ اسے  
حالت ہو رہی تھی۔ اس دوران میں پہلے ہی موجود رہا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”دس پندرہ منٹ کے لئے کیا زیادہ؟“

”زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹا ہو گا جی“ اس سے زیادہ

نہیں۔“

سکتا ہے؟“

وہ زور زور سے نفی میں سرملانے لگا۔ ”نہیں جی! تیرایا  
انسان نہیں ہے۔ وہ تو کام سے کام رکھنے والا لڑکا ہے۔ فارم  
میں پھیلیں کو خوراک ڈالتا ہے۔ یہاں پندرہ سولہ تالاب  
ہیں۔ صبح سے شام تک کام میں مبتلا رہتا ہے پھر تھک ہار کر  
فارم پر ہی سو رہتا ہے۔ کوئی بڑی علت نہیں ہے اسے۔ یادی  
دوستی سے کوسوں دور رہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ شادی شدہ ہے؟“ اس کا جواب محمد  
خاں نے نفی میں دیا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے دیکھا ہی ہے کہ  
ملازم لڑکی اس کی صورت دیکھ کر کس طرح چیخنے چلانے لگی  
تھی۔“

”وہ اپنے حواس میں نہیں ہے جی۔ مدد سے پاگل  
ہو رہی ہے بے چاری۔“ محمد خاں نے مفاہی پیش کی۔

”لیکن ہم پاگل نہیں ہیں۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ دیکھ  
رہے ہیں۔“

میں نے محمد خاں کو باہر بھیج کر تیرنگھ کو اندر بلا دیا۔ اس  
کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی ہماری ہم عمر موٹھیں  
اور ان کے نیچے سانولے سلونے بھڑ۔ ہونٹ تھے۔ عمر  
بیشکل میں بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا سخت  
مند نوجوان تھا لیکن اس وقت چہرے پر نرمی چھائی ہوئی  
تھی۔ یہ بات اب اس کے لئے ذہنی چھپی نہیں تھی کہ اس  
پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے پولیس والوں کا مخصوص حربہ  
استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”تیرنگھ! اچھاپانے سے کچھ حاصل  
نہیں۔ تمہارے چاہنے کے جو کچھ بتا رہا ہے وہ تمہیں ہتھکڑی  
لگوانے اور جیل پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ ہر حال میں  
تمہاری زبان سے سنا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم  
تمہارے ساتھ کوئی رعایت کریں تو یہ اس صورت میں ممکن  
ہے کہ سب کچھ صاف صاف کہ دو۔“

میرے انداز نے اسے گزرا دیا۔ اس نے پہلے تو ہوشیار  
بننے کی کوشش کی لیکن پھر ذرا ہچکل گیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ بات  
ٹھیک ہے جی کہ مجھ پر اچھی لگتی تھی۔ میں ایک دو بار  
اس سے ملا بھی ہوں لیکن اس کے ساتھ ایسی شرمناک  
حرکت کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر کتے ”موتی“ کا  
حشر ترک کا غائب ہو جانا اور کاکا تنگ کا قتل۔ میری تو سمجھ  
میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شروع شروع میں کسی جرم کی سمجھ میں  
کچھ نہیں آتا۔ تمہارے چاہنے کا کہنا ہے کہ تم پہلے اس کے  
ساتھ گئے تھے لیکن پھر کام کا بہانہ کر کے وہاں سے آگئے اور

آٹھ بجے کے گئے ہوئے دس بجے کے لگ بھگ لوٹے۔  
میں نے ہوشی بات کر دی تھی لیکن تیرنٹا نے پر لگا۔  
سنگھ بولا۔ "میں تمہیں میں گیا تھا لیکن واپسی پر تمہوڑی دیر کے  
لئے اپنے بار دربارے کے نیوب دیل پر رگ گیا تھا۔ بلکہ  
اس نے زبردستی روک لیا تھا مجھے۔"  
"کتنی دیر اس کے پاس بیٹھے؟"  
"کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹا۔"

میاں محمد خاں اور بتر سنگھ کے بیانات میں تضاد تھا۔ محمد  
خاں کہہ رہا تھا کہ وہ بد شکل بندہ میں منٹ کے لئے بل سے  
گیا تھا جبکہ بتر سنگھ اعتراف کر رہا تھا کہ وہ دو گھنٹے بل سے  
غائب رہا ہے۔ ان دو گھنٹوں میں بہت کچھ ہو سکتا تھا اور ممکن  
تھا کہ بتر سنگھ نے بہت کچھ کیا بھی ہو۔ وہ ہر قسم کے موقع سے  
فائدہ اٹھانے والا شخص نظر آتا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے ساتھ سختی سے پوچھ گچھ کی  
جائے میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی اور  
اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ زور دولا تھا لیکن لڑائی لڑائی میں  
باہر نہیں تھا۔ میں نے ہسٹول اپنے تہ بند کی ڈب میں ڈال کر  
اس کو ٹھوکوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ تمہوڑی دیر تو  
خاموشی سے مار کھاتا رہا پھر چیخنے چلانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ  
مار کھانے کے بعد وہ ڈھیلے پڑ جائے گا لیکن معاملہ الٹ ہوا۔  
اس میں ایک عجیب سی دھماکی خود سری آگئی۔ چیخ چکر کہنے لگا  
"اروہ! مارو جان سے مار دو مجھے" میں کچھ نہیں بتاؤں گا  
کچھ نہیں۔

پھر وہ نیم جان ہو کر فرش پر گر گیا۔ اس کے منہ اور  
فنتوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جب میں بتر سنگھ سے تفتیش  
کرنے میں مصروف تھا، بابو لیاقت واپس عسرت فارم پر پہنچ  
چکا تھا اور اب وہ اور بوٹا سنگھ وغیرہ ڈیرے کے طول و عرض  
سے شواہد اکٹھا کر رہے تھے۔ انہوں نے آکر مجھے بتایا کہ بالائی  
منزل سے ایک اور ختم ملا ہے۔ یہ ایک ہسٹر کے فوم میں گھسا  
ہوا تھا۔ تیر کی ساخت پہلے تیر جیسی تھی۔ اندازہ لگانا مشکل  
تھا کہ اسے کسی "بروگن" سے چلا گیا ہے یا مکان سے۔ اس  
کے علاوہ قالین اور برآمدے میں خون کے دھبے موجود تھے۔  
یہ دیکھتے ہی اس جتنے شہنشاہ تھے جہاں ہنورا عسرت کی بی  
کار کوڑی تھی۔ ٹائلوں کے نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ  
ٹرک کے پیچھے پیچھے کار بھی ڈیرے سے نکلی ہے۔ اس کے  
علاوہ کسی میری گاڑی کے نشانات نہیں ملے تھے۔ اور میاں  
یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ حملہ آور کس گاڑی میں میاں پہنچے  
تھے۔ جو سب سے اہم چیز بابو لیاقت کے ہاتھ میں آئی تھی وہ

ایک خنجر تھا۔ یہ نہ تو خنجر تھا نہ کربان اور نہ چاقو۔  
ان تمام ہتھیاروں کی تمہوڑی شکل اس میں پائی جاتی  
تھی۔ اس ہتھیار کا دست بائیں دانت کا تھا اور اس پر چھوٹے  
چھوٹے نقوشوں سے ایک کشش کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے  
روشنی میں غور سے خنجر نما آٹے کی دھار دیکھی۔ بلاشبہ یہ بھی  
زہر میں بچھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کپڑے میں لپیٹ کر احتیاط  
سے اپنے پاس رکھ لیا۔

ضروری تھا کہ صبح سے پہلے پہلے ہم عسرت فارم چھوڑ  
دیں۔ مشورے کے بعد رات ڈھائی بجے ہی ہم فارم سے  
روانہ ہوئے۔ اپنی موجودگی کے تمام شواہد مٹانے کی ہم نے  
حتی الامکان کوشش کی تھی۔ واپسی کے لئے ہم نے ایک  
اسٹیشن دیکھنا استعمال کیا۔ یہ دیکھنا بابو کا ملازم فرمان علی چلا  
کر میاں لایا تھا۔ یہ بی بی دیکھ کر بھی ٹرک کی تلاش میں کئی  
گھنٹے کیے گئے۔ راستوں پر بھاگنے کے بعد ناقابل شناخت  
ہو رہی تھی۔ ہم نے نیم بے ہوش لڑکی دیکھ کر عرف جمہو اور  
"لزم" بتر سنگھ کے علاوہ محمد خاں کو بھی دیکھنا میں سوار کرا لیا  
تھا۔ بتر سنگھ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے تاہم محمد خاں کو  
اس یقین دہانی پر آزاد رکھا گیا تھا کہ وہ راستے میں گزربوڑی  
کوشش نہیں کرے گا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم فیکٹری واپس پہنچے۔ راستے  
میں اس کے سوا کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا کہ ایک موقع پر  
جمہو کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی نگاہ سامنے بیٹھے بتر سنگھ پر  
پڑ گئی اور وہ ایک بار پھر ہسٹولی انداز میں چیخنے لگی۔ اسے  
بد شکل قابو کیا گیا۔ فیکٹری میں ڈزین کل "ارجنڈ بانو اور دیگر  
افراد کو ٹرک کی گمشدگی کا علم ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چند  
بانو کی آنکھیں سرخ ہیں۔ یقیناً وہ دیر تک روتی رہی تھیں۔  
ڈزین کل بھی پشیموہ نظر آ رہا تھا۔ سائیں عالی اور اس کا بیٹا  
جانی شاہ تمام ہنگاموں سے لا تعلق ایک کمرے میں فرش پر  
تھکی خند سو رہے تھے۔ ان کے درمیان جیسے خزانوں کا کھنچ  
ہو رہا تھا۔ سائیں عالی کے گلے میں چاندی کا قدیم تعویذ بلب  
کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس تعویذ کی طرح سائیں کے  
نیلے کپڑے چہرے پر بھی ایک چمک سی تھی۔ بھانے کیوں  
سائیں کا جوہر دیکھ کر محسوس ہوا تھا کہ اس میں کوئی خاص  
بات ہے۔ کوئی غیر بشری طاقت یا صلاحیت۔ شاید ارجنڈ بانو  
نے ٹھک سی کہا تھا کہ سائیں ایک روحانی شخصیت ہے۔

فیکٹری میں پہنچ کر ہم نے ایک بار پھر بتر سنگھ سے پوچھ  
کچھ شروع کی۔ اس دفعہ یہ کام بابو لیاقت نے اپنے ذمے  
لیا۔ وہ گفت و شنید میں باہر تھا اور دوسرے کو قائل کرنے کی

خدا داد صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے جمہو نامی لڑکی کی طرف  
مرغ کیا۔ میرے ساتھ فرمان علی بھی تھا۔ جب میں اور فرمان  
علی کمرے میں داخل ہوئے تو لڑکی سر پر موٹی اور جھٹی لٹے  
مسکری پریشانی تھی اور بابو لیاقت کی ایک ملازمہ دودھ میں  
رس ڈیو ڈیو کر اسے کھلا رہی تھی۔ جمہو نے مجھے دیکھا۔ اس  
کی آنکھوں میں وہی کرب آمیز خیالات تھی جو ایک لٹی بی بی لڑکی  
کا عقدہ ہوتی ہے۔ پھر لڑکی کی نگاہ فرمان علی پر پڑی۔ آنچاک  
اس کی حالت پھر غیر ہونے لگی۔ نوالہ اس کے منہ میں ایک  
کر رہ گیا اور آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف سمٹ آیا۔ وہ  
ہسٹولی انداز میں زور سے چیخا اور پھر چیخ چلی گئی۔ اس نے  
چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا اور خوف کے سب ڈھری  
ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے  
سنبھالا۔ فرمان علی ہکا بکا بھی میری طرف اور کبھی لڑکی کی  
طرف دیکھتا تھا۔ میں نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تمہوڑی  
دیر بعد لڑکی کی حالت "نہیل گئی اور وہ کمرے کمرے سانس  
لیتے لگی۔ مگر اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور زخم زخم  
ہونٹ کاپ رہے تھے۔ ملازم نے انہی ڈال کر اس کے منہ  
میں انکا ہوا آواز نکال لیا۔

مجھے جتنکا سا لگا اور ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔  
بتر سنگھ اور فرمان علی میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ دونوں  
بھاری بھرکم موٹوں والے تھے۔ تو کیا جمہو کے خوف کا  
سبب موٹپن نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود پر گزرنے والے  
سامنے کے بعد ہر موٹپن والا شخص سے خوفزدہ ہو گئی ہے۔  
میں نے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بتر سنگھ پر ہمارے شک  
کی بنیاد ایک دم ٹھوٹھکی ہو گئی ہے۔

اب ایک ہی راستہ تھا۔ کسی طرح کو کبھی لڑکی ہمیں خود پر  
بیٹھے والے واقعات کے بارے میں کچھ بتا سکتی۔ عام کو گئے  
افراد کی طرح لڑکی میری بھی تھی۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کبھی  
کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ صرف اشاروں کی زبان میں بات  
کر سکتی تھی۔ اشاروں کی زبان میں اس سے کچھ پوچھ لینا  
ایک طویل اور صبر آزما عمل تھا، جبکہ ہمارے لئے وقت  
نہایت تیزی سے گزر رہا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ ہمارے  
خلاف اور ان باعظموں افراد کے حق میں جارہا تھا۔ جنہوں نے  
عسرت فارم میں شب خون مارا تھا۔

سامان کو سرحد پار پہنچانے کے حوالے سے ہمارے  
مارے انتظامات اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے  
تھے۔ صبح کے پانچ بجے اور پھر ٹرک کے مطابق ہمیں اس وقت  
نیکرا گاؤں میں "بیزرے بدعاش" نوشاد کے ڈیرے پر ہونا

چاہئے تھا۔

میں نے نشست سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے  
ذہن کی بائیں دھلی چھوڑ دیں۔ سوچ کے گھوڑے سر ہٹ دوڑ  
اٹھے اور سپدھے اس جانب گئے کہ جہاں جانب ان کے  
جانے کی توقع تھی۔ معلوم نہیں یہ میرا تعصب تھا، جذبہ  
عداوت تھا یا عمیق تجربات کی دھماکی تھی کہ جب مجھے کوئی چرکا  
لگتا تھا اور میرے ارد گرد شکر شکر موجود ہوتا تھا تو مجھے یقین  
ہو جاتا تھا کہ یہ چرکا کسی نہ کسی طور شکر ہی کا لگایا ہوا ہے۔  
بارہا میرا یہ انداز درست ثابت ہوا تھا اور میں نے چوٹ کھا  
کر کہیں گاہ کی طرف دیکھا تھا تو اسی دشمن شکر سے ملاقات  
ہوئی تھی۔ اس وقت بھی یہی خیال میرے ذہن میں آیا کہ  
شکر شکر کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے پر شک کرنے کا جواز  
ہے نہ ضرورت۔

میں نے فوری فیصلہ کیا کہ سب کام چھوڑ کر شکر شکر کی  
تلاش میں نکلوں۔ یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت تھا۔  
اگر اب بھی میں معائنوں کو پیش نظر رکھتا تو وہ "سب کچھ"  
ہاتھ سے نکل جاتا یعنی تھا جس کے لئے ہم نے اب تک تین  
دو کی تھی۔ ارجنڈ بانو کچھ دور بیٹھی امید بھری نظروں سے  
میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میرے چہرے کے آثار پڑھاؤ  
سے میرے دلی جذبات کا اندازہ لگا رہی ہو۔ مجھے اس کھر  
کا راستہ آتا تھا جہاں میں نے ہتھان کو گواہ سنگھ کے ہاتھوں  
قتل کروایا تھا اور بعد ازاں شکر کے چھ ڈشکوں کو کچھ کر  
میاں فیکٹری میں لایا تھا۔ میں نے ارجنڈ بانو سے اس کی سفید  
گاڑی کی چابی لی اور فیکٹری کے بیرونی دروازے کی طرف  
بڑھا۔ سفید گاڑی وہیں پر کھڑی تھی۔ اسٹنٹ میں جلال پلستر  
والا بازو گلے میں حائل کئے گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔  
اس نے کھور کھنچے دیکھا۔ میں نے اسے دھکیل کر گاڑی کے  
دروازے سے پیچھے ہٹایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے  
کہ میں گاڑی اشارت کرتا، ڈزین کل کی پکارتی ہوئی آواز  
آئی "خوشے استازی! آپ کا پون آیا ہے۔ کوئی آپ سے  
بات کرنے کا بولا ہے۔"

میں گاڑی سے اترا اور فون سننے کے لئے بابو کے آفس  
میں آیا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یہ آس بندھ گئی  
تھی کہ شاید صفدر یا ہنورا عسرت وغیرہ کی طرف سے کوئی  
اطلاع آئی ہے۔

"ہیلو" میں نے آواز دہرائی میں کہا۔  
"میں شکر بول رہا ہوں" دوسری طرف سے آنے والی  
آواز نے مجھے سرتاپا ہلادیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا

”میں اپنے بندہ روم سے بول رہا ہوں۔ میرے سامنے جانی وا کر کی ایک بوتل کھلی پڑی ہے اور ایک لڑکی بھی۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے“ اس کے ساتھ ہی ریبور کئی در سے کھنکھارایا گیا۔

میرے کانوں میں ایک روتی بکھتی نسوانی آواز آئی اور میں سمجھنے میں رہ گیا۔ وہ غزالہ تھی۔ غزالہ میری روم میرا جسم میری زندگی میری بد نصیب آنکھوں کا پہلا اور آخری پہنا۔ وہ بولی ”شاہ جہاں! خدا کے لئے غار گاڑ سیک“ آپ اس کتے کی کوئی بات نہیں ماننا۔ اس نے آپ کو ختم کرنے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ میری پروا نہ کرنا شاہ جہاں۔ میں پھر کدہ رہی ہوں۔“

ریبور غزالہ کے ہاتھوں سے چھین لیا گیا۔ اب اس کی صرف مذہم پتیلیاں سنائی دے رہی تھیں۔ شکر اپنے بھاری بھر کم اور ٹھہرے ہوئے کپے میں بولا ”میں اسی کو بھی تے بول رہا ہوں جہاں تم نے آج میرے آٹھ بندوں سے ”محبت“ کی ہے۔ میری کھڑی میں اس وقت باغ بے ہیں۔ میرے پاس تمہارے لئے صرف دو مٹنے کی صلیت ہے۔ سات بجے تک ٹرک مع تمہارے اور تمہارے تین ساتھیوں کے مجھ تک پہنچ جانا چاہئے۔ دوسری صورت میں یہ لڑکی بہت عذاب جہیل کریموں سے رخصت ہوگی“

شکر کی آواز میں وہ مخصوص درندگی تھی جو پتھر کو پانی کر دیتی تھی۔ یہ میں تھا جو اس کالب و لوجہ جہیل جانا تھا۔ وہ اکثر لوگ اس کے پاؤں پر سر رکھ دیتے تھے۔ وہ غالب دشمن تھا اور مجھے اس کا اعتراف بھی تھا کہ میں نے کبھی اس کا غلبہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج بھی اس کا غلبہ تسلیم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میں نے ریبور کی ٹیل پر چٹا اور بھانکا ہوا آفس سے نکل آیا۔ مجھے یاد ہے اور جند بانو لیاقت اور زریں گل مجھے آوازیں دیتے رہ گئے۔ مجھے نہیں معلوم میں کس وقت گاڑی میں بیٹھا کب فیکٹری سے نکلا اور کب فرید کوٹ کی سڑکوں پر دھناتے لگا۔ راستے میں دو تین جگہ پولیس نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ شاید میں کرفو والے علاقے سے بھی گزرا تھا۔ میرے عقب میں پولیس کاروں کے سائرن گونج رہے تھے۔ ٹریفک پولیس کے دو سار جنت بھی مجھے گاڑی کے عقب نما آئینے میں نظر آئے۔ وہ اپنی بیوی موز سائیکلوں پر اڑے چلے آ رہے تھے۔ یہ سارے مناظر میرے لئے جیسے کئی دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے واضح نظر صرف شکر شکر کے چہرے کا تھا اور ساعت میں صرف اس کی آواز

تھی جو صاف گونج رہی تھی۔ میں اپنے بندہ روم سے بول رہا ہوں۔ میرے سامنے جانی وا کر کی بوتل کھلی پڑی ہے اور ایک لڑکی بھی۔

مجھے یاد ہے میں اس وقت ”راج کالونی“ میں پہنچ چکا تھا۔ ایک بڑے خطر موزکٹ کر میں بڑی سڑک سے چھوٹی سڑک پر آیا تھا۔ اس وقت اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور میرا دایاں پاؤں بے ساختہ بریک پڈل پر دھنچا گیا۔

میرے عقب میں ایک عفریت تھا۔ اس عجیب اندھ میرے میں اپنی چٹکی آنکھوں ”دراڑ ڈٹوں اور دیوانے چرے کے ساتھ وہ مجھے عفریت ہی نظر آیا۔ وہ سائیں عالی تھا۔ وہ دونوں نشتوں کے درمیانی خلا سے برآمد ہوا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک بھاری بھر کم شے نظر آئی۔ یہ وہ خاص قسم کا پتھر تھا جو سرائیکیس فیکٹری کی بر دم کھونے والی مشینوں میں مسالا بنانے کے لئے ڈالا جاتا تھا۔ پتھر کا یہ کھلا کم و بیش دس کلو وزنی تھا۔ میں نے اس پتھر کو تیزی سے اپنے سر کی طرف آتے دیکھا۔ پھر اچانک میری آنکھوں کے سامنے اندھرا چھا گیا۔

تجانبے میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا۔ چند گھنٹوں بعد دونوں بعد یا ہشتوں بعد۔ میری آنکھ کھلی تو میں ایک دیر ان صحرا میں تھا۔ دور دور تک ریت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سوچ جیسے سوائے رے پر گیا تھا۔ میں نے ہتھکڑی ہوتی ریت سے سرائیٹا۔ زبان منہ میں خشک چڑے کی طرح بے حرکت پڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ پیاس اور خفایت کے سبب میرا دم آنکھوں میں ہے۔

”پانی“ میں نے جسم و جان کی پوری قوت سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا لیکن یہ اظہار صرف مجھ تک ہی محدود رہا۔ آواز میرے حلق کی خشک بھول بھولیوں سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے سوچا شاید میں مر رہا ہوں شاید اسی کیفیت کو جان کنی کا عالم سمجھ رہی ہوں۔ اسی وقت میری نگاہ اپنے پہلو کی طرف اٹھی اور میں سمجھنے میں رہ گیا۔ میرے پاس ہاتھ پر کسی کا سر دھرا تھا۔ وہ غزالہ تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر آبلے سے پڑے تھے۔ میری نگاہ اس کے ہونٹوں پر ایک کر رہ گئی۔ ان ہونٹوں پر جی ہوئی سفید پٹریاں گواہ تھیں کہ کئی روز سے یہ لب پانی کو ترس رہے ہیں۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی یا مر چکی تھی۔ میں اٹھ کر اسے دیکھ چاہتا تھا لیکن خود میں اتنی جرات پا رہا تھا اور نہ توانائی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔ وہ سب خواب تھا جو میں دیکھ رہا تھا یا یہ خواب ہے جو میں دیکھ رہا

ہوں۔ شاید وہی خواب تھا۔ کیونکہ اتنے دردناک خواب کے بعد بیداری لازم ہو جاتی ہے۔ اور واقعی ان جان لیوا لمحات میں مجھے محسوس ہوا کہ میں اب تک ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ بننے پلنے والی حویلی تڑو جواہر سے بھرے ہوئے پتلیس صندوق ”مقدور“ زریں گل ”مرد“ فرید کوٹ کی کرفو زدہ انگلیاں سر زمین کا شکار کا مراد بازار ”فرید کوٹ کی کرفو زدہ گلیاں اور وہ سائیں عالی“ سب خواب تھا۔ ایک عجیب و غریب اور طویل خواب۔ اگر یہ سب خواب تھا تو پھر وہ اطلاع بھی خواب تھی جو مجھے غزالہ کے حوالے سے ٹیلیفون پر ملی تھی اور جس کے نتیجے میں وہ بدنام اسٹریٹ فائٹرز المعروف جہانی استاد اور شکر شکر کے درمیان ایک خونریز لڑائی ہونے والی تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ ہتھکڑی غزالہ کے سر کے نیچے سے نکالا اور اسے کندھے سے تھام کر سمجھوڑا۔ وہ بے حس و حرکت رہی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن مذہم تھی۔ میں نے خود کو کمینوں کے بل ریت سے چند انچ بلند کیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ریت اور دوہب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ تا توانی کے سبب آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے خود کو دوبارہ سنگینی ریت پر پھینک دیا۔ ایسے میں میری نگاہ دور اوپر نیلے جاوولی آسمان پر پڑی۔ وہاں گدھ منڈلا رہے تھے۔

اپنے سر پر ان شہزادوں پر ندوں کو منڈلاتے دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ دس کسے دس میں منٹ یا کتنے زیادہ منٹ بعد اس سنگینی ریت پر میری جھنجھکی ہوئی لاش پڑی ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو دور اوپر اڑتے ہوئے یہ گدھ بھی بچے پر داز کرنے لگیں گے۔ پھر وہ ایک ایک کر کے ریت پر اتر آئیں گے۔ کچھ دیر فاصلے پر کھڑے مجھے کھودتے رہیں گے۔ تب ایک توانا اور نسبتاً بزرگ گدھ آہستہ آہستہ چٹا میرے پاس پہنچ جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں بھانکے گا۔ اور اچھل کر سینے پر آئینے گا۔ اس کی چوڑی میرے چہرے سے گوشت نپٹنے لگی۔ توانا گدھ کو مصروف کار دیکھ کر دوسرے گدھ بھی اچھل اچھل کر آئیں گے اور میرے جسم پر اپنی اپنی جگہ سنبھال لیں گے۔ چند گھنٹے بعد اس جی ہوئی ریت پر صرف بڑیوں کا ایک ڈھانچا چڑا رہا جائے گا۔ شاید اس کے بعد غزالہ کے خوبو جسم کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو۔ چاہتیانی دھبوں اور خشک راتوں میں یہ دو انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے سب کو دھکن پڑے دیں گے۔ پھر ریت کی تھیں دھیرے دھیرے ان ڈھانچوں پر دو قبریں بنادیں گی۔ ان میں سے ایک

قبر اس شاہ جہاں کی ہوگی جو جہانی استاد کھلا تھا اور جہاں دنیا کے بڑے بڑے بگاڑی جس کے سامنے سرگرم ہوتے تھے۔ دوسری قبر اس لڑکی کی ہوگی جو اس بدنام شخص سے بچ کر گئی تھی اور بے شمار مرتبہ رک اٹھانے کے باوجود اس زندگی سے نکلنے پر آمادہ نہیں تھی۔

ایک بار پھر بہت کر کے میں نے ریت سے سر اٹھایا۔ میری نگاہ اپنے لباس پر پڑی۔ لباس پر کئی جگہ خون کے دھبے تھے۔ ایسے ہی چند چھوٹے چھوٹے دھبے غزالہ کے لباس پر بھی تھے۔ اس کا ایک رخسار خون آلود تھا۔ معلوم نہیں یہ خون اس کے رخسار سے بہا تھا یا یہ میری ہتھیلی سے بننے والا خون تھا جو اس کے رخسار پر لگ گیا تھا۔ گرمی کی شدت سے یہ خون بھی ہمارے مقدور کی طرح سیاہ ہو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں بلا لیاقت کی فیکٹری میں تھا۔ وہاں شکر شکر کا فون آیا تھا۔ اس کی محسوس زبان سے ادا ہونے والا شیطانی جملہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ اس نے کہا تھا ”میرے سامنے خراب کی بوتل کھلی پڑی ہے اور ایک لڑکی بھی“ پھر اس نے مجھے غزالہ کی آواز سنائی تھی۔ میں دنیا و مافیسا سے بے خبر ہو کر شکر شکر کے ٹھکانے کی طرف لپکا تھا۔ میں نے ٹریفک اور کرفو کی کئی خلاف ورزیاں کی تھیں۔ میری پٹری کے عقب میں پولیس کی گزریاں تھیں اور ریت سے سائرن گونج رہے تھے۔ پھر اچانک دو نشتوں کے درمیانی خلا سے سائیں عالی کسی آسیب کی طرح برآمد ہوا تھا اور اس نے میرے سر پر ایک وزنی پتھر سے ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ چوٹ کا خیال آتے ہی میرا ہاتھ خود بخود سر کی طرف اٹھ گیا۔ سر کے درمیانی حصے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس پٹی کو ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر کان کے قریب کر دے دی گئی تھی۔

یہ سب کیا ہوا ہے اور کیسے؟ میں نے ذہن پر زور دیا۔ ایک شدید نہیں سر میں اٹھی اور میں نے بے حال ہو کر سر دوبارہ ریت پر ڈال دیا۔ آنکھوں میں اب اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ اس وقت میری سب سے اہم ضرورت پانی تھا۔ ٹھنڈا شیشا شفاف پانی۔ جولیوں کو تر کر کے میرے حلق میں اترتا اور جاں بے لب جسم میں زندگی کی لہرو ڈالتا۔ خواب کا ساں تھا لیکن بہت دھشتناک خواب کا ساں۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ شدید ترین ذہن ت غائب آتی جا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے جسم و جان کی پوری قوت پیمپرو د میں سینی اور پورے زور سے پٹایا ”گوتی ہے؟“

حلق سے ایک آواز برآمد ہوئی لیکن یہ آواز مذہم

سمجھاوا کہ ہم ابھی تک بھارت میں ہیں اور غالباً راجستان کے صحرائی علاقے میں ہیں۔

میں نے اپنے تیار داموں سے اس خیال کی تصدیق چاہی تو معمولی تذبذب کے بعد ایک نے تصدیق کر دی وہ بولا "ہم ناگور کے نواحی علاقے میں ہیں" مزید تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا "یہ ایک شکار پاشی ہے مہاراج رتن سنگھ اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ ہرن کے شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "ابھی یہاں جو عربی صاحب بیٹھے تھے وہ کون تھے؟"

جواب ملا "وہ بھی 'ہزبائی نس' کے ایک دوست ہیں۔ امارات سے خاص طور پر شکار کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنی دور بین سے ہمیں دیکھا تھا۔ جبکہ اگر وہ نہ دیکھتے تو شاید ہم اپنے راستے پر سیدھے نکلے چلے جاتے۔ تم لوگوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔"

عرب شکاری کے ذکر نے میرے کچھ پرانے رتھوں کے کھنڈ اُٹا کر دیے۔ مجھے امارات کا وہ امیر زادہ یاد آ گیا جس نے کمروڑیکا میں میری بھی ہوئی زندگی اُٹکاڑی تھی اور نتیجے میں میرے ہاتھوں سے جہنم واصل ہوا تھا۔ میں نے شاہ جہاں سے جہانی امتداد تک کا جو طویل سفر طے کیا تھا اس میں امارات کا وہ امیر زادہ راشد بن راشد سبک میل کی حیثیت رکھتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے میں جاں بہ لب تھا لیکن گھوڑوں کو ملایا پانی جسم میں اترنے کے بعد جیسے تمام امراض اور دلہ زورور ہو گئے تھے۔ بس ایک ٹھنڈی سی بانی تھی جو بتدریج کم ہو رہی تھی۔ میرے تیار داموں کی نگاہ بار بار میرے سر کی پٹی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ میرے سر پہلے سے زخم موجود تھا۔ آخر ساتوں نے رنگ والے ٹھنڈے اس زخم کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ زخم دو دین روز پرانا ہے۔ میرے اوپر وہ جواب نے ان دونوں کے تجسس کو ہوا دی اور وہ میرے بارے میں مزید جاننے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ میں سخت مشکل میں تھا۔ میں انہیں اپنے اصل حالات سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں جو بھی بیان دیتا وہ من گھڑت ہوتا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ غزال ہوش میں آکر کیا بیان دے گی اور غزال کے علاوہ اور کون کون شخص یہاں موجود ہے جو میرے بیان کی تردید کر سکتا ہے۔ میں سخت گموگموں میں تھا جب ایک آواز نے میری مشکل آسان کر دی۔ یہ اسی سرخ و سپید عربی کی آواز تھی جو خاکی قمیص اور

ان کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "وہ لڑکی کہاں تھی ہے؟" میرے حلق سے گزری سی آواز بلند ہوئی۔

عربی لب و لہجہ والے نے انہیں میں کہا "ڈونٹ ڈری۔ شی از بیز۔" بنو نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا "تھیراؤسٹ۔ وہ ہمیں ہے۔ اس سامنے والی گاڑی میں" اس نے دنڈا اسکرین کی دوسری جانب اشارہ کیا۔ وہاں ایک شاندار لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ کھڑکیوں پر نشیوں پر دوسے بیٹھے ہوئے تھے۔

"میں اپنی ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو" میں نے نشست سے پیچھے پاؤں نکالے ہوئے کہا۔ "آرام سے بیٹھے رہو" اس مرتبہ انگریزی بولنے والے عربی نے تھمکانے لہجہ اختیار کیا اور اپنے ملازمین کو آنکھوں میں کوئی بدایت جاری کرنا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔

سامنے عالی نے اب آنکھیں کھول دی تھیں۔ تاہم وہ جت لینا تھا اور خالی خالی نظروں سے گاڑی کی پھٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر ہائے بیٹھے ہوئے ٹھنڈے بانی میں گھوڑوں کی آواز اور بچے سے اسے پلانے لگا۔ غالباً مجھے بھی یہی محلول پایا جانا رہا تھا۔

میں نے ذرا عاجزانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اپنے تیار داموں سے پوچھا "میں کہاں ہوں؟ تم یہاں کیسے پہنچے ہیں۔ میرے ساتھ اور کون کون ہے؟"

گندی رنگ والے ایک بابو نے کہا "تم لوگوں کی گاڑی اُدھر اوپر ایک گڑھے میں چھس کر اُلٹ گئی تھی۔ ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ وہ گاڑی کے نیچے اُٹھ گیا تھا۔ یہ ہمارا ساتھی کی گاڑی کے اندر پھنسا ہوا تھا اور بے ہوش تھا۔ تم اور وہ لڑکی بیٹھے رت پر پڑے تھے۔"

"تم کس گاڑی اور کون سے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا "اور یہ جبکہ کون سی ہے؟ میں تمہیں تو" میں کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"بولو۔ چپ کیوں ہو گئے ہو۔ دیکھو تمہاری گاڑی پر فیوزیور کی نمبر پلٹ لگی ہے اور ڈرائیور کی جیب سے ایک نوٹ بھی ملا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ تم لوگ بیکانیر جا رہے تھے کسی سردار سریندر سنگھ کے پاس۔"

بیکانیر۔ سردار سریندر۔ فیوزیور کی گاڑی۔ یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ تاہم بیکانیر کے حوالے نے مجھے یہ

وہ پچھڑا ہٹ تھی یا انجن کی آواز تھی، میرے بہت قریب آئی۔ پچھڑا ہٹ گھرائی سے۔ بہت گھرائی سے ایک انسانی آواز میری ساعت سے گھرائی "مرگے ہیں۔" ایک دوسری آواز آئی "میں زندہ ہیں۔" پہلی آواز نے کہا "لڑکی بھی ہے۔" تیسری آواز کسی اور زبان میں تھی۔ شاید عربی تھی۔ میں نے یہ شبہ ضرور پیدا ہوا کہ شاید میں مر چکا ہوں۔

\*\*\*

میں کسی بہت ٹھنڈی جگہ پر تھا اور میرے ترے ہوئے لب پانی کے لمس سے آشنا ہو رہے تھے۔ ٹھنڈا پانی ٹھنڈا ٹھنڈا میرے حلق میں اُتر رہا تھا اور جسم کا حصہ بن کر توانائی و زندگی میں داخل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میں اپنے حواس میں آئے لگا اور ارد گرد کے ماحول سے آشنا ہونے لگا۔ دو افراد مجھ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک فریہ چرے والا بندہ تھا۔ اس کے ہاتھ پر تشدد بھرا ہوا تھا۔ دوسرا ایک ٹھنڈی موٹھوں والا سرخ و سپید ٹھنڈا تھا۔ وہ کبھی کبھی عربی لہجے میں انکشاف بولے لگتا تھا۔ میں ایک نہایت شاندار بیپ نما گاڑی میں تھا۔ گاڑی اڑکنڈھ تھی۔ بڑے بڑے شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے صحرا کا جان لیوا خطرہ قریب ہونے کے باوجود بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے غزال کا خیال آیا اور میں نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ کھینچوں پر زور دے کر میں اپنی نشست سے تھوڑا سا بلند ہوا ساتھ والی نشست پر کوئی میری ہی طرح لینا تھا۔ ایک ٹھنڈی بڑی محویت کے عالم میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ لیکن وہ غزال نہیں تھی۔ وہ سامنے عالی تھا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میرے دہم دھماکا میں بھی نہ تھا کہ میں اسے اس گاڑی میں اپنے ہی جیسی حالت میں پاؤں گا۔ اس کے سر کے بالوں اور واڑھی میں ریت کے ذرات چمک رہے تھے۔ سیاہ ہونٹوں پر پتھریاں تھیں اور چہرہ صحرائی کمری سے جھلکا ہوا تھا۔ سامنے عالی پر جھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈا تھا اس کے چہرے پر پھیر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا شاندار جھنجھوڑتا جا رہا تھا۔ سامنے کی آنکھیں بند تھیں۔

غزال کہاں ہے؟ سوال تھری طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ میں غزال کو دیکھنے کے لیے اٹھ بیٹھا۔ وہ اس گاڑی میں موجود نہیں تھی۔ مجھے قہقہے ادا دینے والوں نے میرے شانے تمام لے اور مجھے دوبارہ لینے پر مجبور کرنے لگے لیکن میں اب اتنا خائف نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے شانوں پر

ہونے کے علاوہ بہت عجیب و غریب بھی تھی۔ اس آواز کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ حلق کی خشک ٹالیوں نے احتجاج کیا اور مجھے کھانسی ہونے لگی۔ کھانسی کا یہ دورہ بہت شدید تھا۔ میں کھانسنے کھانسنے اُلٹ گیا۔ جب سانس لینے کے لیے میں نے ہوا اندر کھینچی تو گرم ریت منہ اور گتھوں میں ٹھس ٹھس۔ "میں راکھی نیند سوئے والا ہوں" ایک بار پچھڑا ہٹ کسی گوشے سے آواز آئی۔ میں نے آنکھیں پھینکا اور غزال کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے بدقت تمام اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سانس کا زبردوم محسوس کرنا چاہا۔ پیٹ حرکت کر رہا تھا۔ لیکن مجھے لگا کہ اب یہ حرکت ایک جنبش یا لرزش کی صورت میں رہی ہوگی ہے۔ غزال مر رہی تھی۔ میری آنکھوں کا حسین ترین پتھر رہا تھا۔ نا معلوم سمت سے اُٹنے والی تاریکیاں میرا سب کچھ بڑھ کر دہرائی تھیں۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی بہت تھی کہ میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوا لیکن پھر ایک دم میری ٹھوڑی گرم ریت سے غرائی اور جسم کو ایک شدید ہلکا ہوا۔ میں اوندھے منہ رت پر گر گیا تھا لیکن مجھے کبھی نہ لگا کہ کھڑے کھڑے ایک دم میری ٹھوڑی ریت سے جا بکرائی ہے۔ مگر نے کا قہقہہ بک اور کیسے ہوا مجھے بالکل خبر نہیں ہوئی۔ دوبارہ رت پر گرنا تابوت میں ٹھوڑی جانے والی آخری میل کے حروف تھا۔ ذہن نے گواہی دی کہ میری حہ اختیار ختم ہو چکی ہے۔ اس صحرائی میں نہ جانے کب سے پڑے تھے ہم۔ اب حیات ہمارے جسموں سے اُڑ چکا تھا اور بہت توانا نظر آنے والی زندگی بند ہو چکی تھی۔ میں نے بہت کوشش کر کے اپنا ہاتھ غزال کے جسم پر رکھ دیا۔ معلوم نہیں یہ ہاتھ کہاں رکھا تھا لیکن اتنا اطمینان تھا کہ وہ غزال کے جسم پر ہے۔ ایک خشک اندھیرا سا میرے چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ میں نے کسی جگہ پر چھا اور سنا تھا کہ بہت دیر تک تڑپے رہنے والے کے لیے موت کبھی کبھی بڑی مہربان شکل میں آتی ہے۔ شاید یہ خشک اندھیرا ہی وہ مہربان موت تھا۔ پچھڑا ہٹ کانوں میں ایک پچھڑا ہٹ سی گونجی۔ دل نے گواہی دی کہ یہ وہ غزال خود پر بند ہے جس جو خفاش رتن میں میرے سر ہائے آن وارہ ہوئے ہیں۔ میں اس پچھڑا ہٹ کو غور سے سننے لگا۔ یہ کیسی پچھڑا ہٹ تھی؟ نہیں یہ پچھڑا ہٹ نہیں تھی، یہ کسی انجن کا شور تھا۔ ذہن میں ایک تھمرا سی شہنشاہ ہوئی۔ "پچھڑا ہٹ ہے۔ نہیں انجن کا شور ہے۔ نہیں پچھڑا ہٹ ہے۔"

چلون میں بیوس تھا۔ جب کا اگلا دروازہ کھول کر اس نے سانولے شخص کو زانن کا ہیکہ کر خطاب کیا اور انگریزی میں اس سے کہا کہ چپ بنے باہر آ جاؤ۔

زانن باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے لڑکھاتا ہوا باہر نکلا۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ جسم پر کئی جگہ جوخس موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور احساس بھی ہوا۔ میرے سر میں عجیب طرح کا بھاری پن موجود تھا۔ شک مگر راک مجھے خواب اور انجکشن لگایا جاتا رہا ہے یا پھر کوئی ایسی ہی دوا چلائی جاتی رہی ہے۔ میرا دھیان اپنی رست و راج کی طرف گیا اور میں بڑی طرح چونک گیا۔

اٹھائیس تاریخ تھی اور دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا میں تقریباً اڑتالیس گھنٹے بے ہوش رہا ہوں۔ ظاہر ہے اتنی طویل بے ہوشی کسی خواب اور دوا کی ہی مرہون منت تھی۔

جب سے نکلے ہی ایک بار پھر صحرای گرم ہوائے جسم پر تازیانے برساتے شروع کر دیے۔ زانن نامی شخص علی کے پیچھے چلا ہوا ایک وطلوان طے کرنے لگا۔ میں بھی ان کے پیچھے چل رہا۔ اس وقت وطلوان پر غزال اور میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوئے تھے۔ ہمارا ریت پر گواہ قدموں کے ہمت سے نشان نمودار ہو چکے تھے لیکن ہمارے جیسوں اور ہاتھ پاؤں کے نقوش ابھی تک بچانے جارہے تھے۔ شاید سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم دونوں ہلندی سے ٹوٹنے لگے تھے اور قریباً میں گزرتے گھٹنے کے بعد نسبتاً ہموار جگہ پر تک گئے تھے۔ میں جہاں گرا تھا وہیں بے سمدھ چارہ لگا تھا لیکن غزالہ کرنے کے بعد بھی ہوش میں تھی۔ دوا بچ دس قدم کا فاصلہ طے کر کے میرے پاس آن کر لیٹ گئی تھی یا گرنی تھی اور پھر آخری وقت تک وہیں پڑی رہی تھی۔ غزالہ کا ایک سینڈل ابھی تک موقع پر پڑا تھا جس جگہ ہم نامعلوم وقت تک بے سمدھ پڑے رہے تھے وہاں گرم ریت پر خون کے آثار بھی تھے۔ میرے اپنے جسم پر تو کوئی ایسا خونچکان زخم نہیں تھا۔ ممکن تھا یہ غزالہ کے لوہے کے دھبے ہوں۔ میں اسے دیکھنے کے لیے قراہ ہو گیا۔ وہ شاندار وسیع و عریض چپ قریب ہی کھڑی تھی جس میں غزالہ کو لمبی امدادی گئی تھی۔ ایک گھوٹی کا نیلا پردہ تھوڑا سا سر کا ہوا تھا۔ میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس پردے میں سے جھانکوں لیکن اس سے پہلے کہ میں جب کی طرف بڑھتا اس کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ ایک ملازم صورت شخص ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے لیے باہر نکلا۔ میری نگاہ اس کے عقب میں غزالہ پر پڑی۔ وہ نشست

سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں نیم دھکیں۔ ایک خوبو لڑکی جس نے ستانی لباس پہن رکھا تھا، غزالہ کے قریب بیٹھی تھی اور اس کے منتشر بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے غزالہ نے غالی غالی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں شامائی کے آٹا ابھرے لیکن اس سے پہلے کہ یہ آثار واضح ہوتے، میں نے اپنے چہرے پر اجنبیت بھالی۔ میرے اس انداز کو غزالہ نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ ایک تک مجھے دیکھتی رہی لیکن منہ سے کچھ بولی نہیں۔ میں نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ میری نگاہ ہلندی کی طرف اٹھی اور ہم کر وہ مٹی۔ وہاں کسی گاڑی کے پینے نظر آ رہے تھے۔ جھت سے پہلے گاڑی کے پینے دکھائی دیے تھے۔ مٹی وہ لٹی ہوئی تھی۔ ہم نے چند قدم مزید فاصلہ طے کیا تو مکمل خطر نگاہ کے سامنے آ گیا اور یہ کوئی ایسا خوش کن منظر نہیں تھا۔ پرانے مال کی ایک بڑی لینڈ کو زور جب اتنی بڑی تھی۔ اس کے انجن سے بنے والا موٹیل آکل ریت پر دوڑ تک بکھرا تھا۔ جب کے پاس بی پانی کے دو ٹھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ کیڑوں کے ایک بیگ کا تھوڑا سا حصہ جب کے پینے سے نظر آ رہا تھا۔ اس بیگ میں سے ایک شکلت خارج بھاگ رہی تھی۔ سب سے روح فرسا منظر ایک انسانی لاش کا تھا۔ یہ لاش ناف تک جب تلے دبی تھی۔ لاش کا چہرہ پھول کر گیا ہو گیا تھا اور وحشت ناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوچھاڑوں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اس لاش کو اس خانہ گری میں بڑے کم و بیش ۳۳ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ مجھے ہوئے چہرے کے باوجود میں موتی کو پہچان گیا۔ وہ سائیں عالی کا چیلہ جالی شاد تھا۔ وہ جوان سال تھا۔ اس کے گھونگھرائے بال ابھی تک تیل سے چمک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ یہ داڑھی خون اور ریت میں لتھڑی ہوئی تھی۔ جب کے ارگرد چار پانچ افراد موجود تھے۔ وہ سب کے سب شکاری لباس میں تھے۔ ان میں سے دو کے کاندھوں پر طاقتور رائفلیں بھی بھول رہی تھیں۔ فریہ جسم والا رعب دار سا شخص مداراج رتن سکھ تھا۔ گلے میں چھوٹی سی الیکٹرک دو دین رکائے وہ حقیقی انداز میں جب کے چاروں طرف بکرا رہا تھا۔ شکاری لباس اس کے جسم پر کسی تیلے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اس نے فلی بوٹ پہن رکھے تھے۔ گلے میں ایک پیش قیامت والا تھی۔ یہ لوگ جب کو سیدھا کرتا چارہ رہے تھے لیکن بھاری ہجرم جب اٹھنے کے بعد ریت میں بڑی طرح دھس گئی تھی۔ چند لمبے بعد میں اور زانن و فیرو بھی چپ

سیدھا کرنے کی کوشش میں شریک ہو گئے۔ اس مرتبہ یہ کوشش کارگر رہی اور ہم نے ایک ساتھ زور لگا کر سبز بے پلو کے مل اٹھایا۔ جالی شاد کا زیریں جسم بڑی طرح چلا گیا تھا اور بجتی ہوئی لٹیس کے سے انتہاں جھاک رہی تھیں۔ چند سائے سے لاش پر لڑائے میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہلندی پر چکراتے ہوئے نگاہ اب ہمت نیچے آ گئے تھے۔ ان کی جسم شاد انہیں زمین کی طرف کھینچ رہی تھی لیکن زندہ انسانوں کی موجودگی کے سبب وہ لاش سے دور رہنے پر مجبور تھے۔

لاش پر چادر ڈال دی گئی اور دو افراد جب کی تلاش لینے لگے۔ ڈیل بورڈ میں سے چند بے کار اشیاء کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ مداراج رتن سکھ اور علی مہمان ایک طرف کھڑے ہو کر دھتے لیمے میں باتیں کرنے لگے۔ زانن بھی موزب انداز میں ان کے قریب موجود تھا۔ جیساکہ بعد میں پتا چلا کہ وہ رتن سکھ کا دروازہ شکاری یا منتظم شکار تھا۔ وہ ایک خاندانی شکاری تھا۔ اس کے باپ دادا انگریزوں کو شکار کھلاتے رہے تھے۔ زانن نے "راجستان میں شکار" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رکھی تھی۔ اس نے مداراج اور علی مہمان کی ترغیبی کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آ رہے تھے؟

میں اب ذہنی طور پر ان سوالات کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ سائیں عالی اور غزالہ کے سوا میرے ساتھ اور کوئی موجود نہیں۔ سائیں عالی تو کوئی بھی بیان دینے سے قاصر تھا، اگر دتا بھی تو اسے قابل غور نہ جانا جاتا۔ بات صرف غزالہ کی تھی لیکن غزالہ کو کچھ علم نہیں تھا کہ میں کن حالات میں اس تک پہنچا ہوں۔ لیکن اسی طرح جیسے مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کن حالات میں مجھ تک پہنچے ہے۔ لہذا مناسب تھا کہ ہم اپنے اپنے بارے میں بیان دیں اور ایک دوسرے کے متعلق لاطعلی ظاہر کریں۔ یوں ہمارے بیانات میں تضاد کا خدشہ ختم ہو سکتا تھا۔ قموڑی دیر پہلے میں غزالہ بڑھاپا کر چکا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ابھی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ اس نے میرا مانی الضمیر سمجھا ہو گا اور اب اسی کے مطابق عمل کرے گی۔

میں نے زانن کو بتایا "میرا نام نال سکھ ہے۔ میں پینے کے لحاظ سے کارہیز ہوں۔ میں نے لکڑی کی ٹیوں پر پھول بٹنے کا ڈھنڈے والی مشین بنائی ہے۔ اس طرح کی "کاروٹنگ مشین" پورے ملک میں شاید وہ دین ہی ہوں گی۔ عرصہ دس سال سے میں ملک میں کام کر رہا ہوں۔ بنجاب میں میرے چند

عسریاں عزیز رہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میرا کام یہاں بھی بہت اچھی طرح چل سکتا ہے۔ انہی کی دعوت پر میں پچھلے ماہ فریہ کوٹ آیا تھا لیکن تلاش کے باوجود وہ لوگ مجھے یہاں مل نہیں سکے۔ وہ مکان چھوڑ کر جا چکے ہیں اور یہ بھی پتا نہیں کہ کدھر گئے ہیں۔ میں بس یونی میاں وہاں بھاگ رہا ہوں۔ مشکل کے روز میں ہاتھ لینے و بار صاحب جا رہا تھا۔ میرے پاس ایک کرائے کی گاڑی تھی۔ ابھی میں فریہ کوٹ سے نکلا تھا کہ جی نہیں تھا کہ اپنا کبھی میری نشست کے پیچھے سے یہ پاگل سا شخص برآمد ہوا جو اب آپ کی جپ میں لیٹا ہے۔ اس نے میرے سر پر کسی دھڑلے سے ضرب لگائی۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔ ہوش آیا تو میں گرم ریت پر تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ پیاس اور تھکت سے دم نکلا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی خواب اور انجکشن بھی لگایا جاتا رہا ہے۔ میرے بازو پر انجکشن کے دو نشان صاف دکھائی دے رہے ہیں۔"

میں نے اپنی لٹیس کی آستین اُٹ کر زانن کو انجکشن کے نشانات دکھائے۔ ان نشانات کا علم مجھے ابھی قموڑی دیر پہلے ہی ہوا تھا۔

زانن نے پوچھا "موتی کو جانتے ہو؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" مداراج رتن نے پہلی بار متنگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ راجستانی تھا اور آواز رعب دار تھی۔

"یہ لڑکی بھی میرے لیے اجنبی ہے" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ابھی قموڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ میں اپنی ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں" مداراج نے نکتہ اٹھایا۔

"جناب! میں نے کہا ہے تاکہ آپ کے پیچھے سے پہلے میں ہوش میں آ گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس کا رخسار میرے ہاتھ پر تھا اور یہ بے سمدھ بڑی ہوئی تھی۔ شاید مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے کرتے خود بھی بے ہوش ہوئی تھی۔"

مداراج رتن سکھ کی تیز نظریں میرے آ رہا دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زانن کا لاکا کی طرح اس کا رنگ بھی سانولا تھا لیکن لباس اور ذیل ڈول کے اعتبار سے وہ بہت رعب دار نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اقتدار اور طاقت کا کش تھا اور شاید شراب کا کش بھی۔ مجھے پہلی نگاہ ہی وہ اچھا شخص نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے دھتے لیمے میں زانن

کا کا کو چند ہدایات دیں۔ غالباً یہ ہدایات جابی شاہ کی لاش کے بارے میں تھیں۔ پھر وہ عربی شکاری کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گیا۔

میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں جب کو حادثہ پیش آیا تھا۔ جب سے چند روز ہیں گزرتے ہیں ایک گڑھا تھا۔ میں اپنے گڑھوں کو بخوبی پہچانتا تھا۔ صحرا میں شکار کھینٹنے والے اکثر ایسے گڑھے کو دھتے ہیں اور انہیں گھات لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ماضی میں یہ گڑھا بھی کسی شکاری نے کھودا تھا مگر اسے کھودے ہوئے گڑھے میں وہ خود نہیں گرا تھا کوئی دوسرا گڑھا تھا۔ ذرا نیور کے بے پروائی سے جب گا بیاں اٹھا بیٹا گڑھے میں گیا تھا اور وہ وہیں ٹپا بیاں لگائی تھی۔ دو دن سے کھل جانے کے سبب میں اور غزال و طحوان پر لڑھک گئے تھے۔ جبکہ سائیں عالی اور جابی شاہ اندر ہمیں گئے تھے۔

\*\*\*

قوی در بعد ہم دوبارہ جھوپ میں سوار ہوئے اور نامعلوم منزل کی طرف چل دیے۔ میں اسی جیب میں تھا جس میں مجھے بانی وغیرہ پلا کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ سائیں عالی ابھی تک پہچانی قسمت پر بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ اس کا دایاں بازو پیڑ میں جکڑا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کا بازو وہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ جب میں نرائن کے علاوہ ایک موٹے کھوں والا بھٹا سا شخص بھی تھا۔ مہاراج اور عربی مہمان دوسری جیب میں تھے۔ غزال ابھی وہیں تھی۔

دیکھے ہوئے صحرائی قریب ایک کھٹا سنڑ کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں پہنچ گئے۔ یہاں کچھ بھری پھری اور ناگ چینی کے علاوہ کئی صحرائی پودے درخت نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے مین درمیان بے حد نفیس قسم کے نیچے استادہ تھے۔ ان رنگ برنگے خیموں کی تعداد پانچ تھی۔ خیموں کے عقب میں ایک گھڑی کوچ کھڑی تھی۔ اس کی چھت پر نی وی ابریل نظر آ رہا تھا۔ دو تین بے حد شاندار میزبان درختوں کے پہلو میں کھڑے تھے۔ جو بھی ہم جیب سے باہر نکلے، بٹے ہوئے گوشہ کی منک خیموں سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی جیڑہ کی مسلسل ”گھوں گھوں“ کانوں میں پرانے لگی۔ یہ شکار پارٹی بڑے ذہرست انتظامات کے ساتھ شکار کھیل رہی تھی۔ مجھے ”غزال اور سائیں عالی کو جھوپ سے اترتے دیکھ کر موٹے پر جو خود تمام افراد ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر صورتوں سے ہی ملازم پیش نظر آ رہے تھے۔ کچھ جانوروں کا ہانکا کرنے والے دیہاتی تھے۔ صرف دو

افراد ایسے تھے جنہیں مہاراج کا ساتھی یا مہمان تصور کیا جاسکتا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں تمام صورت حال واضح ہو گئی۔ ہمیں جس جگہ لایا گیا تھا وہ اس شکار پارٹی کا بیس کیمپ تھا۔ یہ جگہ ناگور اور بیکانر کے درمیان صحرائی علاقے میں واقع تھی۔ مہاراج کی اپنی اسٹیٹ کا نام آندل تھا۔ ناگور کی مغربی جانب ایک کالی بڑا رتہ اس اسٹیٹ کی حد میں شامل تھا۔ جو پورنائی ایک بڑا قصبہ اس اسٹیٹ کا مرکز تھا۔

اس شکار پارٹی میں مہاراج رتن، اس کے دو ہم نواں وہم ہالہ دو ستوں پریم کاردار اور کمار بنشن کچھ کے علاوہ دو عربی مہمان بھی شامل تھے۔ ایک مہمان کا تعلق امارت سے تھا۔ اس کا نام شیخ اسد تھا۔ دوسرا مہمان مصری، بابٹ بن رحمان تھا۔ وہ تیرہویں کا ایک بہت بڑا کاشکار تھا۔ ان کئی پانچ افراد پر مشتمل شکار پارٹی کے لیے نوکروں، خدمت گاروں اور معاونین کی ایک فوج ظفر مروج موجود تھی۔ چار شاندار جیبیں، ”ایک کوچ“ پانی کا ایک ٹینکر، تازی گھوڑوں کا ایک دستہ اور دو تین دوسری گاڑیاں اس کے علاوہ تھیں۔ یہ شکاری حضرات، چہ بہ ترین شکاری آلات سے لیس تھے اور پچھلے دو روز میں قریباً تین درجن ہرنوں اور ایک چیتے کے علاوہ بے شمار جانوروں اور پرندوں کو دم آباد روانہ کر چکے تھے۔ وہ صرف ممنوعہ اور غیر ممنوعہ ہور کے اسٹن سے ہی شکار نہیں کھیل رہے تھے۔ ان کے پاس شکاری پرندے، باز اور بھرا وغیرہ بھی تھے۔ تاہم واروٹھ شکار نرائن کا کا کشتا تھا کہ ناموافق موسم کے سبب ابھی تک شکاری پرندوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا ہے۔

غزالہ کے حوالے سے مجھے کچھ ابھن سی ہو رہی تھی۔ ہم جب سے یہاں پہنچے تھے میں صرف ایک مرتبہ اس کی صورت دیکھ سکا تھا۔ وہ اس انوشل کوچ میں تھی جس میں صرف مہاراج رتن یا اس کا مصری مہمان جا سکتے تھے۔ مہاراج رتن اکثر کوچ میں گھس رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی نیت میں فوری سا لگتا تھا۔ میں اس صورت حال پر معترض بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں خود ہی غزالہ سے لاتعلقی کا اعلان کر رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ غزالہ نے میرے اور اپنے بارے میں کیا بیان دیا ہے۔ بہر حال اس کی فراست سے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ سے شناسائی کا اقرار کرے گی۔

اگلا روز بے حد بگڑا تھا۔ مہاراج رتن کچھ اور اس کے دونوں عربی مہمانوں نے تازی گھوڑوں پر سوار ہو کر

سور کا شکار کیا۔ نرائن کا کا نے مجھے بتایا کہ پولو کے کھیل کی طرح سور کا شکار بھی یہاں بہت مقبول ہے۔ مہاراج نے گھوڑوں کی ٹریننگ کے لیے باقاعدہ ایک ”سور گاڑا“ بنارکھی ہے۔ وہاں سیکڑوں کی تعداد میں جنگی سور دیکھے جاسکتے ہیں۔ واقعی وہ ایک بڑے جوش اور دلیرانہ کھیل تھا۔ اس میں جانور اور شکاری کے لیے یکساں مواقع تھے۔ نیزہ بردار شکاری گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک مقررہ جگہ پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہانکا کرنے والے سور کو جھانپوں سے نکالتے تھے۔ جانور کو باہر کھلی جگہ پر نکالنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ جو بھی جانور کھلی جگہ پر آتا تھا نیزہ بردار شکاری اس کے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے تھے۔ یہ منظر دینی ہوتا تھا۔ ہر شکاری کی خواہش ہوتی تھی کہ جانور کو بلا زخم وہ لگے گھوڑے اور سور سرٹ بھائے اور آٹا ٹاٹا نکلوں سے اوچھل ہو جائے تھے۔ شکاریوں اور سور میں لوگر دینے والی یہ دوڑ کسی وقت طول بھی کھینچ جاتی تھی۔ تین چار دفعہ ایسا ہوا کہ سور کو ہانکے کے مقام سے کئی میل دور جا کر مارا گیا۔ یہ نہایت پرخطر کھیل تھا۔ پھر ہوا سور نہایت خطرناک جانور سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بعض اوقات جیتے اور شیر تک کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ اس کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کی دندانہ بھی جاتی ہے۔ اس تیز رفتار دندانہ کے ذریعے وہ پلک بھینکتے ہیں تو متاثر کئے جسم میں شگاف ڈال دیتا ہے۔

اس روز میری آنکھوں کے سامنے کئی سنسنی خیز واقعات رونما ہوئے۔ شکاری بھانگے گھوڑے سے سور کو نیزے کے ذریعے کاری ضرب لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں جی نیزہ ٹوٹ جاتا تھا، بھی دار اوچھا پڑتا تھا اور کبھی انور مشعل ہو کر پلٹ پڑتا تھا۔ سب سے دلچسپ اور سنگین صورت حال وہ ہوتی تھی جب جانور مشعل ہو کر شکار پر پلٹتا۔ وہ براہ راست گھوڑے کے پیٹ پر حملہ کرتا تھا۔ اس دڑ میں نے اپنی آنکھوں سے دو نہایت قیمتی گھوڑوں کی نیل زمین پر پڑنے دیکھی۔ اسی طرح ایک ستاری شکاری گھوڑے سے ٹکرایا۔ اس کا بازو رکاب میں پھنسا اور گھوڑا سے دور تک گھینٹا چلا گیا۔ نتیجے میں شکاری کے جسم پر کئی ٹپ آئے۔ اس طرح کے حادثوں سے اکثر شکاریوں کے دل و خوش میں کوئی کمی واقعی نہیں ہوتی۔ مہاراج اور ماکے مہمان بھی بدستور مصروف عمل رہے۔ ایک ہانکے سور کے بھانے جھانپوں سے دو بھینٹے نکل آئے۔ تین میں وہ ٹپ دکھائی دے رہے تھے لیکن شکاریوں کے

چہرے کی بیچانی کیفیت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بھینٹے ہیں۔ مہاراج رتن اور اس کے ساتھی شکاری اپنی جدید رائفلوں سے پلک بھینکتے میں انہیں ہلاک کر سکتے تھے لیکن وہ کھیل کے موز میں تھے۔ نیزہ برداروں نے تیز رفتار گھوڑوں پر جانوروں کا چھپا کیا اور ڈیڑھ دو میل آگے ایک ٹھک گھاٹی میں انہیں ہلاک کر دیا۔

اس روز سہ پہر کو شکار کا پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ معلوم نہیں پروگرام ہی اتنا تھا یا شکاری نڈھال ہو کر پروگرام مختصر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بیس کیمپ اٹھا ڈیا گیا۔ خیموں سمیت ہڈاؤ کا تمام سامان ایک بڑے لوڈر میں لاد دیا گیا۔ مجھے اور سائیں عالی کو بھی سامان ہی کی طرح ایک گاڑی میں لوڈ کر دیا گیا۔ سائیں عالی تو خیر اپنی مرضی بتانے سے قاصر تھا ہی۔ مجھ سے بھی میری مرضی نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ شاید ہماری حیثیت قیدیوں کی ہی ہے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس حادثے کے سبب ہماری مڈھ بھینٹ اس شکار پارٹی سے ہوئی تھی اس حادثے کے حوالے سے ابھی تک کسی نے مجھ سے تفتیشی بات نہیں کی تھی۔ جب کا کیا کیا جائے گا؟ موتی جابی شاہ کی لاش کہاں ہے؟ اس کی موت کے بارے میں پولیس کو رپورٹ کی گئی ہے یا نہیں؟ کوئی بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ ایک دن نرائن نے بس اتنا بتایا تھا کہ موتی کی لاش جو پور پور پوری گئی ہے۔ یہ لوگ ہمیں کوئی گری پڑی شے سمجھ رہے تھے اور کسی وقت تو محسوس ہوتا تھا کہ اپنے سونے میلے میں ہمیں بھول ہی چکے ہیں۔ ہماری واپسی ایک شاندار عمارت میں ہوئی۔ یہ عمارت جیسا کہ جانے والی سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے قصبے میں واقع تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس قصبے کا نام ہی ”جوہر“ تھا اور یہ ایک اسٹیٹ آندل کا مرکز تھا۔ عمارت کیا تھی ایک شاندار محل تھا جو کم و بیش چھ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس عمارت کو ”میرس“ کا نام دیا گیا تھا۔ نہایت لمبی رتن کچھ جی کے منظم شکار نرائن کا کا سے پتلا کہ اس میرس میں بہت شاندار قسم کی تقریبات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات مہمانوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی ہے۔ ان میں بڑے بڑے اُمراء و ساد اور سوسائٹی کے گھنے چنے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ میرس (محل) واقعی کسی نوادرو کو مرحوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ باتات، قوارے، چلواریاں، سبز قالین جیسے لان، سونگ پل، بلند بالا چیمیں، منقش و دودواریاں، بادردی لازم اور بیش قیمت گاڑیاں، ہر شے سے امارت اور شاندار



شوکت جیتتی تھی۔ غزالہ کا تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اس محل میں آگرمیں خود کو ایک دم پوتا محسوس کرنے لگا تھا۔ محل یا میسر میں بوس نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے میرے سر کی بزمین مرمر پر رکھی۔ میں ابھی تک اسی خون اکود اور پھینے پرانے لباس میں تھا جس میں مجھے حادثہ پیش آیا تھا۔ مجھے میری پسند کے مطابق نیا لباس اور جوڑے مہیا کئے گئے۔ میں اس وقت ایک پُر تکلف لڑکے کے بعد دل کی شکل والے ایک سو نمونگ پول کے کنارے نفل رہا تھا جب زرائن کا ایک شاندار سفاری سوٹ میں لمبوس میری طرف بڑھا۔ اس نے ملاحت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "مسٹر نفل شکوہ ہم نے بہت کوشش کی ہے لیکن جب کے نیچے آکر مرنے والے شخص کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ نہ ہی یہ خبر ہو سکی ہے کہ جس گاڑی میں تم یہاں پہنچے ہو وہ کس کی ملکیت ہے؟ گاڑی پر کئی بولی نمبر پلیٹ جعلی ثابت ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا "وہ لڑکی کیا کسے ہے جو جب پر ہمارے ساتھ سوار تھی۔"

زرائن کا بولا "اس نے تو چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ جب سے آئی ہے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ کبھی تو گھٹا ہے کہ گھر سے بھاگی ہوئی ہے اور اپنا نام پتا جانتا نہیں جانتی۔ ربا وہ ملک قو ات اپنا ہوش نہیں دہ یہ ابھی ہوئی تھی کیا سلجھائے گا۔ اب تو ایک ہی راستہ ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی ملک اور اس کے چیلے کا تعلق ہمارے علاقے سے ہو۔ وہ کسی جگہ میں ہمارے پیچھے لگے ہوں یا کسی نے انہیں لگایا ہو۔ یا پھر ہمارے پیچھے کے حوالے سے کوئی تم سے قاعدہ اٹھانا چاہتا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے پھول کاؤٹنے والی جو مشین بنائی ہے وہ ہمارا "ہکارو داری سیکرٹ" ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اس مشین کے پیچھے ہی لگا ہو۔"

"آپ کتنا کیا چاہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب تو ایک ہی طریقہ ہے۔ کسی کو نکلنے بھیجا جائے اور وہ وہاں جا کر کھون لگائے کہ یہ لڑکی کون ہے اور یہ دیگر دو افراد کون ہیں جو ہمارے ساتھ پائے گئے ہیں۔ یا پھر فریڈ کوٹ میں ہمارے سرکاری رشتے داروں کو ڈھونڈنا چاہئے اور ان سے پوچھ چمکی جائے۔"

"میرے خیال میں تو یہ بے سود ہے" میں نے زرائن کا

کا تعلق میرے آس پاس سے نہیں ہے۔"

زرائن کا کانے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو کے سنے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ یہ کم و بیش تیس نوٹ تھے۔ وہ بولا "یہ دوپے ہڑپائی نس نے ہمارے علاج ساجے اور راستے کے خرچ کے لیے دیے ہیں۔ ان کا کتا ہے کہ اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔"

"اور اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

"تو پھر جب تک چاہو یہاں ہمارے پاس رہ سکتے ہو۔ اس میں ہمارے لیے آسانی رہے گی۔ ظاہر ہے پولیس نے اس حادثہ کی تحقیق کرنی ہے۔ جو کچھ تم پولیس کو بتا سکتے ہو وہ ہم نہیں بتا سکتے۔ موتی کی لاش سروخانے میں پڑی ہے۔ ہر ہائی نس آج اسے پولیس کی تحویل میں دے دیں گے اور ساتھ ہی رپورٹ بھی لکھوا دیں گے۔"

میں نے ریٹائن ہونے کی اداکاری کی۔ زرائن کا پراو راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "ہڑپائی نس تو تمہاری بھلائی سوچ رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پولیس کے پکڑے بڑے بے رحم اور جان لیوا ہوتے ہیں۔ شریف بندہ نقیش کی پگھلی میں پس کر رہ جاتا ہے۔ جب پولیس آئے گی تو وہ بہت کچھ پوچھے گی۔ ملک تو کسی قسم میں نہیں آتا۔ سارا بوجھ تمہی پر پڑتا ہے۔ گاڑی کی چوری اور لڑکی کا اغوا یہ دو ایسے جرائم ہیں جن کے لیے پولیس کو بہر حال "بھرم" تلاش کرنا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جب کے حادثے کو بھی سازش کا رنگ دینے کی کوشش کی جائے۔"

یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ زرائن کا مجھے ہراساں کر کے یہاں سے بھاگنے کے پکڑ میں ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ان لوگوں نے سائیں عالی اور غزالہ وغیرہ کا نام پتا معلوم کرنے کے لیے فیروز پور، فریڈ کوٹ اور فٹلا میں نیم دلی سے کوشش کی تھی اور ان تمام جگہ کر کے اطمینان سے پینہ مئے تھے۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں ہڑپائی نس رتن شکوہ جی کے چوہے بھی سیانے تھے۔ انہیں شب ہو چکا تھا کہ ہڑپائی نس نے حادثے میں بیچ رہنے والی لڑکی پر آنکھ رکھ لی ہے۔ اب انہیں کیا مصیبت بڑی تھی کہ وہ جان جو حکم میں ڈال کر لڑکی کے وارثوں کو تلاش کرتے مہاراجا رتن شکوہ صورت سے ہی بددیت اور عیاش نظر آتا تھا۔ ایک خوب لڑکی کے پھل کی طرح اس کی جمالی میں آگری تھی۔ کیوں اس ستری موتے سے فائدہ نہ اٹھا۔ مجھے نہیں پتا تو کہ غزالہ نے مہاراجا رتن شکوہ کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے۔ تاہم یہ امر یقینی تھا کہ اس نے جو کچھ بھی بتایا ہے

ظاہر کردی تھی۔ اب رضامندی بھی ظاہر کر دی۔ اسی شب میری رواجی کا انتظام کر دیا گیا۔ مجھے قہرے بڑی سڑک تک پہنچنے کے لیے قریباً پندرہ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ سڑک سے بس پکڑ کر ناگور کے ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا اور وہاں سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر عازم پنجاب ہو جانا تھا لیکن یہ دکھاوے کی رواجی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں غزالہ کو اس سال میں اور اس حال میں چھوڑ چلا جاتا۔

معلوم نہیں اگلے روز کیا ہوتا۔ میں کہتے بیچے ناگور اسٹیشن پہنچا۔ کون سی گاڑی پکڑنا؟ پھر کس مقام پر اور کس روپ میں گاڑی سے اتر کر وہاں مہاراجا رتن شکوہ جی کے محل میں پہنچا کر میج ہونے سے پہلے ہی حالات نے ایک نئی کر دئی۔

مجھے "میسر" کے مہمان خانے میں رکھا گیا تھا۔ مہمان خانے بھی دو تھے۔ ایک خاص اور دوسرا عام میں عام تھا۔ اس لیے عام مہمان خانے میں تھا لیکن یہ عام بھی بڑے بڑے خاص مہمان خانوں سے بڑھ کر تھا۔ صاف شفاف کچن، فرش وسیع کمرے اور آہنی فرنیچر ایک خادم ہمہ وقت میرے ارد گرد موجود رہتا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ خادم کے علاوہ مخالف کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اس رات نو بجے کے بعد وہ نہ جانے کہاں او جھل ہو گیا۔ اس کی غیر موجودگی نے مجھے شہ دی اور میں نے توہڑی سی آوارہ گردی کرنے کی ٹھانی۔ درحقیقت غزالہ کے حوالے سے میرا جتنس بڑھتا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ اسی پر شکوہ عمارت میں تھی لیکن ابھی تک میں اس کی جھٹک نہیں دیکھ پایا تھا اور نہ ہی یہ جان سکا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اپنے ملازم کو ڈھونڈنے کے بہانے مہمان خانے سے نکلا اور پچھتا چھا تا اس وسیع حوض کی طرف آیا جس میں اعلیٰ نسل کی بلیں تیر رہی تھیں اور زپر آب رنگی رنگی رویشیوں کا عکس فوادوں کی چھوڑ پر پڑ کر عجیب نظارہ پیش کرتا تھا۔ اچانک مجھے ٹھنک کر کھڑا ہوا۔

جوئی میں ایک سرو کی اوٹ سے نکلا، سامنے ایک پانی کے گرد مہاراجا رتن شکوہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ پانی پر چاندی کے منتشر برتنوں میں چائے یا قہوہ قسم کی چیز رکھی تھی۔ رتن شکوہ کے دونوں ساتھیوں کا انداز منڈیانہ تھا۔ وہ آگے کو نکلتے ہوئے ایک اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ رتن شکوہ بھی اسی اخبار پر جھکا ہوا تھا۔ میری آہٹ سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ جب تک وہ مجھے دیکھتے ہیں خود کو پوری طرح سنبھال چکا تھا۔ رتن شکوہ نے مجھے دیکھ کر اپنی طرف بلا لیا۔ میں پوری طرح الٹ ہو گیا۔ میں ممکن تھا کہ

مہاراجا رتن شکوہ کے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوا ہے۔ میں نے مہاراجا کی بخشش لینے سے تو انکار کر دیا لیکن جو پور چھوڑنے سے انکار نہ کر سکا۔ انکار کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ہریانہ نے کئی پٹی رنگے بنیے تیار کیا تھا کہ میرا اب یہاں کوئی کام نہیں۔ اگر اب بھی میں محل نشین رہنے پر اصرار کرتا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا ڈال میں کچھ کالا ہے اور میں وہ نہیں جو خود کو ظاہر کر رہا ہوں۔ ایک معمولی سے کاروباری شخص کی بھلا کیا بساط تھی کہ وہ جانتے بوجھتے خود کو ایک سنگین معاملے میں ملوث کرنا اور تھا نے پکڑی کے مصائب سے بڑھ نہ ناکتا۔ اس صورت میں مہاراجا اور اس کے گناہتے مجھے آوازے ہاتھوں لے سکتے تھے۔ ایسے تمام لوگوں کے پاس نہیں والی دشمنی ہوتی ہے اور اس میں "ناممکن" کا لفظ نہیں ہوتا۔

میں نے زرائن کا کا کو سمجھا دیا کہ میں اس کی بڑھائی ہوئی پتی پڑھ گیا ہوں اور اس معاملے سے جان چمڑا کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میں نے اس "معلوم خواہش" کا اظہار بھی کیا کہ میں اپنے ساتھ حادثے کا شکار ہونے والی لڑکی کے بارے میں جانا چاہتا ہوں۔

زرائن نے کہا "تم اس کی طرف سے شانت رہو۔ ہم گاتار کو کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اپنے دوٹاکے بارے میں کچھ بتا دے۔ ظاہر ہے اب پولیس بھی اس کوشش میں شریک ہو جائے گی۔ بلکہ ایک طرح سے اب یہ پولیس کا معاملہ ہی ہے۔ ممکن ہے کہ لڑکی کو پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے اور پھر عارضی طور پر ہڑپائی نس اسے اپنی حفاظت میں رکھیں۔"

میں نے سعادت مندی سے زرائن کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنے کامل اطمینان کا اظہار کیا۔ زرائن نے مجھے قانونی نکتے سمجھاتے ہوئے کہا "کسی کو کیا خبر ہے کہ جب میں کہنے نہ دے تھے۔ تم نکل جاؤ گے تو کسی کے باپ کو بھی خبر نہیں دے گی۔ اگر لڑکی نے کوئی انا سید حایان دیا بھی تو وہ پولیس کو ہمارا صرف حلیہ ہی بتا دے گی اور ہماری پولیس اپنی اتنی لاق نہیں ہوئی کہ ملے کی مدد سے کسی شخص تک نہ جائے۔"

زرائن دیر تک مجھ سے مصروف گفتگو رہا۔ غالباً وہ یہ اتنا تھا کہ میں نے اپنے بارے میں بہت سے حقائق چھپائے۔ لیکن وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا "اس کا سارا زور ان اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ میں لڑکی اور سامیں عالی کو فرسٹ میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں نے ہم رضامندی پہلے ہی



رتن سکھ مجھ سے اس لیے محل چل قدمی کا سبب پوچھتا۔ اس سوال کا میرے پاس گھڑا گھڑایا جواب ہے تھا کہ میں ملازم سجاد کو ڈھونڈنے نکلا ہوں۔ تاہم اس درود کوئی کی نوبت نہیں آئی۔ رتن سکھ نے مجھ سے پوچھا "اے سزا کیا نام ہے تمہارا" تم بھی تو فرید کوٹ سے آئے ہو۔ یہ گاندھی چوک کس جگہ کا نام ہے؟ کوئی بازار وغیرہ یہ بار بار بتا دیتا ہے؟" میں نے کہا "جناب! میں کچھ زیادہ دن تو وہاں نہیں ٹرکا۔ ہاں گاندھی چوک کا نام میں نے بھی سنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اندرون شہر کا بارون بازار ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا "کوئی خاص بات ہے جناب؟" رتن سکھ نے اخبار کے بیرونی صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دو گروہوں میں جھگڑا ہوا ہے وہاں۔ بہت فائرنگ ہوئی ہے۔ پانچ افراد مارے گئے ہیں۔ لکھا ہے کہ کسی ٹرک وغیرہ کا چکر ہے۔ اس میں بہت سال مال و اسباب پاکستان سے لایا گیا ہے۔"

رتن سکھ کا انداز تو دلینے والا تھا اور اس "مٹوہ" کے لیے ہی اس نے مجھ سے ہم کام ہونے کی ہمت گوارا کی تھی۔ میں نے منسوب لکھے ہیں کہ "کسی ٹرک وغیرہ کا ذکر تو میں نے بھی سنا تھا جناب! کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ فرید کوٹ میں جو ہندو سکھ فساد ہوا ہے اس کے پیچھے بھی یہ ٹرک والا معاملہ ہی تھا۔ سنا ہے اس ٹرک میں ہیرے جواہرات لدے ہیں اور بہت سے خطرناک لوگ اس ٹرک کے پیچھے لگے ہوئے ہیں" باتوں کے دوران میں نے ایک اچھتی ہوئی سی نظر اخبار پر بھی ڈالی تھی۔ یہ بیکانیر سے نکلنے والا ایک شام کا اخبار تھا۔ اس کے فرنٹ پیج پر ایک تین کالمی ٹریفی لگی ہوئی تھی۔ "فرید کوٹ میں مزید ہنگامے۔ پراسرار لوگوں کی فائرنگ میں پانچ افراد ہلاک۔ مرے والوں میں دو راہ گیر بھی شامل ہیں"

رتن سکھ نے مجھ سے فرید کوٹ اور وہاں کے حالات کے بارے میں چند باتیں اور پوچھیں۔ میں نے کھڑے کھڑے ان سوالوں کے جواب دیے۔ اتنے میں ملازم سجاد مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک داک ٹائی قسم کی چیز تھی۔ یہ چیز اس نے بڑے منسوب انداز میں جھک کر رتن سکھ کے ہاتھ میں تھما دی۔ رتن سکھ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کی اجازت "مرحت" فرمائی۔ میں خود بھی وہاں سے کھٹکنا چاہتا تھا۔ رتن سکھ کا اشارہ ملنے ہی میں جانے کے لیے واپس مڑا اور اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ایک پتھر پڑی سی چوٹ مٹی۔ مجھے "تھمن" نظر

آیا تھا۔ یہ وہی بد معاش تھا جو اس سے پہلے شیخ راشد بن راشد کی چھری کر چکا تھا۔ جن دنوں میں راشد بن راشد کو تلاش کر رہا تھا "تھمن" بار بار میرے آڑے آیا تھا اور مال روڈ لاہور کے ایک مصروف چوراہے میں تھمن اور میرے درمیان ایک زبردست جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ میں ان واقعات کا مختصر ذکر درود کے شروع میں کر چکا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میری اور تھمن کی نگاہیں ملیں "میں نے اس کے چہرے پر ایک رنگ سالہانا محسوس کیا یا شاید یہ میرا دم تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا رخ پھیرا اور مسمان خانے کی طرف نکل گیا۔ تھمن خوش کی طرف چلا گیا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بے قراری سے ٹھٹھنے لگا۔ تھمن کو میں نے آج تقریباً چھ سال پہلے دیکھا تھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی محسوس صورت اور خطرناک نظر آتا تھا۔ آج سے چھ سال پہلے تھا۔ اس کی یہاں موجودگی ذہن میں اُن گھٹ اندیشوں کو راہ دے رہی تھی۔ مین ممکن تھا کہ مداراج کے عرب مہمانوں کا تعلق راشد بن راشد کے خاندان سے ہو یا پھر وہ کسی حوالے سے راشد بن راشد اور اس کے انجام کے بارے میں جانتے ہوں۔ میرے دل نے کوئی دی کہ اگر تھمن مجھے دیکھ کر پہچان چکا ہے تو پھر میرا ایک بل بھی یہاں ٹرکنا مناسب نہیں۔ اگر میرے اندیشے درست تھے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک خوابیدہ آتش فشاں انڈیا کی لے کر بیدار ہو سکتا تھا۔ کثرت و خن کا ایک نیا باب کھل سکتا تھا اور کچھ ایسے دشمن میرے مقابل آتے تھے جن کی شکستیں دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

بعض دفعہ واقعات اتنی تیزی سے رونما ہوتے ہیں اور خدشات اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھارتے ہیں کہ انسان دھک رہ جاتا ہے۔ جو کسی میں نے ملازم سجاد کو آواز دی وہ اسے اپنا مختصر سامان پیک کرنے کو کہا، "زائن کا کامان خانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے کھڑکی میں سے دیکھا۔ اس کی چال میں جب سی بے قراری اور تیزی تھی۔ تاہم چند لمحے بعد جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اس چھوٹے سے سفری بیگ پر ڈالی جس میں سجاد میرے پرانے کپڑے چھڑی اور مارچ وغیرہ محسوس رہا تھا۔

"کیا بات ہے تم جا رہے ہو؟" زائن کا کاٹنے جیانی سے پوچھا۔

"ہاں جی۔ میں نے سوچا ہے کہ صبح نکلا تو پھر شام سا بچے تک گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک گاڑی صبح

سورے چار بجے نکلتی ہے۔ اب چلا جاؤں تو وہ گاڑی پکڑوں گا۔"

زائن نے ہاتھ اٹھا کر اپنی دست و اج نگاہ دوڑائی "لیکن اب تو دس بجتے والے ہیں۔ ناگور جاے والی آخری بس تو نکل چکی ہوگی۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں جی۔ ٹرک تو ساری رات چلتا رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی سواری مل ہی جائے گی۔"

زائن کا کاجھ سے منتظر نظر نہیں آتا تھا، کتنے لگے "لیکن بڑی سڑک تک کیسے جاؤ گے اس وقت تو یہاں کوئی گاڑی بھی نہیں ہے۔"

زائن کے ارادے واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک مجھے یہاں سے "دھکے" دے رہا تھا اب ہر صورت مجھے روکنے کی فکر میں تھا۔ میرے کے بار کنگ لاٹ میں گاڑیاں موجود تھیں لیکن اسے نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اگر میں "دکھانے" کی کوشش کرتا تو وہ کہتا کہ یہ خراب ہیں یا ان کے ڈرائیور موجود نہیں وغیرہ وغیرہ۔ خیالی کا عار وہ ہے کہ سن حرافی تے جتناں ذمیر۔ یعنی کسی کام سے کرنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے لیے سو بھانے تراشے جاسکتے ہیں۔

زائن بھی دو تین بھانے تراش چکا تھا اور ضرورت پڑنے پر مزید تراش سکتا تھا۔ میرے تجربے کو درست ثابت کر کے ہوئے وہ بولا "دو گاڑیاں تو کھڑی ہیں لیکن ان کے ڈرائیور پھنسی کر کے چائے ہیں۔ صرف ہڑبائی بس کا ذاتی ڈرائیور موجود ہے لیکن ہڑبائی بس کو کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے ان کی ہدایت ہے کہ کم از کم ایک ڈرائیور ہر وقت ٹرک میں موجود ہونا چاہیے۔"

میں نے کمر تسلیم ختم کر دیا اور کہا "ٹھیک ہے جیسے آپ کہتے ہیں لیکن پھر کل صبح جانے کے بجائے میں بارہ ایک بجے نکلوں گا کہ اسٹیشن پر گاڑی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔"

زائن کا کانٹے سٹریٹ سٹگاتے ہوئے پوچھا "فرید کوٹ میں تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

میں نے کہا "کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ چارپانچ ہوٹل بدلے ہیں۔ اب پیسے بچانے کے لیے اسٹیشن کے پاس ہی ایک درمیانے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس وقت نام یاد نہیں آ رہا اس کا۔"

زائن مجھے تقیثی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ان عزیزوں کے بارے میں چند سوالات پوچھے جنہیں میں اپنے بقول فرید کوٹ میں ڈھونڈنا پھر رہا تھا۔ میں نے بد

لتا سے ان سوالات کے جواب دیے۔ میں جان چکا تھا کہ

زائن مجھے تقیثی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ان عزیزوں کے بارے میں چند سوالات پوچھے جنہیں میں اپنے بقول فرید کوٹ میں ڈھونڈنا پھر رہا تھا۔ میں نے بد

لتا سے ان سوالات کے جواب دیے۔ میں جان چکا تھا کہ

زائن مجھے تقیثی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ان عزیزوں کے بارے میں چند سوالات پوچھے جنہیں میں اپنے بقول فرید کوٹ میں ڈھونڈنا پھر رہا تھا۔ میں نے بد

لتا سے ان سوالات کے جواب دیے۔ میں جان چکا تھا کہ

زائن مجھے تقیثی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ان عزیزوں کے بارے میں چند سوالات پوچھے جنہیں میں اپنے بقول فرید کوٹ میں ڈھونڈنا پھر رہا تھا۔ میں نے بد

لتا سے ان سوالات کے جواب دیے۔ میں جان چکا تھا کہ



اسباب: خوف، دہشت اور اسرار میں  
ڈوئی ایک خوفناک داستان۔  
اسباب، ایک سرگرمی بدووح کا ہتھ۔  
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان  
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور اب  
تک جاری ہے گی۔

قیمت: ۲۰ روپے

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز  
۲۰۔ عزیزا رکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

فون: ۲۲۴۲۱۳

اسٹاکٹ: علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔

فون: ۲۲۳۸۵۳

بے پرواہی کے سال کا بے باک

حالات کس کس پر جا رہے ہیں۔ اب خود کو چھپانے کی کوشش کارگر ثابت ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ پندرہ میں منٹ بعد نرائن میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور اس کے فوراً بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے خدمت گار سجاد کی جگہ ایک دوسرے شخص نے لے لی ہے۔ بظاہر یہ شخص بھی خدمت گار ہی تھا لیکن اسے دیکھتے ہی میں تاڑ گیا کہ وہ بدعاشوں کے کسی خطرناک قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور میری خبر گیری کرنے کے لیے پوری طرح مسلح ہے۔ پانچ دس منٹ بعد ایک ایسا ہی شخص مجھے سمان خانے کے صدر دروازے پر بھی نظر آیا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر فوم کے بستری پر ڈیر ہو گیا۔ جن خدشوں نے ذہن میں سراخا تھا وہ حقیقت کے قالب میں ڈھل گئے تھے۔ میں بھڑو اُٹا رہا تھا پچھانے کا تھا اور مجھے پہچاننے والا ایک ایسا شخص تھا جو راشد بن ارشد کے واقعہ قتل کا چشم دید گواہ تھا۔ قریباً سات برس پہلے جب میں نے جام پورہ کی ایک شاخدار حوٹلی میں شیخ راشد بن ارشد پر اپنا پستول خالی کیا تھا، شخص مجھ سے چند لڑکی دور پر موجود تھا۔ اس وقت جن افراد نے مجھ پر جوابی فائرنگ کی تھی ان میں شخص بھی شامل تھا۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر مہاراج رتن سنگھ کے علی سمانوں اور شیخ راشد بن ارشد میں کوئی درگاہ تعلق بھی موجود ہے تو میرے لیے ایک بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ چند روز پہلے تک یہ بات میرے دہم دکان میں بھی نہیں تھی کہ ایک بیس قیمت ترک کی خاطر فرید کوٹ اور فائنلکا کے کئی کوچوں میں گھومتے

میں سے ایک ایک راجستان کے اس دور دراز علاقے میں جا پونچوں گا اور یہاں مہاراج رتن سنگھ کے دولت کدے میں کچھ ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہو جائے گی جو مجھے راشد بن ارشد کے قاتل کی حیثیت سے جاننے پہچانتے ہوں گے۔

وہ رات میں نے سخت بے چینی کے عالم میں گزار دی۔ میرے چادوں طرف تاریکی تھی۔ حالات کی کچھ بھی اس طرح ابھی ہوئی تھی کہ کوئی سراپا نہ نہیں آتا تھا۔ سب سے پہلا سوال تو یہ تھا کہ ترک کہاں گیا۔ اسے زمین کھائی یا آسمان نکل گیا۔ مہر دار عشرت کے فارم سے جو شاہدیں ملی تھیں، ان سے کیا پتا چلتا تھا کہ شام کے وقت وہاں کوئی سنگین حادثہ رونما ہوا ہے اور اس حادثے کے فوراً بعد ترک کو وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔ مجھے وہ زہر میں بھی تیرا دے آئے جو جائے واردات سے لے کر وہ وہ عجیب وضع کا پتھر بنا تیار جس کے دستے پر بابائی کشن کی شبیہ تھی۔ دو سرا اہم

سوال خزانہ کے بارے میں تھا۔ وہ شکر شہر کے جنگل میں کیسے پھنسی اور کیسے نکل۔ پھر وہ میرے ساتھ اس جیب میں کیسے سوار ہوئی تھے فرید کوٹ سے سیکڑوں میل دور ایک دبے ہوئے ریکڑا میں حادثہ کا شکار ہوا تھا اور جانی شاہ کی موت کا سبب بنا تھا۔ بے شمار سوال ذہن پر بلخار کر رہے تھے اور مہاراج رتن سنگھ کے وسیع عریض راج محل سے باہر راجستان کی وہ جنگ رات جیسے ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں نے اپنے نئے ”خدمت گار“ سے کہا کہ میں نرائن کا کا سے ملنا چاہتا ہوں۔ خدمت گار نے تھوڑی دیر بعد آگیا کہ میرا بیٹا مہاراج کا کالک بک بچا رہا گیا ہے، وہ کسی کام میں مصروف ہیں کچھ دیر بعد فارغ ہو کر آتے ہیں۔ انتظار کرتے کرتے گیارہ بج گئے لیکن نرائن کا آگیا اور نہ اس کا کوئی شدید۔ میں نے دو تین بار بیٹا مہاراج ”بھیا“ پر بار بھی جواب دیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ آخر بارہ بجے کے لگ بھگ بلبلے سے باہر آئی۔ مجھے بتایا گیا کہ نرائن کا ”بھیا“ نرائن کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کے لیے مانور چلے گئے ہیں اور ان کی واپسی تک مجھے ٹیرس میں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اطلاع دینے والے نے ٹیرس تو محدود رہا کہ وہ رات کو وہاں نہ حقیقت یہ تھی کہ میں سمان خانے سے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ دو بجے کے قریب سمان خانے کے بیڑی دروازے کو باہر سے لاک کر دیا گیا اور میں عملاً اس چار دیواری میں قید ہو گیا۔

\*\*\*

باؤں چل ہو اور دوازے کی طرف بچھا۔ تاہم مجھے مزید زحمت نہیں کرنی پڑی آوازیں حرکت کر کے میری طرف بڑھیں اور دوسرے کمرے میں بولنے والے میرے سامنے آگئے۔ اس کے ساتھ ہی خواب گاہ کی تمام روشنیاں جل اٹھیں۔ میں نے چند لمحوں کی نظروں سے دیکھا، میرے سامنے مہاراج رتن سنگھ جی آف ٹائم اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ موجود تھے۔ گارڈز کے علاوہ ان کے ساتھ نرائن کا اور دو علی سمان نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سمان تو وہی شیخ اسد تھا جسے میں پہلے سے جانتا تھا۔ دوسرا چوڑے شانوں والا ایک دروازہ شخص تھا، اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے مقتول شیخ راشد بن ارشد کا لڑکی قریبی عزیز ہے۔ اس کے خدو خال راشد بن ارشد سے ملتے جلتے لیکن آواز کی مماثلت تو حیران کن تھی۔ اس روز پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ چوٹی کی عی نہیں آوازوں کی بھی ایک صورت ہوتی ہے اور جس طرح قریبی عزیزوں کے چہرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس طرح آوازیں بھی ”بہم شکل“ ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے صدا کا دلوں اور گلوں کی آوازوں پر غور کیا جائے تو حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ مدنی حسن، کمیش اور عالم لوہار کے بیٹے جب گاتے ہیں تو پچھاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ بیٹا گارہ یا باپ؟

نوداد شخص بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے لگ دکھ رہی تھی۔ وہ چلون گیس میں تھا۔ اس نے سرخ ڈی ڈار عمامہ باندھ رکھا تھا مگر اسے اطراف میں نکلنے کے بجائے۔ کر کے سر رکھا ہوا تھا۔ عمر تقریباً پچیس چالیس سال رہی ہوگی۔ وہ چہرے ٹھہرے سے بے حد مضبوط اعصاب کا مالک ایک سخت گیر شخص نظر آتا تھا۔

وہ بڑے بازمع انداز میں مجھے گھورتا رہا پھر عجیب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”تو تم ہوشا جاں؟“ اس نے یہ قہو انگریزی میں بولا تھا۔ میں جانتے بوجھے خاموش کھڑا رہا۔ کمرے میں چند لمے نہایت بوجھل قسم کی خاموشی طاری رہی۔ پھر نوداد کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کہنے لگا ”شاہ جہاں عرف جہاں اُستاد۔ میں دینی میں مت سے کام چھوڑ کر تم سے ملنے یہاں پہنچا ہوں۔ پہلے کار کا سز پھر دینی سے جو وجود تک کا جواز کا طریق سزا اور پھر پہلی کا پڑھنی نرائن کے رہائش گاہ تک رسائی۔ کوئی دس گھنٹے صرف ہوئے ہیں میرے۔ اور تم ہو کہ مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں تمہیں۔ کہیں اپنا تو

نہیں کہ بعض سفید فاموں کی طرح تم بھی تعارف کے بغیر کسی سے کلام نہیں کرتے ہو“ نوداد شش انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اس کے لیے میں روانی تھی۔ میں اب کسی حد تک اپنے حواس میں آچکا تھا، ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا ”میرے خیال میں اگر تعارف ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں“ مجھے انگریزی بولنے کی نگرانی کا کام نہ حیرت سے کھل گیا۔ نوداد نے کہا ”میرا نام عام بن ارشد ہے۔ میں اس شخص کا چھوٹا بھائی ہوں جسے آج سے سات سال اور آٹھ ماہ پہلے فروری کی دس تاریخ کو شام چھ بجے تم نے گولیوں سے چھلٹی کر دیا تھا“ آخری الفاظ ادا کرتے کرتے نوداد کے لیے میں ایک وحشت سی عود کر آئی تھی۔

اس کے لیے نے ایک دم میرے اندر بھی ایک جگہاری کو بھڑکا کر شعلہ بنادیا۔ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑا کہ تم کس کے چھوٹے یا بڑے بھائی ہو۔ ہر انسان کا اپنا کارہوا ہوتا ہے۔ اگر تم اچھے ہو تو میں بھی تمہارے لیے اچھا ہوں۔ ورنہ جو سلوک تمہارے بھائی کے ساتھ ہوا اس سے بڑھ کر تمہارے ساتھ ہو سکتا ہے۔“ میرے اس فقرے نے وہی کام کیا جو مجھڑوں کے جھٹے میں لگنے والا پتھر کرتا ہے۔ سب سے پہلے عام بن ارشد کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ کسی خون کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ پھر مہاراج رتن سنگھ نے کھڑے کھڑے ایک زوردار ٹانگ میری پسلیوں پر جمائی۔ مہاراج کو غضب میں دیکھ کر اس کے کماٹے ہلک جھپٹے میں آ پے سے باہر ہو گئے وہ تعداد میں چارے کم نہیں تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ مجھ پر ہلا بولا۔ شیخ عام نے میرا گریبان تھام رکھا تھا اور فرط غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ مجھے گرا کر بیٹے پر چڑھ بیٹھے اور اس وقت تک میرا گلہ دے کرے جب تک میرے سانس کی ذور ٹوٹ نہیں جاتی۔ مہاراج رتن سنگھ میرے پلو میں ایک ”شہانہ“ ٹھوکر مارنے کے بعد ایک کونے میں جا کھڑا ہوا تھا اور اب جی رہا تھا ”یا شیخ! آپ چھوڑ دیں اسے۔ آپ بیچے ہٹ جائیں تمہارے آدمی کا پی پی اس کے لیے۔“

کمرے میں ایک دم ہی طوفان مچا ہو گیا تھا۔ مجھے زور دے کر کہنے والے چار تھے لیکن ان میں ایک کے سوا کوئی بھی لڑائی بھڑائی میں مابہر نظر نہیں آتا تھا۔ میں ذرا چپٹی دکھانا تو ان کے زہنے سے نکلے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کوشش کرنا عقب سے ایک شخص نے میرے سر سینون ایم ایم کا کھنڈا اتنے زور سے مارا کہ

میں پکڑا کر گھنٹوں کے بل گر گیا۔ سر پہلے ہی زخمی تھا۔ وردی ایک شدید لمریرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

میں دو درجن افراد کے خرنے میں تھا۔ زرد کوب کرنے کے بعد وہ لوگ مجھے گھسیٹے ہوئے ایک تنگ و تاریک کمرے میں لے آئے اور آہنی سلاخوں والا دروازہ باہر سے منقل کدیا۔ میں سمان خانے سے سو پڑھ سو گز دور ایک جیل نما چار دیواری میں تھا۔ جس کو ٹھہری میں مجھے پھینکا گیا تھا وہ بیٹن کسی جیل کی کوٹھری نظر آتی تھی۔ پہلے لاہور جیل اور پھر ایک جیل میں میں نے بھائی پائے والے قیدیوں کو ایسی ہی منٹوں کو ٹھہروں میں تصویر یا سب سے دیکھا تھا۔ مہاراج رتن سنگھ کی طرف سے بخشا جانے والا میرا ناگور لباس تار تار ہو چکا تھا۔ شلوار کا ایک پانچ اوڑھ کر گھسنے تک پہنچ گیا تھا۔ بنیان و جینوں کی صورت لگے ہیں جھول رہی تھی اور ٹیپس کا کیا ذکر؟ وہ تن پر رہی ہی نہیں تھی۔ میں نے بنیان کی دھجیاں گلے سے نوج کر سر سے ہٹنے والا خون صاف کیا اور بدم سا جو کر گھنڈے پر فرش پر لیٹ گیا۔

دو پہر تک کسی نے میری خبر لی نہ ہی کوئی آدم زاد اس تاریک کوٹھری کے آس پاس نظر آیا۔ میرے سر سے ہٹنے والا خون ہمہ کر خود ہی بند ہو گیا تھا۔ پچھلی ہوئی بنیان سفید سے سرخ رنگ اختیار کر چکی تھی۔ صبح کے وقت تو کوٹھری گھنڈی تھی لیکن جوں جوں درختستان کی دھوپ جون پر آتی تھی، کوٹھری بھی گرم ہوتی گئی تھی اور اب نور کی شکل اختیار کرتی تھی۔ بارہ بجے کے لگ بھگ ایک باوردی شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے جیل کے لٹھ برداروں کی طرح سفید شلوار قمیص پر سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں نے ٹیس میں مہاراج رتن سنگھ کی ذاتی فورس دیکھی تھی۔ وہ سب خاکی قمیص اور سرخ ٹیپٹون پہنتے تھے لیکن یہ شلوار قمیص اور سرخ ٹوپی والا عہد پہلی بار دیکھنے میں آیا تھا۔ سرخ ٹوپی والے کے ہاتھ میں ایک جگہ تھا اور بٹل میں کپڑوں کی ٹھنڈی سی دبی ہوئی تھی۔ اس نے جگ کو دوڑانے کی آہنی سلاخوں میں سے گزار کر کوٹھری میں رکھ دیا پھر کپڑوں کا ایک جوڑا میری طرف پھینکتے ہوئے بولا "اسے پہن لو۔"

یہ ایک ذلی دار شلوار قمیص تھی۔ صرف رنگ کا فرق تھا وہ نہ یہ دیباہی لباس تھا جیسا میں لاہور دار ایک جیل میں پہنتا رہا تھا۔ لباس پر ہاتھ نہ بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ تیسو نمبر تھا۔ میں نے لباس ایک طرف پھینک دیا اور سرخ ٹوپی والے سے مخاطب ہو کر کہا "جاؤ! اپنے مالک کو سمجھو میرے پاس یا اس کے ترانے کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں" سرخ ٹوپی والا جواب دیا "یہ جیل ہے اور تو قیدی ہے۔ یہاں وہی ہو گا جو ہم چاہیں گے۔"

اچانک بیرونی دروازے کی طرف سے جھج وپکار کی آوازیں آئیں۔ کچھ بچے دوڑے تھے اور عورتیں جھج چلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی جھمکانے غرائشیں اور مار پیٹ کی آوازیں ابھریں پھر میں نے تنگ و مزنگ افراد کا ایک گروہ دیکھا۔ ان میں پانچ مرد، اتنی ہی عورتیں اور چھ سات بچے شامل تھے۔ ایک شیر خوار بچہ تھا اور دو اتنے کم سن تھے کہ ہنسل چل سکتے تھے مردوں کے جسموں پر صرف دو جوتیاں تھیں جنہیں انہوں نے لپٹ لپٹ کر لٹکھٹوں کی شکل دے رکھی تھی۔ بچے تنگ و مزنگ تھے یا صرف قمیص پہنے ہوئے تھے۔ عورتیں مقامی لباس میں تھیں لیکن یہ لباس کس تھا، کہیں نہیں تھا۔ سرخ ٹوپیوں والے تقریباً ایک درجن افراد ان غریب صورت لوگوں کو جوڑوں، ڈنڈوں اور بٹنوں سے بے طرح پیٹ رہے تھے اور کال کو ٹھہروں کی طرف دھکیل رہے تھے تمام مردوزن کے ہاتھ سامنے کی طرف رستوں سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے گلے میں مڑھ جانوروں کی لاشیں تھیں۔ ان جوڑیوں لاشوں کو رستوں میں پورے قیدیوں کے گلے میں حائل کر دیا گیا تھا۔ کس کے گلے میں گیدڑ کی لاش تھی۔ کسی کے گلے میں لومڑی کی۔ ایک نو عمر لڑکے کے گلے میں دو جنگلی خرگوش جھول رہے تھے اور ایک بوڑھا بہت سے تیتروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ کچھ جنگلی جانوروں کی خشک کی ہوئی کھالیں بھی تھیں۔ یہ کھالیں ایک موٹے ٹکڑے پر سے دارے کاندھے پر ڈال رکھی تھیں۔ میں نے ایک جوان سال عورت کی بے بسی کا منظر دیکھا۔ اس نے ایک شیر خوار بچہ اٹھا رکھا تھا اور گلے میں ایک خون منڈ لومڑی کی لاش تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور دو بار بار لٹکھڑا کر کر جانائی تھی مگر پرے دار اس کی منت سادگی کی پوائے بغیر اسے مار رہے تھے اور کوٹھروں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جلد ہی مہاراج رتن سنگھ آف نامل کے بے جرم میری نگاہوں سے او مجھل ہو گئے اور صرف ان کی جھج وپکار میری سماعت میں باقی رہ گئی۔

یہ لوگ شکل و صورت سے خانہ بدوش نظر آ رہے تھے اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انہوں نے مہاراج کی کسی شکار گاہ میں ٹھس کر شکار چڑانے کی جسارت کی ہے۔ رنگ ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد مسرتہ جانور ان کے گلے میں ڈال دیے گئے ہیں اور یہاں لاکر بند کر دیا گیا

یہ اس روز رات مجھے تنگ میں قریبی کوٹھروں سے "طربان" کی دلدوز چھین سنتا رہا۔ بلا تفریق مردوزن انہیں ہسمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ان کے بچے دو دو کر بندھا ہو چکے تھے لیکن نہ کسی کو بچوں پر ترس آیا تھا اور نہ ان کے بڑوں پر۔ ان آٹھ دس گھنٹوں میں خشک مزاج پر سے دار کے سوا کسی سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ پر سے دار دو دفعہ میرے لیے کھانا لے کر آیا لیکن میں نے دونوں دفعہ انکار کر دیا۔ ہاں پانی کے بیئر گزارا انہیں تھا۔ گرمی اور جس کے سبب جسم سے پینہ دھاروں کی صورت میں ہمہ رہا تھا اور ہر پندرہ میں منٹ بعد منٹ سوکھ کر کڑوا ہو جاتا تھا۔

رات نو بجے کے بعد گرمی کا زور ٹوٹنے لگا اور دھیرے دھیرے کوٹھری کا درجہ حرارت اعتدال پر آ گیا۔ اس وقت گیارہ بجے ہوں گے جب بیرونی دروازے کی جانب سے چند آنہیں سنائی دیں۔ سرخ ٹوپیوں والے دو گھران ایک بیش قیمت صوف اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ یہ سنگل صوف انہوں نے میری کوٹھری کے عین سامنے سلاخ دار دروازے کے پاس رکھ دیا۔ عتب میں گھران خوب صورت تپائی اٹھائے ہوئے تھا۔ تپائی صوف کے متبادل ڈال دی گئی۔ ایک اور شخص نے بڑے سیٹھے سے تپائی پر کچھ سامان چڑی دیا۔ اس سامان میں جو چیزیں شامل تھیں "ان میں بیکری ایک نہایت قیمتی بولٹی اور گھاس کے علاوہ امپورٹڈ سگریٹ کا ایک پکٹ، ایک طٹائی لاٹکڑا اور ایک چھوٹا سا جاپانی ریڈیو بھی تھا۔ یہ انتظام ہو چکا تو امارات کا امیر زادہ شیخ غلام یوسف کو فرسے اندر داخل ہوا اور صوف پر براہ تان ہو گیا۔ اس کے اندر آتے ہی جیل کا وہ گوشہ خادین اور محافظین سے خالی ہو گیا۔ شب کے خشک نشانے میں، میں اور شیخ غلام ایک دوسرے کے سامنے خیارہ گئے۔ خانہ بدوش کی جان اب عارضی طور پر چھوٹ چکی تھی اور کبھی کبھی کسی زخمی مر دیا عورت کی کراہ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

شیخ غلام سگریٹ شکار خرابیہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بے حد ٹھہرے ہوئے لیے میں بولا "جانی" میں نے تمہارے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کی ہیں اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہارے بارے میں اتنی ہی جانتا ہوں جتنا تمہارا کوئی قریبی عزیز جانتا ہو گا تو یہ غلط نہ ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ بہت سی خبیثوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے باوجود تم ایک بد قسمت شخص ہو۔ تمہاری سب سے بڑی بد قسمتی تو یہ ہے کہ غلط وقت پر تمہارے ماں باپ تم سے جدا ہو گئے اور تمہیں اپنی زندگی سے سرے سے شروع

کرنا پڑی۔ تمہاری دو سری بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ تم نے شیخ راشد بن راشد جیسے پائٹ شخص سے غمی اور اس کے خون سے ہاتھ رنگ لیے۔ اس کے بعد کسی اور بد قسمتی کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن بد قسمتی قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیتی رہی۔ تمہارے لیے بہت بستر ہونا کہ تم ایک جیل میں خود رہو ہونے والے قاتلانہ حملوں میں قتل ہو جاتے لیکن ہر بار تمہاری بد بختی آئے آتی رہی۔ سنا ہے ایک بار جیل کی بالائی منزل سے تم پر سنگسار سے بھری ہوئی کڑاہی پھینکی گئی لیکن تیرے گئے تم نے زہریلے کھانے سے آنے والی موت کو بھی چھکا دیا اور اپنی جگہ اپنے ایک ساتھی کو عدم آباد روانہ کر دیا۔ اس کے بعد شاید لوہے کا وہ تاری تمہاری مشکل آسان کر دیتا جو تمہاری گردن کے گرد لپیٹا گیا تھا لیکن وہ سنری موقع بھی تم نے گنوا دیا۔"

میں نے کہا "تم اسے بد بختی کہتے ہو تو پھر خوش قسمتی کیا ہوتی ہے؟"

وہ بولا "خوش قسمتی یہ ہوتی ہے کہ مرنے والا جلد ہی سے مر جائے اسے مرنے کا احساس اس وقت ہو جب موت اس پر دار ہو چکی ہو۔ خدا اب جمیل کر اور سبک سبک کر مرنا بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے!" وہ بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔

میں نے کہا "کس نے کب مرنا ہے اور کس طرح؟" یہ سب کاتب تقدیر نے لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ تم مجھے دردناک موت سے ڈرانے کی کوشش کر کے قدرت کے کاموں میں دخل اندازی کر رہے ہو۔"

وہ سگریٹ کا گھراش لے کر بولا "تقدیر انسان خود بناتا ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے طرز عمل سے اپنی تقدیر پر بد قسمتی کی ٹھکر لیتے ہیں۔ تمہارے مقدر پر بھی ٹھکر لگ چکی ہے اور یہ" "تکلف وہ موت" کی ٹھہرے۔"

میں نے کہا "میں یہ سمجھوں کہ اس سے پہلے میری موت کو آسان کرنے کی کوشش بھی تم ہی کرتے رہے ہو۔"

میرا مطلب ایک جیل والے واقعات سے تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔ خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ان خالی نگاہوں کی میں قریبی بھیلیاں لپک رہی تھیں۔ چند لمحوں کے وقفے سے کہنے لگا "تمہیں مارنا میرا شوق نہیں اور نہ ہی تمہاری موت سے میری کسی ذاتی خواہش کی تسکین ہوگی۔ یہ میری مجبوری ہے۔ تم میرے بھائی کے قاتل ہو اور جب تک میں تمہیں کیڑا کر دار تک نہیں پہنچاؤں گا میرا ذہن قراہ کی دولت سے محروم رہے گا۔ تم خود سوچو ایک معمولی سا

مخلص اپنے بھائی کے قاتل کو زندہ سلامت زمین پر چلنے پھرتے نہیں دیکھ سکتا، میں کیسے دیکھ سکتا ہوں، دو دنوں کے درمیان فاصلے ضرور تھے لیکن ہم دشمنی کے رشتے میں بہت مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے میں نے تمہاری تلاش میں بہت پارہ بنائے ہیں۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے اب تک کم دیش آٹھ لاکھ امریکن ڈالر میں تمہاری تلاش اور تمہاری سزا پر خرچ کر چکا ہوں۔ آج سے چار پانچ برس پہلے ایک موقع ایسا آیا تھا جب میرے آدمی تمہارے گرو اپنا گھیرا بہت تنگ کر چکے تھے، بس چند محنتوں میں تمہیں بیسی اور وہاں سے بذریعہ لالچ دینی پھینچا جانے والا تھا لیکن اس وقت تم اچانک منظر سے غائب ہو گئے۔ ہمیں دھاتی تین سال بعد پتا چل سکا کہ تم نے پاکستان جا کر خود کو بڑی رازداری سے قانون کے حوالے کر دیا تھا اور اب شامی خانے کی ایک دور افتادہ جیل میں بارہ سال قید کی سزا کاٹ رہے ہو۔

”لہذا تم نے دولت کے زور پر جیل میں اپنے آدمی داخل کر دیے اور انہوں نے مجھے آسمان موت مارنے کے لیے نی سبیل اللہ تک دو شروع کر دی۔“

شیخ عاصم میرے گستاخانہ لہجے کو خاطر میں لائے بغیر بولا ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہیں مارنا میری مجبوری ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس قطعہ زمین پر تم رہ سکتے ہو یا میں۔“

بہت دھیما لیکن خطرناک لہجہ تھا شیخ عاصم بن ارشد کا اور اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ وہ میرے گستاخانہ کلام کو برداشت کر رہا تھا۔ ایسے لوگ اپنے سے کمزور فرد کا گستاخانہ طرز نگاہ اس وقت برداشت کرتے ہیں جب وہ اسے نہایت سخت سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں اور انہیں یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ مستوب اس سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

میں نے کہا ”ظاہر ہے اس میں انتخاب کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے ہی یہ قطعہ ارض چھوڑنا ہو گا لیکن تم مجھے بار بار درناک موت کا شروہ بنا رہے ہو کیا اس حوالے سے کچھ وضاحت کرنا پسند کر گئے؟“

شیخ عاصم نیلے انداز میں مسکرایا ”میرا خیال ہے کہ میں نے درناک موت کا لفظ استعمال کر کے تمہیں کسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے دوست! میں تو صرف اچانک آنے والی اور بدترجیع آنے والی موت کا موازنہ کر رہا تھا۔ جیل میں تمہاری بد بختی آؤ سے نہ آتی تو تم اچانک مر جاتے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں قصہ پاک ہو جاتا۔ اب دو تین روز تک تم موت کو اپنی طرف سرکتا

دیکھو گے۔ بل بل مومے اور جینگے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ فاصلہ جو ایک قیدی کال کو فہمی سے بھائی گھاٹ تک طے کرتا ہے، دنیا کا طویل اور تکلف ترین فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے جسم میں سولہ سو دو ہفتی محسوس ہوئی۔ میں نے شیخ عاصم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا ”تو تم مجھے بھائی لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

وہ مسکرایا ”شاہ جہاں عرف جانی! تم ہی اے! اہل اہل بی ہو۔ یہ بات تو ایک آن پڑھ بھی جانتا ہے کہ قاتل کو سزا دینے کا قانونی اور شرعیانہ طریقہ بھائی ہی ہے لیکن گھبراؤ مت۔ میں تمہاری بھانسی کا اعلان نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تو توہین عدالت کے مترادف ہو گا۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ ہر بائی کسی کی عدالت اس سے کم سزا تمہارے لیے تجویز نہیں کرے گی۔“

میں نے کہا ”ہر بائی نس کون ہوتا ہے مجھ پر مقدمہ چلانے والا اور سزا دینے والا۔ انڈین لا کے مطابق۔“

”یکو مت“ اچانک شیخ عاصم بڑے زور سے دہاڑا ”ہر بائی نس سزا دینے کا جائز نہیں تو تم کیسے مجاز ہو گئے تھے میرے بھائی کو گولیوں سے آڑنے کے؟ کیا اس وقت انڈیا اور پاکستان میں قانون کی عمل داری نہیں تھی۔ کیا عدالتوں کے دروازے بند تھے اس وقت؟“

”وہ ظالم تھا“ میں بھی جواباً فرمایا ”اس نے مجھ پر انصاف طلب کرنے اور شرافت سے زندہ رہنے کے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔ اسے مار کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا اور آج بھی بلند ہے۔“

”بلند رکھو اس سر کو“ شیخ عاصم دہاڑا ”کل پرسوں تک یہ سر تمہارے کندھوں سے ایک فٹ اور بلند ہو جائے گا۔“

اس کی دہاڑیں کر سمجھ تو بیوں والے دو عمران بھانجے ہوئے موٹے پر ہتھ گئے تھے۔ شیخ عاصم اٹھا اور عمرانوں کے سامنے سے گزر کر نہانا ہوا باہر نکل گیا۔

اگلے روز مجھے آہنی بھجی لگا کر جیل خانے کے ہی ایک کٹواہ کرے میں لے جایا گیا۔ دو محکمہ خیریتہ تھا میرا۔ ہم پر صرف ایک شلوار تھی اور پاؤں میں چمبی جوتے۔ سر سے پٹے والا خون ابھی تک کندھے اور پشت پر بہا ہوا تھا۔ کٹواہ کمرے میں فرش پر قالین نمادری جمی تھی۔ کمرے کیوں پر پردے تھے اور ایک دیوار پر مہاراج رتن گھدی کی ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر کے عین نیچے ایک تین فٹ اونچے چوڑے پر آجوسی میز کے گرد تین کرسیاں رکھی تھیں۔ درمیان والی کرسی زیادہ آرام دہ اور

پُر تکلف تھی۔ میرا ایک فائل ہنر مند سے بندھی ہوئی تھی اور پاس ہی ڈیڑھ فٹ مربع کا ایک نیپ ریکارڈ رکھا تھا۔ کمرے میں چار اور افراد بھی موجود تھے ان میں سے ایک مہاراج کا پرسل سیکرٹری کمار جگدیش گھگھہ تھا۔ دو سرائانی کا کا اور تیسرا شخص تھا۔ چوتھے شخص کا تعلق مشرق وسطیٰ کے کسی ملک سے تھا۔ وہ میرے لیے انجینی تھا۔ اس نے بہترین تراش کا قہری بیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ شخص شیخ عاصم بن ارشد کا ایک دست عاصم کی نمائندگی کر رہا تھا۔

سرخ فوٹی والے مسلح کارڈز نے مجھے ایک کرسی پر لا کر بٹھار دیا اور دایم بائیں چوکس کمرے ہو گئے۔ ایک شخص نے میرے کندھوں پر چادر ڈال کر بالائی جسم کو ڈھانپ دیا۔ ہشکل ایک منٹ گزرا تھا کہ بھلی دروازے سے ایک بن رسیدہ شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی بھوڑی سفید قمیص اور آنکھوں پر بے حد موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ انگریزی سوٹ میں تھا۔ اس کے پیچھے دو اور افراد اسی لباس میں اندر آئے اور پہلے شخص کے دایم نشیمن سنبال گئے۔ یہ بات مجھے تیسرے روز معلوم ہوئی کہ سفید بھون والا جودہ پور کا ایک ریٹائرڈ جج تھا اور اس اسٹیشن میں مہاراج کی خصوصی عدالت میں منصف کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے لحاظ دیکھ کر بھی قابو نہیں تھا جی کی نشست پر بیٹھا تھا اور انصاف کا بول بالا کرتے چلا تھا۔

خود سائنس عدالت کی بے سبق کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے جج نے اپنی عینک کے پیچھے سے فور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرا جائزہ لیا اور بولا ”شاہ جہاں ولدہ و قار احمد“ تم پر الزام ہے کہ قریباً ساڑھے سات سال پہلے تم نے جام پورہ کے مقام پر امارات سے آئے ہوئے ایک مغز سمان شیخ راشد بن ارشد کو ذاتی عدالت کی بنا پر موعام قانونک کر کے قتل کر دیا تھا۔ کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

میں نے تڑپ کر جواب دیا ”میں تو اپنی صفائی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی صفائی میں ضرور کچھ کہنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی عدالت ہے جس میں مجھے بطور طرم پیش ہونے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ کیا آپ کو جج کی نشست پر بیٹھ کر شرم نہیں آ رہی؟“

”نکواس بند کرو“ جیوری کا ایک ممبر گرج کر بولا۔ اس کا لالہ بھوکا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ذرا سی بھی گنجائش نہ ہو تو وہ ابھی اٹھ کر میری نمکائی کرنے لگے۔

جج نے ہاتھ کے اشارے سے جیوری ممبر کو خاموش کیا اور بولا ”عدالت نے تم سے صفائی مانگی ہے اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو۔“

میں نے کہا ”بہتر ہے بڑے میاں کہ آپ یہ ڈراما نہ کریں۔ آپ نے جو کچھ کہنا ہے وہ پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔ خواہ خواہ اپنا اور میرا وقت ضائع کریں گے آپ۔“

جج کے مشتعل سامنے کا چہرہ ایک بار پھر لالہ بھوکا ہو گیا لیکن اس مرتبہ اس نے بولنے سے باز کر لیا۔ نوڑے جج نے میرے ریمارکس کو نظر انداز کرتے ہوئے فائل کے ایک صفحے پر نظرس دوڑائیں اور بولا ”یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ریاست کی حدود میں داخل ہونے کے بعد تم نے اپنی شناخت چھٹی۔ تم نے اپنا نام نمال گھگھہ بتایا تھا اور یہ بیان دیا تھا کہ تم گھگھہ کے رہنے والے ہو۔ کیا تم بتانا پسند کر گئے کہ یہ غلط بیانی تم نے کیوں کی؟“

”نہیں“ میں نے بتانا پسند نہیں کر لیا گا“ میں نے رسالہ سے جواب دیا۔ مجھے اس تماشے سے چڑی ہو رہی تھی۔

جج نے قہری پس سوٹ والے عدلی سے خطاب ہو کر کہا ”مشر صادق! آپ کی حیثیت وکیل استغاثہ کی ہے۔ آپ اس کیس کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟“

جواب میں صادق نامی اس شخص نے ٹھکانے کر گھٹھا صاف کیا اور آٹھ گھنٹہ دوائیہ کی ایک دھواں دھار تقریر کر ڈالی۔ اس تقریر میں نہ صرف مجھے راشد بن ارشد کا قاتل گردانا گیا بلکہ ایک چھٹا ہوا بد معاش اور درندہ صفت لٹیرا ثابت

# اماوس

## خستہ

### دیا ۱۵٪

مصنف

۲۰۰/-

علیم الحق حقی

علی علی بی کی کیشٹر غریب ناریٹ اردو بازار لاہور

کرنے کے لیے اڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ وکیل استخاش نے ایک نہایت "مستز شری" یعنی ہنری شیر متھن کو چشم دید گواہ کے طور پر پیش کیا اور متھن نے قہرنگ ادا کرتے ہوئے مجھے اسی صدی کا سب سے خطرناک اور بے رحم قاتل ثابت کر دیا۔

یہ ایک طرف کارروائی تقریباً ڈیڑھ گھنٹا جاری رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بے سود زحمت کیوں کی جا رہی ہے؟ یہاں مہاراج رتن سنگھ کو سن مانڈوں سے روکنے والا کون تھا۔ وہ فرتح طبع کے لیے دس بیس راہ گیروں کو پکڑ کر اپنے پالتو سوروں کے آگے ڈال دیتا تو بھی کوئی احتجاج نہیں کر سکتا تھا اور جہاں تک اس کارروائی کی اہمیت کا تعلق تھا وہ اس امر سے واضح ہو جاتی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ تو ایک طرف بارہادی شاخ عاصم نے بھی اس سینگکو کورٹ میں آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یہ "ڈی" کارروائی دیکھنے میں مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ جج نے ریاستی قواعد کے تحت مجھے سزائے موت کا حکم سنایا اور اپنے فیصلے پر شرمندگی سمیٹتے ہوئے باہر چلا گیا۔

\*\*\*

مجھے ایک بار پھر کال کوٹھی پہنچا دیا گیا۔ کال کوٹھی جانے کے لیے ہم جس راستے سے گزرے وہ جیل کے چھائی گھاٹ کے قریب سے گزرتا تھا۔ معلوم نہیں اتفاقاً ایسا ہوا تھا میرا "خون خشک" کرنے کے لیے قصداً مجھے اس راستے سے لے جایا گیا تھا۔ وہ واقعی ایک چھائی گھاٹ تھا۔ جلی ہوئی سیاہ اینٹوں سے تعمیر شدہ یہ ایک کٹواں نما جگہ تھی۔ لیکن یہ کٹواں زمین کے اندر نہیں زمین کے اوپر تھا۔ ایک طرف اندر جانے کے لیے دو سارے ہوا تھا۔ عقب میں بیڑھیاں تھیں۔ یہ بیڑھیاں ایک بڑے چوٹی تختے تک پہنچتی تھیں۔ اس تختے کے اندر ہی وہ دو دروازے تھا جو چھائی پانے والے کے پاؤں تلے سے نکلتا تھا اور وہ دو کھوس میں جم جاتا تھا۔ کھوس کے اوپر چند انکھانے کے لیے جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ مجھے یہ انتظام دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ظاہر ہے یہ چھائی گھاٹ خاص میرے لیے تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ کب سے اس جگہ موجود تھا اور ہزبائی نس کے مستوحین کو نگل رہا تھا۔ درحقیقت یہ ایک مکمل جیل تھی جس میں مشقت خانوں، کال کوٹھیوں اور چھائی گھاٹ سمیت ہر چیز موجود تھی۔ چھائی گھاٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ان مردوزن پر پڑی جنہیں کل شکار چوری کرنے کے جرم میں پکڑ کر جیل میں لایا گیا تھا۔ اب انہیں "عدالت" میں لے

جایا جا رہا تھا۔ مردہ جانور بدستور ان کے گلے میں جم چکا تھا۔ مکمل کے قصد نے اس سب کی بری حالت کر رکھی تھی۔ وہ جیل کے عقوبت خانے سے یوں برآمد ہوئے تھے جیسے کٹا پیلے والی مشین سے مٹا نکلتا ہے۔ مردوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور عورتوں کے لباس تار تار تھے۔ مجھے ایک درازند کی عورت ان میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

کال کوٹھی میں پہنچنے کے بعد بھی میری ہلکی سی کھولی نہیں گئی۔ صورت حال عجیب ہوئی جا رہی تھی۔ کوٹھی کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر میں نے پہلی بار سوچا کیا یہ سرخ لوبیوں والے خردیاد و شکرے مجھے واقعی چھائی گھاٹ کے؟ جہاں استاد جو ان گنت صورتوں میں آنے والی موت کو ان محنت مرتبہ چکھارے کا تھا اس شخص عمارت کے کتنے سال چھائی گھاٹ میں لنگ کر جان دے دے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اگر ہو سکتا تھا تو مجھے اسے "ہونے" سے روکنا تھا۔

جو بات شروع میں بید ازباق نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیوں حقیقت کے قریب آتی جا رہی تھی۔ میں سچ عاصم بن ارشد کے علاوہ ہزبائی نس اور اس کے حواریوں کی نگاہوں میں بھی اپنے لیے بے پناہ نفرت پڑھ چکا تھا۔ میں محو خیال رہا اور کسی قریبی کوٹھی سے کسی عورت کے زور زور سے بولنے اور چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ آوازیں اس چار دیواری کی دشت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ اس رات نرائن کا پھر میرے پاس آدھکا۔ میرے ساتھ اس کا دوتہ شروع سے ہمدردانہ تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ترم کے جذبات دیکھے۔ عجیب سی مٹوٹی چھائی ہوئی تھی اس کے چہرے پر۔ وہ بولا "مجھے تمہارے حالات پر بہت افسوس ہو رہا ہے شاہ جہاں۔"

"لیکن مجھے تو اپنے حالات پر کوئی افسوس نہیں۔" وہ ناکواری سے بولا "شاید تم اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ تمہیں چھائی کے ذکر سے صرف ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ بے وقوف وہ جج جج تمہیں چھائی دینے والے ہیں۔ یہاں جلاوے لے کر چھائی گھاٹ تک پورا انتظام ہے ان کے پاس اور مجھے کوئی ایسی صورت بھی نظر نہیں آتی کہ کوئی چپکرا ہو جائے اور تم جج جاؤ۔"

"تم مجھے یہاں سے نکال سکتے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں" وہ بولا "لیکن تمہاری جگہ مجھے اپنی گردن دینا پڑے گی۔ مہاراج معاف کرنا نہیں جانتے ہیں اور خدا کو

توہ کسی صورت نہیں بخشے۔ یہ جہیں سن رہے ہو غم یہ اس عورت کی ہیں جسے کل شکار چوری سانیوں کے ساتھ پکڑ کر جیل میں لایا گیا تھا۔ دوسرے لڑکان کو آج عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ انہیں قید اور کڑوں وغیرہ کی سزا سنائی گئی ہے لیکن اس عورت کو ایسے خطرناک قیدیوں کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے جنہوں نے پچھلے چار چار پانچ پانچ سال سے عورت کی صورت نہیں دیکھی۔ انہیں مکمل چھٹی دس دس دی گئی ہے۔ اب تم خود سرج فوج تک اس پر کیا نہیں گزر جائے گی لیکن اس کے باوجود اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ لنگڑے ہو جانے والے گھوڑے کی طرح اسے ٹھکی مادی بنائے گی۔ یہ امتیازی سلوک اس عورت سے اس لیے کیا جا رہا ہے کہ چند ماہ پہلے وہ مہاراج کے محل میں خادمہ رہ چکی ہے۔ اس حوالے سے اسے جرم کے بجائے غدار ٹھہرایا گیا ہے اور غدار کی سزا دی جا رہی ہے۔ مہاراج اپنے ملازمین کے لیے جتنے مہمان ہیں اتنے ہی مہمان بھی ہیں۔ میری ایک مہلی ماس بنی اور تین مہموم بنے ہیں۔ میں تمہاری زنجیریں کاٹ کر ان کی اور اپنی زندگیاں اجڑا کیوں کروں گا اور میرے خیال میں میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ مہاراج کے گھرانے سے وفاداری میرے خون میں گئی نسلوں سے پروان چڑھ رہی ہے اور مجھ تک پہنچنے پہنچنے فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔"

"فطرت ثانیہ بن چکی ہے تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے اسے تاؤ دلایا۔

وہ بولا "تمہاری دلبری سے میں متاثر ہوا ہوں۔ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ یہ دلبری نہیں بے وقوفی ہے یا پھر تمہارا کوئی بیچ ڈھیلہ ہے جو اس صورت حال کی اصل علین کا احساس نہیں کر رہے ہو۔"

"پتلا احساس کر لیا" میں نے کہا "اب بتاؤ کیا کروں؟" لڑکے بیڑوں یا داویلا کروں۔"

وہ بولا "دو پینے یا داویلا کرنے سے کچھ فائدہ ہوتا تو میں تمہیں اس کا مشورہ ضرور دیتا۔ تمہارے پاس تو رحم کی ٹیل کرنے کی رعایت بھی نہیں ہے۔" "تو پھر کیوں میرا داغ چاٹ رہے ہو۔ جاؤ جا کر جتی کی غل میں تمہیں کس سوچاؤ۔"

میں صبح دو صری جانب پھیر کر لیٹ گیا۔ نرائن کی بے وقت آمد اور بے مقصد محنتوں نے مجھے واقعی جھجھلاہٹ میں جھکا کر دیا تھا۔ میں اس وقت تکہ کی سے کچھ سوچتا چاہتا تھا۔ کوئی راستہ نکلنے کا کوئی حل اس سمجھ پر مسئلے کا۔

عدالتی کارروائی کے دوران یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ

متھن کی اطلاع پر ہی مجھے مہمان خانے میں پابند کیا گیا تھا۔ اس وقت اس محل میں موجود دونوں عرب شکاریوں کا تعلق بھی وہی ہے تھا۔ انہوں نے متھن کے ساتھ پورا تعاون کیا تھا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر ٹیلی فون پر متھن کا رابطہ شیخ عاصم سے کر دیا گیا تھا۔ ٹیلی فون پر ہونے والی اس گفتگو میں ترجمانی کے فرائض نرائن کا کاٹنے انجام دیے تھے۔ متھن نے شیخ عاصم پر یہ سستی خیر انکشاف کیا تھا کہ وہ استاد جانی جو برسوں سے انہیں مطلوب ہے اس وقت ریاست آندل کے مہاراج رتن سنگھ کے محل میں موجود ہے۔ متھن شیخ کے لیے ابھی نہیں تھا۔ اس کی اطلاع پر شیخ کو پکڑ لگے تھے اور وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر وہی سے اغوا شیخ کیا تھا۔

\*\*\*

اگلے چوبیس گھنٹے میں میرا اضطراب بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ مجھ سے بالکل وہی سلوک کیا جا رہا تھا جو جیلوں میں تختہ دار کے مسافر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میری کوٹھی کی روشنی سارا دن اور ساری رات جلتی رہی۔ مجھے ایک مصلیٰ اور قرآن شریف سنا کر دیا گیا تھا۔ چند سادہ کاغذ اور ایک قلم بھی دیا گیا۔ کھانا بڑے انتہام کے ساتھ لیکن لچکا چٹکا دیا جا رہا تھا۔ پہرے والوں کی نگاہوں میں میرے لیے پہلے بھی دشت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آ کر ٹھکتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ جان بوجھ کر ایسا نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ میں جیل میں موت کو اپنی طرف بڑھتا دیکھوں۔ مجھے یوں لگا کہ یہ کیفیت برقرار رہی تو میرے اعصاب ٹوٹا پھوٹنا شروع ہو جائیں گے۔ مشکل یہ تھی کہ میں اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے قہر نہ تھا۔ بارہرے کسی مدد کی امید نہیں تھی۔ مفرد اور ڈریس گل نہ جانے کس حال میں تھے اور تھے بھی یا نہیں؟ وہی غزالہ تو وہ خود گرفتار بلا تھی۔ میں نے کئی بار کوٹھی کا بارک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ کہیں کوئی ایسی خالی نظر نہیں آتی تھی جو میرے نقطہ نظر سے "خالی" ہوئی اور مجھے باہر نکلنے میں مدد دے سکتی۔ کوٹھی میں نمودورت کا واحد راستہ ایک صلاح دار دروازہ تھا اور اس میں بہت بھاری قفل جم جاتا تھا۔ پہرے داران صلاحوں میں ہی میرے استعمال کی ایسی اندر رکھ دیتا تھا۔

خفت بے چینی اور جس کے باوجود اگلے روز دوسرے کے فوراً بعد مجھے خند آگئی۔ خند کی مہمان دہی مجھے نہ جانے کہاں کہاں لے پھرتی رہی۔ آنکھ مکلی تو میں پھر اسی قفس میں تھا۔ ایک مونسے تازے پہرے دار نے جو اپنے ذیل ڈول۔

جیل کا وارڈن نظر آتا تھا، اپنے ہتھول کا دستہ آہنی سلاخوں کے ساتھ کھرا کھرا مسلسل آواز پیدا کی تھی اور مجھے جگا رہا تھا۔ اس نے سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک کانڈھیری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی نظر آئی۔

”کیا ہے یہ؟“ میں نے کانڈھیرے بغیر پوچھا۔  
”ختم نامہ ہے۔ ہزبائی نس کی مگر کے ساتھ جاری ہوا ہے۔ تم اسے بلک وارنٹ بھی کہہ سکتے ہو“ سپرے دار نے کسی دھوکے کی طرح بالکل غیر جذباتی لہجے میں کہا ”کل صبح پانچ بجے تھیں پچاسی دسے دی جائے گی۔ اگر کوئی خواہش ہے تو تم بیان کر سکتے ہو۔“

یہ تمنا بہت طویل پکڑنا جا رہا تھا۔ مجھے اس سے دھت سی ہونے لگی تھی۔ اپنی اندرونی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے میں نے پوچھا ”خواہش سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میری سب سے بڑی خواہش تو یہی ہے کہ تم میری یہ ہتھکڑیاں کھولو اور مجھے میاں سے نکال دو۔“

وہ بولا ”تم جانتے ہو کہ یہ ناممکن ہے۔“  
میں نے کہا ”شیخ غاصم یا تمہارے ہزبائی نس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”یہ بھی ناممکن ہے“ وہ بولا ”ہزبائی نس اور معزز مسلمان اس وقت ایٹھ میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی واپسی رات گئے ہوگی اور اس وقت انہیں تم سے ملنا ناممکن نہیں ہوگا۔“  
”پھر آٹھ گھنٹے کا ایک گانا سنو اور یا جیسا ہائی کی ایک چٹکی دلو اور“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

وہ ناگوار سے بولا ”اس کا مطلب ہے تمہاری کوئی خواہش نہیں ہے؟“  
میں نے کہا ”آخر جس قسم کی خواہش تم مجھ سے بیان کروانا چاہتے ہو؟“  
وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا ”مثلاً تم اپنی محبوبہ سے آخری ملاقات کر سکتے ہو۔“

اب میرے چوتھے کی باری تھی۔ میں حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا ”کون محبوبہ؟ کسی کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ جپ میں سڑ کر رہی تھی۔“  
غزالہ نام ہے اس کا۔ تمہاری اس کی بہت پرانی یاد اللہ ہے۔“  
فریہ اندام وارڈن نے مجھے ایک کامیاب سربراہانہ انداز میں اس کا مطلب تھا کہ غزالہ کی شناخت چھپی نہیں رہ

سکی۔ معلوم نہیں اسے کسی نے پہچانا تھا یا پھر وہ خود ہی زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کہیں اس پر تشدد تو نہیں کیا گیا؟ یہ سوال ایک ذہربلے تھری کی طرح میرے ذہن میں بدست ہو گیا۔ میں لاکھ انکار کرتا لیکن وہ میری محبت تھی۔ میرے دل کی سختی پر اس کا نام انٹ روشتائی سے لکھا تھا۔ اس کی بات خدشات میرے ذہن میں ابھرے تو میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

میں نے وارڈن سے پوچھا ”کہاں ہے وہ؟“  
وہ زہر پ مسکرایا اور بولا ”میں نہیں میں ہے اگر تم چاہو تو اسے میاں لایا جاسکتا ہے۔“  
میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ”ہاں۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ شام۔ شام غم غم جی جو دھیرے دھیرے ایک تاریک صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماحول ہر شخص پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ مجھ پر بھی ہو رہا تھا لیکن میں نے ماحول کے اثر کو خود ہادی نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک مجبور سا تھا مجھے کہ پچاسی گھنٹے کے تاریک کنوئیں میں بے بسی سے جھونکا میرا مقدر نہیں ہے۔ میں وارڈانے کی آہنی سلاخوں سے لگا ہوا تھا اور اس راہداری کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے غزالہ آ رہا تھا۔ میرا انتظار طویل ضرور ثابت ہوا لیکن رات گزر گئی۔ قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس کا جانا پہچانا سراپا میرے سامنے آیا۔ ہلکے براؤن رنگ کی ایک چادر۔ اسے سراپا چھپا رکھا تھا۔ وہ چند سپرے داروں کے ساتھ کوٹھری کے سامنے پہنچی اور ساکت کھڑی ہو گئی۔ اسے وہ ہلکا سا ہلکا ہلکا جھٹکا ہوا تھا۔ میں نے دیکھ لیا ”اس کی اس کام کی مشق ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے کی دھوپ زلفوں کی چھاؤں“ آنکھوں کی چمک۔ بہت سے جاتے پہچانے رنگ میرے سامنے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ”اس کی سرخ آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا ہوا تھا۔ وہ میرے قریب آئی اور سرسراتے لہجے میں بولی ”لوگ“  
کہہ رہے ہیں۔ یہ کیوں کر رہے ہیں ایسی باتیں؟“

”کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
ایک دم آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسل گئے وہ کراہی ”میری زبان ساتھ نہیں دے رہی۔ لیکن آپ سب جانتے ہیں۔ آپ کہہ کیوں نہیں دیتے۔ یہ سب مجھ سے یہ سب کچھ اس ہے۔“  
میں نے اس کے سر ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”ہاں۔ یہ سب جموت ہے۔ کوئی پچاسی نہیں لگا رہا۔“

مجھے یہ صرف۔ صرف ہمیں خوف زدہ کرنے اور ہمارے اعصاب کو توڑنے کا منصوبہ ہے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ کچھ نہیں ہونے والا مجھے۔ اور ایک بات ذہن میں رکھو“ میں نے اپنی آواز دہمی کرتے ہوئے کہا ”لیکن ہے یہاں قریب ہی کوئی موجود ہو یا ہماری آواز دیکھا دھڑکنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو یا میری بات؟“ غزالہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ مجھے حوصلہ مند دیکھ کر اس کے بیجاں اور ہراس میں بھی کی واقع ہوئی تھی۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا ”تم یہاں کیسے پہنچی ہو؟“  
کوئی اور موقع ہوتا تو غزالہ کو ایک طویل تمہید باندھنا پڑتی لیکن اس وقت وہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے پاس مختصر وقت ہے۔ ”وہ بولی“ مجھے قادر زباں کی بیوی کو دیکھنے کے لیے جنگ جانا پڑا تھا۔ ابھی اس کی ڈیور میں میں مینڈ ڈیڑھ مینڈ باقی تھا۔ مگر آقا قاس نے بچے کو جنم دے دیا۔ قادر زباں کے ذاتی اسپتال میں ناکانی سامان کے ساتھ وہ آپریشن میں نے جن مشکلوں سے کیا وہ میں ہی جانتی ہوں۔ زچہ دیکھ دو توں کی جان بچ گئی۔ قادر زباں ایک خوب صورت بچی کا باپ بن گیا۔ طوطا چٹھی اور مطلب پرستی کی انتہا ہے کہ باپ بننے کے صرف ایک مہینے بعد اس نے وہ سب کچھ کو کھایا جس سے ہمیں ترنم زباں برابر خراب کر رہی ہے۔ میں جب لاہور واپس جانے کے لیے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی، قادر زباں کے کارندوں نے مجھے روک لیا اور واپس چوٹی میں پہنچا دیا۔ دس پندرہ منٹ پہلے مجھے کافی میں ملا کر کوئی خواب آور دوا ملائی جا چکی تھی۔ واپس چوٹی پہنچنے کے چند منٹ بعد میں ایک صوفے پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ دوبارہ میری آنکھ تقریباً دس مہینے بعد کھلی۔ میں نے ایک بند کمرے میں خود کو شکر شکر کے دوہو پایا۔ کمرے میں بہت سی شرمناک تصویریں لگی تھیں۔ شکر بے تمنا شکراب لیا رہا تھا اور خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے سینے پر تیز دھار آلے کا ایک تازہ زخم تھا۔ مجھے وہ زخم دکھنا کہنے لگا۔ ”بولتے بولتے غزالہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے کو شرم کی مٹھری نے زحمت لیا۔

”کیا تمہارا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔  
وہ بولی ”اس نے میرے اور آپ کے بارے میں ناخوشیاں بات کی اور کہنے لگا کہ چند مہینے پہلے یہ زخم آپ نے اتے لگایا ہے۔ وہ اس زخم کا بدلہ مجھ سے لینے کی باتیں کر رہا تھا اور غلطی دہمیاں دے رہا تھا۔“ غزالہ کی خوب صورت آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو نپٹنے لگے۔

”اس نے تمہیں کوئی جسمانی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟“  
میں نے ہنکارتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ غزالہ نے جواب دیا ”اس نے مجھے بتایا کہ میں پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہوں اور یہاں کوئی میری مدد تو نہیں دیتے والا۔ پھر اس نے فون پر ایک نمبر ڈال کر دے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں آپ سے بات کروں۔ ابھی میں نے بالکل آپ کی آواز ہی پہچانی تھی کہ اس نے ریڈیو مجھ سے جھین لیا۔ آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میرا شکار چندہ میں منٹ بعد خود چل کر میاں پہنچ رہا ہے پھر میں تھیں ایک ایسا گارہ تھا شاد کھاس گا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کر شراب پیتا رہا اور سگریٹ پھونک رہا۔ پورا کرا دھوئیں سے بھریا تھا اس نے تقریباً آٹھ گھنٹے بعد پانچ باہر سے بھاگتے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ شکر جلدی سے اٹھ کر دوڑانے کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بولٹ کر اگر دوڑا وہ کوٹھا میں نے ایک حیرت ناگ منظر دیکھا۔ یقین کریں مجھے اب تک اپنی آنکھوں پر مجبور سا نہیں ہو رہا۔ کمرے کی ایک کھڑکی زوردار آواز سے ٹوٹ گئی تھی۔ ایک دیوانہ سا شخص جھست لگا کر اندر آیا۔ یہ ابھی ہوئی واڑھی اور لیے بالوں والا وہی شخص تھا جو بعد میں ہمارے ساتھ جپ میں سوار ہوا اور حواسے کا شکار ہوا۔ دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں وہ کسی جن ہی کے مانند نمودار ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک دہائی پتھر تھا۔ وہ کسی درندے کی طرح شکر شکر پھینکا۔ شکر شکر نے اپنا ہتھول نکالنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی ملک نام شخص نے پتھر سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ یہ بڑی زوردار ضرب تھی۔ میں نے شکر کو لہرا کر اس تابی پر گرتے دیکھا جہاں اس نے بولتیں اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ اس کے بعد مجھے کسی نے عقب سے دھکا دیا۔ میں پھرا کر کسی چیز سے ٹکرائی اور بے ہوش ہو گئی۔ تاہم یہ بے ہوشی بہت گہری نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے اور گرد کے ماحول کا احساس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں کسی شخص کی بہت بھاری آواز سن رہی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ ملک نام شخص میرے سر پر کھڑا ہے اور کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے اس کے گلے میں ہڈی ہونٹی ملاؤں کے آپس میں ٹکرائے کی آوازیں سنیں۔ کسی نے میری آستین کھینچ کر اوپر چھائی اور مجھے آنکھیں لگا دیا۔ اس آنکھیں کے بعد میں گہری بے ہوشی میں چلی گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد میرے حواس نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ میں تخت پیش محسوس کر رہی تھی اور کسی گاڑی میں پھنکے کھاری تھی۔

گوکھری سے نکلنے کا میرے پاس واحد راستہ یہی تھا کہ  
 یطرح پسرے واروں کو دواؤں کے حصول کے لئے اپنے  
 دواؤں کو اندر آئیں تو ان سے بھج جاؤں اور کسی طور  
 سامنے کی کوششوں کے لئے پسرے واروں کو اندر بلانے کا  
 کام نہ کر سکوں۔

نی میں غزالہ کو چند ہدایات مزید دینا چاہتا تھا لیکن  
رہی کرخت آواز نے بات پوری نہیں ہونے دی وہ  
نہ ختم ہو گیا ہے لی بی! اب اب انھے حاسم۔ غزالہ

ہم سرگوشیوں میں بات کرنے کے لیے ایک دوسرے

اس کی آنکھوں کے کنارے اور ناک کی پچھلی سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ اپنے آسودہ بننے کی کوشش کر رہی ہے مگر توازی میں یوں "شاہ جہاں! آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کی کوششیں سب بے اثر ہیں۔ یہ لوگ آپ کو چیشاب دینے کے لیے بھی باہر نہیں نکالتے ہیں۔ کوششیں بے اثر ہیں۔ آپ کو ہتھ کڑی ڈال دیا ہے۔ یہ کیوں کر رہے ہیں



طرف سے اچانک شدید خطر لاحق ہو جائے وہ نتائج پر زیادہ غور کے بغیر اندر نہیں آئیں اور مجھے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا موقع فراہم کریں۔ کم از کم پانچ پہرے دار میرے ارد گرد موجود تھے ان میں فریہ اندام وارڈن بھی تھا۔ وارڈن کے پاس ہسپتال تھا جبکہ باقی افراد میں سے دو آئرننگ راکٹوں سے مسلح تھے یہ وہ افراد تھے جو مجھے نظر آرہے تھے جو نظر نہیں آ رہے تھے ظاہر ہے وہ بھی دوست اور خیر خواہ تو نہیں تھے میں نے بت سوچ چماری لیکن خود کو تکلیف میں ظاہر کر کے پہرے داروں کو اندر بلانے کا طریقہ قابل عمل محسوس نہیں ہوا۔ ایک تو یہ ہمسایا طریقہ تھا دوسرے پہرے دار بھی خاص طور سے محتاط تھے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ انہیں کسی بھی صورت اندر نہ جانے کی خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ بت سوچ چمار کے بعد میری نگاہ اس بلب پر جا کر ٹپک گئی جو کٹھری کی چھت پر روشن تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ بلب پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے بجھایا نہیں گیا تھا۔ اس بلب کا سوچ کٹھری کے باہر تھا اگر میں اس بلب کو توڑ دیتا تو بلب لگانے کے لیے پہرے داروں کو اندر آنا پڑتا۔ اسی خیال کے تحت میں نے اندر چڑھا جہاں ہی بلب کو ”شمید“ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں تک میری معلومات تھیں، جیل میں چماری کی کٹھریوں کو روشن رکھنے کے لیے جو لائٹ لگائی جاتی ہے وہ کٹھری سے باہر ہوتی ہے۔ مقصد یہی ہوتا ہے کہ قیدی کہیں لائٹ کا شیشہ توڑ کر اس سے خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے لیکن مہاراج کی اس جیل میں یہ احتیاط ملحوظ نہیں رہا تھا۔

میں نے پہلے تو ایک پہرے دار سے ڈانٹ ڈپٹ کی اور اسے کہا کہ وہ کٹھری کی لائٹ آف کر دے۔ ظاہر ہے وہ ایسا کرنے سے منذور تھا۔ جب اس نے بات نہیں مانی تو میں نے کمانے کی خالی نرے اچھال کر بلب توڑ دیا۔ کٹھری میں گمری تاریکی چھائی۔ پہرے دار نے فوراً ایک تاجب روشن کر لی اور دوسرے پہرے دار کو آواز دی کہ لگا۔ میں پوری طرح چوکس ہو گیا۔ یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ کٹھری کو روشن رکھنے کے لیے اور نیا بلب لگانے کے لیے کٹھری کا دروازہ کھولنا پڑے گا لیکن میری امیدوں پر اس وقت اوس پڑی جب نیا بلب کٹھری کے اندر لگانے کے بجائے کٹھری سے باہر برآمدے میں لگا دیا گیا۔ ایک پہرے دار اسٹول پر چڑھ گیا دوسرے نے تاجب کی روشنی چھت پر ڈال کر ہولنڈر تلاش کیا اور اس میں بلب آڑیں دیا۔ اچانک میرے جسم میں برق سی گزرتی۔ یہ عمل کا وقت تھا۔ بلب لگانے کے لیے اسٹول پر

چڑھا ہوا پہرے دار مجھ سے تقریباً تین فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے کندھے سے سیون ایم ایم بمول رہی تھی۔ یہ برسہ مارنے والی شاندار گن تھی۔

اس سے پہلے کہ برآمدے کا بلب روشن کیا جاتا اور پہرے دار اسٹول سے اترتا میں نے اپنے ہتھکڑی والے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالے اور قبضے کے اوپر سے اس کے سینے پر ہاتھ ڈالا ایک اچانک اور نہایت شدید ہتھکڑے کے ساتھ میں نے اسے اپنی جانب کھینچا۔ وہ آہنی سلاخوں سے کھرا یا اس کے حلق سے ایک جیسا کہ آواز نکل گئی۔ میں نے پھر سے گن اندر کھینچی۔ جو تین منٹ نے راتقل والے کا تپا چھوڑا وہ کسے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر جا گر۔ آہ دووازے کی ضرب اس کے لیے کافی شامی ثابت ہوئی تھی۔ دوسرے پہرے دار نے اپنا ہاتھ راتقل کی طرف بڑھایا ”خبردار“ میں نے چلا کر کہا ”گولی چلا دوں گا۔“

پہرے دار ٹھٹک گیا۔ دوسرے دار جو خالی ہاتھ۔ سرخٹ مخالف سمت میں بھاگے ان کے جانے سے مجھے فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس محسوس کٹھری کی اسی پہرے دار کے پاس ہے جو اس وقت میری راتقل کی طرف پر ہے نہ زندوں میں ہے اور نہ مردوں میں ”خبردار“ چلائی نہ دکھانا۔ ایک سیکنڈ میں چھٹی کر دوں گا۔ میں نے اسے ٹھکر دیا ”دی“ ”پنی راتقل فرش پر اور دووازے کا تالا کھولو۔“

میرے لمبے میں وہی خدا داد حرارت عود کر آئی تھی میرے مخالف کو مسوت کر دیتی تھی۔ ایک لمحہ شدید درد میں رہنے کے بعد پہرے دار نے ذہنی راتقل فرش پر دی ”چلو تالا کھولو۔ جلدی کرو“ میں نے بے تاب ہو کر پہرے دار اپنی جگہ تکتے بنا کھڑا رہا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کر پا رہا تھا۔ اس نے دو قدم دروازے کی طرف بڑھائے پھر اچانک پیٹڑا ہلا اور برآمدے کے ستوازی بھاگ ”رک جاؤ“ میں نے کہا اور ساتھ ہی ٹریگر دیا دیا۔ راتقل دھماکوں سے شعلہ اٹکے۔ پہرے دار لہرا تا ہوا ایک ستور کھرایا۔ نیم تاریک برآمدے میں وہ مجھے ایک بیولے کی نظر آ رہا تھا۔ مرنے کے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرنا کامیاب نہیں ہوا۔

جیل کے بیونی دروازے پر اب شور و غل مچا ہوا پہرے دار ایک دوسرے کو پکار رہے تھے اور چوکس تھے۔ برآمدے کا بلب روشن ہونے سے پہلے ہی پہرے دار پر ہاتھ ڈال دیا تھا لہذا میری کٹھری اور

سے والا حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ بات میرے حق یا جاری تھی۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی راتقل تھی۔ تاریکی میں تھا۔ اور چماری کا قیدی تھا۔ پہرے دار سے قریب آتے ہوئے ڈر رہے تھے بے شک وہ مہاراج۔ وفادار تھے لیکن انہیں اپنی زندگیاں بھی پیاری تھیں۔ وہ جانتے تو مہاراج ان کے خیمہ بچوں کی پرورش کا انتظام دیتا۔ ان کی بیواؤں کو زمین لائٹ کڑی جاتی۔ لواحقین کو فنی سرٹیفکیٹ یا اسناد وغیرہ مل جاتیں لیکن اس سے کیا نانا کی زندگیاں تو واپس نہ آئیں اور زندگی سے بڑھ کر ی چیز اور کوئی نہیں۔ لہذا وہ کھڑا رہے تھے اتنی جلدی رات کا رُج پانا نہیں چاہتے تھے۔

پہرے دار کا بے حرکت جسم مجھ سے تقریباً پچیس فٹ دوری پر تھا۔ اس کی جیب میں چابوں کا وہ گچھا تھا جو سے زندان کو کھول کر مجھے زندگی کی طرف جانے کا راستہ سکھاتا تھا۔ لیکن پچیس فٹ بہت بڑا فاصلہ تھا۔ میرا ان سیون ایم ایم کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی فائرنگ دہلی تالا توڑنے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن پھر غل خالی رہ جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ ”زہن کے گوشے سے سوال ابھرا تھا یہیں سے جواب ابھرا۔ جو بھی موت سے بڑھ کر کیا ہوگا اور موت تو یہاں ہر طرف۔ شیخ عاصم بن ارشد کی آنکھوں میں مہاراج رتن سنگھ کی ریلی مسکراہٹ تھی۔ اس کٹھری میں ”چماری کھاٹ پر“ راجدھانی تھی۔ ”میں۔ آئی دل کو“ میں نے خود کو تار اور راتقل سوت کر آہنی دووازے کی طرف بڑھا لیکن سے پہلے کہ میں تالے کی کھج کو کھینچا اور راتقل کو ش میں کرتا۔ میری کٹھری اور برآمدے کا ایک حصہ روشن ہو گیا۔ یہ کافی تیز روشنی تھی اور کسی سرچ لائٹ سے بھی تیز تھی۔ روشنی کرنے والوں نے یہ غلطی کی تھی کہ لائٹ کو اوٹ میں رکھا تھا ورنہ میرے لیے ایک دو این ضائع کر کے اسے ناکارہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

چند لمبے بعد محسوس کی چمکاری ہوئی تو آواز میرے کانوں ”جانی! راتقل پچیسک دے۔ تو ہماری راتقلوں کے لیے ہے۔“

محسوس کے لمحے سے اعتماد جھٹک رہا تھا۔ یہ اعتماد قابل نامہ کٹھری روشن ہونے کے بعد میں ایک دم نشاے پر تھا۔ اگر میں کہیں آؤ لیتا چاہتا تو ایک نواچ چوڑے ماکے سوا کوئی جگہ میر نہیں تھی۔ اور یہ ستون مجھے نے کے لیے لگائی تھی۔ اس کے برعکس میرے قہر مقابل

افراد محفوظ جگہوں پر یوزینیشن لے چکے تھے اور ان میں محسوس بھی شامل تھا۔ مجھے اس کی آواز دامن جانب دس پندرہ گز کی دوری سے آ رہی تھی لیکن وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک دھماکوں سے کئی گولیاں کٹھری کی سلاخوں سے ٹکرائیں اور فرش پر پگھلائی سی ٹھہر گئیں۔ اس فائرنگ کے ذریعے محسوس نے اپنے دعوے کی حقیقت ثابت کی تھی۔ وہ پکار کر بولا ”جانی! اس کے بعد ملنے والی گولیاں تمہیں ٹکیر لگی۔ بہتر ہے کہ راتقل کو کٹھری سے باہر پھینک دو۔“

یہ بڑے نازک لمحات تھے یہ لوگ میرے گلے میں رتنے کا پھندا ڈالنا چاہتے تھے لیکن ایسی بات بھی نہیں تھی کہ پھندا ڈالے بغیر ان کا گزارا نہیں تھا۔ اصل مقصد تو میری جان لینا تھا اور جان اس کٹھری میں بھی لی جاسکتی تھی۔ اگر وہ مجھے کہ مجھے ڈھیل دینے سے ایک دو افراد کی جانیں جاسکتی ہیں تو وہ اسی وقت مجھے ٹوٹ کر سکتے تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ کئی الوقت ان کی بات مان لی جائے میں نے راتقل نیچے پھینک دی پھر اسے پاس سے ڈھیل کر کٹھری سے باہر کر دیا۔ تاہم اسے سلاخوں سے زیادہ دور نہیں کیا۔ دوسری احتیاط یہ کہ بہت سی اپنی جانب رکھا۔ اگر ضرورت پڑتی تو میں ایک لمبے میں اسے دوبارہ ہاتھ میں کر سکتا تھا۔

ایک شخص محتاط قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے برآمدے کا بلب روشن کر دیا اور گردے کو اور بلب بھی روشن کر دیا۔ مجھے گردہ نواح روشن ہونے تو سرخ لائٹ۔ بھادی گئی۔ دیواروں پر سائے سے لہرائے اور پانچ چھ افراد مختلف اطراف سے نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ ان میں محسوس کے علاوہ مہاراج رتن سنگھ خود بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھ گولی والی طاقت ور ”پینٹر“ تھی اور عقب میں ایک خوفناک ملٹرائف۔ وہ سخت پیش میں نظر آتا تھا۔ پھر مجھے شیخ عاصم بھی نظر آیا۔ وہ بے شک قدموں سے چٹا مہاراج رتن سنگھ کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ سرخ فوجیوں والے داچ میں اس شخص کو اغوا کر باہر لے گئے جو میری فائرنگ کا شکار ہوا تھا۔ اس کی حالت سے میں نے اندازہ لگایا کہ صرف اس کی ٹانگیں زخمی ہوئی ہیں اور وہ پوری طرح ہوش میں ہے۔ اس کے برعکس وہ محسوس جسے میں نے صرف سلاخوں سے کھرایا تھا۔ ابھی تک لبا لبتا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس کے سر اور پیشانی پر دو جگہ گمری چوس آئی تھیں اور ان چوٹوں نے اسے دنیا دامن سے بے خبر کر دیا تھا۔

شیخ عاصم بن ارشد اور مہاراج سمیت ہر شخص مشتعل نظر آ رہا تھا۔ مجھے تو لگا کہ وہ مجھے نشتا دھلائے بغیر ابھی



پھانسی گھاٹ کی طرف لے جائیں گے اور جلد کی جگہ مسراج رتن سنگھ خدائے ارحم سے میری گردن میں پھندا ڈال کر اپنی آخری کائنات کے گایا پھر دو لیے چکروں میں پڑنے کے بجائے ابھی سات آٹھ سو گرام پھٹکا ہوا سیرے جسم میں سے مگڑا دیں گے۔

چانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں سُن رہ گیا۔ وہ شخص بھی یک تک میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص قبائلی ڈاکو یعنی جان کا ایک ساتھی خناب آفریدی تھا۔ آزاد علاقے میں جب یہی جان نے غلام خاں سے ایک باز خریدی تھا تو باز کو جانچنے پر کتنے میں خناب نے ہی یعنی جان کی مدد کی تھی۔ بعد میں وہ باز بھی جان سے افرایم اور ارجمند بانو کے پاس آگیا تھا۔ فرید کوٹ میں ارجمند بانو کے کارندوں نے میری زبان کھلوایں گے لے وہ باز مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ بات دوسری طرف نکل گئی، میں خناب کی بات کر رہا تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے خناب کو میں نے پہچانے ایسے ہی اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے۔ پھر اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ خناب آفریدی نے ایک طرف جاکر زرائع کا کا سے کوئی بات کی۔ زرائع کا کاجانی کے علم میں سنا رہا پھر فوراً مسراج رتن سنگھ کی طرف بڑھ گیا۔

میں حیران ہو رہا تھا۔ میں یعنی جان کو پاکستان میں چھوڑ کر آیا تھا لیکن اس کے ساتھی آزادانہ میاں محوم رہے تھے اور یعنی جان کے ساتھیوں پر ہی کیا موقف "افرایم" ارجمند بانو، شکر سب میاں دندانہ رہے تھے یوں لگتا تھا "ان لوگوں کے لیے پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ جب چاہا اور چلے گئے، جب چاہا اور آگئے۔ یہ لوگ جس طرح چند منٹوں میں غزالہ کو جنگ سے انگوڑے کر فرید کوٹ لے آئے تھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑے وغیرہ کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔

زرائع کا "مسراج رتن سنگھ اور شیخ عامر وغیرہ سے بات کر چکا تو ان کے اثرات یکدم بدلے ہوئے نظر آنے لگے مسراج رتن سنگھ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

\*\*\*

تقریباً دس منٹ بعد مجھے ایک بے سچے شاندار کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ فرش پر دبیز قالین تھا، کونکوں پر بھاری پردے، ایک بے آواز انڈکشنز سے کمرے میں خوشگوار خشکی مٹا کر رکھی تھی۔ فرج، ٹی وی، ڈبل بیڈ ہر سولت میاں موجود تھی۔ جس زرد بدبودار کال کوٹھری سے

نکل کر اس آراستہ دیراستہ کمرے میں پہنچا، چشم بے جنت میں آنا تھا۔ چشم کی صرف ایک نشانی میرے ساتھ تھی اور یہ وہ پتھری تھی جو پچھلے دو دنوں سے مسلسل میری کھانوں کو جکڑے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر بعد جیل خانے کا فریہ اندام افسر اور زرائع کا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مسکرتہ فریہ اندام افسر کے ہاتھ میں پتھری کی چابی تھی۔ وہ ملاحت سے بولا "ہڑبائی" اس کے خصوصی آڈر پر میں آپ کی پتھری کھولنے آیا ہوں۔

میں نے کہا "دو روہلیک وارنٹ جو سپر کوٹم نے مجھے دیا تھا؟"

"مجھے خوشی ہے کہ اس ملک وارنٹ پر عمل نہیں کیا جا رہا۔" مولے افسر نے کہا اور پتھری میں چابی کھما کر میرے ہاتھ آزاد کر دیے۔

"تو پوری زیادتی ہے وارنٹ ہی" میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "میں تو پوری تیار کر چکا تھا۔ دوسرے تو بت گناہ گار بندہ ہوں لیکن یہیں تھا کہ ہائی ٹس کے ہاتھوں بے وجہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں جاؤں گا۔ آف۔ سارے ارمان دل میں رہ گئے۔ چھلوں سے لدے ہوئے ہاتھ۔ ٹھنڈی ہوا میں اور خوراک باقاً

زرائع کا لکڑی کے ڈشرو "ہائی" پر سیٹ کرتے ہوئے کہا "یہ تو ٹھنڈی ہوا میں اور خوروں کا انتظام میاں بھی ہو سکتا ہے۔"

"واہ واہ" میں نے ہاتھیں پھیلا کر شیشے کی تپائی پر رکھ لیر "زرائع کا کھانا ساری اس امیٹ سے لگتا گزرتی تو شاید وہ بگو الٹی جی۔ ہر بات زرائع ہے میاں۔ جو منت حاجت کرتے ہیں اور بے گناہی کی دہائی دیتے ہیں ان پر بھوکے روئے چھوڑے جاتے ہیں۔ جو تھمارا اسلحہ چھینے اور تھمارے ایک دو بندے زخمی کر دے اسے جنت نہیں کھڑا جاتا ہے اگر میاں لطف و کرم اسی شرط پر ہوتا ہے تو خدا کی قسم میں میاں خون کی ندیاں بہانے کو تیار ہوں۔"

زرائع کا لکڑی کے ڈشرو اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہ "اس کا جواب تمہیں ہڑبائی ٹس ہی دے سکتے ہیں۔ بہرط میرا غمناک مشورہ ہے کہ ان کے سامنے اس قسم کی کھڑ گنگو مت کرنا۔ دو مت کھلون مزاج ہیں۔ فیصلہ بدلنے نہیں لگاتے۔"

ی اولاد ہیں، آپ کی ماں۔"

"خاموش!" فریہ اندام افسر چپنا "ہم گستاخی کرنے والے کی زبان کھینچ لیتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر اس کی توند میں انگلی چھوئی "یار اتم زبان کی بات کرتے ہو، میں تو گردن کھنچوانے کو تیار ہوں۔"

مولے افسر کی آنکھوں میں دھشت تھینے لگی۔ شاید وہ مجھ پر بھگت ہی پرنا لیکن زرائع کا لکڑی کے ڈشرو ہٹا دیا۔ پھر مجھ سے سرویلے میں بولا "تم لہر کم اور بے وقوف زیادہ ہو۔ مجھے لگتا ہے تم اپنے حالات پھر ویسی ہی کرلو گے جیسے تھوڑی دیر پہلے تھے۔ بہر حال وہ سامنے ہاتھ روم کا دروازہ ہے۔ وہاں تھمارے لیے لباس وغیرہ موجود ہے۔ نماز کو کر کے پڑھو۔ شاید ابھی تھوڑی دیر میں ہڑبائی ٹس تم سے ملاقات کریں۔"

باہر جانے سے پہلے اس نے بڑی تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آنکھوں میں مولے افسر سے کوئی بات کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے تو میں نے دروازے کو اندر سے لکڑی چڑھائی اور محوم پھر کر اپنے اس سے ممکن کا جائزہ لیا۔ یہ ایک سوٹ تھا۔ اس میں دو کمرے ٹیلیکامیوناسیون ڈیوڈ اور ایک بڑا سا ہاتھ روم تھا۔ اس سوٹ میں دو دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ دبیز ریشمی پردہ ہاتھیں لے کھڑکی کے پت کو کھولے۔ باہر سے گرم ہوا بڑا مہار کا اندر گھس آئی۔ کھڑکی میں جالی تھی اور جالی کی دو سری جانب آہنی گرل تھی۔

میں دل مسوس کر رہ گیا لیکن دل کو زیادہ بڑا دھچکا اس وقت لگا جب میری نگاہ کھڑکی کے نظر آنے والے خوبصورت ایف پی پر پڑی۔ راجستان کی "سنگ مزان" زمین میں اتنا سرخ بڑیاں اگاتا دولت ہی کا کرشمہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں گھبرگ لاہور کی کسی شاندار کوٹھی میں کھڑا ہوں لیکن اس فوش نما باغ کے پتوں میں ایک کمرہ منظر نگاہ کو گھما کر رہا نا۔ ہاتھ چینی کے ایک درخت سے ایک چھپنکلا لاش لٹک رہی تھی۔ کس قریب سے آنے والی روشنی میں لاش کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک عورت کی لاش تھی۔ لباس سے پتا چلتا تھا کہ یہ وہی سانس عورت ہے جس پر ایک روز پہلے بے تحاشہ قسم ڈھایا جا رہا تھا۔ عورت کے ایک بازو سے رتی نہر کر اٹا لٹکایا گیا تھا۔ اس کی دوسری ہاتھ عجیب بے وقوفت سے ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بوسیدہ بال منہ سے چھوڑے تھے۔ میں نے "نظارہ" دیکھ کر کہنے میں رہ

گیا۔ مجھے لگا جیسے میں مسراج رتن سنگھ جی آف تامل کے ٹیرس میں نہیں، کسی آسیب زدہ محل میں ہوں اور وہاں ارواح خبیثہ انسانوں کا روپ دھار کر ہولناک قہقہے کر رہی ہیں۔ حیرت ناک بات تھی۔ کسی جانور کی لاش بھی یوں لٹکی ہوئی تو یہ ایک ناخوشوار منظر ہوتا تھا۔ یہ کہ ایک انسان کی لاش سرعام بھول رہی تھی۔ پھر ایک سایہ سالہا اور ایک مسلح سپرے وارنٹ کے انداز میں کھڑکی کے بائیں قریب سے گزر گیا۔ میں نے کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کر دیا۔ میں ممکن تھا کہ یہ لاش ابھی ابھی میری ہی نگاہ تواری کے لیے میاں لٹکا لی تھی ہو۔ کہ دیکھو استاد جانی! اور عورت پکڑ۔ مسراج سے دعا کرو گے تو تھمارا بھی ایک ہاتھ سے رستا باندھ دیا جائے گا۔

"خوب صورت" باغیچے کے منظر نے میرے سر میں انگارے سے بھریے تھے۔ آن انگاروں پر پانی ڈالنے کے لیے میں ہاتھ روم میں گھس گیا۔ بڑا ٹکٹف ہاتھ روم تھا۔ بارہ ضرب بارہ فٹ سے کم کیا سائز ہو گا اس کا۔ وارڈروب، ہاتھ ٹب، فون باکس ہر سولت میاں موجود تھی۔ میں نے وارڈروب کھول کر دیکھی۔ مختلف سائز اور انداز کے کم از کم تین درجن لباس میاں موجود تھے۔ میں نے قد آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور دیکھا کہ کیا واقعی چٹائی کا قیدی نظر آتا تھا میں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بال اچھے ہوئے ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ جسم پر صرف ایک شلوار اور وہ بھی شکستہ سی۔ سر سے ہر کرم جانے والے خون نے بالوں کو سریش ہی لگا دی تھی۔ میں نے پہلے شیش کی بھرا اچھی طرح نماز کو کر مل کی کھلی آئینوں والی قیص اور لٹکے کی شلوار پہن لی۔ سر کے زخم کو حسب توفیق دوائی وغیرہ لگا کر میں باہر نکل آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے برقی لہرائیں کھڑکی ایک دم بدلا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس جیل کی وجہ غزالہ تھی۔ وہ سبز رنگ کی چھوٹا رلان کا بے حد نفیس عورتی جیس سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ بازو میں پیچنگ سینڈل تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھی ایک اندیش ٹیکیز کی رون گردانی کر رہی تھی۔ مجھے باہر نکلنے دیکھ کر اس نے ٹیکیز کی ایک طرف رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسرت آمیز اطمینان جھک رہا تھا۔

"تم یہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ بولی "مجھے سمجھا گیا ہے۔"

"کس لیے؟"

اس کے چہرے پر سرفی سی لہرائیں "یہ پیچیدہ والوں سے پوچھئے۔"

رات کے وقت ایک بند کمرے میں تمام حو کے پاس ایک لڑکی کو بھیجے جانے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا اور لڑکی بھی وہ جسے اس مو کی عجب سمجھا جا رہا ہو۔ مجھے اپنے سوال کے بے مقصد ہونے کا احساس ہوا۔

مجھے یاد آیا کہ ہاتھ روم میں مٹھنے سے پہلے میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے کھول دیا تھا۔ میرے "شان" کے دوران غزالہ خاموشی سے انکریاں بیٹھ گئی تھی۔ میری غیر موجودگی میں ہی کمرے میں کچھ اور لوازمات بھی رکھ دیے گئے تھے مثلاً رسالے، معدنی پانی، دھسکی اور بیڑی کی دو بوتلیں۔ غزالہ کے ساتھ ساتھ ٹائونش کا سامان دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اپنی ذہنیت اور ماحول کے مطابق ان لوگوں نے "عجب" کے ساتھ میری ملاقات کا خوب خوب انتظام کیا تھا۔ انہیں اس رشتے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا جو میرے اور غزالہ کے درمیان استوار تھا۔ یہ جسم کا رشتہ نہیں تھا، بلکہ زبان اور آنکھوں کا بھی نہیں تھا۔ یہ قول کی اتھاہ گمراہیوں میں کسی موتی کی طرح چھپا ہوا ایک انمول جذبہ تھا۔ غزالہ اپنے موتی کی پینک مجھے دکھائی تھی لیکن میں نے اپنے دل کا موتی کچھ اور خسر و خاشاک میں لپیٹ کر کہیں بہت دور رکھ چھوڑا تھا۔ کبھی کبھی خواہشات کی لہروں بہت زور مارتی تھیں اور اس موتی کو ابھال کر غزالہ کے سامنے لے آتا چاہتی تھیں مگر ایسے میں وہ خسر صورت میری آنکھوں میں محسوس ہوتی تھی جس نے میرے اور میری بہن کے لیے اس دنیا کو جسم بنایا تھا۔ وہ میری چچی فاطمہ کی صورت تھی۔ اپنے باپ کا چھوٹوں سے ڈھکا ہوا نیلگوں چہرہ میرے تصور میں آتا تھا اور کانوں میں وہ صدا گونجنے لگتی تھی "یہ زندگی کے لیے دنیا میں کم نہ ہوں گے" افسوس ہم نہ ہوں گے۔ اور میں غزالہ کے لیے بے حد سفاک ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ چچی فاطمہ "غزالہ کے روپ میں میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔

"کچھ ٹھنڈی سی نہیں ہوگئی؟" غزالہ کی مہترم آواز نے مجھے چونکا دیا۔  
"ہاں" میں نے چونک کر کہا۔  
غزالہ اٹھی اور بڑی دلکشی سے چلتی ایزکینڈیشہ جھک گئی۔ ایزکینڈیشہ کو آف کر کے اس نے کھڑی کھولنا چاہی۔ یکایک مجھے وہ لاش یاد آگئی جو کھڑکی سے باہر جمبول رہی تھی۔ میں نے غزالہ کو کھڑکی کھولنے سے منع کر دیا۔  
"کیوں۔ کوئی خاص بات ہے؟" اس نے پوچھا۔  
"نہیں۔ بونٹی، تھوڑی سی ٹھنڈا اچھی لگتی ہے۔"

میں نے سامان ٹائونش پائی سے ہٹا کر کمرے کے اگلوتے بیڈ کے نیچے چھپک دیا۔ غزالہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور خاموش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے روپے میں ایک تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ تبدیلی "مری" والے دانے کے بعد دوٹو ہوئی تھی۔ غزالہ نے جیسے تیز کر لیا تھا کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے گی اور "جوانی معاملات" پر مجھ سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ یوں لگتا تھا کہ کئی برسوں سے جاری تکلیفیں نے آخر اسے تھکا دیا ہے۔ میں نے موجودہ حالات پر بات کرتے ہوئے کہا "تمہاری سبجو میں کچھ آ رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟"  
وہ بولی "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔"  
"میں کہ پہلے مجھے پکڑا گیا اور پھر مائیکسی کی دھمکیاں دی گئیں۔ پھر چھوڑ دیا گیا اور جان بخشی کے ساتھ ساتھ یہ تمام آرام آسائش مینیا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی میرے پاس بھیج دیا گیا ہے حالانکہ مہاراج رتن سنگھ کے خیالات مجھے تمہارے بارے میں کچھ اچھے نہیں لگتے تھے اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ تمہارے سلسلے میں کہیں روایتی جاگیردار نہ بن جائے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں" وہ بولی "لیکن یہاں اور بھی بہت کچھ ایسا ہو رہا ہے جو ہماری سبجھ سے بالاتر ہے۔ میں برسوں اوپر بالکونی میں کھڑی تھی۔ نیچے حوض کے کنارے رتن سنگھ چند افراد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ سب صورتوں سے جیسے ہوئے بدعاش نظر آتے تھے۔ وہ کسی گاڑی کو تلاش کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ گاڑی پنجاب کے شہر فید کوٹ سے اس علاقے میں لائی گئی ہے۔" کوئی بہت اہم گاڑی تھی۔ غالباً ترک یا اس قسم کی کوئی اور بار بار سوار تھی۔ کل بھرم میں نے اسی قسم کی ہتھکڑی۔ رتن سنگھ ریاست کشن گڑھ کے سابق والی دن سنگھ جی کے کسی پوتے سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک عملی بھی اس وقت اس کے پاس بیٹھا تھا۔ رتن سنگھ کو ذرا اونچی آواز میں بولنا پڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "گاڑی کے نمبر کاپتا نہیں چل سکا اور نمبر کے چکر میں تھپڑ بھی مت۔ بس یہ سمجھو کہ یہ اس صدی کا سب سے بڑا شکار ہے جو راجستان میں کیا جائے گا۔ اوہ تمہیں بتا رہے ہیں یادگار شکار کے لیے مصیبت تو اٹھانی پڑی ہے" پھر وہ ایک اخبار کا تذکرہ کرنے لگا جس نے بڑی تفصیل سے اس بارے میں لکھا تھا اور جس کا روبرو فید کوٹ جا کر اس سلسلے میں مزید معلومات اٹھنی کر رہا تھا۔ مہاراج رتن سنگھ کی آواز میں جوش و خروش تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ

اور اس کے ساتھی اس ترک والے معاملے میں بے حد دلچسپی لے رہے ہیں۔"  
غزالہ کی باتیں انکشاف انگیز تھیں۔ میں نے ذرا غور کیا تو ذہن میں ایک جھپکا سا ہوا اور ایک سلسلے کی چند گمشدہ کڑیاں آہں میں مل گئیں۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ اور شیخ عاصم دیمو کے روپے میں تبدیلی خباب آفریدی سے ملنے کے بعد واقع ہوئی تھی۔ خباب آفریدی، یعنی جان کا ساتھی تھا اور اس حوالے سے قادر زباں وغیرہ کا بھی ساتھی تھا۔ قادر زباں کو معلوم ہو چکا تھا کہ پٹنہ پل کی حویلی سے ترک نکلے والا میں ہوں اور میں ہی اسے لے کر اٹھنا پڑتا ہوں۔ یہ بات خباب کو بھی معلوم تھی۔ وہ کسی سلسلے میں مہاراج رتن سنگھ سے ملنے میں راجستان آدھکا تھا۔ یہاں اس نے مجھے نیل کی کوٹھری میں دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا۔ یہ اتفاق میرے لیے جاں افزا ثابت ہوا تھا۔ خباب آفریدی نے مہاراج رتن سنگھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ آج کل جس گمشدہ ترک کے چرے ہیں اس کا مرکزی کردار تو ان کے قبضے میں ہے۔ اس انکشاف کے بعد میری کوٹھری کا دروازہ کھل گیا تھا اور مجھے بڑی حفاظت کے ساتھ اس جنت نظیر کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں میرے بیشتر اندازے درست ثابت ہو گئے اور یہ بھی پتا چل گیا کہ خباب آفریدی اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا تھا۔ دراصل یعنی جان کا زانی کے علاوہ ایک برنس بھی کرنا تھا۔ یہ شکاری برنوں کی فروخت کا برنس تھا۔ وہ مقامی لوگوں کے پڑے ہوئے شکاری پرندے باز، شاہین اور عقاب وغیرہ اودنے پونے داموں خریدتا تھا اور انہیں عملی اور دوسرے غیر ملکی شکاریوں کے ہاتھوں نہایت گراں قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ اس وقت بھی خباب آفریدی، یعنی جان کے دو نہایت قیمتی باز لے کر سامان آیا ہوا تھا۔

ہم بہت دیر تک موجودہ صورت حال پر غور کرتے رہے۔ میں نے غزالہ سے لاہور کے حالات بھی دریافت کئے اس نے بتایا کہ جنگ جانے سے صرف تین چار گھنٹے پہلے اس نے ساسی صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ساسی صاحب نے بتایا تھا کہ شفق اور انجم بالکل خیریت سے ہیں۔ ساسی صاحب نے انہیں ایک محفوظ مقام پر رکھا ہوا ہے اور ان کے سوا ناپائیدار کسی کو بھی اس جگہ کا علم نہیں۔ غزالہ نے شروع و خشک فریال کا ذکر بھی کیا اور کہا "وہ آپ کو بہت یاد آ رہی ہے کتنی ہے اگر آپ دوبارے کے اندر اندر لاہور آئیں نہ آئے تو وہ آپ کے بارے میں تلاش گمشدہ کے

اشتراک چھوڑنا شروع کر دے گی اور اگر آپ بھر بھی واپس نہ آئے تو وہ ان اشتہادوں میں "تو ذی توازن" والے فقرے کا اضافہ کر دے گی اور بھی بہت سی اوٹ پانگ باتیں اس نے آپ کے لیے جمع کر کے رکھی ہوئی ہیں۔"

ہم رات بڑھ دو بجے تک گفتگو کرتے رہے۔ کسی نے ہمیں دسڑب نہیں کیا۔ اس دوران میں نے ایک دوبار کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ لاش بدستور درخت سے جمبول رہی تھی۔ کھڑکی کے آس پاس کم از کم دو مسلح سپرے دار موجود تھے۔ آخر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کمرے میں صرف ایک ڈبل بیڈ موجود تھا۔ میں ساتھ والے کمرے میں جا کر صوفے پر لیٹ گیا۔ غزالہ بیڈ پر دراز ہو گئی۔ اس نے ٹانگ بلب روشن رہنے دیا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر ان کمروں میں جیسے اس کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ یہ وہ خوشبو تھی جس کا میں بچپن سے عاشق تھا لیکن اب اس خوشبو کے اور میرے درمیان نفرت کی ایک لہر بھی حاکم ہو چکی تھی۔ خوشبو اور نفرت کی لہروں کے درمیان ایک جنگ سی تھی جو بدت سے جاری تھی۔ اس رات بھی میرے اندر یہ جنگ تادیر ہوئی رہی۔ میں سوچتی ہی نہ سکتا تھا کہ ایک شب مجھے ایسی بھی گزرائی پڑے گی جب ایک بند کمرے میں میرے اور غزالہ کے سوا اور کوئی نہ ہوگا۔

نہ جانے کس گھڑی مجھے نیند چھن۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں گھری ناری کی جھانکی ہوئی تھی۔ غزالہ میرے بالکل پاس موجود تھی۔ وہ مجھے شانے سے تمام کر چھوڑ رہی تھی "اٹھیں۔ میری بات سنیں۔ انہیں۔"

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ خود بخود کمر پر آیا لیکن رپو اور یا پتول نام کی کوئی شے میرے پاس نہیں تھی۔ کمرے سے باہر ایک مسلسل پھکار سی گونج رہی تھی۔ کھڑکیاں دروازے دھڑ دھڑ مزج رہے تھے۔ مجھے یہ فکرتیں میں دیر نہیں لگی کہ باہر نہایت شدید قسم کا طوفان آیا ہوا ہے۔ لاش بھی اس طوفان کے سبب چلی گئی تھی۔ میرے پاس تو ماچس بھی نہیں تھی کہ روشنی کر سکتا۔ اچانک کہیں برآمدے میں کوئی بہت بھاری چیز ہوا کے زور سے لڑاک کر فرش پر گر گئی اور کچھ شیشے چھناٹوں سے ٹوٹ گئے۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے" غزالہ منمنائی "اس نے میرا شانہ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ میں نے اسے اپنے قریب صوفے پر بٹھالیا۔ سحرانی ملاٹوں میں ریشمی آنہ جیوں کی شلت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی زور دار آنہ تھی۔ مجھے یہاں کے ملازمین پر تاؤ آ رہا تھا۔ انہیں

مکوڑوں کے درمیان سے گزر کر ہم ایک جنگ راہداری پر داخل ہوئے۔ یہاں گھناؤں تیرگی تھی۔ ہم ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھے اور تقریباً سو گز چلنے کے بعد اچانک مکلی جگہ نکل آئے۔ یہودی چار دیواری کا بھولا ہمارے بالکل سامنے تھا۔ ایک چھوٹے سے دروازے پر بھی سائیکس منہ سر پہ کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آندھ میں نے ذرا زور پکڑا تو وہ "ہوا" ہم سفر ہو جائے گا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔

چار دیواری سے نکل کر ہم نے خود کو ایک وسیع میدان میں پایا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ میرس کی عقبی سمت تھی۔ مکلی جگہ پر آتے ہی ہوا کی شدت حد سے زیادہ محسوس ہونے لگی۔ ڈھانا پوش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ چرے بنگے ہوتے تو "رست کی مار" ہمارا برا حال کو بڑی۔ اب بھی جہم کے نیچے حصوں ہاتھوں اور گردن وغیرہ پر سونیاں سی چھ رہی تھیں۔ کسی دقت تو یوں لگتا تھا جیسے واقعی چند سونیاں کھال میں اتر گئی ہیں۔ کچھ فاصلے پر سمجھ کر ایک ٹھنڈ نظر آیا۔ ٹھنڈ کے عقب میں ایک بند چب کھڑی تھی۔ جو خنی ہم چپ کے نزدیک پہنچے اس کا جنج جگ اٹھا۔ ہوا کے شور میں انجن کی آواز مدھم سرسراہٹ سے زیادہ تھیں تھی۔ جب پر کیوس منڈھا ہوا تھا۔ ایک ڈھانا پوش نے آگے بڑھ کر جب کا عقبی کیوس ہٹایا اور ہمیں اندر بٹھار دیا۔ چند لمحوں کے اندر اندر بالی افراد نے بھی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ ہینڈ لائٹس روشن کئے بغیر چپ متحرک ہوئی اور ہوا کو چرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

\*\*\*

ایک گھنٹے تک جب بلا ٹوکے چلتی رہی۔ طوفان کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ جب چونکہ ہوا کی مخالف سمت میں جابی تھی لہذا اس کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ راستہ ناموار اور ریتلا تھا۔ بس کہیں کہیں درختوں کا کوئی ٹھنڈ یا ویران ٹیلا نظر آتا تھا۔ غزال کی گھڑی صبح چار بجے کا وقت تیار تھی۔

اب تک کا سفر تقریباً خاموشی میں ہی طے ہوا تھا۔ میرے استفسار پر لیڈر ڈھانا پوش نے صرف اتنا بتایا تھا کہ ہم ساڑھے چار بجے سے پہلے پہلے منزل پر پہنچ جائیں گے۔ اس نے بتایا تھا کہ ہم ایک رست ہاؤس میں جا رہے ہیں اور رست ہاؤس میں وہ شخص ہم سے ملاقات کرے گا جس نے ڈھانا پوش کو ہمیں "میرس" سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا۔ ڈھانا پوش اس سے زیادہ بتانے پر آمادہ نہیں تھے لہذا میں نے

قیص میں لمبوس تھے۔ ایک اور ایسا ہی بھولا مجھے کچھ فاصلے پر نظر آیا۔ جو شخص سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں ایک نہایت جدید قسم کی ہتھیار تھی۔ وہ ایک مشین تھی۔ کھڑکی کی گرل اسی مشین سے کالی گئی تھی۔

"آپ کی ساتھی کہاں ہیں؟" مجھ سے ہم کلام ہونے والے نے تیزی سے پوچھا۔

میں نے غزال کو بلانے سے پہلے ڈھانا پوش سے پوچھا کہ ہمیں یہاں سے کیسے نکالنا ہے اور اگر مزاحمت ہوئی تو اس سے نکلنے کا کیا انتظام ہے ان کے پاس؟

ڈھانا پوش نے بڑے اعتدال سے ان سوالات کے واضح لیکن مختصر جواب دیے۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ گھر کے بھیدی ہیں اور یہاں کی ہر ادھج سے واقف ہیں۔ اس کے علاوہ رست کا طوفان بھی ان کا دھماکا ثابت ہو رہا تھا۔ میرس کے طول عرض میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ رکھوالی کے گتے بھی نہ جانے کن کوئے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ مشین پر اور ڈھانا پوش نے اپنی پتلون کی عقبی جیب سے ایک چھوٹا لیکن طاقتور پشیل نکال کر میرے ہاتھ میں تنہا دیا۔ پشیل لوڈ تھا۔ میں نے تسلی کرنے کے بعد غزال کو آواز دی۔ وہ فوراً کھڑکی پر اُچھل کر گرل میں سے تقریباً ڈھائی فٹ مرلے کا ٹکڑا نکال کر نکالا۔ اس میں سے لگنا مشکل نہیں تھا۔ ڈھانا پوش نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم اپنے چرے کپڑوں میں چھپائیں ورنہ ریتیلی ہوا میں چلنا دشوار ہو جائے گا۔ میں نے ایک میز پوش کو ڈھانے کے طور پر استعمال کیا۔ غزال کے پاس اوڑھنی تھی لیکن اس نے صرف ڈاکڑی بڑھی تھی۔ ڈھانا لگانا نہیں سیکھا تھا۔ میں نے اسے بھی ڈھانا لگایا۔ پہلے میں خلا میں سے نکلا پھر سارا رستے کر غزال کو بھی نکال لیا۔

ڈھانا پوش ہمیں لے کر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ میں نے ایک پہرے دار کا بے حرکت جسم پھولوں کی گیارہ میں پڑے دیکھا۔ بائیں طرف گردن ٹھکرا کر میں نے غلا بدوش عورت کی عبرت نگاہ لاٹھ دیکھا جابی لیکن تاریکی اور آندھ میں زیادہ دو گز دور کی تھے۔ یہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب سے آگے ڈھانا پوشوں کا لیڈر تھا۔ اس کے پیچھے غزال، غزال کے پیچھے میں اور میرے عقب میں بالی دونوں ڈھانا پوش تھے۔ دیوار کے بالکل ساتھ ساتھ چلتے ہم دائرے کی ایک بلند ڈھانچے کی قریب سے گزرے اور ایک مضبوط میں داخل ہو گئے۔ پہلے تو مجھے یہی شک ہوا کہ ہم مکوڑوں پر سوار ہو کر کاڈیواڑ کی طرح یہاں سے فرار ہوں گے لیکن پھر یہ شک غلط ثابت ہوا۔ بہت سے بدکردار

شور میں ویڈنگ پلانٹ کی آواز نہ ہونے کے برابر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر چننی ڈھونڈی لیکن اس سے پہلے کہ میں چننی گراؤں ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ اگر آئینہ گرل کاٹنے والے ہمارے بدخواہ تھے یا غیر متعلق لوگ تھے یعنی نسب زن وغیرہ تو پھر اس مرحلے میں انہیں تو کتنا فیک نہیں تھا۔ ظاہر ہے جو خنی انہیں پتا چلا کہ کمرے کے کین جاگ گئے ہیں وہ اپنا کام اوجھڑا چھوڑ کر رو پکڑ ہو جاتے۔ بدھ تھا کہ ان سے رابطہ اس وقت کیا جائے جب وہ گرل کاٹ چکیں اور بند کھڑکی پر طبع آزمائی شروع کریں۔ ایسے میں اگر وہ بھاگ بھی نکلتے تو ہمیں کمرے سے نکلنے کا موقع مل جاتا۔

یہ سن کر میں واپس صوفے پر آ بیٹھا۔ غزال نے ایک بار پھر میرا بازو تھام لیا۔ میں نے اسے سرگوشیوں میں سمجھایا کہ میں کیا پاؤں رہا ہوں۔ گرل کاٹنے والوں نے پندہ میں منٹ میں اپنا کام مکمل کر لیا۔ اب فیصلہ کن لمحہ آنے والا تھا جو خنی کھڑکی کے تختوں پر ٹھٹ پٹ شروع ہوئی۔ میں ایک بار پھر یہ آہستہ کیڑی پر چڑھ گیا۔

کھڑکی سے منہ لگا کر میں نے پوچھا "کون ہے؟" باہر ایک دم سکوت سا چھا گیا۔ پھر کسی نے کھڑکی کے تختے پر ہاتھ کی پشت سے مدھم دستک دی "کون ہے؟" میں نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔

"جانی صاحب! ڈاکڑی کولیس" کسی نے گھبرائے میں کہا "ہم آپ کے لیے آئے ہیں۔"

"آپ کے لیے آئے ہیں؟ کیا مطلب؟"

"آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ آپ ہمیں دوست سمجھ سکتے ہیں۔"

"میرا سارے ہی دوست ہیں۔ تم اپنا تعارف کراؤ"

میں نے کہا۔

"آپ وقت ضائع کر رہے ہیں جانی صاحب ہمارا تعارف یہی ہے کہ ہم جان پر کھیل کر آپ کو ان خطرناک لوگوں سے بچانا چاہتے ہیں۔"

ایک دیل بہت واضح طور پر میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس وقت شیخ ناظم بن ارشد سے بدھ کر میرے خون کا پیاسا اور کوئی نہیں تھا۔ جو شخص مجھے اس کی دسترس سے نکال دیا تھا وہ کتنا بھی برا تھا لیکن میرے لیے آسانیاں یہ یاد رکھنا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے اندر اندر فیصلہ کیا اور چننی مگر اکرپٹ وا کر دیا۔ ریتیلی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اندر مٹس آئی۔ میں نے اپنے سامنے دو ڈھانا پوش افراد کو دیکھا۔ وہ سیاہ پتلون

چاہے تھا کہ ہماری خبر گیری کرتے یا پھر اس کمرے میں روٹنی کا کوئی متبادل انتظام موجود ہوتا۔ یہ اکرکٹیشنڈ کمرہ بالکل بند تھا پھر بھی سرکش بھتوں کا شور یہاں تک پہنچ رہا تھا۔ میں اس دروازہ نہیں کھول رہا تھا کہ ہوا کو ایک بار رستہ ملا تو نہ جانے کتنے کلور گرامر رت اندر مٹس آئے۔ دس پندہ منٹ ہم اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ طوفان کی شدت میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔ ہاں مختلف اشیاء کے گرنے کا شور اور کھڑکیاں دروازے بجنے کی آوازیں کم ہو گئی تھیں۔ اچانک ایک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ یہ آواز کمرے کی واحد کھڑکی کی جانب سے آئی تھی۔ میں نے پوری توجہ کھڑکی پر مبذول کر دی۔ آواز ایک دھم پھرتی۔ میں پہچانتے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ یہ ویڈنگ پلانٹ کی آواز تھی۔ اس طوفانی شب کے ہوناگ اندھیرے میں یہ کون تھا جو یہاں ویڈنگ پلانٹ لیے بیٹھا تھا۔ ویسے بھی یہ الیکٹریک پلانٹ کی آواز تھی اور بجلی گئی ہوئی تھی۔ کھڑکی پر ہونے والی آہٹوں نے غزال کو کچھ اور ہراساں کر دیا۔ وہ مضبوط اعصاب کی مالک ایک خبر مند ڈاکٹر تھی لیکن اس انجینی ماحول اور ان وحشت ناک واقعات نے اسے دھما کر رکھ دیا تھا۔ صوفے پر بیٹھی بیٹھی میرے ساتھ گئی تھی۔ اس کے جسم میں جی کی لرزش تھی۔ یہی لرزش اس "گرفت" میں تھی جو اس نے میرے شانے پر قائم کر رکھی تھی۔

ہم پھر دو خاموش بیٹھے ان آوازوں کو سنتے رہے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ کوئی اس کھڑکی کی گرل کو کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کائنات والا کون ہے؟ یہ سوال بہت اہم تھا اور اس کا جواب ہمیں جلد سے جلد درکار تھا۔ تین صورتیں ہو سکتی تھیں۔ گرل کاٹنے والا ہمارا ہمدرد تھا۔ ہمارا کوئی دشمن تھا یا پھر کوئی غیر متعلق شخص تھا۔ دشمن ہونے کی صورت میں بھی یہ بات وضاحت طلب تھی کہ وہ ہمارے لیے "میزبانوں" سے زیادہ خطرناک ہے یا کہ اگر کم خطرناک تھا تو پھر اس سے رابطہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ باقی دونوں صورتوں میں بھی اس سے رابطہ کرنا ہمارے لیے سودمند تھا۔ میں نے سرگوشی میں غزال سے کہا "تم ہمیں بخشید۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟"

اس نے اور مضبوطی سے مجھے تھام لیا۔ میں نے اپنا بازو اس سے چھڑا دیا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی "اگر انہوں نے کوئی وغیرہ چلا دی تو؟"

"پتہ نہیں ہوگا" میں نے بے رخی سے کہا۔

میں دھیمے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ طوفان کے

بھی انہیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

ہم مغرب سے مشرق کی سمت سفر کر رہے تھے اور جس علاقے کی طرف جا رہے تھے وہ نسبتاً گرم تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی نظر آجاتے تھے۔ بندہ ہمیں منٹ بعد ہم درختوں کے ایک ایسے ہی بڑے جھنڈ کے قریب پہنچے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہاں ایک عمارت بھی موجود ہے۔ جب مجبور اور پائس کے بست سے درختوں میں سے گزرنے کے بعد ایک تاریک عمارت کے سامنے جاؤ گی۔ جب کے رستے ہی عمارت کی ایک دو کھڑکیوں سے روشنی جھلکتی تھی۔ یہ لائین یا گیس کی نہیں بلکہ کی روشنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس دور افتادہ عمارت میں بجلی موجود ہے۔

ہم جب سے نکل آئے تھے تو طوفان اب ہوا کی صورت بانی رہ گیا تھا۔ رست بھی بہت کم آؤ رہی تھی۔ عمارت کے اندر سے ایک راکٹل پرواز دیکھائی دے رہی تھی۔ لیڈر ڈھانچا پوش نے اس سے چند باتیں کیں پھر وہ لوگ ہمیں لے کر اندر آگئے۔ یہ بلند ڈالیا جھٹوں، موٹی دیواروں اور دیوہیکل دروازوں والا ایک قدیم رست ڈاؤس تھا۔ یقیناً کسی انگریز گورنر نے یہ درختوں کی سولوں کے لیے تعمیر کرایا ہوگا۔ رست ڈاؤس میں قدیم عمارتوں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی لیکن ابھی تمام تر قدیمت کے باوجود وہ صاف ستھرا اور مرتن نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں اکثر شکاری حضرات کی آمدورفت رہتی ہے۔

ہمیں ایک کشادہ کمرے میں پہنچایا گیا۔ کمرے میں شطرنج کے خانوں جیسی سیاہ و سفید ٹائٹلوں کا فرش تھا۔ کمرہ اچھی قسم کے ہماری بھر کم فرنیچر سے آراستہ تھا۔ یہاں پہنچ کر لیڈر ڈھانچا پوش نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ وہ ایک چمپس چیمپس سالہ نوجوان تھا۔ شکل صورت سے تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ پر ایک خوب صورت نل تھا۔ اس نے کہا "میرا نام حقیق خاں ہے۔ یہاں آپ کی تمام ضروریات کا خیال رکھنا میرے ذمے ہے۔ یہاں آپ کے بیٹے کے ساتھ کھنٹی موجود ہے۔ میں ساتھ والے کمرے میں موجود رہوں گا۔ آپ جب چاہیں مجھے بلائیں۔"

میں نے ہنسنے سے روک لیا۔ "میں یہ سمجھ لو کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔"

"جی فرمائیے؟" اس نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔ "میں نے کہا کہ اگر تمہیں کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آج رات میں یہاں رہنے کے لیے تمہیں نہیں ہوگا۔ جب

تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے اور لانے والا کون ہے؟ ہماری بے چینی برقرار رہے گی اور بندہ بے چین ہو تو پھولوں کے بستر بھی نیند نہیں آتی۔"

وہ بولا "بچلے چند دنوں میں ہم نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ دلچسپ باتیں بھی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں آپ سے باتیں کرنے کا خوب موقع ملے گا لیکن ابھی الحال مجھے ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں اس لیے آپ سے معذرت چاہوں گا۔ باقی رہا اصل میزبان سے ملاقات کا سوال تو آپ فکر مند نہ ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس گیارہ بجے تک آپ ان سے مل سکیں گے۔ اگر آپ کچھ دیر لیٹنا چاہتے ہیں تو یقیناً جائیں ورنہ غسل کا انتظام موجود ہے۔ غسل کر لیں۔ میں آپ کے لیے چائے وغیرہ بھجواتا ہوں۔"

حقیق خاں کی دو سری تجویزیں پسند آئی۔ جب کسلندی سی محسوس ہو رہی تھی۔ غسل اور ایک کپ گرم پانی کا تصور فرحت بخش تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے تم آؤ گے۔ تم آؤ گے۔ تم آؤ گے۔"

اس نے اطاعت مندی سے سر جھکا دیا اور باہر جانے کے لیے صرا "غزالہ" نے آواز دی۔

وہ رُک گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا "سری ہوگی تمہارے پاس؟" غزالہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ فحتم دیکھیں۔ حقیق خاں نے کہا۔

"نہیں۔ بس اسٹری بھجواؤ۔" غزالہ نے کہا۔

وہ "بہت اچھا" کتا ہوا باہر چلا گیا۔ "سری کیا کرنی ہے؟"

"میں نے غزالہ سے پوچھا۔

"آپ کے پاس دوسرا لباس ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔"

"تو پھر یہ ممکن ممکن لباس اچھا لگے گا؟" اس نے میرے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کپڑے گو صاف ستھرے تھے لیکن رات سو جانے کی وجہ سے چرم ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ نکل پرواز دیکھائی دے رہی تھی۔

یوں "آپ شادو لیں" میں اتنی دیر میں کپڑے پر پیس کر دیتی ہوں "ایک دنگل ڈاؤس اپنا بیٹہ بھی اس کے لیے میں اور اس کے علاوہ ایک خوب صورت بے ساختہ بھی۔

غسل کر کے اور اسٹری شدہ کپڑے پہن کر میں باہر نکلا تو میری پشت پر ایک چمپل بڑے سینے سے ہاتھ روم کے دروازے پر

رکھی تھی "اسے کسی کپڑے یا بڑبڑ سے خوب جھکا دیا گیا تھا۔ طوفان اب گزر چکا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور باہر صبح کے سورج کے ہندوں کی چھایا ہٹ لے کر اندر آ رہے تھے۔ ایک کھڑکی کے بالکل پاس ایک خوب صورت تپائی پر چائے کے برتن رکھے تھے اور غزالہ کرسی پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے واش بین سے ہنہ ہاتھ دھو کر بال سنوار لیے تھے اور اب صبح نوی کی طرح اچلی اور تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پائیز کی کی چمک تھی۔ یہ وہ چمک تھی جس کا خوب صورت خذوال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ چمک انسان کے چہرے پر راست بازی اور نیکی کے صلے میں نمودار ہوتی ہے۔ جب انسان کا ضمیر گناہ پر در راتوں کو نکلتا دیتا ہے۔ جب بند کمروں میں بھی نفسانی خواہشات کو قریب نہیں چھٹنے دیا جاتا تو یہ دلواؤ دہنی چمکے سے چوں پر طلوع ہو جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اگر خدا انا خواست گزرنے والی رات ایسے نہ گزری ہوتی جیسے گزری ہے تو غزالہ کے چہرے پر یہ دلواؤ روشنی نظر آتی؟ اس کی آنکھوں میں دو تیری کاپا چمپن اور میری نگاہ میں اعتماد کی طاقت ہوتی؟ ہر گز نہیں۔

مشرق کی جانب کھٹنے والی اس کھڑکی کے سامنے بھڑکے طلوع سحر کا منظر دیکھنا اور چائے پینا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ میری سوچ کے بند سوتے کھل گئے تھے اور ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آخر یہ کون لوگ تھے جو اتنی دیدہ وبری تھے؟ ہمیں سماران جیسے بااثر شخص کی ذمہ سے نکال لائے تھے۔ نیرس سے روانہ ہوتے وقت میں نے سرخ ٹوپی والے ایک پرے دار کو باغیچے میں بے حرکت بڑے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ اور پرے داروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا ہو۔ یقیناً یہ کسی بااعتماد اور بلند حوصلہ شخص کا کام تھا۔ نیرس سے نکلنے کے بعد ہم نے جب پر تقریباً بیس کلومیٹر کا سفر کیا تھا۔ میرے خیال میں تو ہم ابھی تک ٹائڈل ایسٹ میں ہی تھے۔ ایسٹ ہی میں رہ کر ہڑپائی ٹک کے منہ سے سونے کا نوالہ چمین لینا بڑے دل گروے کا کام تھا۔

ان فضاؤں میں حُسن تھا لیکن اس کے ساتھ ایک طرح کی بے عزت بھی رہتی تھی۔ بھول نظر آتے تھے لیکن ہر بھول کے ساتھ کائنات کا التزام تھا۔ نیرس میں "میں نے ایک دکان پر پہنچا دیکھا تھا مگر اس باغیچے کے پتوں پتوں ایک نئی جلی عورت کی لاش بھول رہی تھی۔ اب اس پر سکون کھڑی تھی۔ ہمیں متاثر کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک

دلخراش بینٹنگ بھی نگاہ کو گھما کر رہی تھی۔ یہ بینٹنگ (ہو) بینٹنگ کی لوگوں کے لیے قابل دیدہ ہوگی) سامنے کی دیوار پر لگی تھی۔ کتوں کے ذریعے نیل گائے کے خنکار کا خطرہ تھا۔ دو گھڑ سوار اور سات آفہ گئے باؤنڈ گئے نظر آ رہے تھے۔ یہ گئے خوب صورت نیل گائے سے جو کتوں کی طرح چمپے ہوئے تھے۔ کسی نے ہانگ دھوج رکھی تھی، کسی نے گردن میں دانت پھوست کر رکھے تھے۔ کوئی پشت پر سوار تھا۔ نیل گائے کی آنکھیں باہر اُلی ہوئی تھیں جیسے اسے اپنا دردناک انجام صاف نظر آ رہا ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ غزالہ اس تصویر سے نگاہ ہچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر کسی وقت بے دھیانی میں نگاہ پڑ جاتی تھی تو ایک کرب سا اس کے چہرے پر لہرا جاتا تھا۔ یہ نازک اندام، نرم دل، نہیں ذرا کڑیاں سنگلاخ ماحول میں آن پہنچی تھی۔ شاید اسی خوب صورت نیل گائے کی طرح جو بھٹک کر گرے باؤنڈ گئے جڑوں میں آئی تھی۔ میرا دل اندر سے کانپ گیا۔ ایسا بے یاس خیال کیوں میرے ذہن میں آیا تھا؟ ایسا خیال میرے ذہن میں نہیں آتا چاہیے تھا۔ خدا نہ کرے غزالہ کا انجام اس نل گائے جیسا ہو۔

میں تھیں سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم اس رست ڈاؤس میں آزاد ہیں یا قید؟ تاہم وہ پھسل ابھی تک میرے پاس تھا جو نیرس سے روانگی کے وقت حقیق خاں نے مجھے دیا تھا۔ اس میں پوری جھگڑا لیا ہوئی تھی۔ آٹھ بجے کے قریب ہمیں پُر تکلف ناشتا دیا گیا۔ ناشتا دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہم مغربی راجستان کے اس دور افتادہ رست ڈاؤس میں نہیں لایا ہوا ہے۔ کراچی کے کسی ایسے ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ انڈے، "بھام" ڈھیل روٹی، تیرے کے گوشت کا آچار، کھن "دودھ" بہت کچھ موجود تھا۔ ناشتے کے بعد گرم گرم کانی سے تواضع کی گئی۔

اس کے بعد ہم نے گھوم پھر کر رست ڈاؤس دیکھا۔ یہاں کم و بیش پانچ ملازم اور چھ کنین موجود تھے۔ وہ جب ہمیں کھڑی تھی جس میں ہمیں لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک شیڈولڈ کار بھی کھڑی تھی۔ خبر نہیں یہ پہلے سے یہاں تھی یا ہمارے بعد کوئی یہاں آیا تھا۔ دھوپ کی تمازت کا مقابلہ کرنے کے لیے رست ڈاؤس کے اور گرد و خوار شجر کاری کی گئی تھی اور صرف شجر کاری ہی نہیں کی گئی تھی۔ شجرہ درمی بھی جاری تھی۔ گھوم پھر کر ہم واپس اپنے کمرے میں آئے۔ غزالہ بھی بولی تھی۔ ایک آرام کر رہی پر بیٹھی تھی۔ میں کمرے میں کھٹنے لگا اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اس وقت دس بجے تھے جب حقیق خاں تیرہ دنوں سے

اندرو داخل ہوا۔ غزال کو سوتا یا کر اس نے دبے لمبے میں کہا "جہانی صاحب! ایلے۔ آپ کو یاد کیا جا رہا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ وہ میرے اچانک جانے پر پریشان تو ہوئی لیکن متیق خاں کے سامنے اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ میں اور متیق خاں ایک طویل راہداری میں آگے پیچھے چلتے رہتے ہاؤس کی مشقی جانب بڑھے۔ میری نظر رست ہاؤس کے پورچ پر پڑی۔ یہاں اب ایک اور شاندار جیب کھڑی تھی۔ قاصد زادہ ہونے کے سبب میں یہ نہ دیکھ سکا کہ یہ کون سی جیب ہے۔ چند قدم آگے ایک پالش شدہ منقش دروازے کے سامنے دو گن میں چوکی سے ہر اوڑے رہے تھے متیق خاں مجھے ساتھ لے کر

اس دروازے میں داخل ہوا۔ یہاں فرش پر چینی کاربٹ تھا۔ کاربٹ پر چلتے ہوئے ہم ایک نسبتاً چھوٹے دروازے کے سامنے رُکے متیق خاں نے یہاں نہایت مذہب انداز میں دستک دی۔

"میں کم ان" اندر سے ایک بیماری بھر کم آواز آئی۔ متیق خاں مجھے لے کر اندر داخل ہوا۔ یہ وسیع کمرہ شاندار انداز میں سجا ہوا تھا۔ کمرے میں خواب ٹاک سی روشنی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے ایک شاندار صوفے پر پڑی۔ اس صوفے پر ترنم جسم والا ایک شخص صرف ایک شخص نیکر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیڑ کا گلاس تھا۔ سامنے رنگین ٹیلی وژن چل رہا تھا اور ایک نیم عریاں خوبو لڑکی صوفے کے عقب میں کھڑی اپنے دروہیا ہاتھوں سے

اس کے کندھوں کی پالش کر رہی تھی۔ میں اس شخص کو دیکھ کر دھک رہ گیا۔ وہ میرے لیے ابھی نہیں تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا بلکہ اسی کے پنگل سے نکل کر یہاں آیا تھا۔ وہ مہاراج رتن سنگھ تھا۔ اس نے چند لمبے میری حیرت سے لطف اندوز ہونے میں صرف کچھ مجھڑ بوار آواز میں بولا "ہینو جہانی استاد! ہم خود بھی تمہاری حیرت دور کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے اپنے بالفاظ ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کو شش کر کے اپنے تجزیہ قابو پایا اور مستحکم قدموں سے چٹا صوفے پر جا بیٹھا۔ مہاراج رتن سنگھ نے کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ میرے قریب کھڑا متیق خاں اُلٹے قدموں چٹا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی خوبو لڑکی نے مہاراج کے بچنے والے شانوں پر ایک جنازی ساز تکیا رکھا اور مذہب انداز میں مہاراج پر جھک گئی۔ مہاراج نے

مرگوشی میں اس سے کوئی بات کہی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اُلٹے قدموں چلتی باہر نکل گئی۔

اب مہاراج رتن سنگھ اور میں کمرے میں تھے۔ مہاراج دی پر سفید قام پہلوان اپنے داؤ بیچ رہا تھا۔ مہاراج نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کر دیا۔ کمرے میں کچھ دیر ہو چل خاموشی طاری رہی پھر مہاراج اپنے گلاس سے ایک بڑا گھونٹ لے کر بولا۔

"تمہیں یہاں بیچنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"جی نہیں۔ بہت آرام سے بیچا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میری تکلیف کا پوچھ کر رتن سنگھ نے مجھے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اب معلوم نہیں میرا یہ احساس غلط تھا یا درست؟

مہاراج رتن سنگھ نے کہا "دیکھو جہانی! کسی بھی حوالے سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ چلتا ہے۔ تم بھی جنگ لڑ رہے تھے اس لیے کل رات تمہیں ہماری قید سے رہائی پانے کا موقع ملا تو تم نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ہم بھی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے ہم نے تمہیں اپنی ہی قید سے رہائی دلائی۔"

میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ ساری زحمت کیوں کی آپ نے؟"

"ہم جانتے تھے کہ تمہارا اگلا سوال یہی ہوگا۔ اس سوال کا سچا کرا جواب یہ ہے کہ ہم تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے جس نظر سے ہمارے کچھ مہمان دیکھ رہے تھے۔ ہمیں آشا ہے کہ تم ہمارا اشارہ سمجھ گئے ہو گے۔"

"آپ شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کی بات کر رہے ہیں؟"

"تم ایک ذہین شخص ہو۔ مہاراج نے تعریف کی۔

"آپ کتنا چاہتے ہیں کہ میں شیخ عاصم وغیرہ کی نظر میں مجرم تھا لیکن آپ کی نظر میں مجرم نہیں ہوں؟"

وہ بولا "ہم تمہارے مجرم ہونے یا نہ ہونے کی بات نہیں کر رہے۔ تمہارے قابل معافی ہونے یا نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پُر فریب چمک نظر آ رہی تھی۔

ایک ایسی بہت سی باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ یقیناً شیخ عاصم اور مہاراج رتن سنگھ میں میرے حوالے سے کوئی اختلاف ہوا تھا۔ شیخ عاصم میری سزا پر عمل درآمد چاہتا ہوگا جبکہ مہاراج رتن سنگھ کی آنکھوں میں کچھ دوسری طرح کے خواب اتر آئے ہوں گے۔ بہت سے دوسرے طالع آزمائش

تھا لیکن یہ جیسے جو ابھی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی کسی اور ہی جگہ کی مالک تھی وہ حسین تھی اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کا خُسن چاندنی کی طرح لعلنڈک بخش نہیں سورج کی طرح چڑھتا تھا۔ یہ خُسن، دل و نگاہ کو مشتعل کرتا تھا اور ایک طرح کی آگ بیٹے میں جگا دیتا تھا۔ وہ سرتاپا عورت تھی اور ہر صوبہ کی نگاہ سے تقاضا کرتی تھی کہ وہ اسے "مروانہ وار" دیکھے۔ شاید کسی ایسی ہی فتنہ سالان کو دیکھ کر کسی زبان داں نے "توبہ فکین" اور "فارت گم ایمان" جیسے لفظ ایجاد کیے ہوں گے۔ اس نے اپنے جگمگاتے ہاتھ جو ذکر بڑی آواز سے مجھے ہنستے کہا اور معنی خیز بے باکی سے میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ مہاراج رتن سنگھ زربل مسکرایا اور بولا۔ "اس کا نام نسا ہے۔ ہمارے خاص الخاص "میزبانوں" میں سے ہے۔ جب تک تم یہاں ہو یہ تمہاری سیوا پر مامور رہے گی۔"

"سیوا" کے لفظ میں مہاراج نے اپنے لمبے کی مدد سے وسیع تر معانی بھر دیے تھے۔ وہ کسی ریڈیو آرٹسٹ کی طرح اپنی آواز کے آثار چڑھاؤ سے عام الفاظ کو خاص لباس پہنانے کا فن جانتا تھا۔ کوئی جھڑکا محض بھی ہوتا تو یہ فحوش کر اور اپنے پہلو میں کھٹی قیامت کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ضرور جی اٹھتا۔ میرے بیٹے میں بھی ایک سرسری درد ڈھکی۔

وہ لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے تک مہاراج کے کندھوں کو سلارہی تھی دوبارہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نہایت دیدہ زیب نرے تھی۔ نرے میں حلال مشروبات کے ساتھ ساتھ پھل بھی تھے۔ یہ پھل ابھی ابھی خربز سے نکال کر لائے گئے تھے۔ کچلے، سرخ سیب اور انگوڑ کے خوشنما کچے۔ میں انہیں چمکے بغیر خان سلکا تھا کہ وہ بے حد شیریں

اور سرد ہیں۔ نرے پٹائی پر رکھ دی گئی۔ میرے پہلو میں نیچی "قیامت" متحرک ہوئی اور اس نے جھک کر نرے سے چھری اٹھائی۔ یقیناً اس نے یہ چھری کسی بڑی نیت سے نہیں اٹھائی تھی کیونکہ وہ کسی کو زخمی یا قتل کرنا چاہتی تو اس کے لیے اس کی نگاہ ہی کافی تھی۔ اس نے اپنے سر میں ہاتھوں میں ایک سیب تھا اور بڑی فصاحت سے اسے چھیلنے لگی۔

سناج کرنے والی لڑکی نرے رکھ کر واپس چلی گئی تو مہاراج نے اپنے ہماری بھر کم لمبے میں کہا۔ "پچھلے دو تین روز میں ہمیں تمہارے بارے میں کافی جانکاری ہوئی ہے۔

پرتو! بات یہ ہے کہ ہم تم سے متاثر ہوئے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم تمہیں "میرس" کے مشکل حالات سے نکال

کی طرح وہ بھی ٹرک کے شکاریوں میں شامل ہو چکا تھا۔ یہ سستی خیر اطلاع ملنے کے بعد کہ کشیدہ ٹرک سے میرا براہ راست تعلق رہا ہے، رتن سنگھ کے لیے ممکن نہیں رہا ہوگا کہ وہ "انصاف کے قہر" پورے کرنا اور مجھے بارگاہی نقد پر مجبور لیتا۔ اس نے میری سزا کا ٹانا چاہا تھا مگر شیخ عاصم راستے کی دیوار تھا۔ آخر مہاراج نے ایک ایسی چال چلی تھی کہ سائب مرگیا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی تھی یعنی مہاراج نے بلا نقصان اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اپنے ہی کارندوں کے ذریعے مجھے اپنے محل سے نکالا تھا اور اس رست ہاؤس میں پہنچایا تھا۔ ممکن تھا کہ اس ذرا سے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے اپنے

ایک آدھ دو فادر کو عدم آباد بھی روانہ کر دیا ہو۔ اب شیخ عاصم کہیں کسی مقام پر دانت کچپا رہا تھا اور مہاراج اس خفیہ لٹکانے پر میری "معیت" سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں زور کی نیرنگی اور یہی دنیا کا وہ ملک ترین جادو ہے جو ہر خاص و عام کے سرچڑھ کر بولتا ہے۔

اچانک مجھے اپنے خیالات سے جھٹکا پڑا۔ مہاراج کے عقب میں واقع دروازہ کھلا اور ایک قیامت اندر آگئی۔ یقیناً وہ قیامت ہی تھی کیونکہ اس کے آگے ہی سورج چیتے سوا پڑے پر اٹھیا اور نشست گاہ کے نیکیوں منقوشوں میں روشنی ختم ہو گئی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ بے حد حسین اور مناسب جسم کی مالک۔ اس کا لباس مختصر تھا اور جتنا تھوڑا بہت تھا وہ اس کی موٹائی چھپانے کے بجائے نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے بال کندھوں پر جمول رہے تھے۔ گلے میں نہایت قیمتی جہوں کی لالائیں تھیں۔ جلد لالہ، آنکھیں روشن، ہونٹ گداز خانے ہموار اور شانوں سے نیچے سبز زمین تک ایک ہمہ قیامت۔ وہ ایک آواز سے چل پڑی جیسے دردمان جسم اٹھے۔

ایک شاندار معلق تھا اس کی چال میں۔ وہ نچے پاؤں تھی۔ بھونے بھونے قدم اٹھاتی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

نیل جانے سے پہلے تین سال کے مختصر عرصے میں میں نے ایک دنیا دیکھ لی تھی۔ لاہور کا بازارِ خُسن اور وہاں کے بنگلے ظلم اسٹوڈیوز، بھٹی کے ہائٹ کلب اور فائبر اشار ہوئی، دہلی کے گے خانے اور ان سے خانوں میں تھرکتی ہوئی مینیاٹم۔ ایک سے بڑھ کر ایک پری زاد میری نگاہوں کے سامنے آئی تھی۔ ایک سے ایک حسین چہرہ وہ بے بسارت چہرے

کر یہاں لے آئے ہیں۔ جوں لینے اور دینے والا تو بنگلوان ہے لیکن ایسے کاموں کے لیے وسیلے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ بنگلوان نے ہمیں تمہارا جیون بھانے کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ بلکہ شاید یہ کتنا مناسب ہو گا کہ ایسا دور مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب تم ریگستان میں جاؤ گے۔ یہاں سے اور ہم نے تمہیں اپنی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا تھا اور دوسری مرتبہ اب جبکہ تم میرس سے یہاں پہنچاؤ گے۔ اور ہم کو لگ رہا ہے کہ ہمارے ذریعے تم پر بنگلوان کی یہ کپڑا ابھی جاری رہے گی۔ ماسوائے اس کے کہ تم خود ہی کوئی ایسی طغلی کر بیٹھو جس کے کارن ہمارا تمہارا ساتھ ختم ہو جائے۔

میں نے اب سے کہا۔ ”میں یونہی نہ لے کر جاؤں گی۔“

دشانت چاہوں گا۔“

مہاراج نے اپنے بالوں سے بھرے سینے کو بھڑکی اٹکیوں سے سلاپا اور بولا۔ ”ہم تم سے صاف سیدھے انداز میں بات کرنا چاہتے ہیں اور تمہاری بڑھی (ذہانت) سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ تم ہماری کسی بات کو غلط مطلب نہیں پڑھاؤ گے۔“ اس نے تھکا کر رکھا صاف کیا اور بولا۔ ”یہ بات ہمارے لیے ذمہ داری نہیں کہ کچھ روز پہلے افزائیم نامی ایک پاکستانی نے کسی مقام پر کھدائی کی ہے اور اس کھدائی کے نتیجے میں نہایت قیمتی سامان سے بھرے ہوئے جگہیں صندوق برآمد ہوئے ہیں۔ اتفاقاً وہ صندوق ایک ٹرک میں لدے ہوئے تھے اور وہ ٹرک تمہارے ساتھیوں سمیت ایک فریڈ کوئی زمیندار کے فارم پر موجود تھا لیکن پھر ٹرک وہاں سے غائب ہو گیا۔ ہم نے اب تک یہ کہنا ہے ”اس میں کچھ غلط تو نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”آپ کہتے چاہیں۔ میں اپنی گزارشات آخر میں کروں گا۔“

مہاراج نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں دشواری ہے کہ وہ ٹرک اور اس کا اسباب جہاں کہیں بھی ہے تم اس سے باخبر ہو۔ اور اس وقت تمہاری سب سے بڑی ترجیح یہ ہے کہ اس ٹرک کو جو غلطی سے سرحد پار کر گیا ہے، وہاں پاکستان لے جاؤ اور اس کے اسباب کو کسی محفوظ مقام پر پہنچاؤ۔ ہم اس بارے میں تمہیک سے نہیں جانتے کہ تم ٹرک کو پاکستان واپس کیوں لے جانا چاہتے ہو۔ ممکن ہے تمہارے ذہن میں قانون پسندی کا کثیرا کثیرا رہا ہو اور تمہارا ارادہ ہو کہ اس دفعے میں سے حکومت کو مقررہ حصہ دیا جائے یا پھر اس سامان کو ٹھکانے لگانے کے لیے پاکستان میں تمہارے پاس کوئی بہت محفوظ جگہ ہو یا پھر۔ خیر جو کچھ بھی

مہاراج رتن سنگھ خود کو سرچشمہ و درویش صفت ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس کی سرچشمی کے بارے میں پوچھ نہیں تھا۔ مجھے غزالہ نے بتایا تھا کہ مہاراج گمشدہ ٹرک میں بے حد دلچسپی لے رہا ہے اور اسے ایک یادگار ٹھکانہ نام دے رہا ہے۔ پھر میں اپنے ارد گرد جو لہو و لعب دیکھ رہا تھا وہ مہاراج کی درویشی پر نہیں تیش کو شی پر دلالت کرتا تھا۔ دولت کی فراوانی کسی طرح بھی اس چیز کو ثابت نہیں کر سکتی کہ دولت مند کو اب مزد دولت کی ضرورت نہیں۔ اکثر و بیشتر صورت حال برعکس ہوتی ہے۔ جوں جوں دولت بڑھتی ہے اس کی ہوس بھی بڑھتی ہے۔

میں نے مہاراج سے اجازت طلب کر کے اپنے پسندیدہ برائڈ کا سکرٹ نکلیا اور ایک گھبراہٹ لے کر کہا۔ ”یونہی نہ لے کر جاؤں گی۔“ میں نے میرے اور گمشدہ ٹرک کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ بہت حد تک درست ہے۔ سوائے اس بات کے کہ میں ٹرک کے موجودہ ٹھکانے سے آگاہ ہوں۔ ابھی تو وہی دیر پہلے آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ ہمیں دو ٹوک اور واضح بات کرنی چاہیے۔ آپ کی اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا۔

”گو“ میں سن رہا ہوں۔ ”مہاراج نے کہا۔ ”جناب! یہ حقیقت ہے کہ مجھے تعاون کی ضرورت ہے اور آپ جیسے بازرع اور بہرہ مند شخص کا تعاون حاصل کر لینا میرے لیے بہت بڑی بات ہوگی لیکن یہ بات آپ بھی تسلیم کریں گے کہ اس دنیا میں کچھ بھی بے قیمت حاصل نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی حوالے سے کسی نہ کسی صورت میں اس کا ملکا پکا ہی پڑتا ہے۔ کم از کم میری جہاں کر دی کا پھر تو یہی ہے۔“

مہاراج مسکرایا۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا واسطہ ایک بیکھل اور حقیقت پسند شخص سے ہے۔ تم نے جو کماؤ اپنی بکدورت ہے لیکن کوئی بھی قانون پر کسی برس و دمن لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ عام لوگوں کی بھڑ میں کہیں نہیں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو کھسے پٹے اصولوں سے ہٹ کر چلتے ہیں۔ ایک بار پھر واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ہمیں اس دولت سے کوئی دلچسپی نہیں جو تم جنگ کی کسی قدیم حویلی سے نکال کر لائے ہو۔ یاں یہ بات تم کہہ سکتے ہو کہ۔“

”کچھ کہتے کہتے مہاراج رتن سنگھ ایک دم خاموش ہو گیا۔ لڑا تھا کہ بجھ گیا ہے مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میرا تجس

**لہو کا سکرٹ**

**محمود احمد مودی**

قیمت -/ ۱۵۰ ڈاک خرچ -/ ۲۰

**علی میاں سہیل کشنر عزیز لکھنؤ اردو بازار لاہور**

بڑھانے کے لیے اس نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑی ہو۔ میری سوالیہ نگاہیں مہاراج رتن کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ بالکل خالی نگاہوں سے اس حینہ کو دیکھ رہا تھا جس کا نام اس نے بنایا تھا اور جو میرے بازو سے لگی نیچی تھی۔ چند سینکڑے کے وقت سے وہ بولا۔ ”نوادرات سے ہماری دلچسپی بہت پرانی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق جو صندوق تم نے جنگ کی حویلی سے نکالے ہیں ان میں قدیم دور کے چند نوادرات بھی ہیں۔ ہم ان نوادرات پر اپنی رمال ضرور پکائیں گے کیونکہ اس کے بغیر ہم وہ نہیں نکلتے اگر تم نے ان نوادرات کو بیچا جاو اور وہ ہماری پسند کے مطابق بھی ہوں تو ہم ان کے پہلے خریدار ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دفعے کے بارے میں آپ کبھی کچھ جانتے ہیں۔“

”کافی کچھ تو نہیں لیکن توہی بہت جانکاری ہمیں حاصل ہے۔“

”یعنی آپ شہر ہیں کہ ان صندوقوں میں نوادرات دیکھ رہے ہیں؟“

”بالکل ہوتے چاہئیں۔ اگر کھدائی سے برآمد ہونے کے بعد وہ صندوق تمہارے پاس ہی ہیں اور انہیں کھولا نہیں گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ بہت سی نایاب اشیاء ان میں نہ پائی جائیں۔ اس ناطے سے چند قدیم جنگی ہتھیاروں کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ آج سے بیس چھتیس برس پہلے لندن کے ایک معروف مفت روزہ میں ان قدیم ہتھیاروں کے بارے میں ایک لمبا چوڑا نیچہ چھپا تھا۔ اس کے بعد دو ٹکڑے چوں میں میں اس سلسلے میں تفصیلات آئی تھیں۔ غالباً کچھ تصاویر دیکھیں

مجھے تھیں۔  
میرے اندر ایک دم تجسس کا دریا بر نکلا۔ "کس قسم کے اختیار تھے یہ؟"

مہاراج رتن سنگھ مسکراتا ہوا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آج شام جو وہ پورے کچین آڑ کے بھوانی میاں پہنچ رہے ہیں۔ ان سے تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ فی الحال تو ذرا باہر چلے ہیں۔ تمہیں اس جنگل کی سر کراتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک "کال بیل" کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ چند لمبے بعد دواڑے پر ایک باوردی ملازم نمودار ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مہاراج تھکاتے لمبے میں بولا۔ "ہری سنگھ! ہاتھ سے کھو ہمارے گھوڑے کے ساتھ ایک اور گھوڑا تیار کرے۔ ہم تھوڑی دیر میں باہر جا رہے ہیں۔"

باوردی ملازم سرٹھکا کر باہر نکل گیا۔ مہاراج نے مسکراتی نگاہوں سے میرے آبدہلو کو دیکھا اور بولا۔ "تم بڑا کے ساتھ میاں بیٹھو۔ ہم دس منٹ میں تیار ہو کر آتے ہیں۔"

وہ کھڑا ہونے کے بعد اور بھی بد وضع نظر آنے لگا تھا۔ توند مزید نمایاں ہو گئی تھی۔ پورا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تاہم وہ فریہ ہونے کے ساتھ توانا اور قوی بھی نظر آتا تھا۔ اس نے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے نیکر کے لاسٹک میں ڈالے اور اسے اوپر کی طرف کھینچ کر اپنی نصف توند صاحب لی۔ اس کے بعد مست چال چلا کرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی خود کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ نشست گاہ کی خواہناک تنہائی میں "بڑا" اور میں ایک دوپے کے پلوں میں بیٹھ رہ گئے۔ وہ بڑی بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ نسوانی کشش ان آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی لگاؤ کی بات کرے گی لیکن وہ "بہنی" کے بجائے "تنگ بولی" کی قائل تھی۔ زبان کو زحمت دینے کے بجائے اس نے اپنے جسم کو زبان بنایا اور اشتعال انگیز خاموشی سے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ مجھے ایسے بھونڈے پن کی توقع نہیں تھی۔ بالکل بازاری سا انداز تھا۔ پھر اس کی ہدایات ہی ایسی تھیں۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ کم وقت میں اسے زیادہ سے زیادہ "سکار کری" ڈھکائی ہے۔ ایک بقیہ تھی جو اس کی بانہوں میں سرایت کرنے کے بعد مجھ پر گری تھی۔ ایک ہی لمحے میں اس کتنے مشق نے اپنے سینے پر ان کا تمام تر گداز میرے پلو میں منتقل کر دیا۔ اس کے اڑھ سال ب سر تا پا دعوت تھی

اس دعوت کو ٹھکراتا مت دل گڑے کا کام تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے خود سے دور ہٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے دواڑے پر نازک سی دھک ہوئی۔ "میں، تم، ان۔" میں نے کہا۔

وہی مساج کرنے والی لڑکی اندر آئی۔ اب اس نے اپنے مختصر ترین لباس پر ایک ٹائل گاؤن پہن لیا تھا۔ اس کے ایک بازو پر کوئی لباس بھول رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں جم جم کرتے شکاری بوٹ تھے۔ اس نے بوٹ پڑی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ دم کے دواڑے پر رکھ دیے اور لباس لے کر اندر چلی گئی۔ چند لمبے بعد نکل کر مسکرا کر بولی۔ "بڑائی نس کا کتا ہے کہ آپ بھی لباس بدل لیں۔"

میں ابھی تک کان کے اسی بگلے جھٹکے لباس میں تھا جسے صبح غزالے نے دوبارہ اسڑی کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لباس گھڑ سواری اور جنگل نوروی کے لیے موزوں نہیں تھا۔ میں نے چند لمبے سوچنے کے بعد ہاتھ دم کا رخ کیا۔ کمرے کی طرح ہاتھ دم بھی بد سے جھانسا اور تھوڑی دیر میں آتا تھا کہ یہ ایک کٹن سال رست ہاؤس کا حصہ ہے۔ میں نے شکاری لباس پہن لیا۔ یہ میرے جسم پر بالکل پورا تھا۔ کبھی انیس بیس کا فرق بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں باہر نکلا تو شکاری بوٹ ہاتھوں میں لیے کھڑی تھی۔ "بیٹھے میں پناؤں۔" وہ بولی تو کمرے میں بیٹھے تقریبن کھینچاں آج تھیں۔

ایسے خوبصورت ہونٹوں سے ایسی شیریں آواز ہی برآمد ہونی چاہیے تھی۔ وہ میری خدمت پر کئی ہوئی تھی اور مجھے اپنی عاقبت شدید خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ راشد بن ارشد کو جسم واصل کرنے کے بعد میں نے جو دھواں دھار میں برس گزارا ان میں شراب کے ساتھ ساتھ عورت بھی میری زندگی میں در آئی تھی لیکن بعد میں میں نے اپنی پیاری بہن شستا کے پیار کے سامنے ہتھیار سپیکے اور خود کو قانون کے شہر کو کیا تو ان سب گناہوں سے بھی توبہ کر جو مجھ سے سرزد ہو چکے تھے۔ اب میری زندگی میں شراب کا دور دورہ چاہیں تھا اور عورت کے حوالے سے بھی میں اب تک ثابت قدم رہا تھا۔ مگر آج جو آفت مجھ سے چٹنی تھی وہ سرتاپا باؤدھی اور اپنے اندر ہر انسانی ارادے کو جلا کر خاک کر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھے کے بعد بوٹ اس کے ہاتھوں سے لینا چاہے لیکن وہ بڑی ادا سے پیچھے ہٹ گئی۔

"تمہیں جناب! اس داسی کے ہوتے ہوئے آپ یہ کتہ کیوں اٹھائیں گے؟" وہ قالین پر دوڑا تو پیچھے گئی اور مجھے بوٹ

پہنانے لگی۔

پانچ منٹ بعد میں اور مہاراج رتن سنگھ آف ٹائمل دو شاندار نازی گھوڑوں پر سوار اس کٹن سال رست ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے رست ہاؤس چھوڑنے سے پہلے میں نے غزالے کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ بھی یہ جان کر ششدر ہو گئی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ اس رست ہاؤس میں موجود ہے اور اسی کے کارندے ہمیں ٹیس سے نکال کر اس دیرانے میں لائے ہیں۔ میں نے غزالے کو بتایا تھا کہ میں مہاراج رتن سنگھ کے ساتھ باہر جا رہا ہوں اور دوسرے کے کھانے تک واپس آ جاؤں گا۔ غزالے نے حد فکر مند نظر آئی تھی۔ پہلے اس نے اصرار کیا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن پھر میرا موڈ دیکھ کر وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ دوسرے ایک بجے تک لوٹ آؤں گا۔

قریباً گیارہ بج چکے تھے سورج اب خاص بلندی پر چل رہا تھا۔ مگرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گھوڑوں کو کوئی چال چلاتے ہم رست ہاؤس سے قریب دو فرلانگ کی دوری پر آ گئے۔ میاں سے کھٹے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ریشیلے علاقے میں ان مجاز جھکاؤ درختوں کا وجود غنیمت تھا۔ ہم قریب ایک ٹھنڈا یونی لہو اور گھوڑے دوڑاتے رہے۔ آثار سے اندازہ ہوا تھا کہ میاں پر قسم کا شکار ملتا ہے۔ بڑے ایک درخت پر کئی پرانی چکان کی باقیات نظر آئیں۔ کئی درختوں پر گولیوں کے نشانات موجود تھے۔ ایک مقام پر ناگ پھٹی کے درخت تلے پختہ قبر بنی ہوئی تھی۔ قریب کچھ گرمی خیال آیا کہ یہ کوئی "شکار" حضرت "ہوں گے لیکن خود شکار ہو گئے ہوں گے اور انہیں سوہ خاک کر دیا گیا ہو گا یا پھر کوئی درویش ملک ہو گا۔ مگر مہاراج رتن سنگھ نے بتایا کہ یہ ایک خوبصورت مور کی قبر ہے۔ تین چار سال پہلے سریشوں کے موسم میں وہ کار پر سوار میاں سے گزر رہے تھے کہ یہ جنگلی مور کار کے وند اسکرین سے ٹکرا کر مر گیا تھا۔ مہاراج کی المیہ بھی ہمراہ تھیں۔ انہیں اس خوبصورت کی موت کا اتنا افسوس ہوا کہ زار و قطار روٹنے لگیں۔ نتیجے میں مہاراج نے شکار کار پر گرام منسٹن کر دیا اور اس مور کی تجیز و تحنیں میں لگ گئے۔ یہ بڑا ہی واقف کی ڈاگر تھی۔ اس قسم کی نجائے کتنی ڈاگر میں اس جنگل میں غمری ہوئی تھیں۔ مہاراج نے مجھے ایک تارو در درخت دکھایا۔ اس درخت پر ایک چھری تھی نصب تھی۔ سختی پر لٹا تھا۔ "یہ وہ درخت ہے جس پر پچان لگا کر بڑائی نس

مہاراج رتن سنگھ آف ٹائمل نے خطرناک جیتے "ہاگلے" کا شکار کیا تھا۔" مجھے وہ تاریخ اور وقت بھی دست تھا جب وہ نامستقل بیت مہاراج کی بندقت کا نشانہ بنا۔

میں یوں تو مہاراج کے ساتھ گھوم رہا تھا اور اس کی باتیں بھی سن رہا تھا لیکن میرا ذہن کسی اور ہی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں فرید کوٹ سے میاں راجستان کے صحرائی علاقے میں کیونکر پہنچا ہوں اور اب حالات مجھے کس رخ پر لے جا رہے ہیں۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا اور اس کے بعد جو کچھ مجھے غزالے نے بتایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فرید کوٹ میں غزالے کو شکار شکار کے پھیلنے سے نکالنے والا اور ہمیں فرید کوٹ سے راجستانی علاقے کی طرف لانے والا سامیں عالی ہی ہے۔ اس کام میں اس کے ساتھ اس کا چیلنا جانی شاہ بھی شریک تھا۔ انہوں نے کسی طرح ایک جیب حاصل کی تھی اور ہمیں بے ہوشی کی حالت میں اس میں ڈال کر فرید کوٹ سے روانہ ہو گئے تھے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کہاں جا رہے تھے اور کس کے پاس؟ جس جگہ جیب کو حادثہ پیش آیا وہاں سے کئی سمتوں میں سفر کیا جاسکتا تھا۔ ٹائمل، جو وہ پور "انجیر" لونی یا پھر اس سے آگے مارواڑ وغیرہ کو بھی منزل مقصود قرار دیا جاسکتا تھا۔ دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ سامیں عالی ہمیں وہاں کیوں لے جا رہا تھا؟ اس کے دو جوابات قریب قریب تھے پہلا تو یہ کہ وہ ہمیں صرف شکار شکار سے بچانے کے لیے یہاں لایا تھا۔ دوسرا ممکن تھا کہ اس علاقے میں سامیں کا کوئی خاص غرض موجود ہو اور اس کے ہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہو۔ دوسرا قیاس یہ تھا کہ سامیں عالی کچھ نہایت اہم معلومات تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور اس کو وہ جانتا تھا کہ وہ نرک ۲۲ مارچ کی شب گنڈارا پور گاؤں کے عشرت فارم سے غائب ہوا ہے راجستان کی طرف لایا گیا ہے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ نرک کے ٹھکانے سے بھی آگاہ ہو چکا ہو۔ اس صورت میں یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ فرید کوٹ سے سیکڑوں میل دور کیوں چلا آیا تھا۔ سامیں عالی میرے لیے ابھی تک ایک معنی بنا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ دیوانے سے دیوانہ ہے۔ یا فرزانہ، کبھی بھی تو یوں گستاخ کہ وہ اپنی منتقل سمجھ سے کچھ بھی نہیں کرتا اس کا ہر فعل ایک وجدانی کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حادثے کا شکار ہونے کے بعد سامیں عالی ہمارے ساتھ ہی جو پور پہنچا تھا اور ابھی تک وہیں پر تھا۔ میرے ساتھ اس کی آخری ملاقات کوئی تین روزہ پہلے ہوئی تھی۔



جنگل میں آوارہ گردی کے بعد ہم ایک بچے رست بازس واپس پہنچ گئے۔ بچہ تیار تھا۔ کھانے کے کمرے میں پہنچے تو ہمیں پاس سے اُٹتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے معدے میں اچھلی سی چھادی۔ غزال ابھی ابھی ڈانگ روم میں پہنچی تھی۔ اس نے نما کر لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لباس اسے رست ہاؤس ہی سے منیا گیا تھا۔ گلابی شلوار قمیص اور ہم رنگ دوپٹے میں وہ ٹھکری ٹھکری نظر آ رہی تھی لیکن اس کا سارا حسن اور نکھار ایک زبردست امتحان سے دو چار تھا۔ بٹا دیوی بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ یوں گستاخ کہ غزال کا چاند رشا کے سورج کے سامنے آ گیا ہے اور اچانک اپنی آب و تاب کھو بیٹھا ہے۔ کچھ ایسی ہی چکا چوند تھی بٹا رشا کے حسن میں کہ اس کے ارد گرد کی ہر شے دھندلا جاتی تھی مگر ایک بات اپنی جگہ حقیقت تھی 'چاند کا وہمیان' اس کی سادگی اور ٹھنڈک سورج کا نقیب نہیں ہوتی۔ سورج کتنے بھی ٹانیاک ہو اور کسی بھی موسم میں پٹکے اس کی طرف دیکھنا انھوں کے لیے زحمت ہو جائے۔

کھانے میں دیگر لوازمات کے علاوہ دلی سرخ کا کڑا ہی مگوٹ بھی تھا۔ اس خصوصی ڈش کا لطف دہلا کرنے کے لیے دی کی تمکین اتنی بھی موجود تھی۔ بھوک چکی ہوئی تھی۔ ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے دوران بٹا میرے ارد گرد ہی چکراتی رہی تھی۔ غزال اسے گاسے گاسے کن انھیں سے دیکھ لیتی تھی۔ انہی لمحات میں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مہاراج رتن سنگھ نے ابھی تک غزال کو اپنے نشانے سے بنایا نہیں ہے۔ غزال کو دیکھ کر اس کی بھوکی نگاہ میں ایک چمک سی نمودار ہو جاتی تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں میرے ارد گرد بٹا کی موجودگی بھی تو اسی سلسلے کی نشانی نہیں ہے۔ عین ممکن تھا کہ مہاراج رتن سنگھ 'بٹا' کے چمکنے دیکھ حسن سے میری آنکھیں چمکدھیا کر ایک بار پھر غزال کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہو۔ بہر طور ابھی اس مرحلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جو کچھ تھا پیش آمدہ سامانوں کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نشست گاہ میں بیٹھنے۔ غزال کھانے کی میزبانی سے واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔ شاید مہاراج رتن سنگھ کی نگاہوں کی چشم سے پچھا جاتی تھی۔

مہاراج نے کہا۔ "اب ہمیں واپس جو پور جانا ہوگا۔ تن شام کیپٹن آدے کے ہوائی جودھ پور سے آ رہا ہے اور ہمیں اس کے سواگت کے لیے ٹیرس میں موجود ہونا چاہیے۔ تم یہاں بالکل بے فکر ہو کر رہو۔ حقیق خاں ہمیں ہے۔ کسی حکم

کی ضرورت ہو تو اسے بتاؤ۔ ہمارا خیال ہے کہ کل تک شہ عاصم واپس چلا جائے گا۔ اس کے جاتے ہی ہم اور کیپٹن ہوائی میاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ٹرک کے سلسلے میں تفصیلی بات ہوگی۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں اور وہ بولا۔ "کیا خیال ہے؟ کیا ہم اس سلسلے میں کل تک کی تاخیر برداشت کر سکتے ہیں؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے انجان بہتے ہوئے پوچھا۔

"ٹرک کے سلسلے میں۔" وہ بولا۔

میں نے کش لیتے ہوئے کہا۔ "میرا بانی نس ایچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت ٹرک کے بارے میں میں بھی دی کچھ جانہ ہوں جو آپ جانتے ہیں۔ میرے ساتھی ٹرک کو گنڈارا پور گاؤں لے گئے تھے وہاں سے انھوں نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا اور گنڈارا پور آئے کو کہا۔ جب میں گنڈارا پور پہنچا تو ٹرک وہاں موجود نہیں تھا۔"

"اور تمہارے ساتھی؟" مہاراج رتن نے پوچھا۔

"ان میں سے ایک تو ٹرک کے ساتھ ہے اور دوسرا فرکوت میں۔"

مہاراج کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ میرے موقف کو تو بے فائدہ سمجھ رہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں طویل بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس وقت کم تھا۔ کہنے لگا۔ "صرف یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ایک دن کی تاخیر سے کوئی زیاد فرق تو نہیں پڑے گا؟"

میں نے کہا۔ "میں اس وقت کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں اندازے ہی لگائے جاسکتے ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ جہاں اتنے روز گزر گئے ہیں ایک روز اور گزر جائے تو کچھ ہوگا۔"

مہاراج معنی خیز لہجے میں بولا۔ "یہ ایک روز کی تاخیر ہم اس لیے ہو رہی ہے کہ ہم شہ عاصم کی طرف سے فارغ ہو چاہتے ہیں۔ وہ جب تک یہاں ہے، تمہاری آزدادی اور جلا فخرے میں رہے گی۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ یہ صورت حال برقرار رہے۔ تمہاری اور شیخ عاصم کی ساری کٹھنیں معلوم ہو چکی ہیں۔ تمہارے مقتول شیخ راشد بن راشد کا نام بھی ہوا ہے۔ ہم نے بڑی دلچسپی اور تحسین کمائی ہے۔ یہ۔"

اتنے میں دردناکے پر دستک ہوئی۔ "میں کم ان۔"

مہاراج نے کہا۔

خوبو حقیق خاں اندر داخل ہوا اور ادب سے بولا۔

"میرا بانی نس ایچ بات تو یہ ہے۔"

مہاراج رتن سنگھ مجھے گڈائی کتا ہوا باہر نکل گیا۔ اب ایک بار پھر میں اور بٹا کمرے میں تھا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر ہم دونوں کو بار بار تنہائی فراہم کی جا رہی ہے۔

"آپ کی سیر کیسی رہی؟" بٹا نے بے حد شیریں لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک رہی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"رام رام" اتنی لمبی میرا اور ایسا مختصر جواب۔ "وہ شرارت سے مسکرائی۔"

"میں لمبی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے روک لہجے میں کہا۔

"آپ کو بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ کی تو آنکھیں بولی ہیں۔" اس نے مسک لگایا اور ایک دم نزدیک آگئی۔ غالباً اپنے محرکار شہاب ربیت بھوسا تھا اسے۔ یوں بے دھڑک تیردہی چلا آتا ہے جس کا نشانہ بے خطا ہو اور اپنے بارے میں اس کے اندازے کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ اس کی دعوت ٹھکرانے کے لیے پھر کا دل اور سندھ کا عرف وادہ تھا اور میں ایسے دل اور ایسے عرف کا دعویٰ ار نہیں تھا۔ لہذا حالات بگڑنے سے بہت پہلے میں نے اس خوبصورت بلا کی پیش قدمی روکی اور کمرے سے نکل آیا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" وہ اپنی ہوتی آواز میں بولی۔

"اپنے کمرے میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

کمرے میں پہنچا تو غزال بیڈ پر دراز تھی۔ اس نے اپنا ایک بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے بغور اس کی سانسوں کا زیر و بم دیکھا۔ لگتا تھا سورہی ہے میں نے اسے پکارا۔ یہ آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ اسے سوتے سے جگا دیتی اور نہ ہی اتنی مدھم تھی کہ وہ سن نہ سکتی۔ وہ بے حرکت پڑی رہی۔ میں اس کے کتکے تلے ایک چھوٹا سا اُبھار محسوس کر سکتا تھا۔ یہ وہ پٹسل تھا جو آج صبح میں نے اسے دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وقت پڑنے پر وہ پٹسل چلا سکتی ہے انہیں۔ بہر حال تحفظ کا ایک احساس تو اسے میرا تھا تھا۔

میں بھی ٹیلوے کی غرض سے صوفے پر دراز ہو گیا۔ ستانے کے لیے لینا تھا کہ فریڈ آئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو شام کے چوتھے والے تھے پانچ نہیں۔ مگر نیند رت کٹنے کا نتیجہ کی یا اس کا زخمی لٹی کا جو میں آج میں کی گھاس لی گیا تھا۔ زالہ مجھ سے پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی اور آئینے کے سامنے مڑکی بال سنوار رہی تھی۔ جاگنے کے بعد میں خود کو تازہ دم

اور ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔ ایک عجیب رنگ سی رگ و پے میں آرتی ہوئی تھی۔ کمرے سے نکل کر میں برآمدے میں پہنچا۔ سورج اپنی نمازت کو کر مغرب میں غوطہ زن تھا۔ آفتاب پر شمع کناروں والے سفید پابل چکرا رہے تھے ہوا میں نامعلوم نباتات کی مہک تھی اور وہ نازکی بھی جو آلودگی سے پاک فضاؤں کا خاصہ ہوتی ہے۔ میں نے منہ کھول کر چند کمرے سانس لیے اور اس کیاری کے قریب جا کھڑا ہوا جس میں سفید اور سیاہ گلاب کی چھوٹی بڑی کھلیاں مہک رہی تھیں۔ وہ شاندار گاڑی اب پورج میں موجود نہیں تھی جس میں مہاراج رتن سنگھ اس رست ہاؤس میں پہنچا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ واپس جو پور جا چکا ہے۔ میں نے ڈوبتے سورج پر نگاہ ڈالی اور یہ اندازہ لگائے کہ کی کوشش کرنے لگا کہ جو پور کس رخ پر واقع ہے۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا کہ کتنے گھوڑے ہیں۔ بہر حال وہ سمت بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ان کا رخ جنوب سے شمال کی طرف تھا۔ یعنی آج دوپہر جس جنگل میں گھومتے رہے تھے وہ اس جانب سے نمودار ہوئے تھے اور جو پور کی طرف جا رہے تھے پھر گھوڑوں کی ٹاپوں میں کسی انجن کا شور بھی شامل ہو گیا۔ میں دوڑ کر رست ہاؤس سے باہر نکلا اور ایک چھوٹے سے نیلے پر کھڑا ہو گیا۔ جنگل کی جانب سے مجھے گرد آؤٹی دکھائی دی۔ یقیناً یہ کوئی جیب تھی۔ یہ جیب گھوڑوں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ پیچھے تھی۔ گھوڑے تو میری نگاہوں سے اوچھل ہو چکے تھے لیکن چند لمحوں بعد میں نے سیاہ جیب کو دیکھ لیا۔ وہ ناہوار راستے پر تیزی سے اچھلتی کودتی جنوب کی سمت بڑھ رہی تھی۔ ایک ایک فائر ہوا اور فضا میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ شکاری ہندوؤں کا فائر نہیں تھا اور نہ ہی کسی شکاری نے کیا تھا۔ یہ کوئی اور پکر لگتا تھا۔ فائر سن کر رست ہاؤس کے ملازمین بھی بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ان میں حقیق خاں سب سے آگے تھا۔ عاتقا بدھت پرست اُترا تھا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید سو رہا تھا۔

"جناب! یہ کیسی آوازیں ہیں؟" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میرے جواب دینے سے قبل ہی ایک بار پھر خود کار رائل کی "ترتر" سے فضا گونج اُٹھی۔ اس مرتبہ مسلسل سات آٹھ فائر کیے گئے تھے اور یہ فائر دو مختلف اطراف سے ہوئے تھے۔ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جیب گھوڑوں



کے تعاقب میں ہے اور تعاقب کرنے والے اور بھاگنے والے ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ انجن کا شور اب معدوم ہو چکا تھا لیکن گرد کا بادل صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ گرد ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہری گئی تھی۔ ہم ٹھہر رہے کہ شاید مزید فائر ہوں لیکن جنگل پہلے کی طرح خاموش تھا۔ انسانوں کا پر کیا ہوا شور محسوس نہیں کیا تھا۔ اب ایک بار پھر صرف فطرت ہی دکھائی اور سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”آؤ متیق خاں! دیکھیں یہ کیا چکر ہے؟“ وہ پہلے تو متذبذب ہوا پھر میرے ساتھ جیب کی طرف بڑھا۔ یہ وہ جیب تھی جس میں علی الصبح یہاں پہنچے تھے دو مسلح افراد سمیت ہم تیزی سے جیب میں داخل ہوئے اور جنگل کی طرف بڑھے۔ متیق ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ قریباً ایک میل آگے جانے کے بعد اچانک ہمیں روک جانا پڑا۔ ایک تیز فیز منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک بانٹا ہوا گھوڑا خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی چند یادوری گاڑوں کے ہاتھوں دو غریب صورت افراد کی زبردست ٹھکانا کی ہو رہی تھی۔ ان پر راتھوں کے بٹ برساتے جا رہے تھے اور وہ جان بخشی کی التجائیں کر رہے تھے۔ پھر میں نے وہ سیاہ جیب دیکھی جس کی جھٹک ٹھوڑی دیر پہلے درختوں میں نظر آئی تھی۔ جیب کے قریب ایک نہایت بازمب خوش پوش شخص کھڑا تھا۔ بت سرخ و سپید رنگت براؤنش بال، براؤنش مونچھیں اور گرمی وادی آنکھیں، اس کے ایک ہاتھ میں دھوپ کا چترہ تھا اور وہ جیب کے بونٹ پر کئی نکلے اطمینان سے کھڑا تھا۔ یقیناً چند لمحوں پہلے تک وہ گھڑ سواروں کی پٹائی ہوتے دیکھ رہا تھا لیکن اب اس کی ساری توجہ ہماری طرف تھی۔ بڑے غمٹ سے چٹا ہوا وہ ہمارے قریب پہنچا۔ متیق خاں نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔ ”یہی کیپٹن آکرے بھائی ہیں۔“

پھر وہ جلدی سے نیچے اترتا اور ماتھے پر ہاتھ لے جا کر کیپٹن بھائی کو سلام کیا۔ کیپٹن بھائی بھی اسے دیکھ کر قدو سے حیران نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”تم رتن سنگھ صاحب کے ملازم ہو؟“

متیق خاں نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں، میرا نام متیق ہے۔“

اس دوران گھڑ سواروں سے مارچ کرتے والے انہیں گھرو جانوروں کی طرح ٹھہرتے ہوئے کیپٹن آکرے بھائی کے قدموں میں لے آئے وہ دونوں لولہ لولہ تھے اور قہر قہر کانپ رہے تھے۔

”یہ کون لوگ ہیں راجا صاحب۔“ متیق خاں نے کیپٹن بھائی کو راجا کہہ کر مخاطب کیا۔

”ابھی سارا چا چل جاتا ہے۔“ کیپٹن بھائی نے بازو بے آواز میں کہا۔ پھر ہماری جیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟“

متیق خاں نے کہا۔ ”میںاں قریب ہی ایک رست ہاؤس ہے جناب۔ بڑائی نس اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔“

کیپٹن بھائی کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ ”اویس، اتنی ری مہر۔ میں رتن صاحب کے ساتھ ایک دفعہ اس رست ہاؤس میں ٹھہر چکا ہوں۔ یہاں سے نکلے فاصلے پر ہے وہ جگہ۔“

متیق خاں نے بچوں کے بل کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ سامنے جھنڈی کی دوسری طرف پانی کا ٹینک نظر آ رہا ہے۔ وہ رست ہاؤس کی پھٹت ہے۔“

کیپٹن بھائی نے متیق خاں کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور رست ہاؤس کے آثار دیکھ لیے۔ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے اپنے یادوری گاڑوں کو حکم دیا۔ ”چلو ان دونوں کتوں کو جیب میں ڈالو۔ ان سے رست ہاؤس میں چل کر بات کریں گے۔“

”وہیل ٹو۔“ راتھوں والے یادوری ملازموں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور دو بٹکے دساتیوں کو اٹھا اٹھا کر سیاہ جیب کے عقبی حصے میں بٹھوایا۔ بعد ازاں پکڑیوں وغیرہ سے ان کی ٹھکیں بھی کس دی گئیں۔ اسی جیب کی اگلی نشست پر ایک موٹا تازہ میلا لٹاگ بھی موجود تھا اور دھیمی آواز میں مسلسل غرا رہا تھا۔ رست پر تڑپا ہوا گھوڑا اب راہی عدم ہو چکا تھا۔ اس کی ایک جھپکی ٹانگ اور پیٹ میں گولیاں گوی تھیں۔ ایک دوسرا گھوڑا یوں ہی ادھر ادھر پکڑا رہا تھا۔ کیپٹن بھائی کے آدمیوں نے اسے بھی گھیر کر پکڑ لیا۔ اس دوران ایک اور شاندار گاڑی بھی موٹے پر پہنچ گئی۔ یہ کسی باطلو کیپٹنی اور ماڈل کی گاڑی تھی۔ جیب کی طرح اس گاڑی پر بھی کیپٹن بھائی کے مصاحب اور محافظ سوار تھے۔ انہیں گھوڑوں کی دوڑ میں یہ گاڑی پیچھے رہ گئی تھی۔ کیپٹن بھائی نے کار میں سوار ایک بٹے کئے جلاوطن شخص سے کہا۔ ”آؤ وہ حرام کا حکم تیسرا بندہ بھاگ گیا ہے۔ میرا خیال ہے ان درختوں میں کہیں چھپا ہوگا۔ اندھا میرا پھیلنے سے پہلے پہلے تلاش کرو۔ وہاں سامنے ایک رست ہاؤس ہے ہم وہاں جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر تم بھی وہاں آ جاؤ۔“

جس شخص کو کاکڑ کہا گیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ

مستعدی سے سر جھکا یا اور فوجی انداز میں گھوم کر کاری جانب بڑھ گیا۔ کیپٹن بھائی جیب میں بیٹھ گیا۔ میں اور متیق خاں اپنی جیب میں سوار ہو گئے۔

پندرہ منٹ بعد ہم رست ہاؤس کی پڑاسا نشست گاہ میں کیپٹن بھائی کے سامنے کھڑے تھے۔ کیپٹن بھائی شاہانہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا اور اس کے مسلح باڈی گارڈز دائیں بائیں کھڑے تھے۔

متیق خاں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”جناب! ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ آپ آج شام جو پور پہنچنے والے ہیں۔“ ”لیکن اطلاع ملی تھی۔“ کیپٹن آکرے بھائی نے کہا۔ ”لیکن راستے میں ایک مسئلہ پیش آگیا تھا۔“ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں اٹھارہ خیال کرنے والا ہے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اپنا ہماری بھگڑ ہاؤس کی شیشے کی نازک پٹائی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”رتن صاحب کہاں ہیں؟“

متیق خاں نے کہا۔ ”دوسرے کتے تو ہمیں تھے لیکن پھر جو پور پہنچ گئے۔ وہ آپ کو خود ریسو کرنا چاہتے تھے۔“ ”جو پور کا فاصلہ یہاں سے کتنا ہے؟“ کیپٹن بھائی نے پوچھا۔

”چھتیس چھتیس میل کے قریب ہے۔“ کیپٹن بھائی کی سرخ و سپید چٹائی پر تھڑکی سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ ”چند لمحوں کے وقفے سے بولا۔“ ”تم کسی بندے کو فوراً جو پور روانہ کرو۔ رتن صاحب کو سندھیا دو کہ وہ یہاں چلے آئیں۔ بلکہ ٹھہرے میں تمہیں ان کے لیے وقفہ لکھ دیتا ہوں۔“

اس نے قہقہے کی ”چھٹیس پاٹ“ میں ہاتھ ڈال کر ایک خوبصورت گولڈن قلم برآمد کیا۔ متیق خاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک رائٹنگ پیڈ تپائی پر رکھ دیا۔ کیپٹن بھائی نے اٹھریڑی میں چند سطروں لکھیں اور کانڈے تر کے متیق خاں کو سوپ دیا۔ ”میں نے اس میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔“ وہ فوجی لب و لہجے میں بولا۔ ”تم فوراً اسے جو پور پہنچاؤ۔ اگر تمہاری جیب ٹھیک ہے تو لے جاؤ۔ ورنہ میں اپنے ڈرائیور کو کہہ دیتا ہوں۔“

”آپ بالکل بے فکر رہیں۔ جناب۔“ متیق خاں نے کہا۔ ”میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔“

رست ہاؤس کے ایک دوسرے کمرے میں کرام چاہوا تھا۔ دونوں گرفتار شدہ افراد کو بے دردی سے مارا چٹا بارہا تھا۔ وہ ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح چلا رہے تھے

اور رحم کی درخواستیں کر رہے تھے۔ ٹھوڑی دیر بعد کیپٹن بھائی بھی اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو کس جرم میں پکڑا گیا تھا اور اب کیوں تشدد کی چٹکی نہیں پڑا جا رہا تھا۔

میں کیپٹن منٹ بعد متیق خاں نے مجھے آگے تھپا کر وہ کیپٹن راجا بھائی صاحب کا پیغام لے کر خود بڑائی نس کے پاس جا رہا ہے۔ امید ہے کہ صبح تک واپسی ہو جائے گی۔ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں بلا تکلف ملازمین سے کہہ سکتا ہوں۔ ابھی میں اور متیق خاں باتیں ہی کر رہے تھے کہ کیپٹن آکرے بھائی کی جیب کے ہمراہ آنے والی نامعلوم ماڈل کی کار بھی رست ہاؤس پہنچ گئی۔ کار میں کیپٹن بھائی کے محافظ تھے۔ عقب میں وہ گھوڑا چلا آ رہا تھا جس کا بد نصیب سوار ایک قریبی کمرے میں ماں بھن کی غلط گالیاں سن رہا تھا اور گدھے کی طرح مار کھا رہا تھا۔ اس گھوڑے کو کیپٹن بھائی کا ایک یادوری ملازم لے کر آیا تھا۔ جلاوطن شخص نے کیپٹن بھائی نے کاکڑ کہا تھا گاڑی سے اتر آئے۔ چند لمحوں کے ساتھ میں سے باتیں کرتا رہا پھر مجھ پر ایک نگاہ انداز ڈالتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا جہاں تشدد کا بازار گرم تھا۔ جب کاکڑ کمرے میں داخل ہوا، ”میری نگاہ اُدھ لگے دو اڑے سے کمرے میں گئی۔ میں نے ایک دیوانی کو سر تاپا پر بند دیکھا۔ اس کے دونوں بازو موڑ کر اسے زبردستی فرش پر لٹایا جا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ بند ہو گیا اور یہ شرمناک منظر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

متیق خاں نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے توقع ہے کہ آپ اس معاملے سے الگ تھلگ رہیں گے۔ یہ بندے جو پکڑے گئے ہیں، عادی جرائم پیشہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ راجا صاحب نے انہیں کوئی عظیم واردات کرتے دیکھا ہے۔ بہر حال صبح تک ساری بات واضح ہو جائے گی۔ بڑائی نس بھی آ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ کوئی خاص معاملہ ہوگا۔“

اپنی رانت میں مجھے سمجھانے بھانے کے بعد وہ جیب پر جو پور روانہ ہو گیا۔ تاہم جاتے جاتے وہ اپنے آدمیوں کو پوری طرح چھس کر گیا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ میری گھڑان، انھوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہر گھڑی مجھے حصار میں لے ہوئے ہیں۔ ایک طرح سے اس رست ہاؤس میں میری حیثیت آزاد قیدی کی تھی۔ ایک طرف مجھے اپنی حفاظت کے لیے ہٹل فراہم کر دیا گیا تھا اور دوسری طرف خود کار راتھوں والے افراد میرے ارد گرد

تعبیات کو لیے گئے تھے۔

○☆☆○

وہ رات میں نے غزالہ کے ساتھ رست ہاؤس کے اسی ہوا دار کمرے میں گزار دی۔ اس کمرے کو اپنے قیام کے قابل بنانے کے لیے ہم نے اس میں دو تہیلیاں کیں۔ ایک تو اس میں دو سر ایئر لکوا یا جس پر مجھے سونا تھا۔ دوسرے وہ تصویر دیوار سے اتار دی جس میں گرسے ہاؤسنگٹوں کی مدد سے شکار کا ایک وحشت ناک منظر دکھایا گیا تھا تاہم یہ تصویر اتارنے کے باوجود ماحول کی وحشت ناک کم نہیں ہوئی۔ کیپٹن بھوانی کے خوفناک بلند آواز گنتے کی غزا نہیں رست ہاؤس کے برآمدے میں گونجی رہیں اور ان غزاؤں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی غزائے اور کرتے رہتے رہے جو ایک قریبی کمرے میں گرفتار شدگان پر عرصہ حیات تک کر رہے تھے۔ فوج کے بعد دساتیوں کی بچ و بکا بند ہو گئی تھی اور میں نے سمجھا تھا کہ شاید صبح تک گئے لیکن ان کی جان بچوٹ گئی ہے لیکن رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے پھر مارپیٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کھڑکی میں سے ایک شخص کو دیکھا جو کسی درخت کی ایک موٹی شاخ کو خنجر سے تراش کر ڈنڈے کی شکل دے رہا تھا۔ یقیناً یہ اہتمام بھی ایذا رسانی کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ غزالہ بے حد سہمی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے لوبان دساتیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اب وہ ان کی چیخ دیکھ کر سن رہی تھی اور صرف چیخ دیکھ رہی تھیں مارپیٹ کی آوازیں اور گالی گلوں بھی اس کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے تمام کھڑکیاں اور دونوں دروازے بند کر دیے، مگر آوازیں بدستور ہماری ساعت تک راست بناتی رہیں۔ آخر غزالہ سننائی۔ ”آپ ان سے جا کر کہہ نہیں سکتے کہ یہ مارپیٹ بند کر دیں۔ وہ پہلے ہی زخمی ہیں۔ کیا اب انہیں جان سے مار ڈالیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہم اس معاملے میں بالکل بے خبر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ واقعی قصور وار ہوں۔“  
وہ بولی۔ ”قصور دار ہیں تو انہیں پولیس میں دے دیں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے اس طرح تندر دکر نہ لگے۔“  
میں نے کہا۔ ”پولیس بھی انہیں کرسی تو چیل نہیں کرے گی۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اس سے بھی ہولناک ہے۔ غریب بے سارا آدمی ہر جگہ پتا ہے۔“  
”تو کیا ہم اس طرح خاموش بیٹھے رہیں گے؟“  
”مجبوری ہے۔ کم از کم مہاراج رتن سنگھ کے آنے تک خاموشی رہنا ہوگا۔ عیش خاں مجھ سے خاص طور پر کہہ کر

کیا ہے کہ ہم اس پکرے دور ہیں۔“

اتنے میں ایک دستانہ دلہنڈا انداز میں چنبا۔ اس کی آواز بند دوہام کی رکاوٹیں عبور کرتی تھی۔ کچھ بچے یوں لگا کہ انسان کے بجائے کوئی ایسا جانور چنبا ہے جسے بے حد کند پھری سے آہستہ آہستہ ذبح کیا جا رہا ہے۔  
میرے لیے اس نوع کی آوازیں نئی نہیں تھیں لیکن غزالہ کے لیے یہ سب کچھ ہدایت سے باہر تھا۔ وہ ان آوازوں سے بچھا چھڑانے کے لیے بھاگ کر ہاتھ روم میں گھس گئی اور اندر سے کٹدی چڑھائی۔ کانی در بعد وہ باہر آئی تو اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ تھیں لیکن گرجنے برسے اور رونے پینے والی صداؤں کا سلسلہ بنوڑ جاری تھا۔ کمرے میں ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ میں نے اسے لے لیا اور آواز پوری کی پوری بھول دی۔ بند کمرے کے اندر ایک انٹرن گانا زور شور سے بجنے لگا۔

بول میری تقدیر میں کیا ہے، میرے ہم سفر یہ تو بتا جیون کے دو پہلو ہیں ہر پالی اور راستہ کبھی کبھی شور بھی سکون کا باعث ہوتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کے شور میں غزالہ کو ادھم سی آنے لگی۔ پہلے وہ ہم دروازہ ہوئی پھر در بندہ منٹ بعد سو گئی۔ میں بھی دوسرے بہتر دروازہ ہو گیا۔ شاید نیند آتی جاتی لیکن ایک چھوٹے سے دانے نے یہ امکان بالکل محسوس کر دیا۔ ڈھائی تین بجے کے گک بھگ مجھے رست ہاؤس کی عقبی جانب کچھ آگشیں سنائی دیں۔ میں دبے پاؤں باہر نکلا۔ عقب میں چند خود رو جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دو ٹیپ لائن کی مدد سے اس جگہ کو روشن رکھا گیا تھا۔ میں نے تین افراد کو بھاگ کر درختوں میں دوپوش ہوتے دیکھا۔ وہ خاص انداز کی چٹانیاں بازو سے ہوتے تھے۔ ان چٹائیوں میں خاستری رنگ کی ایک بچی بست نمایاں تھی۔ میرے علاوہ دوسرے آدمیوں نے بھی ان افراد کو درختوں کی طرف لپکتے دیکھ لیا تھا۔ ایک پسرہ ار نے چڑھتی سے اپنی بندن سیدھی کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ نشانہ لیتا، نوادہ او جھل ہو گئے تھے۔ دونوں پسرہ ار اضطرابی طور پر ان کے پیچھے بھاگے لیکن پندرہ تین قدم بھاگ کر ٹوک گئے۔ وہ کچھ دیر آپس میں بائیں کرتے رہے ایک پسرہ ار کا آواز ہوا سا فقو میرے کانوں میں پڑا۔ ”ان غیرت مندوں کا انتقام ہم اب ہی کرنا ہی پڑے گا۔“

صورت حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی پانا پکڑے اور راہ فرار اختیار کرنے والوں سے، پہلے بھی پسرہ اروں واسطے پڑا رہا ہے۔

میں واقعی جانتا چاہتا تھا کہ سائیں عالی مجھے فرید کوٹ سے اٹھا کر راجستان کی چٹانوں دھوپ اور ریشمی آنکھوں میں کیوں لے آیا ہے۔

مہاراج رتن سنگھ نے کہا۔ ”یہ سائیں عالی ہمیں کیپٹن راجا آر کے بھوانی صاحب کے پاس جودھ پور لے جا رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی کا شمار سائیں عالی کے مریدوں میں ہوتا ہے اور سائیں عالی چار پانچ سال پہلے بھی یہاں کیپٹن بھوانی کے پاس آچکا ہے۔ بلکہ کیپٹن بھوانی خود ہی اسے بھینے سے لے کر آیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک جہاز چارڑز کیا گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کیپٹن بھوانی کے پتا ”بڑے راجا صاحب“ بہتر مرگ رہے۔“

یہ اطلاع میرے لیے انکشاف انگیز تھی کہ سائیں عالی مجھے اور غزالہ کو شکر شکر کے چنگل سے نکالنے کے بعد شمالی راجستان کے ایک نہایت بااثر شخص کے پاس لے جا رہا تھا۔ میں نے مہاراج سے پوچھا۔ ”لیکن کیپٹن صاحب کو کیسے پتا چلا کہ سائیں عالی یہاں آپ کے پاس موجود ہے۔ جواب میں مہاراج رتن سنگھ نے جو کچھ بتایا اس سے ساری صورت حال واضح ہو گئی اور یہ بھی پتا چل گیا کہ کل پکڑے جانے والے دونوں دساتیوں نے کیا جرم کیا ہے۔

دراصل جودھ پور میں کیپٹن بھوانی کو ایک ملازم کی زبانی اطلاع مل گئی تھی کہ سائیں عالی اپنے تین ہمراہیوں کے ساتھ چند روز پہلے فرید کوٹ سے جودھ پور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ اتنے دن گزرے مگر جودھ پور سے فرید کوٹ ”فانٹلا“ فیروز پور اور امرتسر تک دوڑائے لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ اس سلسلے میں سخت پریشان تھا۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو چکی تھی کہ قاتل احرام شہر چند روز پہلے فرید کوٹ سے جودھ پور جانے کے لیے فلاں نمبر جیسے پتے تھے۔ یہ جیسے سائیں کے ایک باری عقیدت مند کی تھی اور وہ باری بھی حیران تھا کہ جیسے اور شہر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ کیپٹن بھوانی نے سمجھنے سے پتا کرایا۔ معلوم ہوا کہ کچھ روز پہلے فرید کوٹ سے دو افراد آئے تھے۔ وہ سائیں عالی کی خدمت گار جاہی شاہ کے جاننے والے تھے۔ وہ سائیں عالی اور جاہی شاہ کو کچھ دنوں کے لیے فرید کوٹ لے گئے ہیں۔

اس دوران کیپٹن آر کے بھوانی کو مہاراج رتن کی طرف سے ٹائمل اسٹیٹ آنے کا پیغام ملا اور کیپٹن بھوانی مہاراج رتن سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک دیران

مہاراج رتن سنگھ اپنے چار عدد محافظوں اور ایک ڈرائیور کے ساتھ علی الصبح رست ہاؤس پہنچ گیا۔ عیش خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ رانی پریم بھی تھی۔ پریم مہاراج کی بیٹی تھی۔ دیکھنے میں کوئی سیدھی سادی کاٹ گرل نظر آتی تھی۔ ذوق برق لباس اور ہماری بھر کم نمونوں نے اس کی مصوویت کو بڑی طرح مجموع کر رکھا تھا۔ وہ بے حد خاموش طبع تھی۔ اس کے ساتھ ایک گول منڈل سا چار پانچ سال بچہ بھی تھا۔ بچے نے رانی کی انگلی تمام رکھی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ رانی کا سوتا بیٹا تھا۔ اس بچے کے تین بہن بھائی اور بھی تھے جو ”جو پور“ والے محل میں تھے۔

مہاراج رتن سنگھ اور کیپٹن آر کے بھوانی کے درمیان ایک علیحدہ کمرے میں طویل میٹنگ ہوئی۔ پھر وہ لوگ اس عقوت خانے میں چلے گئے جہاں کل رات گئے تک دونوں دساتیوں کی خاطر تواضع کی جاتی رہی تھی۔ پندرہ تین منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور دونوں افراد کو باہر لایا گیا۔ ان کے جیسوں پر جگہ جگہ چروں کے نشان تھے اور بے چاروں کے لیے چٹانہ دشوار ہو رہا تھا۔ ان میں ایک آدمی عمر تھا اور دوسرے کی عمر پچیس تھیں کے درمیان تھی۔ برآمدے میں انہیں کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ مہاراج رتن سنگھ کے ساتھ آئے ہوئے افراد نے ان کی مرہم پٹی کی اور درد کش گولیاں دیں۔ مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کا رویہ بھی اب ان دونوں کے ساتھ نرم تھا۔ میں نے سوچا شاید انہوں نے کوئی اقبالی بیان دے دیا ہے یا پھر یہ لوگ کسی حوالے سے مہاراج کے شناسا نکل آئے ہیں۔

میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مہاراج رتن سنگھ نے مجھے ایک جانب کھڑے دیکھا تو میری طرف آگیا۔ کہنے لگا۔ ”ہمارا خیال ہے کہ تمہارا ایک معاف تو مل ہو گیا ہے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں پڑتی تھی؟“  
مہاراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کتا ہے کہ تم اس ملک نما شخص سے ناواقف ہو جو جنہیں راجستان میں لے کر آیا ہے اور یہ بھی نہیں جانتے ہو کہ وہ جنہیں یہاں کیوں لایا ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے احماد سے جواب دیا۔  
”اس کا نام سائیں عالی ہے اور وہ بھینکے کا رہنے والا ہے۔“ مہاراج رتن نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”اور یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ جنہیں اس طرف کیوں لایا تھا۔“  
میری سوالیہ نگاہیں مہاراج کے چہرے پر جمی تھیں۔

مقام پر انیس ایک جب نظر آئی۔ یہ جیب اپنے پہلو کے بل رست میں دھکی ہوئی تھی اور چند دھاتی اسے رستے وغیرہ باندھ کر کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیپٹن بھوانی اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ کر دھاتی ہتکے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر ہجاک نکلے۔ کیپٹن بھوانی کی نگاہ سبز جیب کی نمبر پلٹ پر پڑی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ وہی جیب ہے جس کے ذریعے چند دن پہلے سائیں عالی جو وہ پورے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا کہ مفرد گھڑ سواروں کا تعاقب کیا جائے ڈرائیور نے جب گھوڑوں کے تعاقب میں دوڑائی۔ یہ دشوار گزار علاقہ تھا۔ کہیں ریتیلے ٹیلے تھے اور کہیں درختوں کے جھنڈ راستہ مسدود کیے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال مڑ سواروں کے لیے سازگار تھی۔ بہر طور کیپٹن بھوانی کا ڈرائیور بھی اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے بہت نہیں ہادی اور گھوڑوں کا چھپا چھاری رکھا۔ دو گھڑ سوار تو کسی اور جانب نکل گئے لیکن باقی تین کو کیپٹن بھوانی کے ڈرائیور نے جالیا۔ گھوڑوں اور چوہوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو گیا تو گھڑ سواروں کو وارننگ دینے کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی۔ جواب میں انہوں نے بھی ہوائی فائرنگ کر کے ہتایا کہ وہ مسلح ہیں۔ آخر یہ دوڑ اس مقام تک پہنچی جہاں ایک شیلے کے دامن میں مہاراج رتن سنگھ کا رست ہاؤس واقع تھا۔ کیپٹن بھوانی جانتا تھا کہ گھڑ سوار ان درختوں میں داخل ہو گئے تو ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس نے "سیدھی فائرنگ" کا حکم دیا۔ جواب میں گھڑ سواروں نے بھی اپنی دھکی ساخت کی رانقل سے چند فائرنگ اس فائرنگ میں ایک گھوڑا شدید زخمی ہو کر گر گیا۔ اس کے سوار کو بچانے کے لیے ایک دوسرے گھڑ سوار نے اپنا گھوڑا واپس موڑ لیا۔ اس دوران جب سربراہ پہنچ گئی اور کیپٹن بھوانی کے گارڈز نے دونوں دھاتیوں کو گرفتار کر لیا۔ تیسرا شخص بچ نکلے میں کامیاب ہو گیا۔ کیپٹن بھوانی کو معلوم نہیں تھا کہ جیب حادثہ کا شکار ہوئی ہے۔ وہ کسی سمجھا کہ مسلح افراد نے ٹوٹ مار کی غرض سے جیب پر حملہ کیا ہے۔ وہ غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں افراد کو پکڑ کر اس رست ہاؤس میں لے آیا اور ان کی زبان کھلانے کے لیے تشدد شروع کر دیا۔ وہ ان سے سائیں عالی کا تاج دریافت کر رہا تھا جبکہ وہ لاعلم تھے ان کا قصور صرف یہ تھا کہ دیوانے میں پڑی ہوئی ایک قابل استعمال گاڑی دیکھ کر اپنی بیٹیوں پر قابو نہ رکھ سکے اور اسے وہاں سے لے جانا چاہا۔ اس کے سواہ کسی واقعے میں ملوث نہیں تھے اور نہ ہیچ جانتے تھے۔

دونوں دھاتیوں کی مزاحمت کرنے کے بعد انہیں دودھ وغیرہ پلایا گیا اور پھر رست ہاؤس سے روانہ کر دیا گیا۔ ان کا گھوڑا بھی واپس کر دیا گیا تھا۔ جس بدقت سے جوبالی فائرنگ کی گئی تھی وہ اس تیسرے دھاتی کے پاس تھی جو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ دونوں مضبوطی کی انک شولی کے لیے انہیں کچھ رقم وغیرہ بھی دی گئی ہو۔ نہ ہی دی گئی ہو تو وہ خوش نظر آتے تھے۔ جان بچی سولا کھوں پائے خبر سے بڑھو گھر کو آئے۔ "حادثہ شدہ جیب" بچانے نکلے تھے۔ ایک گھوڑے سے بھی ہاتھ دھوئے اور جوبالی گارڈ رست نیو وہ علیحدہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ ان کے دلوں کے اندر کہیں گہرائی میں انتقام کا خیال موجود ہو مگر غمزدگی کے دل میں انتقام کا خیال صبح کے شعلے کے مانند ہوتا ہے۔ زندگی کی ہجاک دوڑ میں ہانپے ہوئے سینے میں یہ شعلہ بہت جلد بجھ جاتا ہے اور جب اس شعلے کو بجھانے کے لیے جبر اور طاقت کی شدید آندھی بھی چل رہی ہو تو وہ بھلا کتنی دیر روشن رہ سکتا ہے۔ ان زخم زخم دھاتیوں کو بھی چند روز میں بھول جانا تھا کہ مہاراج رتن سنگھ کے رست ہاؤس میں ان دونوں پر کیا جاتی تھی۔ وہ ساری آنتہ زبانی اور شرمندگی فراموش ہو جاتا تھی جو اس وقت ان کے رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ اگر مدح و تحسین ہلکے والے زعموں کی آنتہ ہمیشہ جوں کی توں رہے تو شاید کوئی ذی روح بھی زندہ نہ رہ سکے۔

جس وقت زعموں سے پھر دونوں افراد رست ہاؤس سے نکل رہے تھے اس وقت ایک نئی ٹولی دوسری جیب رست ہاؤس میں داخل ہوئی۔ جیب کی دو پہلی نشستیں نکال دی گئی تھیں۔ وہاں فوم پچھا کر ایک بستر سائیا کر دیا گیا تھا۔ اس بستر سائیں عالی پر دو افراد بچھڑے پئے ہوئے ٹھاٹ سے ہم دراز تھا۔ جیب ٹکی تو دو باروری ملازم تیزی سے آگے بڑھے اور سائیں کو بڑک و احتشام کے ساتھ باہر نکالا۔ وہ خالی خالی نظروں سے جاردوں طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی بے بسی ملاری رہتی تھی اس پر، کیپٹن بھوانی نے اسے بازو سے قہر کر نشست گاڑی کی طرف لے جانا چاہا لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر مخالف سمت میں چل دیا۔ میاں گھوڑے کے ایک مچھڑے کے پیچھے سے طلوع آفتاب کا سناٹا منظر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر محبت سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس نے سر جھٹکا اور گھوڑے کے سنے سے نیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کیپٹن بھوانی "مہاراج رتن سنگھ" بھتی خاں اور تمام باروری و سادہ پوش محافظ سائیں عالی کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ سائیں عالی کی خاموشی میں ایک

جلال کی سی کیفیت تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کئے پا کر ہے۔ اچانک سائیں عالی کے ہونٹوں نے حرکت کی اور وہ بلند آواز میں بولا۔ "مٹلاش کھ۔ مٹلاش کے پتا کھ نہیں ملتا۔ حرکت میں برکت ہے۔ سڑو سڑو قطرے ڈھونڈنے والے کو بھگوان ملتا ہے۔ سونے کا پناہ ملتا ہے۔" اسی کا عمل ملتا ہے اور تو اور شفیع محمد بھی ملتا ہے۔ کون کھو غور کھو! سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔" پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ زور سے بولا۔ "اوتے شفیع! اوتہ آ۔ اوتہ آ میرے پاس۔" انداز حسمانہ تھا، میں ڈرا کر شاید ارمد بانو کی طرح میرے سر پر بھی جوتانی ہونے والی ہے لیکن خیریت گزری۔ میں سائیں کے قریب پہنچ کر بیٹھا تو اس نے میرا کان پکڑ لیا۔ پھر موڑ کر زور سے گھنپا۔ اندازہ ہوا کہ وہ کان کھینچ کر مجھے اپنے قریب کر رہا ہے۔ میں نے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ اپنے ہونٹ سرگوشی کے انداز میں ہلانے لگا لیکن ہونٹوں سے آواز بالکل نہیں نکلتی۔ چند لمحے بعد اس نے میرے کندھے پر ٹھکی دے کر مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں سائیں جی۔" میں نے کہا۔

"جاؤ۔" وہ گرج کر بولا۔ "بس اب جاؤ۔" "واپس آجاؤ۔" کیپٹن بھوانی نے میرے عقب سے تیز سرگوشی کی۔ میں اٹنے قدموں واپس آ گیا۔ سب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ سائیں عالی کچھ دیر کجور کے پتوں کو کھکا رہا پھر وہیں ایک موٹے تنے کے قریب دروازہ ہو گیا اور ایک بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ مہاراج رتن سنگھ کے کہنے پر سب افراد سائیں کے ارد گرد سے چھٹ گئے۔ صرف دو باروری محافظ دس چندہ قدم کی دوری پر کھڑے رہ گئے۔ میں بھی مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کے پیچھے چلا نشست گاڑی میں آ گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اب تک سائیں عالی کے حیران ہانپا میں سے جو مزید سامنے آئے تھے وہ دونوں گمشدہ رنگ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یعنی ارمد بانو اور کیپٹن آر کے بھوانی جو کہ ریاست جودھ پور کے سابق والی کا بھائیایا جاتا تھا۔ خاص طور پر ارمد بانو کی دلچسپی تو اتنا کہ پتھر سی تھی۔ وہ اس دولت تک پہنچنے کے لیے اپنا تن من و دھن سب کچھ قربان کرنے پر تیار تھی۔ اب یہ کیپٹن بھوانی سامنے آیا تھا۔ وہ مہاراج رتن سنگھ سے کم مہربوئے کے باوجود اس کے ہم

نوالہ دیالہ دوستوں میں سے تھا۔ گمشدہ رنگ کے بارے میں مہاراج رتن سنگھ اور کیپٹن بھوانی کا علم اب تک اخباری خبروں تک محدود تھا لیکن اچانک انہیں میری صورت میں ایک زبردست سراغ ہاتھ لگا گیا تھا۔ وہ رنگ کے سلسلے میں بے حد سنجیدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف مجھے شیخ عاصم بن ارشد جیسے غضب ناک اور جاہل دشمن کے چنگل سے نکالا تھا بلکہ اب مجھے ہر قسم کی سولت اور تعاون کی پیشکش کر رہے تھے۔ میرے خیال میں ان کی ملائگی یہ تھی کہ پہلے کبھی سیدھی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کی جائے، اگر نہ نکلے تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کر لی جائیں۔ میں جانتا تھا میری جان مہاراج رتن سنگھ اور کیپٹن بھوانی وغیرہ سے آسانی چھوٹنے والی نہیں۔ وہ بے حد بااثر لوگ تھے۔ پھر غزالہ ان کی کبھی میں تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ غزالہ میرے لیے کس قدر اہم ہے۔ درحقیقت میرے ساتھ "آسمان سے گرا گھوڑ میں اٹکا" والا معاملہ ہوا تھا۔ مجھے شیخ عاصم بن ارشد کے بے رحم چنگل سے نکالنے والوں نے ایک ناممکن کام کو ممکن کیا تھا لیکن اب میں اس "احسان" کے بدلے ان کے چنگل میں تھا۔

نشست گاڑی میں پہنچنے ہی مہاراج رتن سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔ "سائیں صاحب نے تم سے کیا کہا؟" "کچھ بھی نہیں۔ وہ صرف ہونٹ ہلاتے رہے۔ ایک لفظ بھی نہیں بولا انہوں نے۔" "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" کیپٹن بھوانی مسکرایا۔ "ہم نے خود انہیں ہاتھ کر کے دیکھا ہے۔" "آپ نے دیکھا ہے لیکن سائیں صاحب نے بھی صرف دیکھا ہے۔" "کوئی ایک آدھ لفظ تو سمجھ میں آیا ہو گا؟" مہاراج رتن نے پوچھا۔ "میں تو بڑی نرس! ہستنی کی معافی چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔" رتن سنگھ سہلہ کر رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ میری بہت سی باتوں کی طرح اس بات پر بھی یقین نہیں کیا گیا لیکن مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ میں نے مہاراج رتن سنگھ سے کہا۔ "میں تو بڑی نرس! آپ نے کل ذکر کیا تھا کہ کھدائی سے برآمد ہونے والے سالن میں کچھ نادر جنگی ہتھیار بھی شامل ہیں اور ان کی تفصیل محترم کیپٹن بھوانی صاحب کو معلوم ہے۔" "ہاں، ہاں ہم نے کہا تھا۔" پھر وہ کیپٹن بھوانی سے

مخاطب ہو کر بولا۔ ”بھائی صاحب! آپ اسے ذرا اس آرٹیکل کے بارے میں بتائیے جو لندن کے مفت روزہ میں چھپا تھا۔“

”وہ آرٹیکل تو اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ مواد ہے جو میں ساتھ ہی لے آیا ہوں۔“ کیپٹن بھوانی نے جواب دیا۔

اس نے اپنے سیکریٹری کو آواز دی اور اسے بریف کیس لانے کو کہا۔ بریف کیس قریب ہی ایک الماری میں پڑا تھا۔ سیکریٹری نے بریف کیس کیپٹن بھوانی کے سامنے رکھ دیا۔ کیپٹن بھوانی نے اس میں سے ایک چھوٹی سی فائل نکال لی۔

”انگلش پڑھ سکتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں گزارا کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے فائل میں سے چند کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ ایک برطانوی اور دو انڈین جریڈوں کے تراشے تھے۔ میں نے پہلے غیر ملکی جریڈے کا تراشہ دیکھا۔ جوں جوں پڑھتا گیا آنکھیں حیرت سے کھلتی گئیں۔ یوں لگا جیسے آرٹیکل میرے سوالات کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ دیکھنے کے حوالے سے اپنی ہمت یا الجھنوں کا حل مجھے اس آرٹیکل میں نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک مفصل تحریر تھی اور میرے ہمت سے اندازوں کی تصدیق کرتی تھی۔ دو صفحات پر پچھلے ہونے قریباً تین ہزار الفاظ تھے۔ میں یہاں اس تحریر کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

۴ ستمبر ۱۸۵۵ء کو ایک انگریز مصنف رچرڈ لسن نے راجستان میں اپنے ایک دیرینہ دوست نواب نور علی خاں کے ہاں قیام کیا۔ رچرڈ لندن سے بیرونیات کے دورے پر آیا تھا۔ دراصل وہ راجستان جیسے پسماندہ علاقے میں بنیادی انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کی حالتِ زار کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ راجستان میں قیام کے دوران اسے ایک عمر رسیدہ شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اپنے حکیم کے سلسلے میں پکارتے آئے ہوا تھا۔ اس ہندو سراج کا حکیم بہت بڑا تھا۔ وہ راجپوت خاں میں قریباً دس مربع زمین چھوڑ کر آیا تھا۔ اسی طرح سازدوسالمان کی شکل میں بھی اسے اپنی بے شمار دولت سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس شخص سے مصنف کو سراج ملا کہ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے راجپوت خاں کے علاقے سے تعلق رکھنے والے کچھ نہایت بااثر افراد ایک زبردست ایسے سے دوچار ہوئے تھے ان افراد میں چند بڑے زمیندار سماج کار اور کارخانے دار شامل تھے۔ یہ تمام

افراد ہندو تھے اور انہوں نے بگڑتے ہوئے ملکی حالات کے پیش نظر اپنی اپنی جمع پونجی ایک جگہ اکٹھی کرنے کے بعد انڈین علاقے میں پھیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مقصد کے لیے دو گاڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ ان گاڑیوں کی حفاظت کے لیے ایک تیسری گاڑی میں قریباً نصف درجن مسلح افراد بھی موجود تھے۔ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کی شب یہ تینوں گاڑیاں راجپوت خاں سے راستہ بجنور روانہ ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں کو اپنے پیش قیمت سازدوسالمان سمیت چار جولائی کو رات گیارہ بارہ بجے تک بیکار بیٹھ جانا تھا لیکن وہ نہیں بٹھیں۔ ۲ جولائی کو گاڑی کے ساتھ جانے والے محافظوں میں سے چار کی لائسنس ہریکائر کے کنارے ایک ویرانے سے ملیں۔ ان محافظوں کے علاوہ گاڑیوں کے ساتھ جانے والے دو زمیندار بھی موت کے گھاٹ اتار کر اسی پہلے میں پھینک دیے گئے تھے۔ اس تھکنا خیز واردات کی اطلاع پولیس میں نہیں دی گئی۔ اس وقت مقامی حالات اتنے اتر گئے کہ اکثر مقامات پر انتقامیہ اور حکومت کا وجود ہی نظر نہیں آتا تھا۔ اس واقعے کی پہلی ایف آئی آر وقوع کے قریباً پانچ ماہ بعد بیکائر کے مرکزی قحانے میں درج ہوئی۔ تاہم اس دوران متاثرہ افراد اپنے اپنے طور پر کئی سازدوسالمان کا سراغ لگانے کی سرگرمیوں کو شروع کرتے رہے تھے۔ اس واقعے کے متاثرین میں راجپوت خاں شہر کے دو ممتاز ترین ٹھاکر خاندان بھی تھے۔ ان دونوں خاندانوں کی آپس میں رشتہ داری تھی۔ ان لوگوں کے پاس قدیم جنگی ہتھیاروں کا گنجینہ ”کوٹیش“ تھا۔ یہ بے بہا نوادرات بھی دیگر سالمان کے ساتھ ہی پکارتے روانہ کیے گئے تھے۔ اس واقعے سے کچھ عرصہ پہلے صوبائی برٹش گورنمنٹ نے یہ نوادرات اپنی تحویل میں لینے کے لیے دونوں ٹھاکر خاندانوں سے بات کی تھی اور اس سلسلے میں بھاری رقم بھی آفر کی گئی تھی۔ ابھی یہ بات چیت کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ مالکان ان نوادرات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں سے کچھ نوادرات قریباً ۲۵ سال پرانے تھے۔ اور ان کا تعلق منگولوں کے شاہی خاندان سے تھا۔ ایک گوار اور کچھ بھجوراس سے بھی پہلے دور کے تھے۔ وکٹوریہ عہد سے تعلق رکھنے والی کچھ اشیاء ذخیرے کا جو بہر خاص تھیں اور برٹش گورنمنٹ کی ان پر خصوصی نگاہ تھی۔ مصنف کو ان میں سے کچھ اشیاء کی تصاویر بھی دستیاب ہوئی تھیں اور وہ اس نے اپنے آرٹیکل کے ساتھ شائع کر دی تھیں۔ اس آرٹیکل کی اشاعت کے بعد دو انڈین جراند نے بھی اس حوالے سے مضامین شائع کیے تھے۔ ان میں سے

آثار قدیمہ کے ایک ماہر پروفیسر محمد نوشاد دہلوی کا مضمون قابل ذکر تھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ گم ہونے والے زودجوار ہریکالیت لاکھوں میں نہیں کوڑوں میں تھی اور اگر کسی طرح ٹھیک ٹھیک حساب لگایا جائے تو اس واردات کو اس علاقے میں ہونے والی ”ریکارڈ واردات“ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن شاید درست اعداد و شمار کبھی بھی سامنے نہ آسکیں کیونکہ درحقیقت اسے اکثر حضرات اب اس دنیا میں نہیں اور جو ہیں وہ بھی بجائے کہاں کہاں ہیں۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں ان دونوں ٹھاکر خاندانوں کا ذکر بھی کیا تھا جس کے مجموعی نقصان کا تخمینہ قریباً چھ کروڑ روپے تھا۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ ٹھاکر خاندانوں کے سالانہ جنگی ہتھیاروں کے علاوہ کئی پیش قیمت ہیرے اور طلائی ظروف شامل تھے۔ اس دولت کی گمشدگی کے بعد ان دونوں خاندانوں پر چاکم زوال آیا۔ ایک خاندان کا سربراہ ٹھاکر بھوجے آہندہ جولائی ۱۸۵۵ء کو دل کا دورہ پڑنے سے مرگ پاشی ہوا۔ بعد ازاں بی بی کچی جاکر اس کے تازے نے اس کے وارثوں کو آپس میں لڑا کر تباہ و برباد کر دیا۔ دوسرا خاندان لٹ پٹ کر بیکائر پہنچا۔ ان لوگوں نے اپنے ذرائع سے کئی گنا اثاثوں کی تلاش شروع کی۔ اس تلاش کے دوران ایک صحرائی قبیلے سے ان کی اُن بی بی ہوئی اور چند افراد قتل ہو گئے۔ وحشی اور عقیدے بازی کا ایسا سلسلہ چلا کہ دو تین برسوں میں ہی یہ لوگ کوڑی کوڑی کھان ہو گئے اور پھر بجائے کہاں کہاں مگر گئے۔

جراند کے ان تراشوں کے علاوہ بھی بہت سے کاغذات فائل میں موجود تھے۔ ظاہر ہے ان میں اس کئی گنا دولت کے حوالے سے تفصیلات ہوں گی لیکن کیپٹن بھوانی نے ان تراشوں کے سوا مجھے اور کچھ نہیں دکھایا۔ اس نے تراشے بریف کیس میں رکھ کر اس کے اندر سے ایک شدہ کاغذ نکالا اور اسے کھولا دکھایا۔ یہ ایک جہاز ساز کا نقشہ تھا۔ اس نے نقشہ دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اس میں ہمارے کے ننھی پنجاب اور شمالی راجستان کے علاقے دکھائے گئے تھے۔ فیوڈلر، فیریڈ کوٹ، شہر، راج، گڑھ، ناگور، وغیرہ کے شہروں کے حوالے سے نظر آ رہے تھے۔ اس نقشے پر کئی جگہ سرخ پھل سے نشانات لگائے گئے تھے۔ فیریڈ کوٹ کے نواح لی گنڈاپور گاؤں تک کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ایک لائن کے ذریعے وہ راستہ دکھایا گیا تھا جس پر ہم سڑک کے ٹانڈل ٹیٹ پختہ تھے۔ جہاں ہماری جیب کو حادثہ پیش آیا وہاں کھڑا رہ کر دیکھا تھا۔

کچھ دیر اس نقشے پر غور ہوئی رہی۔ میں نے سنجیدہ لہجے

میں کہا۔ ”یو رہائی نس! ہمتا فی صاف۔ میں اس نقشے کو فی الحال ضروری نہیں سمجھتا۔ میری سوزانہ رائے ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس جگہ پہنچنا چاہیے جہاں ٹرک کو آخری بار دیکھا گیا تھا۔ میرا مطلب گنڈاپور گاؤں کے مشرقی قدام سے ہے۔ جیسا کہ آپ کو بتا چلی گیا ہوگا، وہاں ایک قتل بھی ہوا ہے۔ یقیناً مقامی پولیس اس قتل کی تحقیق کر رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ انیس کوئی اہم شخص قتل ہو گیا ہو یا پھر ہم ہی وہاں سے کوئی سراغ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

مہاراج نے پوچھا۔ ”تو تم چاہتے ہو کہ فیریڈ کوٹ جایا جائے؟“

”میرا ناچیز رائے تو یہی ہے جناب۔“

”لیکن تمہارے اور مس غزالہ کے لیے وہاں بے حد خطرات ہیں۔“ رتن سنگھ نے کہا۔

”یہ بات میں جانتا ہوں جناب لیکن ہم جتنی تاخیر کریں گے کئی گنا ٹرک تک پہنچنے کے امکانات اتنے ہی معدوم ہوتے جائیں گے۔“

”پھر ایک رائے ہماری بھی ہے۔“ رتن سنگھ نے کہا۔ ”تم اپنی سامی کو ان خطرات میں مت جھگو۔ اسے ہم اوپر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ تم سے ہمارا وعدہ ہے کہ وہ ہماری وابستگی تک یہاں بالکل ٹھیک اور شانتی سے رہے گی۔“

میں جانتا تھا کہ مہاراج رتن کے منہ سے جلد یادیر یہ بات نکلے والی ہے۔ مہاراج چاہے کچھ بھی کہتا لیکن یہ حقیقت تھی کہ غزالہ کو یہاں پر غل بٹایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں بحث و محارکہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے“ جیسے آپ مناسب سمجھیں لیکن ہمیں روانہ کب ہونا ہے؟“

”ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر ہمیں کون سا لہجہ چڑا انتقام کرنا ہے۔“

اب میرے سامنے غزالہ کو مطمئن کرنے کا مسئلہ تھا۔ وہ تو میرا گھر سے باہر نکلتا ہی گوارا نہیں کر رہی تھی کہاں یہ کہ مجھے فیریڈ کوٹ جانا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک سمجھ دار اور دلیر لڑکی تھی لیکن یہاں کے ماحول اور یہاں پیش آنے والے بے درپے واقعات نے اسے سخت ہراساں کر رکھا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ غزالہ سے کیسے بات کروں اور اسے کس طرح سمجھاؤں کہ وہ چند روز خاس رست ہاؤس میں گزارنے پر آمادہ ہو جائے کہ کچھ آوازوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کوئی بلند آواز میں دوا بولا کہہ رہا تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ جناب آفریدی کی آواز تھی۔ بیٹھی جان کا

وہی خوبو ساتھی جو یہاں باز فروخت کرنے آیا تھا اور جس نے مہراج رتن وغیرہ کو بتایا تھا کہ پاکستانی ٹرک والے معاملے سے میرا براہ راست تعلق ہے۔ خراب کے واویلے کی آوازیں کسی قریبی کمرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ میں تجسس سے مجبور ہو کر کمرے سے نکلا اور میز میاں چڑھ کر بالائی منزل پر پہنچ گیا۔

آوازیں ایک ٹیلی فون کمرے سے آ رہی تھیں۔ کمرے کے دو دروازے پر ایک باوردی محافظ کمرے سے ہتھلکاٹے نکل رہا تھا اور زبردست مسکرا رہا تھا۔ میں نے ایک اودھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا اور دیکھا کہ ایک خراب آفریدی موجود دیکھنے میں ایک سنجیدہ اور زبردست دارمغض نظر آتا تھا جسے میں سن ہو کر مضطرب خیر کرتیں کر رہا تھا۔ ایک انڈویٹر کے سوا اس نے سارے کپڑے اتار کر بیچک دیے تھے اور اب سر پر دلائی شراب کی بوتل رکھے ناچ رہا تھا۔ غالباً کچھ دیر پہلے اس نے شراب سے نمائنے کی کوشش بھی کی تھی۔ فرش پر شراب کی کئی خالی بوتلیں ٹھوس ٹھوس ہوئی تھیں اور سارا قاتلین لکھا ہوا تھا۔ اس کمرے کے اندر ایک الماری میں نیچے سے اوپر تک بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔

جن دنوں میں یہی جان کے ساتھ تھا مجھے معلوم ہوا تھا کہ خراب آفریدی شراب کا رسا ہے اور ابھی شراب کی ایک بوتل کی خاطر جان تک قربان کر سکتا ہے۔ آج یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی۔ وہ شراب میں غرق تھا اور سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ وہ بوتل سر رکھے تھوڑی دیر چمکے لگا تاہم پھر کوئی بے ہنگم گیت گانے لگا۔ تب اس کی نگاہ دوبارہ اوپر اڑاں ایک تصویر پر پڑی۔ یہ بالی ووڈ کی ساحرہ رائلز کی ایک نیم عریاں تصویر تھی۔ خراب ایک کرسی پر چڑھ کر تصویر سے لپٹ گیا اور "ماں۔۔۔ ماں۔۔۔" پکارنے لگا۔ "تو میری ماں ہے مجھے جوڑ کر مت جانا۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ پھر وہ دوڑ کر ایک کپڑا اٹھا یا اور اس سے رائلز کی تصویر کا جسم ڈھانچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ رجحان کے اس دور دراز علاقے میں باز فروخت کرنے آیا تھا لیکن ابھی ایک خطی کے سبب تعین مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی تھی جسے سننے کے بعد مہراج رتن اور کپٹن بھوانی اسے واپس جانے کی اجازت دے ہی نہیں سکتے تھے۔ بالکل تیندھی سادی بات تھی۔ خراب آفریدی واپس چلا جاتا تو فوراً یہی جان وغیرہ کو بتا کہ جانی استاد آندل

اسٹیٹ کے محل میں ہے۔ یہی جان اور شکر اپنے پورے بلاؤ لشکر کے ساتھ آندل اسٹیٹ پہنچے اور مہراج رتن سے کہتے کہ فرمائیے جناب کہاں ہے "ہمارا" جانی استاد ہم تو اس کی چھائی میں پھان ہو رہے ہیں، بھاگ بھاگ کر نکلیں جواب دے گئی ہیں اور زبانی باہر نکل آئی ہیں۔ لہذا اس صورت حال سے بچنے کے لیے مہراج رتن سنگھ نے خراب آفریدی کو چھاپ لیا تھا اور اس کی کنزروی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے چادوں طرف شراب کی دیوار چن دی تھی۔ اوّل تو اسے شراب سے ہی فرصت نہیں ملتا تھی۔ اگر کل بھی جاتی تو رست ہاؤس میں مہراج کے رات نکل ہوا رست ہاؤس موجود تھے وہ اسے یہاں سے نکلنے نہ دیتے۔ دوسرے الفاظ میں خراب آفریدی بھی میری ہی طرح اس وقت تک یہاں "سہماں بالیجر" تھا جب تک ٹرک والا معاملہ کسی اختتام تک نہ پہنچتا۔

اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ غزالہ اس رست ہاؤس میں بالکل محفوظ رہے گی تو میں کبھی اسے وہاں چھوڑ کر نہ جاتا لیکن مجھے کمال یقین تھا کہ مہراج رتن اس کی مکمل حفاظت کا انتظام کر کے یہاں سے جانے گا۔ میں نے خرابی میں غزالہ کے ساتھ تفصیلی بات کی اور اسے یہ یاد کرانے میں کامیاب رہا کہ میرے ساتھ فرید کوٹ جانے سے اس کا یہاں رست ہاؤس میں رہنا زیادہ مفید اور حفاظت بخش ہے۔ اس وقت تو مجھے میں اچھی دس پندرہ منٹ باقی تھے جب ہم رست ہاؤس سے فرید کوٹ کے طویل سفر روانہ ہونے کے لیے چھوڑے سو رہے ہوئے گھراس سڑک کو بالکل آغاڑی میں ہی ایک لگ گئے ابھی گاڑیاں اسٹارٹ ہی ہو رہی تھیں کہ مہراج رتن کا ایک گھڑسوار محافظ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اس نے مہراج کو یہ سنسنی خیز اطلاع پہنچائی کہ اس نے پچاس کے قریب ساڑنی سواروں اور گھڑسواروں کو رست ہاؤس کی جانب بڑھتے دیکھا ہے۔ محافظ نے کہا: "جیوز بالی لٹل قاتل زیادہ تھا۔ میں انہیں ٹھیک سے پہچان نہیں سکا۔ لیکن ان کی برچیاں کھڑیاں وغیرہ دور سے بھی چمک رہی ہیں۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دیتے ہیں اور سیدھا حاسی طرف آ رہے ہیں۔" میرا ذہن فوراً ان دو ساتھیوں کی طرف چلا گیا جو تھوڑی دیر پہلے یہاں سے زبردست ڈرگت بخرا کر گئے تھے۔ میں ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط نکلا ہو اور وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ چکانے کے لیے یہاں آجئے ہوں۔ بعض اوقات لوگوں کے ایک گروہ میں سے کسی ایک کی ذلت و رسوائی سب کے لیے اشتعال کا باعث بن جاتی ہے اور وہ فرد واحد کی طرح ذل

دار شخص یا اشخاص کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ لگ رہا تھا۔ ممکن تھا کہ دونوں گمشدہ دستاویز کو ڈھونڈنے کے لیے پہلے ہی کچھ لوگ نکلے ہوئے ہوں۔ اپنے لولہان اور زخم زخم ساتھیوں کو دیکھ کر ان کے غم و غصے میں اضافہ ہوا ہو اور وہ مہراج سے حساب بے باقی کرنے کے لیے یہاں پہنچ گئے ہوں۔

میں نے دیکھا کہ مہراج رتن سنگھ کا سانولا چوہون کے دباؤ سے کچھ اور سانولا ہو گیا ہے۔ آنکھیں جیسے شعلے بر ساری تھیں۔ اس نے چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دور نگاہ دوڑائی۔ جنوب مغرب کی طرف گرد کا پادل سا نظر آ رہا تھا۔ اس دم یہ دم بلند ہوئی اور پھیلتی گرد کا رخ رست ہاؤس ہی کی طرف تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ رست ہاؤس میں مہراج رتن اور کپٹن بھوانی کے کم و بیش پندرہ مسلح محافظ موجود ہیں۔ چالیس پچاس برچھی ہواؤں سے نمٹنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ اگر آئے والوں کے پاس چند ایک راتخلیں بھی ہوئیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اور ابھی تو طے نہ ہوا تھا کہ وہ لوگ رست ہاؤس کی طرف جھگڑا مول لینے کے لیے آ رہے ہیں یا کسی اور غرض سے۔ دور دراز علاقوں میں جہاں انتظامیہ کی گرفت کمزور رہتی ہے، اس قسم کے واقعات رونما ہوا ہی کرتے ہیں۔ اکثر اوقات جویشیہ لوگ اپنے تاؤعات خود حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انصاف طلبی کے لیے پولیس کے پاس جانا بڑی سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر میں جس قسم کے باور پیر آزاد علاقے میں تھا وہاں اس قسم کی آندھیاں اکثر چلتی رہتی ہیں لیکن یہاں حیرت کی بات یہ تھی کہ کچھ بے سوسانان قسم کے دہشت گرد مہراج رتن سنگھ آف آندل جیسے شخص سے لڑائی مول لیتا چارہ رہے تھے۔ کم از کم اطلاع دینے والا تو یہی اطلاع دے رہا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد گھوڑوں کی ٹاپیں صاف سنائی دینے لگیں اور پھر ایک دھلوان کے کیلائی کنارے پر گھڑسوار نظر آئے۔ وہ ایک غضب ناک جیسے کے مانند نمودار ہوئے اور دھلوان کے عرضی رخ پر دو دو تک پھیل گئے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا اور مجھ پر ایک نیا انکشاف ہوا۔ وہ دہشت گردی کے بارے میں عام دہشت گرد نہیں تھے۔ ان کی بھاری بھر کم گاڑیوں اور دھلوان میں ایک خاص قسمی رنگ کی چوڑی پٹی صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ لٹے پٹے لباس پہنے ہوئے تھے اور ان میں سے اکثر کے ہتھیار بھی ایک جیسے تھے۔ ہاتس کے دستے والی لیوٹری برچیاں اور چھوٹی چھوٹی کھڑیاں۔ لیکن

وہ آتشیں اسلحے سے بھر محروم نہیں تھے۔ درمیان میں کافی قاصد ہونے کے باوجود مجھے کئی افراد کے ہاتھوں میں راتخلیں نظر آ رہی تھیں۔ میرا ذہن فوراً اس واقعے کی طرف چلا گیا جب میں نے رست ہاؤس کے عقب سے کچھ گڑی پوش افراد کو بھاگتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی مجھے یہ معاملہ برسر اس محسوس ہوا تھا۔ اب اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں مہراج رتن کے باوردی محافظ نے کہا تھا کہ اب ان غیرت مندوں کا سزا دیا کرنا ہی پڑے گا۔

یہ بات وضاحت طلب تھی کہ ان "غیرت مندوں" نے کس بات پر غیرت کھا رکھی ہے۔ اور وہ مہراج رتن جیسے شخص سے گھرا کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گھڑسوار اور ساڑنی سوار ایک جگہ اکٹرو گئے تھے۔ آگے بڑھ رہے تھے نہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ جیسے تلاطم میں ہوں کہ کیا کریں۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے تو مہراج رتن سنگھ نے گرج کر حقیق خاں کو آواز دی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور انہیں شن کھڑا ہو گیا۔ مہراج نے کہا: "ہمارا خیال ہے حقیق خاں ان لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے یہ بہت مناسب موقع ہے لیکن پہلے ان کی نیت معلوم ہو جانی چاہیے۔ تم جاؤ اور پوچھو ان سے کہ کیا چاہتے ہیں۔"

حقیق خاں نے اوب سے سر جھکا یا اور دوڑ کر اپنی جیب میں سوار ہو گیا۔ جیب کے اوپر سے کیونس کی چھت ہٹائی جا چکی تھی۔ اب وہ ایک کھلی جیب کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ دور سے دیکھنے والا بھی جان سکتا تھا کہ جیب میں کتنے سوار ہیں۔ حقیق خاں کی جیب تو محل اُڑاتی اور پھولے کھاتی گھڑسواروں کے قریب جاؤ گی۔ قاصد زیادہ ہونے کے سبب گفتگو سنتا ہیچوں کے تاثرات دیکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ تاہم گفتگو کے انداز اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی خائن موضوع پر بات ہو رہی ہے۔ قریباً دس منٹ بعد حقیق خاں جیب دوڑاتا واپس آیا۔ اب اس کا چہرہ بھی لال لال جھپکا ہو رہا تھا۔ اس نے مہراج رتن سنگھ اور کپٹن بھوانی کے قریب جا کر سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ اس مختصر گفتگو کے بعد مہراج رتن سنگھ اور کپٹن بھوانی نے آئے لگا۔ اس نے اپنے اور کپٹن بھوانی کے تمام گاڑیوں اور کارندوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان کی مجموعی تعداد ابھی تھی۔ گاڑیوں کے درآئند اور دیگر لازم بھی اس میں شامل تھے۔ تین چار کے سوا وہ سب کے سب آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

مہاراج رتن نے غزاکر کہا۔ ”ان کشتوں کو ٹھیک خاک ستی سکھانا ہے۔ آٹھ دس مہینے جاسیں تو کوئی بات نہیں۔“  
کیپٹن بھوانی نے قہقہہ لگا کر اپنے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کیا اور بولا۔ ”رتن جی آپ چنتا نہ کریں۔ بھگوان نے چاہا تو بندے مارنے کی قوت نہیں آئے گی۔ میں اتنی دور سے جانچ رہا ہوں۔ رات میں یہ سب کے سب بھگوڑے ہیں۔ پتا نہیں کس کے بھگاؤ سے میں آگرمیں چلے آئے ہیں۔ آپ آٹھ دس فائرنگال کر دیکھیں۔ ابھی بڑبڑاتے ہوئے لگیں گے۔“  
پھر اس نے قریب کھڑے ایک گاڑے سے جرمن ایم پی جی ۱۲۔ یہ یہ طاقتور گن ”دی کوئل سسٹم“ کے تحت کام کرتی ہے اور زبردست گن گرج کے ساتھ چلتی ہے۔ کیپٹن بھوانی نے گن کی ٹال آہن کی طرف کر کے ٹیگہ دیا اور دو دھنوں کے ساتھ قریباً دو درجن رائیڈ فائر کیے۔ خوفناک تڑتڑاہٹ سے قریب و جوار گونج اٹھے اور اس کے ساتھ ہی فاصلے پر کھڑے دیہاتی بڑبڑاتے ہوئے لگے۔ وہ درمیان سے کافی کی طرح پھٹ گئے تھے۔ کچھ پیچھے ہٹ کر دھواں کی دو سری طرف او بھل ہو گئے اور کچھ بائیں جانب بھگوڑوں کے ایک جھنڈ کے قریب سٹ گئے۔ کیپٹن بھوانی مسکرانے لگا۔ اس کے ایک بالائی رانت کا تھوڑا سا گولٹا ہوا تھا لیکن یہ شکست و انت اس کی مسکراہٹ کو بد صورت بنانے کے بجائے جاذبِ نظر بنا دیتا تھا۔ اس نے گن بڑی رحمت سے واپس گاڑی سست اچھال دی اور بولا۔ ”رتن جی! میری تو رائے ہے کہ ان بھگوڑوں کو مارنے کے بجائے کھیر کر پکڑیں اور باندھ کر یہاں لے آئیں۔ جو ان میں کچھ پختے خاں قسم کے بندے ہیں ان کو کاڑے کے حوالے کر دیں۔ ایک گھنٹے کے اندر سب آپ کے پاؤں نہ چاٹنے لگیں تو میرا نام بدل دیں۔“

کیپٹن بھوانی کی باتوں نے مہاراج رتن سکھ کے جارحانہ عزائم کو ہوا دی اور اس کی شکل سے نظر آنے لگا کہ وہ مارنے مارنے پر آمادہ ہو رہا ہے اس نے پانچ گاڑیوں کی ایک ٹولی کو دوسرے گاڑوں سے علیحدہ کیا اور انہیں خصوصی ہدایات دینے لگا۔ کچھ دیر بعد یہ گاڑیوں رست ہاؤس میں داخل ہوئے اور عمارت کی قطعی جانب سے نکل کر درختوں میں روپوش ہو گئے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مہاراج رتن سکھ اپنے تربیت یافتہ مسلح گاڑوں کے ذریعے دیہاتیوں کو گھیرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اسی دوران میں تین ہماری گاڑیوں کا شور مچا دیا۔ یہ شور ہمارے بائیں پہلو سے اُبھرا تھا۔ ٹیلیوں کے عقب سے گرد کے بادل بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے مہاراج رتن سکھ کے ایک گاڑی کو قیاس آرائی کرتے سنا کہ

شاید پولیس پہنچ گئی ہے مگر اگلے چند سیکنڈ میں یہ قیاس غلط ثابت ہو گیا۔ آنے والی گاڑیاں پرائیویٹ تھیں۔ ان کی تعداد تین تھی۔ دوڑتے تھے اور ایک ڈسکریٹریلی۔ زالی کے اوپر سایہ رکھنے کے لیے ایک چھتر سا بنا ہوا تھا۔ رنگ خستہ حال تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ مقامی طور پر اینٹیں ریت وغیرہ ڈھونے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جو کسی یہ تینوں گاڑیاں روکیں، ان میں سے دیہاتی چھلانگیں لگا لگا کر نیچے اترنے لگے۔ وہ سب کے سب مسخ تھے۔ کئی ایک کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان لوگوں کا تعلق اسی سسٹم سے ہے جو پہلے سے یہاں ختم ہوئے کھڑا ہے۔

گاڑیوں سے اترنے والوں کی تعداد حیران کن حد تک زیادہ تھی۔ وہ کم و بیش دھاتی سوار تھے۔ جوان ’لڑکے‘ بڑھے ’ان میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ اکثر افراد کے سروں پر غاستری پٹی والی کپڑیاں تھیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ لوگ پکڑی کو ایک خاص انداز سے باندھتے تھے۔ پکڑی نیچے سے چمیلی ہوئی اور اوپر سے مت گھٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کا طویل پلو سامنے کی طرف لٹکا رہتا تھا یا اسے منہ پر لپیٹ کر منڈاے کی شکل دے دی جاتی تھی۔ تینوں گاڑیوں کے ساتھ چند گھوڑے اور بچر بھی تھے۔ اور اس پر بس نہیں ہو گیا تھا۔ ابھی چھوٹی چھوٹی ٹیلیوں کی صورت میں بیدل اور سوار لوگ موٹے پر پہنچ رہے تھے۔

میں نے مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر جوش و خروش کی جگہ اب پریشانی اور ہراس نے لے لی تھی۔ کیپٹن بھوانی نے مہاراج سے مخاطب ہو کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے رتن جی۔ یہ مودہ کہاں سے اُمدے چلے آ رہے ہیں؟“

مہاراج رتن کے چہرے پر سوچ کی پر جھانپائیاں اُمد آئیں۔ ”یہ کوئی گمراہ سازش لگ رہی ہے کیپٹن۔“  
گاڑیوں سے اترے ہوئے والوں نے پہلے سے موجود مسلح افراد کے ساتھ مل کر رست ہاؤس کو تین اطراف سے گھیر لیا تھا۔ چوتھی جانب نیلے تھے اور تین ممکن تھا کہ ان کے عقب میں بھی افراد موجود ہوں۔ یا ایک جیسے صورت حال کی اصل عینگی کا احساس ہو۔ مہاراج رتن سکھ آف نائل اور کیپٹن بھوانی علاقے کے دو نہایت بااثر اور طاقتور اشخاص ہونے کے باوجود اپنے چند کارندوں کے ساتھ اس الگ تنہا رست ہاؤس میں پھنس گئے تھے۔ ان کے چاروں طرف مشعل دیہاتی تھے اور ان کی تعداد میں ہتھیار و اضافہ ہوا

تھا۔ مشکلات اور حوادث کو پیش میرے ساتھ رہا ہے۔ اب یہ جو واقعہ رونما ہوا تھا، مجھے کب سے اس کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ یہ واقعہ چند روز پہلے یا بعد میں بھی رونما ہو سکتا تھا مگر یہ آج ہوا تھا اور اس رست ہاؤس میں موجود تمام دوسرے لوگوں کی طرح میری اور غزالہ کی زندگی کو بھی خطرات لاحق ہو گئے تھے۔

مہاراج رتن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے کسی گمراہ سازش کا نتیجہ ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ رست ہاؤس کو گھیرنے والے کون تھے اور کہاں سے آئے تھے، یہ حقیقت تھی کہ اس رست ہاؤس کا گھیراؤ بے حد منظم طریقے سے اور بڑے مناسب موٹے پر کیا گیا تھا۔ یہ بات قریب قیاس تھی کہ رست ہاؤس میں ہی حملہ آوروں کا کوئی مخبر موجود ہو اور اس نے گھیراؤ کے سلسلے میں حملہ آوروں کی مدد کی ہو۔ اس رست ہاؤس میں ٹیلیفون تھا نہ کوئی اور ایسا ذریعہ جس سے جوہر میں رابطہ قائم کیا جاسکتا۔ چاروں طرف جنگل تھا یا اونچے نیچے ریستلے تھے۔ یہاں پر کچھ بھی ہو جاتا، کسی کو کانٹوں کاں خبر نہیں ہوتا تھی۔ بے شک گاڑوں کے پاس جدید رائلٹیں موجود تھیں لیکن یہ چند رائلٹیں بھجے ہوئے لوگوں کے جم غفیر کو بے شک فاصلے پر رکھ سکتی تھیں۔ ان حوصلہ شکن حقائق کا عکس اب مہاراج کے ساتھ ساتھ کیپٹن بھوانی کے چہرے پر بھی نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک بھیموں کو زندہ پکڑنے اور اٹاٹا دکھانے کی باتیں کر رہا تھا، اب بار بار پریشانی سے پسینہ پونچھنے پر مجبور تھا۔ یہ حالات کی نیرنگی کا ادنیٰ سا نمونہ تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جا رہا تھ عزام رکھنے والوں کو اب مدافعت بھی مشکل نظر آ رہی تھی۔

اتنے میں دو گھوڑے تیزی سے رست ہاؤس کی طرف آتے دکھائی دیے۔ ان میں ایک منگلی تھا۔ منگلی گھوڑے پر ایک دراز قد فوجان سوار تھا۔ وہ نمایاں اس لیے بھی نظر آ رہا تھا کہ اس کی داڑھی نہیں تھی۔ اس کی کمرے گولیوں کی بیٹیاں بندھی تھیں اور کندھے پر رائلٹیں بھول رہی تھی۔ دونوں گھوڑے سار مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کے دہریہ جاؤ کے کیپٹن بھوانی کا کتا، انہیوں کی بوجا کر زد و شور سے بھونکنے لگا تھا۔ دراز قد فوجان ابھی شکل و صورت اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ گلے میں ایک خوبصورت اور وزنی طلائی زنجیر تھی۔ اس کی آنکھوں میں آگ سی جل رہی تھی اور چہرہ تنہا رہا تھا۔ وہ مٹلے اور غدد خال سے کھاتے پیتے کھانے کا فرد لگتا تھا۔

علم الحق حق

کایک ناقابل فراموش ناول

سافل

قیمت: ۱۵۰/- روپے

آبِ حیات

تلاش میں نکلنے والوں کی

عبرت انگیزانی

برادر راست منگولنے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۳۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۳۳۳۳۳۳

وہ بڑی بے باکی سے بولا۔ ”راجا صاحب مجھے تراخان نے بیچا ہے جس تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“  
نوجوان کے گستاخانہ لب و لہجے نے مہاراج رتن کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں نے دیکھا کہ غصہ پینے کی کوشش میں اس کا چہرہ تاریک تر ہو گیا ہے۔ وہ غرا کر بولا۔  
”ہمیں تم سے کوئی ”پرائیویٹ ٹاک“ نہیں کرنی ہے اور نہ تم اس قابل ہو کہ ہمارے برابر بیٹہ کر بات کر سکو۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے سب کے سامنے کہو، ہمیں کسی سے کچھ نہیں چھپانا ہے۔“  
نوجوان نے سینہ تان کر دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”پر تم کو ہمارے حوالے کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تیرا ہی لال کو بھی۔“

مہاراج رتن کے پہلو میں کھڑا کیپٹن بھوانی آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنے ربوہ الو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ پلک جھپکتے میں نوجوان کو شوٹ کر دے گا لیکن مہاراج رتن نے بروقت اسے سنہال لیا۔ ”نہیں کیپٹن۔ غصہ۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”ہمیں اس نکتے سے بات کرنے دو۔“  
صورت حال بگڑتی دیکھ کر سب کا رُخ نے ایک دم اپنا گھبراہٹ کر دیا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ دو دروہاٹوں پر کھڑے سب افراد میں بھی اچھل پید ہو گئی ہے۔ کیپٹن بھوانی گوجیچے بٹانے کے بعد مہاراج رتن سنگھ نوجوان کے مین سامنے جا کھڑا ہوا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ”تم بھگوان ہو کہ اتنی بڑی بات کہنے کے بعد بھی زندہ کھڑے ہو۔ جاؤ جا کر اپنے تراخان سے کہہ دو کہ جس کا نام لے رہا ہے وہ ہماری دھرم جتنی ہے اور اس تک کسی کا ہاتھ تب پہنچے گا جب ہم میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہے گا۔“  
”اور وہ تیرا ہی لال؟“ نوجوان دھمکانے سے بولا۔

”وہ تمہارا نہیں ہمارا بھرم ہے اور ہم نے اسے سزا دی ہے۔ ہم تمہاری پلید زبانوں پر اس کا نام سنا بھی پسند نہیں کریں گے۔“  
نوجوان کی آنکھیں شعلے اٹھنے لگیں لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ لگتا تھا کہ اس نے گھوڑے کا رخ پھیرا اور واپس روانہ ہو گیا۔ دوسرا گھوڑا سوار بھی اس کے ساتھ تھا۔ مہاراج رتن سنگھ نے ہاتھ پشت پر باندھے اور بے قراری سے اپنی گاڑی کے آس پاس مٹلے لگا۔  
پر دم کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ مہارانی پر دم مہاراج رتن سنگھ کی دھرم جتنی تھی۔ جو پر دم میں غزالہ اس سے کئی بار ل چکی تھی اور آج مجھ سویرے میں نے بھی اس کے درشن

کر لیے تھے۔ آثار سے پتا چلتا تھا کہ اس کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔ وہ ہماری بھرم کلباس اور گھنوں کے باوجود کارڈ گرل ہی نظر آ رہی تھی اور بہت کم کومکائی دیتی تھی۔ چند لمبے لمبے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سارا ہنگامہ اس لڑکی کے لیے ہو گا۔ اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ رست ہاؤس کا گھبراؤ کرنے والوں کا تعلق رانی پر دم سے ہے۔ وہ لوگ رانی پر دم کے علاوہ کسی تیرا ہی لال نامی شخص کو مہاراج رتن سنگھ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر میاں آئے ہیں لیکن اپنے مطلب کے لیے وہ کس حد تک جا سکتے ہیں یہ بات ابھی واضح نہیں تھی۔ مہاراج رتن سنگھ نے انہیں دو ٹوک جواب دیا تھا۔ اب یہ سوال ذہن میں شدت سے ابھر رہا تھا کہ کیا وہ واقعی رست ہاؤس پر ہلا بول دیں گے۔  
مجھے احساس تھا کہ غزالہ سخت بے چین ہو گئی۔ میرے قتل دینے کے لیے اندر چلا آیا۔ وہ کھڑکی سے لگی کھڑا تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے شمار سوالات اُبھر آئے۔ جو جتنی میں اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ”آپ اہم تک گئے کیوں نہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے یہاں۔ کیا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟“ اس نے ایک ساتھ تین سوال جڑ دیا تھے۔

میں نے کہا۔ ”جھگڑا ہی سمجھو۔“ میرے مختصر جواب سے اس کی تشفی نہیں ہوئی اور اس کی خوبصورت آنکھیں سواہیہ انداز میں مجھ پر بھی رہیں۔ میں نے کہا۔ ”رانی پر دم۔ بارے میں تم کیا جانتی ہو؟“  
وہ بولی۔ ”کچھ زیادہ نہیں۔ ٹیڑ میں بس دو تین دفعہ اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مہاراج کی تیسری بیوی ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق ہو گئی تھی۔ دوسری دھاتی تین برس پہلے مر گئی۔ دوسری بیوی سے مہاراج کے چار بیٹے ہیں۔ رانی پر دم ان بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ مہاراج رتن سنگھ نے یہ تیسری شادی صرف دم بھانے کے لیے کی ہے ورنہ اسے اپنے لیے عورتوں کی کیا کمی تھی۔ آخری الفاظ ادا کر کے ہوئے غزالہ کے چہرے پر حیا کی شرم لڑائی۔ اس نے سر ہونچا دیا اور بولی۔ ”دراصل مہاراج کے خاندان میں یہ بہت پرانی رسم چلی آ رہی ہے۔ راجا غیر شادی شدہ نہیں ہوتا۔ وہ چاہے دس سال کا ہو ضعیف العمر اس کی کم از کم ایک جتنی ضرور موجود ہو چاہیے۔ مہاراج رتن کے ساتھ بھی اسی رسم کا مسئلہ تھا۔ دوسری بیوی کی موت کے بعد ایک مہرہ عیاد کے اندر ا:

اسے تیسرا یا دہ کرنا تھا لیکن وہ اپنے بچوں سے بھی بہت چاہت رکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے سروں پر سوتیلی ماں آجائے۔ میں نے سنا ہے کہ مہاراج نے قریباً ایک برس تک شش دن میں رہنے کے بعد یہ شادی کی ہے۔“  
میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ بھی رسم کسی کو دھرم لڑکی کی زندگی ہی پر یاد کرے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اپنی عمر کے مطابق کسی بیٹے عروست سے بھی شادی کر سکتا تھا۔“  
”غزالہ کر سکتا تھا۔“ غزالہ نے کہا۔ ”مہاراج کے جھوٹے بھائی مہونت سنگھ نے ایک بیوہ سے شادی کر رکھی ہے۔ اب پر دم بھنے ہندوؤں میں بیٹے عمر کی کنواہیں یا بیوہ عورتوں کو ایسا اچھوت نہیں سمجھا جاتا جیسا پہلے سمجھا جاتا تھا۔“

واقعی یہ سوچنے کی بات تھی۔ اگر مہاراج نے یہ شادی صرف خانہ پر کی کے لیے کی تھی تو وہ ایک بالکل نو عمر نا سبھ لڑکی کو گھر کیوں لے آیا تھا اور کچھ نہیں تو چوبیس پچیس سالہ خاتون ہوئی۔ مہاراج کے ساتھ چلتی پھرتی بھی اتنی بڑی نہ لگتی اور با شہور ہونے کے سبب اس کے بچوں کی دیکھ بھال بھی اچھے طریقے سے کرتی۔ لگتا تھا کہ جتنی کاچاؤ کرتے ہوئے ایک بار پھر مہاراج کی پیش پرستی کو دکر آتی تھی اور اس کی نگاہ انتخاب مینکے چھوٹوں کو چھوڑ کر ایک ایسی مکی کی پر باغھری تھی جس نے ابھی ٹھیک سے رنگ بھی نہیں پڑے تھے۔

میں نے غزالہ سے پوچھا۔ ”رانی پر دم والے معاملے سے تیرا ہی لال نامی شخص کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“  
وہ بولی۔ ”یہ نام میں پہلی بار سن رہی ہوں۔“  
میں نے کہا۔ ”رست ہاؤس کے باہر جو جھگڑا چل رہا ہے اس میں رانی پر دم کے ساتھ ساتھ کسی تیرا ہی لال کا نام لیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ مسلح ہو کر میاں بیٹے ہیں اور اراج رتن سنگھ سے معاملہ کر رہے ہیں کہ رانی پر دم اور اری لال کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔“  
غزالہ کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی۔ بات تھی ہجرت کی۔ کسی معمولی شخص سے بھی ایسا معاملہ کیا جائے۔ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانا ہے۔ مہاراج تو میاں کا آن تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ یہ سیکوں لوگ کون ہیں جو نیال کر رہے ہیں کہ رانی پر دم پر ان کا حق مہاراج سے زیادہ اور وہ کون سا بیوہ ہے جس نے ان سب کو فردا فردا کے مہاراج کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔  
رست ہاؤس کا گھبراؤ پونے نو بجے کے قریب کیا گیا تھا۔

شام تک صورت حال جوں کی توں رہی۔ گھبراؤ لٹنے والے بچے بچے نہ آگے آگے یوں لگتا تھا کہ وہ رات کا انتظار کر رہے ہیں یا پھر انہیں کچھ مزید سنا سنا کر انتظار ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خون خرابے سے بچنے کے لیے مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کو سوچنے کا موقع دینا چاہتے ہوں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ پرانے میدان جنگ سے اور ایک فوج میں باندھے کسی قلعے پر پھلنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ فضا میں عجیب سی سسٹنی رہتی ہوئی تھی اور گزرنے والے ہر شخص کے ساتھ اس سسٹنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

رات کا کھانا سب لوگوں نے رست ہاؤس کے اندر ہی کھایا۔ مہاراج رتن سنگھ، کیپٹن بھوانی اور رانی پر دم کے لیے ڈائننگ روم میں کھانا پڑا گیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد ڈائننگ روم سے بلند لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کیپٹن بھوانی بہت طیش میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قعد او میں بہت ہونے کے باوجود یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بزدلوں کا جم غفیر ہے۔ اس نے مثال دیتے ہوئے کہا۔ ”رتن جی! آپ دس ہزار مفرغی جمع کر لیں تو جواب مفرغی آئے گا۔“

مہاراج رتن کی آواز آئی۔ ”لیکن کیپٹن! اس میں خطرہ ہے۔ ہم تمہیں ایسا کرنے کا شہرہ نہیں دے سکتے۔“  
”بپ خواہ خواہ چتا کر رہے ہیں رتن جی۔“ کیپٹن بھوانی نے بھڑک کر کہا۔ ”میں پورے دشو اس سے کتا ہوں کہ کچھ نہیں ہو گا۔ ان لوگوں کو بہت سی نہیں بڑے گی ہمیں روکنے کی اور جب تک بہت بڑے گی۔ ہم دو درنقل چکے ہوں گے میری جیب آپ نے چلا کر رکھی ہوئی ہے خراب سے خراب راستے پر بھی وہ تیس چالیس کی رفتار سے تو بھاگ ہی سکتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایسی کون سی سواری ہے جس پر ہمارا پیچھا کر سکیں گے۔ اور پہل بات تو یہ ہے کہ ہو سکتا ہے پیچھا کرنے کی فوج ہی نہ آئے۔ ہم بغیر کسی کی نگاہ میں آئے میاں سے نکل جائیں۔“

رانی پر دم کی آواز آئی۔ اس نے فیضانہ دم لیے میں کچھ کہا تھا۔ اس کے الفاظ سنائی نہیں دیے۔ جواب میں کیپٹن بھوانی جھنجھلا کر بولا۔ ”ہم اسی طرح سوچ رہا کر رہے ہیں گے اور یہ سوچ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آپ مجھے جانے دیں جو کچھ بھی ہو گا اس کا ذمہ دار میں خود ہوں گا۔“  
کرسیاں جھپٹے جانے کی آوازیں آئیں۔ پھر کیپٹن بھوانی دنگاٹا ہوا ڈائننگ روم سے باہر نکل آیا۔ جلد صورت کا کڑواہٹ راتقل بدست اس کے پیچھے تھا۔ دونوں تیز قدم اٹھا



ہوئے رست ہاؤس سے نکلے اور گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔  
کیپٹن بھوانی کے مسلح محافظ اس کے گرد آکھٹے ہو گئے تھے وہ  
ان سے باتیں کرنے لگے۔ صورت حال کچھ بگڑ چکی تھی۔  
کیپٹن بھوانی رست ہاؤس کے ارد گرد موجود لوگوں کا  
گھیراؤ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نیلیوں  
کی جانب راستہ کھلائے گا یا بہت معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا  
پڑے گا۔ تاریکی اور دشوار گزار راستے کا فائدہ اٹھا کر اگر وہ  
یہاں سے نکلے گا یا سب ہو جاتا تو جو پورے ملک لے کر  
یہاں پہنچ سکتا تھا یا کسی بھی نزدیکی آبادی سے سیکڑوں افراد  
آکھٹے کر سکتا تھا۔

تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ رست ہاؤس کے اطراف میں  
جتنو سے جتنو رہے تھے۔ یہ محاصرہ کرنے والوں کی ٹارگیٹیں  
تھیں یا بھروسہ ایک نئی جہت سے انہوں نے جگہ جگہ چلا رکھی تھی۔  
گاہے گاہے گھوڑوں کے ہنسنے اور سانپوں کی آوازیں  
بھی رست ہاؤس تک پہنچ رہی تھیں۔  
کیپٹن بھوانی نے اپنی جیب کو دھکا لگا کر اس کا رخ  
نیلیوں کی جانب کیا۔ جیب کا انجن اشارت نہیں کیا گیا تھا اور  
نہ خیال روشن کی گئی تھی۔ کیپٹن بھوانی کے پانچ تھوڑے گاڑے  
جیب کو دھکا لگاتے ہوئے نیلیوں کی طرف لے گئے اور  
دھولان راستے طے کر کے بلندی پر پہنچ گئے۔ سارا عمل بڑی  
خاموشی سے مکمل ہوا تھا۔ جیب کو بلندی پر پہنچا کر جہاں سے  
تین گاڑے واپس آئے۔ اب کیپٹن آر کے بھوانی کے علاوہ  
جیب میں کاگز اور تین مسلح محافظ موجود تھے۔

کیپٹن بھوانی کی اس مہم جوئی کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکا  
تھا۔ لہذا رست ہاؤس میں موجود اکثر افراد اپنے آپ کو ذہنی  
طور پر بدتر حالات کے لیے تیار کر رہے تھے۔ میں غزالے سے  
قرب رہنے کے لیے کمرے میں چلا گیا اور اس سے چھوٹا  
بہنسل لے کر جیب میں رکھ لیا۔

نیلیوں کی جانب سے جیب کا انجن اشارت ہونے کی  
آواز آئی پھر وہ گرجتی ہوئی مخالف سمت میں بڑھی۔ بمشکل  
چار پانچ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ ”ترتر“ کی خوفناک  
آوازیں سے فضا گونج اٹھی۔ ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے  
غزالے کو دروازے کے قریب رہنے کی ہدایت کی اور باہر نکلتا  
ہوا برآمدے میں پہنچا ایک چوکور درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر  
میں نے نیلیوں کی جانب نگاہ دوڑائی۔ فائرنگ کی آوازیں اسی  
سمت سے آ رہی تھیں لیکن نیلیوں کی آغواں کے سبب سب  
کچھ گھبراہٹ سے اوجھل تھا۔ خود کار رائفمنوں کے علاوہ سب  
مشین گن بھی چل رہی تھی۔ یہ سب مشین گن کیپٹن بھوانی

کے محافظ خاص کاگز کے ہاتھوں میں تھی۔  
ایک فائرنگ ٹیم تھی۔ چند لمبے بعد میں نے انہیں کاٹھ  
سنا۔ یہ کیپٹن بھوانی ہی کی جیب تھی۔ وہ تیزی سے رست  
ہاؤس کی جانب واپس آ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد جیب کی  
روشنیاں نیلیوں کے اوپر چلیں۔ وہ تیزی سے اوجھلی ہو گئی  
ڈیوڑھی رست ہاؤس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ جو نمی وہ  
رست ہاؤس کے مین دروازے کے سامنے پہنچی، مہاراج  
رتن سنگھ سمیت کئی افراد اس کے گرد آکھٹے ہو گئے۔ ان میں  
میں بھی تھا۔ جیب کا ڈیوڑھی اسکرین ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ ایک  
ہیڈ لائٹ بھی چپٹا چڑھ رہی تھی۔ گولیوں کے قریب نصف درجن  
سوراج ڈرائیور والے دروازے پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے  
حیرت زدہ نظروں سے دیکھا ”ڈرائیور سے ساتھ والی نشست  
کیپٹن بھوانی اپنے ایک پہلو پر لٹکا ہوا تھا۔ گولی اس کے  
گولے میں لگی تھی اور وہ دروٹی شدت سے ڈھیرا ہوتا جا رہا  
تھا۔ بھرا ہوا ہسپتال ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور گود میں  
ڈیوڑھی اسکرین کے بے شمار ٹکڑے پھرتے ہوئے تھے۔

عجبی نشست پر کاگز نظر آیا۔ اس کا پھیلا ہوا مزدور نشتون  
کے درمیانی غلام تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ کسی نے جیب کی ٹوٹی  
ہوئی کھڑکی میں سے اس پر ہتھی کا وار کیا تھا اور یہ بھی  
اس کے پہلو میں دوڑ تک ٹھس ٹھس تھی۔ اگر کاگز کو صرف  
برہمی لگی ہوتی تو شاید وہ اب تک زندہ ہوتا لیکن اسے  
آتشیں ہتھیاروں نے بھی نشانہ بنایا تھا۔ اس کی پشت پر نیلا  
قیص میں گولیوں کے سوراج اور خون کے دھبے صاف نظر  
آ رہے تھے۔ صرف تین یا چار منٹ پہلے یہ شخص زندہ  
سلامت اس جیب میں سوار ہوا تھا اور اب بے جان لاش  
کی صورت دو نشتون کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔  
کیپٹن بھوانی بمشکل دروازہ کھول کر باہر نکلا اور محسوس کر  
کاگز کی طرف آیا۔ ”کاگز“ کاگز۔ ”اس نے اسے کارے  
تھا کر۔ مجبور ڈالا۔ شاید اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ  
کاگز رائیڈ ہم ہو چکا ہے یا پھر وہ ابھی تک اس کی حالت سے  
بے خبر تھا۔ کاگز کو مجبور ڈالتے ہوئے وہ اچانک خود بھی لڑکھا  
گیا اور تیزو اگر جیب کے اندر ان پر گر گیا۔ مہاراج رتن سنگھ  
بے قرار ہو کر آگے بڑھا دیگر افراد نے بھی کیپٹن بھوانی کو  
سارا دیا اور اٹھا کر اندر لے گئے۔ خون کی ایک لکیر کیپٹن  
بھوانی کے پیچھے ہی پیچھے اندر تک گئی۔

حقیق خاں نے محافظوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے  
ایک محافظ بیانی بے میں بولا۔ ”وہ حزام زادے نیلیوں کے پیچھے  
بھی گمات لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے

اندھاؤ نہ فائرنگ کر دی۔ ڈرائیور خوشحال خاں نے دلیری  
دکھائی جو جب کو رپورس میسر میں ہی بھاگ کر پیچھے لے آیا ورنہ  
شاید وہ سب کو چھلنی کر دیتے۔“  
”تم نے فائر نہیں کیا؟“ حقیق خاں نے پوچھا۔

”میں نے دو تین برسٹ مارے ہیں۔ اس سے زیادہ کا  
انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ تو اندھاؤ نہ جیب کے اوپر  
چڑھے چلے آ رہے تھے۔“ محافظ نے جواب دیا۔ اچانک مجھے  
خیال آیا کہ محافظ تو تین تھے۔ جیب سے دو اترے تھے۔ تیسرا  
کہاں گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یہ سوال پوچھتا، ڈرائیور  
خوشحال خاں خود ہی بول اٹھا۔ ”مشتاق علی بھی آخری وہ گیا  
ہے۔ وہ پچھلے دروازے پر تھا۔ زور سے جھٹکا تو آچل کر پیچھے  
جا پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھا، چار پانچ بندوں نے اسے  
دوبچ لیا۔“

بے حد ناکام اور حوصلہ شکن ”مشن“ ثابت ہوا تھا۔ یہ  
کاگز کی خوشحال لاش کو بمشکل کھینچ کر جیب میں سے نکالا  
گیا اور اس کے سامنے اسے رست ہاؤس میں لے گئے۔ میں  
دیکھ رہا تھا کہ رست ہاؤس کے ارد گرد تاریکی میں پھل سی نظر  
آ رہی ہے۔ شاید محاصرہ کرنے والے متحرک ہو رہے تھے۔ یہ  
بڑا مدد فرما خیال تھا۔ تین ساڑھے تین سو افراد کے آگے  
رست ہاؤس کے چند کینوں کی کیا حیثیت تھی۔ وہ مشتعل ہو  
کر حملہ کر دیتے تو یہاں کئی پھنی لاشوں کے سوا کچھ باقی نہ  
ہوتا۔ اطراف میں پھل دیکھنے کے بعد میں بھاگتا ہوا اندر  
پہنچا۔ ایک کمرے کا صاف شفاف بستر کیپٹن بھوانی کے خون  
سے رنگین ہو رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی پہلو کے بل لیٹا تھا اور  
ماراج رتن سنگھ کسی باہر ڈاکڑ کی طرح اس پر جھکا ہوا تھا۔  
ری طور پر گولی نکالتا تو ممکن نہیں تھا لیکن خون کا مسلسل  
خارج ہونا ضروری تھا اور مہاراج رتن اس کو شش میں لگا  
اٹھا۔ کیپٹن بھوانی کے سرہانے سامنے عالی کم صدم کھڑا تھا۔  
میں نے منسوب لیے میں کما۔ ”مہاراج رتن اس نے امداد پر  
رہنا ہوں۔ دراصل اطراف میں گز بے نظر آ رہی ہے۔  
یہ وہ لوگ ہلا بولنے والے ہیں۔“

ماراج سمیت موقع پر موجود ہر فرد کے چہرے پر  
ایک سائے لرا گئے۔ مہاراج نے اپنے خون آلود ہاتھ  
ال سے پونچھے ہوئے حقیق خاں سے کہا ”حقیق! تم اپنے  
یوں کو لے کر چھٹ پر چلے جاؤ اور جہاں جہاں میں نے کہا  
پوزیشن سنبھال لو۔“  
حقیق خاں تعظیم پیش کر کے فوراً باہر نکل گیا۔ مہاراج  
باقی افراد کے ساتھ بندوں سے نکلا اور برآمدے میں

پہنچ گیا۔ متحرک روشنیاں اب قریب پہنچی تھیں اور محاصرہ  
کرنے والوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ہمارے  
کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ بہت بڑبڑا دکھائی دیتے تھے  
اور ناقابل فہم لٹاکارے بلند کر رہے تھے۔ ایک حد تک آگے  
بڑھنے کے بعد وہ لوگ پھر رگ گئے۔ چند منٹ تک کوئی نقل  
و حرکت نہیں ہوئی، پھر دو تین منٹ بعد دروازے پر سوار آگے  
بڑھتے دکھائی دیے لیکن وہ بھی ٹھوڑے آگے بڑھنے کے بعد  
غیر گئے۔ مہاراج رتن سنگھ بغیر صورت حال کا جائزہ لے رہا  
تھا۔ ان لمحات میں کچھ کتنا مشکل تھا کہ اگر محاصرہ کرنے  
والوں نے رست ہاؤس پر حملہ کر دیا تو مہاراج رتن اور اس  
کے گاڑے کا رڈ عمل کیا ہوگا، بہر حال وہ سب کے سب پوری  
طرح چوکس تھے۔

اچانک تاریکی میں سے ایک سایہ نمودار ہوا اور  
لڑکھاتا ہوا سا ہماری طرف بڑھا۔ مہاراج کے ذاتی ڈرائیور  
چند رو جان نے گاڑی کی تھوڑی روشنیوں سامنے پر پھینکیں  
وہ اپنا ہی آدمی نکلا۔ یہ وہی گاڑے تھے تھوڑی دیر پہلے محاصرہ  
کرنے والوں نے پکڑ لیا تھا۔ ڈرائیور نے اس کا کام لٹا علی  
بتایا تھا۔ غالباً اس کی ایک ٹانگ پر چوٹ لگی تھی۔ وہ لڑکھاتا  
ہوا آیا تھا۔ رائفل اندر آئی اور قیص بھی سامنے سے  
پھنچی ہوئی تھی۔ مہاراج کے سامنے پہنچ کر اس نے سر زوئی  
رکھی اور سیلوٹ کرنے کے بعد ایک کاغذ مہاراج کی طرف  
بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ مہاراج نے پوچھا۔  
”ان لوگوں نے دیا ہے مہاراج۔“ وہ لڑاؤں آوازیں  
بولتا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ کی گئی ہے اور  
وہ ابھی تک اپنے اعصاب پر قابو نہیں پاسکا۔  
مہاراج نے کاغذ پر نگاہ دوڑائی اور اس کے غیظ و  
غضب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ غرایا۔ ”مشن آف۔ جگ۔ اس کی یہ  
محال کہ ہمیں دھمکیاں دے۔“ اس نے کاغذ کے پڑے کر  
دیے اور ہاتھ پت پر باندھ کر ایک بار پھر گاڑی کے ارد گرد  
چکرانے لگا۔ وہ دھمکے سے نیم پڑا ہوا تھا لیکن پھر تدریج  
اس کا تپا ہوا چہرہ نرم پڑا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا رست  
ہاؤس کی طرف چلا گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر یہ بات رست ہاؤس میں سب  
کو معلوم ہو چکی تھی کہ محاصرہ کرنے والوں نے مہاراج رتن  
اور اس کے ساتھیوں کو صبح پانچ بجے تک کی سہلت دی ہے۔  
انہوں نے کہا تھا کہ اگر پانچ بجے تک ان کے مطالبات تسلیم  
نہ کیے گئے تو وہ کارروائی پر مجبور ہو جائیں گے۔ مزید برآں



انہوں نے اپنے مصالحت میں ایک مطالبے کا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ مہاراج رتن اور کینٹن بھوانی لکھ کر دیں کہ یہاں جو جانی یا مالی نقصان ہوا ہے اس کے ذمے دار وہ خود ہیں اور اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا حق نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ کسی جرمے میں کسی طرح کا دعویٰ کریں گے۔

وہ رات بے حد تاریک اور پرسکون تھی لیکن اس تاریک اور پرسکون رات کے بطن میں ایک خونی ہنگامہ پرورش پا رہا تھا۔ وہ گھڑی جو غزالہ نے مجھے تحفے میں دی تھی اور جو پھانسی کی کوٹھڑی میں مجھ سے جدا ہو گئی تھی اب پھر میرے پاس آگئی تھی۔ مجھ میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ غزالہ کی موجودگی میں میں اس گھڑی کو کھلائی پر باندھتا میں نے اسے جب میں ڈال رکھا تھا اور بوقت ضرورت نکال کر وقت دیکھ لیتا تھا۔ میں نے وقت دیکھا شب کے بارہ بج رہے تھے۔ پانچ بجتے ہیں ابھی پانچ بجتے ہیں تھے میں رست ہاؤس سے نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ان ٹیلوں کی جانب آگیا جن کے عقب میں کینٹن بھوانی اور محاصرہ کرنے والوں کے درمیان جان لیوا جھڑپ ہوئی تھی۔ نیلے کے دامن میں تین گاڑوڑے نے پرانی اینٹوں سے ایک چھوٹی سی دیوار بن کر مورچا بنالیا تھا اور اب اس "مورچے" میں بیٹھے تھکے ہوئے کر رہے تھے۔ یقیناً یہ بلکی چٹنگلی سرگوشیاں نہیں تھیں۔ اس مجبور فضا میں بلکی چٹنگلی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں ان گاڑوڑے کے پاس سے گزرتا ہوا جنوب کی طرف آگیا اور ایک ہموار جگہ پر ٹانگیں سپار کر لیت گیا۔ رست کی خیمہ نمود خنکی نے بدن میں نازکی کی لہو دوڑا دی۔ اچانک مجھے چونکا ہوا۔ کوئی میرے بالکل قریب موجود تھا۔ میرا ہاتھ خود بخود چٹولن کی جانب میں چلا گیا۔ یہاں ہٹل موجود تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے چھ فاصلے پر ایک سایہ سا میری طرف آ رہا تھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی کیونکہ اس کی ساری یا اوڑھنی کا کالہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ بھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہنسا تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر منہ سے کیا اور میرے قریب رست پر گر گئی۔ رست ہٹل کی نظر آ رہی تھی وہ اس نے چٹکیلے ٹانگوں والی ساری پہن رکھی تھی۔ بال آزاد تھے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے نفرتی توڑے تھے۔ ٹانگوں کی مدھم مدھمی میں وہ کوئی اُپر ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رست ہاؤس سے ہی میرے پیچھے آ رہی ہے۔ "نہایت ہے؟" میں نے پوچھا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" وہ ہنسی ہنسی

آواز میں بولی۔ "بات تو تم نے ٹھیک کی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا زراش ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے صبح تک کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔" "دل کے بٹلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" وہ بے دلی سے مسکرائی۔ چند لمحوں ہم دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی پھر وہ بولی۔ "میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ہوں جہانی صاحب۔ مجھے بڑا ڈر آتا ہے موت سے۔ شاید اس لیے کہ گناہ گار ہوں۔ یا شاید اس لیے کہ انسان ہوں اور موت کا ڈر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔" "تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی ہو۔"

"جی ہاں۔ میں نے گجرات یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا تھا، آگے پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن گھریلو حالات نے نوکری پر مجبور کر دیا۔ میرے پتا پتی نے دوسری شادی کر رکھی تھی۔ گھر میں میری ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایسا بے ٹاؤ کیا جاتا تھا جو اکثر بھیک منگوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ میں نے نوکری کا ارادہ ظاہر کیا تو پتا چلی کہ یہ وہاں نہیں کیا گیا کہ میں نوکری پر کیوں مجبور ہو رہی ہوں۔ وہ حسبِ عادت اپنی ذاتی دیکھارے اور پیش گوئیاں کرنے بیٹھ گئے۔ نوکری کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اگر کہیں عزت کی نوکری ملے گی تو وہاں خون پسینہ ایک کرنا پڑے گا۔ چاروں میں پتا چل جائے گا کہ عزت کی کمانی کسے کہتے ہیں۔ اور میری ایک بات لکھ لو۔ عزت کی نوکری تمہیں ملے گی بھی نہیں۔ تم جیسی لڑکیوں کو لوگ قابلیت دیکھ کر نہیں خوبصورتی دیکھ کر نوکری دیتے ہیں اور جو خوبصورتی دیکھ کر نوکری دیتے ہیں وہ صرف دیکھتے تنگ نہیں رہتے۔ نوکری کے پہلے دن سے ان کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ پانچ کی نصیحتوں اور ان کے زہر آلود بیجے سے مجھے چھٹی میں پیشہ ان کی بدایاؤں کے برخلاف چلتی تھی۔ میں نے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نوکری کر لی۔ وہیں پر مجھے مائڈنگ کی پیشکش ہوئی اور میں نے مائڈنگ شروع کر دی۔ ٹی وی پر میرے تین چار کمرشلز بہت پاپولر ہوئے۔ ان دنوں میرے بہت سے رستار پیدا ہو گئے تھے۔ ایسا ہی ایک رستار کینٹن بھوانی بھی تھا۔ وہ حسن کا شکاری ہے اور اچھے شکار کے کھوج میں اس کے ہر کارے دور دور تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ایک لمبی کمانی ہے۔ مختصر یہ کہ میں کینٹن بھوانی کے بچائے ہوئے خوبصورت جال میں پھنس کر جودھوڑ بیچتی تھی۔ جودھ پور میں میرے ساتھ وہی کچھ ہوا جس کی پیش گوئی پائی

نے کی تھی۔ میرے شر سے وہ شیشی کی ٹرمنڈی مٹی۔ میں نے سوچا اب کون سا منہ لے کر گھر واپس جاؤں گی۔ پتا پتی کا شعلہ بار چہرہ پیشہ کی طرح اپنی دانائی کی حق پر سرشار نظر آئے گا۔ میں نے واپسی کے راستے پر اس راستے کو ترجیح دی جس پر میں چل نکلی تھی۔ ایک آزاد بیچنے کی طرح میں نے دل پسند فضاؤں میں اڑنا شروع کر دیا۔ تین چار ماہ تک میں نے کینٹن بھوانی کی کینٹن انجوائے کی پھر کینٹن بھوانی کے ایک مسلمان دوست سالار احمد کے ساتھ بمبئی چلی گئی۔ وہ بیرون کا ایک بہت بڑا تاجر ہے۔ سالار احمد کے ساتھ میں نے قریباً ایک سال گزارا پھر ایک نئی آفیسر راکیش رائے کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اس کے ساتھ میں نے سکا پور کا ایک طویل اور پر لطف تقریبی دورہ کیا۔ راکیش رائے سے جب میں واپس کینٹن بھوانی کے پاس آئی تو میں بیمار تھی۔ میرے پیٹ میں ایک چھوٹی سی رسولی کا آپریشن ہونے والا تھا۔ عیاش امیر زادوں کی خصلت کے عین مطابق کینٹن بھوانی میرے ساتھ رکھائی سے پیش آیا۔ لیکن بھگوان جانتا ہے مجھے اس کے دوتے کا ڈر۔ بھگوان نہیں ہوا۔ مجھے ان امیر زادوں کے ساتھ "ڈیل" کرنا آگیا ہے۔ میں ان کے دوتے ہوئے دوتوں کے لیے پہلے سے تیار رہتی ہوں۔ مجھے اپنی قدر و قیمت کا بھی پتا ہے اور اپنی حدود کا بھی۔ کینٹن بھوانی کے پاس میں کیول آٹھ دس روپیہ رہی تھی کہ مہاراج رتن غلے مجھے اپنے ساتھ ٹانڈل اسٹیل لے آئے۔ یہاں میرا کامیاب آپریشن ہوا اور ایک ماہ کے اندر اندر میں صحت یاب ہو گئی۔ اس واقعے کو قریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس وقت سے میں مہاراج رتن کے پاس ہی ہوں۔"

میں نے سگریٹ ملگاتے ہوئے کہا۔ "نشا! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں لیکن پتا نہیں تم بچ بٹاؤ کی یا نہیں۔" وہ بولی۔ "اگر بات تمنا سے والی ہوئی تو بتا دوں گی۔ ورنہ چپ رہوں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ مہاراج رتن کتنے کیسا گھص ہے؟" وہ بے تکلفی سے رست پر نیم دراز ہو گئی اور بولی۔ "مجھے نام لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں بڑائیاں بھی ہیں اور خویاں بھی۔ کبھی وہ بہت بڑا لگتا ہے اور کبھی بہت اچھا۔ میرے خیال میں اس کی خویاں اس لیے قابلِ تعریف ہیں کہ ایسے دلوں میں اکثر یہ خویاں نہیں ہوتیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ مہاراج رتن کتنے گھص نے اپنے لیے کچھ قاعدے ضابطے بنا رکھے ہیں۔ دوسرے شدوں میں اسے مہاراج کا "اپنا ضابطہ" خلاق "بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ اس ضابطہ اخلاق سے ذرا بھی

دوگردانی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر آپ اپنی پھانسی کا معاملہ ہی لیں۔ شیخ عاصم بن ارشد آپ کی جان لینا چاہتا تھا۔ مہاراج کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ شیخ عاصم خون کا بدلہ خون مانگ رہا ہے لیکن اسٹیل کے قانون کے مطابق آپ کی جان لینے کے لیے تمام قانونی تقاضے پورے کیے گئے۔ اسٹیل کی عدالت میں آپ برآمد ہو چلا اور آپ کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ اس طرح ہر معاملے میں مہاراج اپنے قاعدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ قاعدے قابلِ تعریف بھی ہیں۔ مہاراج اپنے چھپے دیکر اصرار کی طرح رگین مزان ہیں۔ عورتوں کی بھی انہیں کوئی کمی نہیں ہے لیکن انہوں نے بھی کسی عورت کو اس کے خشا کے خلاف حاصل نہیں کیا۔ دوسرے راجاؤں کی طرح انہیں نت نئے بیاہ رہ جانے کا بھی کوئی چاڑ نہیں۔ چلی جتی کے ساتھ ان کا مزاج نہیں ملا۔ انہوں نے اسے طلاق دے دی۔ دوسری جتی کے ساتھ انہیں بے حد پریم تھا۔ اس کی موجودگی میں انہوں نے دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ بے حد مستند اور نیک خاتون تھیں۔ رحم دل اتنی کہ کسی کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ مہاراج مجرموں کو سزا میں دینے میں شہرہ میں بہت سخت رہے ہیں۔ اس عورت کے جیون کو اس غم نے کھالیا کہ اس کے بچے کے ہاتھوں لوگ اذیت ناک موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ برسوں جنگل کی سرک گئے تھے وہاں آپ نے ایک فرد بھیجی ہوئی اور میرا خیال ہے کہ وہ کمانی بھی سنی ہوگی جو اس قبر کے بارے میں بیان کی جاتی ہے۔" میں نے اقرار میں جواب دیا۔ "نشا بولی۔ "یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ایسی بے شمار کمانیاں رانی چندرا سے وابستہ ہیں۔ شاید میں آپ کو رانی کا نام بتا بھول گئی۔ ان کا نام چندرا کماری تھا۔"

میں نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق رانی چندرا قریباً چار برس قبل انتقال کر گئی تھیں۔ ریاستی قانون کے مطابق مہاراج کا تیسرا بیادہ جلد ہونا چاہیے تھا لیکن انہوں نے صرف چند ماہ پہلے بیاہ کیا ہے۔" "نشا نے کہا۔ "یہ بیاہ بھی جس طرح ہوا ہے، مجھے معلوم ہے۔ مہاراج کو چندرا کماری کے چاروں بچوں سے بے پناہ پریم ہے۔ وہ تیسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے لیکن مجبور تھے۔ ان کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ راج باٹ سے علیحدہ ہو کر اپنے کسی بھائی کو گدی پر تختادیں یا شادی کر لیں۔ آخر انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے مشیر خاص تیاری لال کو بلایا اور اسے اپنے لیے کسی اچھے

خاندان سے رشتہ تلاش کرنے کا کام۔ مہاراج کی بڑی بیٹی کی عمر قریباً چودہ سال ہے۔ مہاراج نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی نوجوان لڑکی بیاد لائیں جو اپنی بیٹی کی بڑی بہن لگے اور ناجائز کارہوں کے سبب اپنے سوتیلے بچوں کے لیے بھی مشکلات کا باعث بنے۔ انہوں نے تیواری لال سے کہا کہ ان کی ہونے والی بیٹی کی عمر چھبیس ستائیس برس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے منشا سے ایک خاص پابندی بھی قبول کرنا ہوگی اور وہ پابندی یہ ہے کہ وہ بھی بچہ پیدا نہیں کرے گی۔ اس پابندی کی ظاہری وجہ تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مہاراج آنے والے بچوں میں اپنا پریم اور اپنی وراثت تقسیم کرنا نہیں چاہتے تھے۔

شرائط کڑی تھیں لیکن ٹانڈل اینٹ کے حکمران کے لیے کسی بھی قسم کا رشتہ نامناسب نہیں تھا۔ تیواری لال تنگ نہ بننے سے کوشش کرتا تو یقیناً مہاراج کو خواہش کے مطابق رشتہ مل جاتا لیکن تیواری لال نے کیسکی دکھائی۔ اس نے مہاراج کی شادی کی آڑ میں اپنا ایک پرانی بلہ پکایا۔ مہاراج قبیلے کے ایک نہایت خوشحال زمیندار تھے جس نے کسی موٹے پر تیواری لال کی بے عزتی کی تھی۔ اب سکتے سورگ باشی ہو چکا ہے اور اس کی دودھا (بہو) زمیندارا چلائی تھی۔ سکتے کی ایک نو عمر لڑکی پریم تھی۔ وہی پریم جو اب مہاراج کی بیٹی ہے۔ تیواری لال مہاراج کے لیے رشتہ کو بے نکلا تو سیدھا سکتے کی حویلی واقع کشن گڑھ میں جا پہنچا۔ اس نے اپنی چوب زبانی سے پریم کی والدہ کو اس بڑی طرح جال میں پھنسا دیا کہ وہ اپنی پھول سی نو عمر بیٹی کا رشتہ پچاس سالہ مہاراج رتن سنگھ سے کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ مہاراج رتن سنگھ کی خواہش کے مطابق جس خاموشی سے یہ رشتہ ڈھونڈا گیا تھا، اسی خاموشی سے بیاد کی رسم ادا ہو گئی۔ ساگ کی رات جب مہاراج نے ڈھن کے چہرے سے کھوکھٹ اٹھایا تو انہیں سخت دھچکا لگا۔ وہ ان کی بیٹی سے بمشکل دو تین سال بڑی ہوگی۔ بھرا انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تیواری لال نے یہ رشتہ کس طرح گردن پر پاؤں رکھ کر حاصل کیا ہے۔ انہیں جہاں لڑکی پر ترس آیا وہاں تیواری لال پر بھی بے حد غصہ آیا۔ جہاں تک میرے علم میں بات آتی ہے، مہاراج نے اسی رات رانی کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ ان سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ رانی پریم خاندانی لڑکی ہے شریعت اس میں کوئی کوتاہی نہ تھی۔ وہ روئے تھی۔ اس نے مہاراج سے کہا کہ اب اس کا جیون ان سے وابستہ ہو چکا ہے اس کا مرنا جینا ان کے سبک ہے۔ وہ کوئی ایسی بات

سوچ بھی نہیں سکتی۔ مہاراج نے اسے دو بھتیجے کی سہلت دی اور کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے۔ وہ اسے طلاق دینے اور اس کے منشا سے اس کا بیاد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ (در اصل مہاراج کو یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ رانی پریم اپنے ہی خاندان کے ایک لڑکے سے پریم کرتی تھی) دو بھتیجے کی مدت ختم ہونے پر جب مہاراج نے رانی سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے وہی جواب دیا جو پہلے دوڑا تھا۔ اس نے کہا کہ دھرم نے انہیں جس بندھن میں پابند کر دیا ہے وہ انٹ ہے اب میں آپ کی بیٹی ہی نہیں آپ کے بچوں کی ماں بھی ہوں۔ نہ میں اپنے بچے سے بچھا ہو سکتی ہوں اور نہ اپنے بچوں سے۔

مہاراج رتن سنگھ کو اپنے مشیر خاص تیواری لال پر سخت غصہ تھا۔ انہوں نے ریاست کی عدالت میں تیواری لال پر مقدمہ چلایا اور اسے پانچ سال قید سخت کی سزا ہوئی لیکن اسی دوران مہاراج قبیلے میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو چکا تھا۔ مہاراج رتن سنگھ کے بدخواہوں نے یہ بات مشہور کر دی کہ مہاراج رتن نے سکتے کی نو عمر بیٹی کو زبردستی محل میں ڈالا ہے۔ اس کی دھواں کو درپردہ دھمکیاں دی گئی ہیں اور اسے ڈرا گیا ہے کہ اگر اس نے مہاراج رتن کو داماد کے طور پر قبول نہ کیا تو اس کی زمینوں پر نیکرو دروازے جاری ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پریم مہاراج کی بیٹی نہیں پابندی ہے اور ان کی جس بے جاں ہے اس فتنے کو بڑھاوا دینے میں وہ لڑکا بھی پیش پیش تھا جس کا کہنا تھا کہ پریم اس سے پریم کرتی تھی اور ان دونوں کا بیاد ہونے والا تھا۔ اس کا نام منوج ہے۔ رات پہلے پریم آپ نے اس لڑکے کو دیکھا بھی تھا۔ وہ پہلے کے سردار ترانہاں کا بیٹا ہے۔ لڑکا تھا۔ وہ لے قہر والا جس نے گلے میں سونے کی مولیٰ زنجیر پہ رکھی تھی۔

میری نگاہوں میں اس نوجوان کی شبیہ محو مئی جم نے مہاراج رتن سے آگے بڑھے ہیں بات چیت کی تھی اور ہر طرف میں بھرا ہوا دایں چلا گیا تھا۔ اب یہ تھکن کانی حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس رست پاؤں کا محاصرہ کن لوگوں نے ہے اور وہ کیا چاہ رہے ہیں۔ رانی پریم کے ساتھ ساتھ تیواری لال کے شخص کو حوالے کرنے کا مطالبہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراج کے کردار کا ایک بالکل مختلف روپ بھی سامنے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے لیے ایک رنگین مزاح، مغزور اور ظالم راجا تھا مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں کچھ برعکس صفات بھی موجود ہیں۔ ان صفات

میں سب سے نمایاں صفت اصول پسندی تھی۔ اس نے کچھ اصول بنائے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اصول کس حد تک مفید ہیں وہ ان کی عمل پاداری کرتا تھا۔ غزالہ کے سلسلے میں بھی غالباً اس کی یہی اصول پسندی کارفرما تھی۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ وہ غزالہ پر ”آٹھ رکھ چکا ہے“ اور ہر جوان خوبصورت عورت سے خوشنویس ہونے کی فغری خواہش اس کے اندر جوش مار رہی ہے لیکن غزالہ کے ساتھ اس کا رویہ بدستور متبدل نہ تھا۔ وہ ایک طرف غزالہ سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری طرف مجھے رشتہ کی جادو اثر خوبصورتی میں الجھا رہا تھا۔ عشق و محبت کے یہ داؤ بیچ پانے اور عامیانہ تھے لیکن انتہائی شاندار عزت کے ساتھ استعمال کیے جا رہے تھے۔ مہاراج کے بارے میں سوچتے ہوئے رشتہ کا یہ فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ ”مہاراج رتن عام انسانوں جیسا ہے۔ اس میں بڑائیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ کبھی بہت اچھا نظر آتا ہے، کبھی بہت بُرا۔“

رشتہ کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ”کس سوچ میں کھو گئے ہیں؟“ اس کے لہجے میں تشویش کے بخور تھے۔ ”کچھ نہیں۔ مہاراج رتن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آخر جانی استاد ہیں آپ۔ کوئی بات تو ہوگی جو بڑے بڑے پتے خاں اور خانب آفریدی جیسے جنگاوری آپ کو استاد کہتے ہیں۔ میں نے جب پہلی بار آپ کا کام سنا تو سوچا کہ آپ چالیس پینتالیس برس کے کوئی خونخوار شخص ہوں گے لیکن آپ بالکل مختلف تھے۔ جو اس عمر میں استاد کہلاتا ہے وہ بڑا فن کار بندہ ہوتا ہے۔“ وہ میرے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی اور جتنا جانتی تھی اس سے زیادہ پرہیز رکھتی تھی۔

میں نے پینتارہ دلا۔ ”چھاتم ہی بتاؤ۔ میں اس موجودہ صورت حال میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”مجھے نہیں پتا۔ لیکن۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ تم پر اقبال کیا جائے۔ تمہارے ان بازوؤں پر، تمہارے کشادہ سینے پر، تمہاری روشن آنکھوں پر، بھگوان جانے کیوں میں اس فن گہری میں تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔“

وہ ایک دم آپ سے تم پر آڑ آتی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ جیسے اب تک مصنوعی لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کا سچا اور کھرا لہجہ بھی تھا جس میں اس نے مجھے اب بکا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں کہیں سے دو سیلانی نہیں مٹا کر دوں اور انہیں پریم کریم یہاں سے نکل جائیں۔“ وہ پہلی بار مسکرائی۔ اگر سیلانی نہیں کی بات ہے تو پھر دو نہیں تین دو کار ہوں گی۔ تم کس غزالہ کو یہاں بھجوا کر کیسے جاسکتے ہو؟“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور یہ آہستگی اس کی سیاہ چادر کھینچ لی۔ یہ چادر اس نے ساری کے اوپر سے اوڑھ رکھی تھی۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ بے غلط فہمی کا شکار ہے ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ جو شخص بند کرے کی شرانگیز خنائی میں اس سے دور رہا تھا اب قریب کیسے آسکتا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں، میں کوئی قلمی سین نہیں کرنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے اس چادر کی ضرورت ہے۔ میں ذرا آگے جا رہا ہوں۔ تم واپس رست پاؤں میں جاؤ۔“

”کیا کرنے جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”تین سیلانی نہیں تلاش کرنے۔ تم نے میرے بازوؤں اور کشادہ سینے کی تعریفیں کر کے مجھے کچھ جذباتی کر دیا ہے۔ دل چاہتا ہے کچھ کر کے دکھایا جائے۔ میرے ناتا مرحوم ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔ خوبصورت عورت اچھے بھلے اسن پسند شخص کو زبردست جنگو بنا سکتی ہے۔“

”لیکن۔ کہو گے کیا تم؟“ وہ ابھنسنے سے بولی۔ ”جو کچھ کر سکتا ہوں اس سے زیادہ کروں گا۔ بس تم اتنا کرنا کہ اگر میں دایں نہ آیا تو کس غزالہ کی سرپرست بن کر کسی اچھی تنگ مسلمان قبیلے میں اس کا رشتہ کرادیں۔ بھگوان تمہیں اس کا مل دے گا۔“

وہ جیڑائی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے چادر کی بالکل ماری اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میری پتلون پہلے ہی سیاہی مائل تھی، اب کالی چادر اوڑھ کر میں سیاہ پوش بن گیا تھا۔ نیلے کے دامن میں چٹا میں ان درختوں کی جانب بڑھنے لگا جہاں اب روشنیان بہت کم دکھائی دے رہی تھیں۔ سرشام مہاراج قبیلے کے افراد نے جگہ جگہ جو لوگ جاتی تھی وہ اب بچہ بچہ تھی بس کہیں کہیں کسی تاج کی روشنی ٹھٹھا جاتی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس تاریک شب میں ان بھجوا جھکاؤ درختوں اور جھاڑیوں میں سے ایک دو افراد کا راہ فرار اختیار کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

چالیس بجاس گز چلے کے بعد میں رت پر اوند حالت گیا اور احتیاط سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں سے دو خٹیاں بھٹکل سو قدم کے فاصلے پر تھیں۔ وہ خٹیوں کے درمیان ایک تنگ ٹالا سا تھا۔ ٹالے کے میں چٹکیں گز چڑے پات میں کھل آئی تھی۔ میں گھنٹوں اور گھنٹوں کے مل اس ٹالے کی طرف کھینکے لگا۔ رت پر یوں پھرا لگا کہ ٹالے حد آسمان جا بہت ہو رہا تھا۔ ہوا بھرا پھٹل میری جب میں تھا اور میں اسے آٹا ٹالا ہاتھ میں کر سکتا تھا۔ ٹالے کے کنارے پہنچ کر اچانک میں ٹھک گیا۔ کہیں بالکل قریب سے انسانی آواز ابھری تھی۔ یہ آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ شاید میں دو تین گز بھی آگے گیا ہوتا تو بولنے والے کی نگاہ میں آجاتا۔ بولنے والا ٹالے کے خٹیب میں تھا اور میری نگاہ سے کھل طور پر اوجھل تھا۔ وہ دوبارہ بولا تو میں اس کی آواز صاف پہچان گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جسم میں چو خٹیاں سی رینگ گئیں۔

یہ وہی لڑکا تھا جس کا نام رشتا نے منوج بتایا تھا اور انکشاف کیا تھا کہ وہ رانی پر م کا رہی ہوئے کا دعوے وار ہے۔ رات پہلے پر میں نے منوج کو مہاراج رتن سنگھ سے ملا کر کرتے بھی سنا تھا۔ اس وقت گھانا ٹوپ تیرگی میں منوج تنگ ٹالے کے اندر کھڑا تھا اور اپنے کسی ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی بات دار آواز ابھری۔ ”تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ وہاں بات چیت کی نوبت آسکتی ہے لیکن اگر بات چیت کے لیے جانا ہوا تو تراخاں مجھے ہرگز ساتھ نہیں لے جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں جو خٹیا ہوں، میری ضرورت لڑائی میں ہوتی ہے، صلح منافی میں نہیں۔“

منوج کا ساتھی بولا۔ ”بات واقعی سوچنے کی ہے جی! اگر آئے سانسے ہونے والی تنگٹوں میں صلح منافی کا چکر لگ گیا تو کچھ۔“

”کھوتے کے پتر تو کس مرض کی دوا ہے۔“ منوج نے دھن کے جسم پر دھول جھار کر کہا۔ ”اگر تراخاں بات چیت کے لیے جاتا ہے تو تو بھی اس کے ساتھ جانے گا۔ میں نے دو تین ہندوں کی ذہنی لگادی ہے۔ وہ صلح منافی کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔ اگر کوئی ایسی بات بن بھی گئی تو تو اپنا کام دکھا دیتا۔ ایسے نازک موقعوں پر ایک گولی بھی کافی ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھا کہ کس نے چلائی ہے اور کس پر چلائی ہے۔ سمجھ رہا ہے تا میری بات؟“ یقیناً منوج کے مخاطب نے انبات میں سر ہلایا ہو گا لیکن میں دیکھ نہیں سکا۔

منوج کی آواز دوبارہ ابھری۔ ”یہ لے۔ یہ چھوٹا پھسل

ہے لیکن سے نذر داب۔ واسٹ میں رکھ لیتا۔ جب کے اندر سے ہی کام نہ کھانا جائے گا۔“

میں اس غصے منصوبے کا ایک ایک نقطہ اتنی وضاحت سے سن رہا تھا کہ لگتا تھا سنبھال میں بیٹھا ہوں اور قلعی کرداروں کو باتیں کرتے سن رہا ہوں۔ نجانے یہ کھنکھرتے والوں کی چٹکی جس قلعی یا کوئی اور بات کہ کچھ دیر بعد ان کی آوازیں دھیمی ہو گئیں۔ دو تین منٹ یہ کھسکے جاری رہی پھر غیب سے دو دم ہم ہوئے برآمد ہوئے اور مخالف سمت میں چل دیے۔ درواز قدامت منحن صاف پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ گھٹتے ہوئے جسم کا ایک شخص تھا، وہ نظر اکر چل رہا تھا۔ دس پندرہ قدم چلنے کے بعد منحن نے توجہ دشن کر ل۔ تاج کا دائرہ ٹالے کے غیب و فراز میں گردش کرنے لگا۔ یہاں چند گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور آثار سے نظر آ رہا تھا کہ عاصروہ کرنے والے ٹالے کے قریب و جوار میں موجود ہیں۔ میں کچھ دیر غصہ زنی رت پر پھٹ کے مل لینا سوچا رہا پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا۔

حالات انسانی ارادوں سے کھلونوں کی طرح کھیتے ہیں۔ کیپٹن آر کے بھائی جو سر شام بے فکری سے قہقہے لگا رہا تھا اور عاصروہ کرنے والوں کو بھیڑوں کی طرح اٹانٹا لگانے کی باتیں کر رہا تھا۔ اب رشت ہاؤس کے ایک کمرے میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اسی طرح مہاراج رتن سنگھ جو مویشاں قبیلے کے نمائندوں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا اور جسے منوج کے مست خاندان دلیہ نے آگ بگولا کر دیا تھا، اب ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ساڑھے چار پونے پانچ بجے کے قریب جب سپیدہ پھر تارکی پر غالب آنا شروع ہو اور عاصروہ کرنے والوں کی صفوں میں اضطرابی کیفیت نمودا ہونے لگی تو میں رشت ہاؤس میں مہاراج رتن سنگھ کے قریب ہی موجود تھا۔ مہاراج کے ساتھی لڑنے مرنے پر تیار تھے اور اپنی حرکات و سکنات اور اپنی زبانوں سے اپنے ارادوں کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ تاہم مہاراج انہیں سو کے منہ میں جھونکنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا سخت خون خراب ہو گا اور اس خون خرابے کے باوجود عاصروہ کرنے والوں کو روکا نہیں جاسکے گا۔ دوسری طرف مٹھا۔ مان لینا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ گھڑی کی سوئیا مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھیں۔ وقت پانچ بجتے میں دس منٹ باقی تھے جب متیق خاں دو ہوا اندر داخل ہوا۔ ایک مسل بازی گاڑو اس کے پیچھے متیق خاں نے ہانپتے ہوئے لیے میں کہا۔ ”میرا ہائی لرس!؟“

ہوڈیشن سنبھال لی جا ہے۔ وہ لوگ آگے بڑھ آئے ہیں اور کسی بھی وقت فائرنگ شروع کر سکتے ہیں۔“

”نہیں۔ کوئی گولی نہیں چلائے گا۔“ مہاراج نے مہرج کر کہا۔ اس نے بے قراری سے پندرہ میں قدم کمرے کے اندر ہی چل قدمی کی۔ پھر ایک جگہ رگ گیا اور پھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”متیق خاں! آج جاؤ اور تراخاں سے کہو کہ ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہل۔ لیکن۔“ متیق خاں بھلایا۔

”کچھ نہیں۔“ مہاراج ہاتھ اٹھا کر گرجا۔ ”جو ہم کہہ رہے ہیں وہی کہو۔“

متیق خاں نے سر جھکا دیا اور اگلے قدموں باہر نکل گیا۔ ”غصو۔“ مہاراج نے اسے پکارا۔ وہ ٹھک کر پھر اندر آ گیا۔ مہاراج نے کہا۔ ”اس سے پوچھ کر آؤ کہ وہ یہاں آکر بات کرے گا یا ہم اس کے پاس آئیں۔“

متیق خاں نے ایک بار پھر تقسیم چٹکی کی اور باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ تراخاں نے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنے دو بیادھی ملائیوں سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔

مہاراج رتن سنگھ نے متیق خاں اور اپنے دوسرے گاڑو کو ضروری ہدایات دیں۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں غزالہ کے پاس جاؤں۔ وہ پریشان ہوئی۔ میں نے کہا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

تھوڑی ہی دیر بعد رشت ہاؤس کے بیٹوں دوواڑے پر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ سردار تراخاں اور اس کے ساتھی پہنچ گئے ان کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ سردار تراخاں عام جسامت اور شکل و صورت کا شخص تھا لیکن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سے کم نہیں تھی۔ واڑھی کے بال سفید تھے قبیلے کے باقی افراد کی طرح اس نے فاکسٹری پنی والی بڑی مخصوص انداز میں لیٹ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے افراد میں میری نگاہ سب سے پہلے اس شخص پر پڑی جو نظر اکر چل رہا تھا۔ وہ بھدڑی سی ناگ والا ایک گشت چڑھو شخص تھا۔ اس نے رنگ دار موٹی چادر کی بگلیں مار رکھی تھی۔ سردار تراخاں نے آگے بڑھ کر مہاراج رتن سنگھ سے ہمنامہ کیا پھر دونوں حضرات نے نشستیں سنبھال لیں۔ دونوں اطراف کے آٹھ دس معززین بھی

نشستوں پر بیٹھ گئے باقی افراد دائیں بائیں گھڑے رہے۔ نشست گاہ مسلح افراد سے کھینچ بھر گئی تھی۔ کم دیش چٹکیں راتھلیں اور پستول وغیرہ اس کمرے میں موجود تھے۔ باحل میں زبردستی تم کاٹاؤ تھا۔ چہرے تھمٹائے ہوئے، اعصاب کشیدہ اور آنکھیں سرخ۔

مہاراج رتن سنگھ اور تراخاں بغیر کسی لمبی چوڑی حمید کے اصل موضوع پر آگے تراخاں نے کہا۔ ”راجا صاحب! ہمارے جرم کے کاغذہ فیصلہ ہے کہ گھٹے کی بٹی پر ہم سے آپ کا بیادھی کسی طرح قابل قبول نہیں۔ آپ کے لوگوں نے یہ رشت حاصل کرنے کے لیے لڑکی کے وارثوں پر ناجائز دباؤ ڈالا، دھمکیاں دیں، ہر قسم کے غلط چھنڈے استعمال کیے اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود جب ناکامی ہوئی تو لڑکی کو زبردستی بھجورے کر دئے اور مومڑیں ڈال کر لے گئے۔“

مہاراج رتن سنگھ نے الزامات حمل سے سے اور پُر سکون آواز میں کہا۔ ”وہ عورت کہاں سے تھی جی کا رشتہ دینے کے لیے ذرا یاد دھمکیاں کیا اور ایک مل کیا گیا؟“

ایک شخص تراخاں کے عقب سے چلا۔ ”وہ عورت تم سے خوفزدہ ہے اور اتنی خوفزدہ ہے کہ نہیما گل ہو چکی ہے۔ وہ تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔“

ایک دم نشست گاہ میں اچھل بھاڑ ہو گئی۔ تھمٹائے چہرے کچھ اور تھمٹائے۔ ہتھیاروں پر گرفت سخت ہو گئی۔ تراخاں نے گھوم کر اپنے بندے کو ڈانٹا۔ ”خاموش رہو، تم سے کس نے بولنے کو کہا ہے؟“ قبیلے کے تین چار افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ نشستوں پر بیٹھے معززین نے ان لوگوں کو بکھشل چپ کرایا۔ تراخاں نے کہا۔ ”راجا صاحب! ہم نے مت کہ ششتر کی ہے لیکن گھٹے کی بیوہ آپ کے سامنے آنا نہیں چاہتی۔ اس نے جرم کے کے دو دو حلفیہ بیان دیا ہے کہ اس کی بٹی کی زبردستی اس سے جھینا گیا ہے اور اس کے علاوہ زمین کے کاغذات پر بھی بڑو رخ کرائے گئے ہیں۔“

مہاراج رتن سنگھ نے کہا۔ ”اگر رانی پر م خود یہ بیان دے کہ اس پر اور اس کے اہلی خاندان پر کوئی ذبردستی کیا گیا تو پھر؟“

تراخاں بولا۔ ”وہ جب تک آپ کی تحویل میں ہے اس کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔ مان بٹی اتنی خوفزدہ ہیں کہ وہ آپ کے خلاف زبان کھول ہی نہیں سکتیں۔“

مہاراج نے کہا۔ ”تراخاں! میرے خیال میں تم اتنے بُدی دان تو ہو کہ کھوٹے کمرے میں پہچان کر سکتے ہو۔ اگر

تمہاری نیت صحیح ہے تو میں پورے دشوار سے کہتا ہوں کہ پریم کا بیان تمہاری تسلی کو نہ لے گا۔ اگر تم چاہو تو اس سے اکیلے میں بات کر سکتے ہو۔“

تراخان کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک فریہ اندام شخص بھڑک کر بولا۔ ”ہمیں باتوں میں مت الجھاؤ راجا صاحب! باتیں بہت جلد ہی ہم نے تمہاری لڑکی ہمارے حوالے کر دی اور اس کے تیار ہونے کو بھی۔ وہ تمہارا مجرم نہیں تمہارا ساتھی ہے۔ تم اسے سزا دیاؤ گے اسے سزا دیں گے اور سارا جگہ دیکھ لے گا۔“

”تراخان! اپنے بندوں کو بولنے کی تیز سکھاؤ۔“ حقیقی خاں نے کرج کر کہا اور رات نکل کھڑے سے آنارلی۔ ایک دم بچ بھاڑ کرنے والے افراد کھڑے ہو گئے اور انہوں نے حقیقی خاں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ اتنے میں نشست گاہ کا اندرونی دروازہ کھلا اور سب کی آنکھوں میں حیرت اُٹھ اُٹھ۔ رانی پریم نشست گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کے سر پر سفید چادر تھی۔ اس کی کم عمری اس کی سنجیدگی اور اس کے باوقار انداز کے عجب میں جا بھٹی تھی۔ قریباً چار برس کا بچہ اس کی انگلی تھامے ہوئے تھا۔ جوئی وہ کمرے میں داخل ہوئی ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ایک اوجیز عمر شخص آگے بڑھا اور اس نے رانی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر ایک دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر اسے پیار دیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ دونوں حضرات رانی پریم کے چچا اور ماموں تھے۔

”کیسی ہو میری پڑی؟“ رانی پریم کے چچا نے لڑاں آواز میں پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔ اور آپ کو یہی بتانے آئی ہوں۔“ وہ بے حد مستحکم لہجے میں بولی۔ چند قدم چل کر وہ سردار تراخان کے دربار جا کھڑی ہوئی۔ سردار تراخان نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”سردار! آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے آپ کو مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔ ہر حال میں آپ سب کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ شادی میری ماں کی مرضی اور خوشی سے ہوئی تھی اور اب میں اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے بچے کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ نہ مجھ پر کوئی روک ہے اور نہ کسی طرح کا جبر۔ مجھے نہیں خبر کہ آپ لوگ کس کے بھکاوے میں آکر میرا گھر اُٹاڑنے چلے آئے ہیں لیکن میں بھگوان کی سونکھ کھاتی ہوں کہ اگر ایسا کچھ ہوا تو تیراں سے میں نہیں میرا بے جان شرر جائے گا۔“

نشست گاہ کا سناٹا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا اور اس سناٹے میں صرف رانی پریم کی آواز گونج رہی تھی۔ میں حاضرین کے درمیان راستہ بنا ہوا اس لشکرے شخص کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا جو تراخان کے عجب میں ایک الماری سے ٹپک لگائے کھڑا تھا۔ میری نگاہ پر گزری اس کا جائزہ لے رہی تھی اور میں اس کی طرف سے کسی بھی ایسی دیکھی حرکت کے لیے تیار تھا۔ ٹالے کے کنارے میں نے جو گفتگو سنی تھی وہ اس قدر واضح اور دو ٹوک تھی کہ گفتگو پر ٹپک نہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی۔

تراخان کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ رانی پریم سے مخاطب تھا۔ ”دیکھو بیٹی! اس طرح کسی بات کا بھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی اور تمہاری ماما جو کچھ کر رہی ہے وہ غلطی نہیں ہے تو تمہیں ایک مرتبہ جرے کے سامنے پیش ہونا پڑے گا اور۔“

”میں ہر جگہ پیش ہونے کو تیار ہوں۔“ رانی پریم تراخان کی بات کاٹ کر بولی۔ ”جہاں چاہئے مجھے لے جاؤ۔“

میرا بیان دہی رہے گا جو اس وقت ہے۔ تراخان کے جو شیلے ساتھیوں کے چہرے لٹک گئے تھے۔ رانی پریم کا چچا جو بہت اڑکڑ کھڑا تھا ”اب ہوا نکلے غارے کی طرح ایک نشست پر لٹکھا ہوا تھا۔ مہاراج رتن اب خاموش ہو گیا تھا۔ اسے اب بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تراخان کے ہر سوال کا جواب رانی پریم خود سے دیتی تھی اور بڑے منہ توڑ انداز میں دے رہی تھی۔ اس کے اندر ایک جتنی پرست عورت کی مدح تھی اور وہ شریقت تھی جو نسل در نسل سیکڑوں برس سے اس کے خون میں سفر کر رہی تھی۔

اچانک میرے اندر کھلنے والا اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا۔ میری نگاہ شاید ایک سینکڑے کے لیے گفتگو ”دن“ کی طرف سے ہٹی تھی۔ دوبارہ میں نے اس کی طرف دیکھا تو بدن سناٹا تھا۔ چادر کے نیچے دن کا ہاتھ حرکت کر رہا تھا۔ پھر میں نے چادر کے نیچے ہتھول کا اہمار صاف محسوس کیا کوئی لمحہ جا تھا کہ اس نشست گاہ میں طبل بنگ بجنے والا تھا۔ میری نگاہیں فرید کوٹ والا واقعہ گھوم گیا۔ بابو لیاقت کی جینک میں اس سے ملتی جلتی صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ صلح صفائی کی گفتگو کے دوران اچانک جذبات بھڑک اٹھے تھے اور پہلی کوئی جلتے کی کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ اس واقعے میں ایک سالانہ پولیس آفیسر سمیت دو افراد

ہلاک ہوئے تھے۔ جوئی مجھے یقین ہو گیا کہ رنگ دار چادر کے نیچے دن کے ہاتھ میں آتشیں ہتھیار ہے، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپک کر اسے بازوؤں میں بکڑ لیا۔ میرا دایاں ہاتھ اس کے ہتھول پر آیا تھا جب کہ بائیں بازو نے اس کے دونوں بازوؤں کو گھنٹوں پر سے بکڑ لیا تھا۔ دن پہلے تو بولکھا گیا پھر اس نے خود کو پھڑانے کے لیے ایک دم زور لگایا۔ میں نے اسے زمین سے چند انچ اُپر اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ نشست گاہ میں ایک دم گھٹکی سی گج گئی۔ میں نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر دن کی گرفت سے ہتھول چھینا اور سردار تراخان کو کھمبوا۔

”یہ کیا ہے؟“ تراخان نے حیرانی سے پوچھا۔

”آپ کا یہ ساتھی کوئی چلا رہا تھا۔ پوچھیں اس سے کہ یہ کیوں کر رہا تھا۔“

دن اس بڑی طرح بولکھا گیا تھا کہ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تراخان کی عقابانی نگاہیں ایک ہی لمحے میں بات کی نہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اس نے ہتھول کو بغور دیکھ کر کہا۔ ”یہ تمہارا ہتھول تو نہیں ہے دن لال؟“

”جی۔ جی۔ وہ“ دن بھلا یا۔

اسی دوران ایک شخص نے عجب سے میری گردن پر ٹٹکا مارا۔ ٹٹکا مارنے والے کو حقیقی خاں نے دھکا دے کر کرسیوں پر گر دیا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ خون ریز ہنگامہ شروع ہو جائے گا مگر پھر تراخان نے دانشمندی کا ثبوت دیا اور لپک کر پھڑا کرنے والوں کے درمیان آگیا۔ اس نے فریقین کو ایک دوسرے سے دور ہٹایا اور مجھ سے کہا کہ میں دن کو چھوڑ دوں۔ میں نے اجازت طلب نظروں سے مہاراج رتن سکھ کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا کہ دن کو چھوڑ دیا۔ اس کے ناک منہ سے خون رس رہا تھا اور اگلوتی ٹٹک کا پتلی چل جا رہی تھی۔

تراخان نے تھک کر مہاراج رتن سے کوئی سرگوشی کی۔ پھر بلند آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ مہاراج رتن سکھ نے بھی اپنے بازوؤں کو باہر پھینک دیا۔ مجھے بھی سب کے ساتھ باہر آنا پڑا۔ رست ہاؤس کو گھر کے لیے لینے والے اب بالکل قریب آچکے تھے۔ ان کی پیٹیاں کھلا زیاں اور بندھنیں چٹا پانی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ان میں سے کئی گروہ ٹھوڑی بھی کر رہے تھے۔ یہ نئے غضب ناک قسم کے نعرے تھے۔ جلائے گئے گرائے اور

کھڑے کھڑے کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے وہ لوگ بہت بجلیات میں نظر آتے تھے۔ شاید انہیں اندیشہ تھا کہ مہاراج رتن سکھ بات چیت کو طول دے کر انہیں کسی جال میں پھانسنے کی کوشش کرے گا اور ان کا اندیشہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ ان کے نقطہ نظر سے ”مقاصد حاصل“ کرنے کے لیے یہ بے حد دشمنی موقع تھا۔ اس رست ہاؤس میں مہاراج رتن کا دورہ بالکل خفیہ تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی اس وقت کس مصیبت میں ہیں۔ وہ مکمل طور پر محاصرہ کرنے والوں کے رحم و کرم پر تھا۔ تاہم یہ صورت حال تاہر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی بھی وقت اس محاصرے کی خیر عام ہو سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد مہاراج رتن سکھ نشست گاہ سے باہر آیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر مجھے تلاش کیا اور پھر اپنے پاس بٹھلایا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ مہاراج نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے تراخان کے ساتھی کو کیوں روکا تھا اور مجھے قتل اذیت کیسے پتا چل گیا کہ وہ گولی چلانے والا ہے۔

میں نے دو گھنٹے پہلے پیش آنے والا واقعہ تفصیل سے مہاراج کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے بتایا کہ جھانپوں میں دن اور منوج ٹائی نوجوان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ مہاراج دھیان سے سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلانا رہا۔ مجھے اس کی نگاہوں میں اپنے لیے غریبی جذبات نظر آئے۔ مجھے پوری طرح چوس رہنے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ نشست گاہ میں واپس چلا گیا۔ آٹار سے نظر آ رہا تھا کہ یہ معاملہ صلح صفائی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ اتنا اچانک اور آٹا قاتا تھا کہ حواس پر بھروسہ نہیں ہوا۔ مواش قبیلے کے ایک فرد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے نر کر دیکھا۔ وہ ہمیں پینتیس سالہ شخص تھا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”میرے ساتھ آئیے۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے رست ہاؤس کے برآمدے میں لے آیا۔ یہاں مواش قبیلے کے بہت سے افراد کھڑے تھے اور نشست گاہ میں ہونے والی گفتگو کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے وہ پولنگ اسٹیشن پر ہوں اور اندر ایک کانٹے دار مقابلے میں دونوں کی گنتی ہو رہی ہو۔ مہاراج رتن کے چند بازوؤں کا رگڑ بھی یہاں وہاں کھڑے تھے۔ مواش قبیلے کا فرد مجھے ایک کونے میں سامنے عالی کے پاس لے گیا۔ سامنے عالی حسب عادت زمین پر پڑتی پائی مارے بیٹھا تھا اور لمبے ناخنوں سے

پاؤں کھجا رہا تھا۔ مجھے ساتھ لانے والے نے سانس کے سامنے جھک کر آگئی سے کہا۔ "سانس جی ایسی ہے نا!" سانس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سارے دانت نکال کر مسکرائے گا۔ ساتھ ساتھ وہ اثبات میں سر بھی ہلا رہا تھا۔ وہ شخص میری طرف گھومنا اور بے حد گھبرائے میں بولا۔ "تپ کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے؟"

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے اپنی آواز کچھ اور مذہم کی اور کہا۔ "میں سانس جی کے عقیدت مندوں میں سے ہوں۔ انہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ سانس جی نے آپ کا اور آپ کی ساتھی ایک لڑکی کا نام لیا ہے غالباً وہ چاہتے ہیں کہ آپ دونوں کو بھی یہاں سے نکالا جائے۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں "شستی" کسی بقی لہریے کی طرح گونڈ گئی۔ آہستہ سے بولا۔ "میں چار منٹ میں یہاں سب کچھ لٹایا میٹ ہونے والا ہے ہمارے لوگ ہر صورت میں مہاراج اور اس کے ساتھیوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جو بھی سردار تراخان اور دوسرے لوگ ریش ہاؤس سے نکلیں گے ریش ہاؤس پر ہلا بول دیا جائے گا۔ وقت بہت کم ہے۔ میں اپنی بات دہرائیں سکتا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں 'بہت غور سے سنیں۔ آپ بیس برآمدے میں کھڑے ہیں۔ جو بھی آپ دیکھیں کہ سامنے ٹیلیوں پر کھڑے لوگ ایک ساتھ نیچے اتر رہے ہیں۔ یعنی سب کے سب ایک دم تیزی سے اتر رہے ہیں تو آپ اپنی ساتھی لڑکی اور سانس جی کو لے کر ریش ہاؤس کے کسی بھی مقبلی دروازے سے باہر نکل آئیں۔ سرخ رنگ کی ایک لاری آپ کو سمجھوروں کے پاس کھڑی نظر آئے گی۔ وہ خالی ہو یا اس میں لوگ ہوں آپ بے دھڑک اس کی طرف آئیں اور اندر ٹھس جائیں۔ نشتر کے عقب میں جو جگہ خالی ہے وہ آپ کے لیے زیادہ محفوظ رہے گی۔ بہتر ہے کہ فرش پر لیٹے رہیں۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اس لاری کے سوا آپ گئے لیے محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ مہاراج نے ہر بات تراخان کے سامنے کھول دی ہے۔ لڑکی نے خود سامنے آکر تفصیل سے بیان دے دیا ہے۔ اب ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟"

وہ شخص "تپ" سے "تم" پر آگیا۔ رکھائی سے بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم سے جو کچھ کہا

جا رہا ہے وہ کہو۔ میں تمہارے حق میں بہتر ہے۔" وہ مجھے قیلے کی کوئی اہم شخصیت نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ "دیکھو بھائی، اگر تم اپنے بیو مرد کے لیے سوچ رہے ہو تو اپنے بیو بھائیوں کے لیے بھی سوچو۔ کیپٹن بھوانی جو اندر زخمی حالت میں پڑے ہیں سانس جی کے سرمد خاص ہیں۔ سانس جی انہی سے ملنے بھیجی سے یہاں آئے ہیں اور ان کے دوست مہاراج رتن بھی سانس جی سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "میری معلومات ان لوگوں کے بارے میں تو سے بہت زیادہ ہیں۔ تم مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔" اس شخص کا لہجہ سچائی میں ڈوبا ہوا تھا اور بیسیا کہ اندیشوں کو جنم دے رہا تھا۔ میں اندر سے کانپ گیا۔ "کیا، تصادم ٹک نہیں سکتا؟" میرا مطلب ہے اگر مہاراج مطالبات مان لیں تو۔"

"مطالبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بہت گمراہ جگہ ہے تم نہیں سمجھو گے۔"

کھسکے شرکی آوازوں نے قرب و جوار کے لوگوں کو متحرک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس شخص نے اپنا بازو میری گرفت سے چھڑایا۔ اور نگاہوں گھولیں میں سانس جی کو سلام کرتا، آگے نکل گیا۔ میں اپنی جگہ جموت کھڑا تھا۔ سانس جی کا ایک دم اٹھ کر پڑنے لگا۔ اس کا جسم حرکت میں آیا تو گنگے جھولتی ہوئی بے شمار مالاں میں اور بھی مٹی گھنٹیاں جھٹکا پچھتے لگیں۔ وہ دہانے کے ساتھ ساتھ "حق ہو" کے لہرے بلند کر رہا تھا۔ برآمدے میں موجود سب لوگ اس کے گرد ہو گئے۔ سانس جی کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ اس کے ناچ ایک خاص قسم کی موسیقی اور ایک ناقابل بیان کشش میں اس موٹے کا فائدہ اٹھا کر غزالہ کے پاس پہنچا اور ا جوتی پسنے اور چادر لینے کو کہا۔ میرا اضطراب دیکھ کر اس اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ "کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ابھی کچھ معلوم نہیں، فی الحال یہاں نکلنا ہے۔"

ایچانک مجھے زنا کا خیال آیا۔ وہ موت سے ڈری ہوئی لڑکی جو نہ جانے کیوں مجھے اپنی ڈھال سمجھنے لگی غزالہ کو کمرے میں چھوڑ کر ریش ہاؤس کے اندر مدنی کی طرف ایک زینوں پر مجھے خناب آفریدی دکھائی دیا۔ کے دونوں ہاتھوں میں بوٹھیں تھیں اور وہ جموستا ہوا آ رہا تھا۔ زینوں کے ساتھ والے کمرے میں میں

ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا برآمدے کی طرف لے چلا۔ "ہائے رام! یہ کیا کر رہے ہو۔ کدھر لے جا رہے ہو مجھے؟" وہ چلائی۔

میں سنی اس کی کرتا ہوا اسے اس کمرے میں لے آیا جہاں غزالہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ جو سنی میں کمرے میں داخل ہوا، میری نگاہ مشرق جانب کھلنے والی کھڑکی میں گئی۔ تراخان، مہاراج رتن سنگھ سے بات چیت کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے واضح تھا کہ بات چیت مودمند رہی ہے۔ تراخان کے پیچھے ہی پیچھے اس کے ذرا دور جن مسلح ساتھی بھی ریش ہاؤس سے باہر آگئے ہیں ایک کمرہ اندر میں آیا۔ میری چھٹی حس نے اعلان کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور پھر میری نظر ٹیلیوں کی طرف گئی۔ رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ بہت سے گھڑسوار اور پیدل افراد ایک بڑے جلوس کی طرح ریش ہاؤس کی جانب آ رہے تھے۔ اب سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے غزالہ کا ہاتھ تھاما اور بٹائے کہا۔ "چلو آؤ میرے پیچھے۔"

ایچانک زور وار فائرنگ ہونے لگی۔ سانس جی کا رقص دیکھنے والے محسن کی طرف لپک۔ سانس جی نے ایک فلک شکنغ نعرہ مٹانے بلند کیا اور لپک کر زنا کا بازو تھام لیا۔ زنا گھبرا کر چینی مگر سانس جی نے اسے بے پناہ قوت سے ریش ہاؤس کے مقبلی دروازے کی طرف کھینچ چلا گیا۔ میں اور غزالہ بٹائے کے پیچھے آ رہے تھے میں زنا کو پیچھے سے دھکیل رہا تھا لہذا وہ سمجھ گئی کہ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں جہاں سانس جی جا رہا ہے۔

ریش ہاؤس کے بیرونی دروازے سے نکلے ہی مجھے وہ شرح کھانا ریس نظر آئی جو ابھی ابھی سمجھور کے درختوں میں لڑکی تھی۔ بس کے دونوں دروازوں سے مسلح افراد گود گود کر باہر نکل رہے تھے۔ ذرا نیچے سیٹ پر بیٹھے شخص نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور چکر بولا۔ "جاؤ۔"

یہ وہی شخص تھا جس سے تھوڑی دیر پہلے ریش ہاؤس کے برآمدے میں بات ہوئی تھی۔ اب انہماؤند فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں بیسیاں بجائی ہو پڑا زینیں۔ ہم ٹھک کر بھاگتے ہوئے بس میں داخل ہوئے اس وقت تک بس خالی ہو چکی تھی۔ اپنے محسن کی ہدایت کے مطابق ہم نشتر کے درمیانی راستے سے گزر کر بس کے مقبلی حصے میں چلے گئے اور فرش پر بیٹھ گئے۔ بس میں میرے ہاتھ میں خور ہر آنے والی آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے میں پوری طرح تیار تھا۔ ریش ہاؤس کو مسلح افراد نے یوں گھیرا تھا جیسے مصری



کے چھوٹے سے ٹکڑے کو چو نہیں گھیر لیتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اندر سے شدید مزاحمت ہوگی لیکن صورت حال برعکس نکلی۔ ابتدا میں سیون ایم ایم اور سب مشین گن کے چند مختصر اور طویل برست مارے گئے لیکن پھر ایک دم مزاحمت دم توڑ گئی۔ میں نے ریش ہاؤس کی چھت پر مہاراج رتن کے جاں نثار محافظوں اور حملہ آوروں میں دوید و لڑائی ہوتے دیکھی۔ میری آنکھوں کے سامنے دو محافظوں کو کھلاڑیوں سے شدید زخمی کر کے چھت سے نیچے پھینک دیا گیا۔ پھر کیپٹن بھوانی کا ایک گارڈ جو بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑا مشین گن سے فائرنگ کر رہا تھا گولیوں سے چھلکی ہو کر ریش ہاؤس کے محسن میں گرا۔ ریش ہاؤس کے اندر دنی حصوں سے خود کار رائفلوں کے تھمتے مسلسل سناؤ دے رہے تھے تب میری آنکھوں نے ایک ناقابل فراموش منظر دیکھا۔ ریش ہاؤس کے مقبلی دروازے سے چند افراد جانیں بچا کر بھاگے ان میں کیپٹن بھوانی بھی تھا۔ وہی کیپٹن بھوانی جو تھوڑی دیر پہلے تک بستر پر تھا اور ذرا سا ہلکا بھی تھا تو کراہا اٹھتا تھا۔ اب اپنی جان بچانے کے لیے نہ صرف بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا بلکہ باقاعدہ بھاگ رہا تھا۔ اس کا رخ اپنی سیاہ بیب کی طرف تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ٹھٹ پروف بیب میں داخل ہو کر وہ اپنی جان بچائے گا۔

لیکن جو جان کے درپے تھے وہ اتنے غافل نہیں تھے۔

تین گھڑ سوار کیپٹن بھوانی کے پیچھے لپکے ان کے ہاتھوں میں برصاں تھیں۔ چند لمبے کے لیے میری آنکھوں میں برقی سی لہرائی۔ کچھ روز پہلے بھی میں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اس وقت کیپٹن بھوانی کی جگہ ایک زخمی سوار تھا جو جان بچانے کے لیے سر ہٹ بھاگ رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی کھڑے پر سوار تھا اور اس کا پاس کے دستے والا نیزہ چڑھتے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ کتنی جلدی اس منظر میں کسی ہولناک تبدیلی آگئی تھی۔ ایک ساعت کے لیے میرے دل میں آئی کہ باہر نکلوں اور زخمی کیپٹن بھوانی کی مدد کروں۔ لیکن دل کی آواز پر ذہن کی آواز غالب آگئی۔ یہ بہادری نہیں خود کی بھی خود کو سیکھوں افراد کے مشترکہ غضب کے جبروں میں پھینکنا پڑے وہ بے کی بیوقوفی تھی۔ معلوم نہیں یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا لیکن جو کچھ بھی ہو رہا تھا اسے اب ہو کر رہا تھا۔ ڈیڑھ واڑ دوے آؤ۔

کیپٹن بھوانی قتل ہوا لیکن میری آنکھوں کے سامنے نہیں۔ وہ گھڑ سواروں کے آگے نکل کر دوڑ دوڑ کر زخموں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ تین چار منٹ بعد میں نے اس کی خوشحال لاش دیکھی۔ دو افراد اسے باندھیں سے کھینچے ہوئے لا رہے تھے۔ یقیناً اس وقت تک وہ مر چکا تھا۔

میں نے دیکھا تین افراد اس کے دو اندوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس کے کئے پر ہم بس میں آئے تھے۔ یہ لوگ گاہے گاہے ہوائی فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ غزالہ اور زینا کانوں میں انگلیاں کھولنے، ہاتھوں میں سر دیے بے حس و حرکت بیٹھی تھیں۔ جبکہ سائیں عالی ہر چیز سے بے پروا مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ وہ جیسے کچھ بھی دیکھ اور سن نہیں رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا اور رال سینے تک بہہ رہی تھی۔

ہمارے سروں پر ابھی راجستان کا آگ برساتا سورج نمودار نہیں ہوا تھا چرخ بھی بس کے اندر جس تھا اور چوٹی سے اڑی تک پھینک رہا تھا۔

ایک ایک میری نگاہوں کے سامنے ایک اور لڑنے خیر منظر آیا۔ میں نے رالی پر دم دیکھا اس کے سر سے چادر غالب تھی۔ دو بٹے کئے افراد اسے کھینچتے ہوئے لاری کی طرف لا رہے تھے۔ وہ چلا رہی تھی اور خود کو چڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے کھینچنے والوں میں سے ایک منجنیق تھا۔ میں نے اسے کھلی کی چمکی دیکھ کر غلطی نہ سمجھ کر بچاؤ۔ لاری کے نزدیک پہنچ کر دو سرا شخص پیچھے ہٹ گیا اور منجنیق تباہی پر دم کو کھینچتا ہوا اس کے دروازے تک پہنچ گیا۔ بس پر ہزار دینے

والوں میں سے سائیں عالی کا مڑید آگے بڑھا۔ اس نے منجنیق کے ساتھ کوئی مکالمہ کیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ منجنیق کو بس میں سوار ہونے سے روکنا چاہتا ہے اور کچھ فاصلے پر کھڑے ایک ٹرک کی طرف اشارہ کر رہا ہے جیسے کہ رہا ہو کہ اس ٹرک میں سوار ہو جائے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا سائیں عالی کا مڑید نہیں چاہتا تھا کہ منجنیق لاری میں سوار ہو اور لاری میں ہماری ”موجودگی“ افشا ہو جائے منجنیق ہماری بات سنوانے میں کامیاب رہا۔ وہ پر دم کو کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دے بالی۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ بھوانی کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے میرے بے کے پاس جانے دو۔“ ساتھ ساتھ وہ منجنیق کے صندوق جیسے پینے پر دو ہتھ بھی مار رہی تھی۔ اس کی چوڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹی جا رہی تھیں۔

منجنیق نے اندر پہنچ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ لاری کے وسط میں ایک نشست پر جا گئی۔ غیظ و غضب کی زیادتی سے منجنیق کی صورت بگڑی ہوئی تھی۔ قطعی غیر انسانی شکل اختیار کر چکے تھے اس کے خدو خال۔ وہ چٹکھاؤ۔ ”حرا عبادی“ حتی سادوٹی بنتی ہے۔ ایسی کی ایسی تھی اور تیرے بے کی دوس برس پرانے یا رکو بھول گئی اور چھ مہینے پہلے کا پانی یاد رہا۔ ابھی نکال ہوں تیری ساری شوہر پرستی۔“ وہ کسی غریب کی طرح پر دم بچھتا۔ اس کی دیوانگی اپنے بڑا رہا ہاتھوں سے اپنے ہتھکڑ کو ٹوٹنے کھسکے گی۔ پر دم کی دلدل و جھجھ سے بس گونج اٹھی۔ میرا خیال تھا کہ ان جھجھوں کو سن کر کوئی پر دم کو بچانے آئے گا لیکن بس سے باہر تو کوئی اور ہی منظر نظر آ رہا تھا۔ بے شمار افراد بس کے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں لڑکے، جوان، بوڑھے سبھی شامل تھے لیکن سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے تنہا رہے تھے اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ بس کے ارد گرد کھڑے وہ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ میرے حیاں لڑا رہے تھے اور ٹھو زن تھے جیسے پر دم کی پٹیاں دیکھ کر غارتخانے میں طوطی کی آواز باندنا چاہتے ہوں۔

زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان بھی بھی کتابا ہے بس ہو جاتا ہے۔ مجھ سے صرف چند گز کے فاصلے پر ایک روٹی چلائی عورت سے ناقابل بیان سلوک کیا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پھل تھا اور میری انگلی کی ایک جنبش غلام کا خاتمہ کر سکتی تھی لیکن میں انگلی کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے گولی داغ دی تو ان دو لڑکیوں کو بچانا مشکل ہو جائے گا جو خوف و ہراس کی انتہا کو

چھو رہی ہیں اور اپنی شرم و حیا اور نسوانیت کو کھر فراموش کر کے میرے جسم سے پیوست ہوئی جا رہی ہیں۔

میں خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ غزالہ اور زینا کی طرح میں آنکھیں بند کر سکتا تھا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس سکتا تھا۔ مجھے کسی بھی خطرے سے غفلت کے لیے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ بس کے اندر جیسے بھونچال آیا ہوا تھا۔ شطان محور قفس تھا اور ایک مجبور و بے بس لڑکی کی مزاحمت کر زور پڑتی جا رہی تھی۔ وہاں وہ سب کچھ ہوا جو میں ہونا چاہیے تھا اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ میں چند گز کی دوری پر ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکا۔ بے چارگی کی بے چارگی تھی۔ میرے ہاتھ میں پھل تھا اور انگلی لپٹی پر تھی۔ مگر شدید خواہش کے باوجود میں گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں۔ جب انسان کی ساری فہم و زراست اس کی ساری دلیری اور بہادری اس کے تمام آدرش اور سارا عیب و بد پر دھرے فادہ قرار دے جاتا ہے۔ وہ آلات کی بلند و بالا ہوں کے سامنے ایک حقیر تنے کی مانند بنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاید قدرت کبھی کبھی ایسے حالات برار کرے ان لوگوں کو جن کو بھڑائی ہے جو مخلوق کو خدا کی کار و جہ بچے لگتے ہیں۔ کسی اپنے پیچھے بندے کے بارے میں ان کے ناشی جذبات اس پنج پہنچ جاتے ہیں کہ وہ اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ مجھے لگتے ہیں کہ وہ ”جسے چاہتے ہیں“ وہ ہم اعظم کا مالک ہے اور ہر نامکون کو ممکن کر سکتا ہے جیسے الہ تھی۔ بچانے وہ مجھے کیا سمجھتی تھی۔ کیا کیا توقعات اس نے مجھ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ جس بھی توقع تھی لگتا تھا کہ ماکے لیے میں الف لیلی کی کہانیوں کا وہ شہزادہ ہوں جو سیاہ بید کا مالک ہے، اور اپنی قوت بازو سے دن کو رات اور رات کو زندگی میں بدل سکتا ہے۔ ہر طوفان سے ٹکرا سکتا ہے ہر خطرے سے سرخرو نکل سکتا ہے۔ لیکن آج وہ دیکھ رہی تھی کہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لڑکی پال ہو رہی تھی۔ مدد کے لیے بلارہی ہے لیکن میں عضو منقطع بنا بیٹھا۔

وہ حشر کی گھڑیاں تھیں۔ لہذا مختصر ہونے کے باوجود بے قول تھیں۔ جب حشر بڑا ہو چکا تو منجنیق پر دم کو کھینچتا ہوا اسے لے گیا۔ میں نے غلط انداز میں غمگینی سے باہر گاہ رست ہاؤس کے مختلف حصوں سے شعلہ بلند ہو رہے۔ شعلوں کا رنگ و روپ بتا رہا تھا کہ یہ آگ پٹرول والی ہو گئی تھی ہے۔ مسلح افراد کی طرف سے ہوائی فائرنگ کا بھی جاری تھا۔ کیپٹن آر کے بھوانی اور اس کے محافظ

کی لاشیں بس کے عین سامنے کھلے آسمان تلے پڑی تھیں۔ خاص طور پر کیپٹن آر کے بھوانی کی لاش تو بس یا لاری کے بالکل قریب تھی۔ میں اس کے اوپر کھٹے منہ سے جھانکتے ہوئے جھپکے رات دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ایک دانت کا ٹوٹا ٹوٹا ہوا تھا اور یہ شکستہ دانت اس کی مسکراہٹ کو خوبصورت بنا دیتا تھا۔ اپنی تمام خوبصورتی خوش پوشی اور اعلیٰ نسبی سمیت کیپٹن آر کے بھوانی کا وہ بریف کیس یاد آیا جس میں سے مجھے کیپٹن آر کے بھوانی کے تڑائے کٹائے تھے۔ یقیناً اس نے پڑنے پر چوں کے تڑائے کٹائے تھے۔ یقیناً اس بریف کیس میں اور اہم کالڈز بھی موجود تھیں۔ معلوم نہیں اب وہ بریف کیس کہاں تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ افراد نے بھوانی اور اس کے محافظ کی لاشوں پر پٹرول آڈیلا اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے رست ہاؤس کے شعلوں میں پھینک دیا۔

میرے جوش و دہائوں کے ایک ٹوکے میں مجھے سردار ترا خان بھی نظر آیا۔ میری نگاہ اس کو ڈھونڈ رہی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بیابا ہونے والے کشت و خون اور لوٹ مار کے دوران ترا خان کا کردار کیا رہا ہے۔ لیکن اگر میرا خیال تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے لڑتا بھگڑتا نظر آئے گا۔ اس نے انہیں اس درندگی سے روکنے کی کوشش کی ہوگی جس کا مظاہرہ ٹھوڑی دیر پہلے اس لاری میں ہوا تھا تو یہ غلط فہمی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سردار بھی منظر و غضب اور جوش کے ویلے میں بہہ گیا ہے۔ یعنی مہاراج کے ساتھیوں اور پر دم و دیگرہ پر جو کچھ بتی گئی وہ ترا خان اور دوسرے بڑے بوڑھوں کی موجودگی میں بتی گئی اور اس سانحے کا یہی پہلو زیادہ تکلیف دہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے مواش قبیلے کے لوگوں کو ٹرکوں اور دوسری گاڑیوں پر سوار ہوتے دیکھا۔ کچھ لوگ بھڑا مار کر سرخ لاری میں بھی کھس آئے۔ اندر آنے والوں میں سائیں عالی کا مرید سب سے آگے تھا۔ اس نے ہمیں جلدی سے اٹھا کر رشتوں پر بٹھایا۔ سائیں عالی کے سوا ہم سب رشتوں پر بیٹھ گئے۔

”یہ کون ہیں؟“ ایک بٹے کئے شخص نے ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت سے پوچھا۔ سائیں عالی کے مرید نے کہا۔ ”انہیں میں لے کر آیا ہوں۔ یہ رست ہاؤس میں مہاراج کے قیدی تھے۔ مہاراج کے اوسوں نے بڑی مہربانی کی ہے ان سے۔ یہ سائیں صاحب بھی کئی کے رہنے والے ہیں۔ میں انہیں بہت پہلے سے

جاتا ہوں۔ یہ بے چارے بھی یہاں پہنچے ہوئے تھے۔  
اس گفتگو کے دوران ہمیں یہ پتا چلی جلاک سائیں مالی  
کے مرید کا نام سفیر احمد ہے اور وہ کسی بڑے پولیس افسر کا  
بھائی ہے۔ لاری میں موجود سب لوگ اب بڑے عور سے  
ہمیں دیکھ رہے تھے۔ غزال اور بٹائے اپنے چہرے چادروں  
میں چھپا لیے تھے اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ کچھ دیر  
ہمارے ارد گرد کھسک پھسک جاری رہی پھر سب لوگ اپنی اپنی  
نشستوں پر بیٹھ گئے۔ کسی نے لاری کے باہر سے نفرت انگیز  
نعرہ بلند کیا "مہاراج نکلا"۔  
بس کی سواروں نے گونج دار آواز میں "ہائے ہائے"

کہا۔  
دوسری بار نعرہ بلند ہوا تو ساتھ ہی ہوائی فائرنگ بھی  
ہونے لگی۔ غزال اور بٹائے کچھ اور سسم ٹھکڑیں۔ ایک بار پھر  
مجھے بریف کیس کا خیال آیا۔ میں نے سفیر احمد کو بلایا اور اس  
سے کہا کہ تھوڑی دیر پہلے نقل ہونے والے کیپٹن بھوانی کے  
پاس ایک بمست خاص بریف کیس تھا۔ وہ بریف کیس ضائع  
ہو گیا تو بمست نقصان ہو گا۔  
سفیر احمد نے اپنی آنکھوں سے ایک معنی خیز اشارہ کیا۔  
اس اشارے سے یہ مطلب نکلا تھا کہ وہ اس بریف کیس کے  
بارے میں جانتا ہے۔ تاہم اپنی الوقت مجھے اس موضوع پر  
خاموش رہنا چاہیے۔

مہاراج رتن سنگھ کے خلاف نفرت انگیز نعرہ بار بار  
بلند ہو رہا تھا۔ رست ہاؤس کے شعلے بمست اور تک جارہے  
تھے گھرے سیاہ عورتوں میں اڑنے والی چنگاریاں لاری تک  
پہنچ رہی تھیں۔ اس بمست بڑے الاؤ کے گرد سڑک گڑاوار اور  
سانڈی سوار رقص کرنے والے انداز میں پکڑا رہے تھے۔  
میں نے چند افراد کو دیکھا جو جلتے ہوئے کمروں کے اندر سے  
رنگین لٹی ری فریج اور قالین وغیرہ اٹھا کر لارے تھے۔ چند  
لحوظ بعد کوچ کا حکم ہوا اور یہ حملہ آور جھٹا تیز رفتاری سے  
مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔



مواش قبیلے کی زیادہ تر آبادی "کلاشاٹی" نام کی بستی میں  
رہتی تھی۔ یہ بستی آندل ایٹھ کی جنوبی زمینوں سے "حق  
تھی۔ قریباً آٹھ سو مکانات ہوں گے۔ ان میں تین چوتھائی  
مکان کے باہر پختہ بستی کے مرکز میں بستی ہی حوالی نما  
پختہ عمارتیں تھیں۔ یہ سب کی سب حال ہی میں تعمیر ہوئی  
تھیں۔ بستی کے نواح میں ایک سڑک بھی ذرا خیر تھی جس  
کے متعلق پتا چلا کہ وہ چندہ نہیں کھو بیڑا آگے جا کر کاتیرہ روڈ  
سے مل جائے گی۔ سائیں مالی کے مرید سفیر احمد نے ہمیں اپنی

حوالی میں آنا رہا۔ یہ حوالی بمست وسیع و عریض تو نہیں تھی مگر  
جتنی بھی تھی خوب بھی سنوڑی تھی۔ اس حوالی میں سفیر احمد  
اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ غزال اور  
بٹائے کوڑے میں پہنچا دیا گیا جب کہ میں اور سائیں مالی مساز  
خانے میں ٹھہرے۔ سفیر احمد سائیں مالی کے قدموں میں بچہ  
جارہا تھا۔ سائیں مالی کے لیے گاؤں کے کاغذ کا انتظام کیا گیا تھا۔  
بستی میں بجلی موجود تھی لیکن "مکئی" ہوتی تھی۔ دو افراد ہمیر  
بڑے بڑے پتھروں سے ہوا دینے میں مصروف ہو گئے۔  
ہمارے سامنے پانی پر ٹھنڈے شروبات سجادیے گئے۔

تھوڑی دیر بعد دوسرا کھانا آگیا۔ کھانا ہماری آمد سے  
پہلے ہی تیار تھا اس کے باوجود ہر ٹکٹ تھا۔ دو تین قسم  
عورت "چادل" خیریت روٹی، راستا مسلا دوسری کچھ دسترخوا  
پر سجایا ہوا تھا، مگر داخلہ کا اثر ذہن کے ساتھ ساتھ معدے  
پر بھی ہوا تھا اور رست ہاؤس کے وحشت ناک مناظر دیکھ  
کے بعد ہموک مری گئی تھی۔ میں نے بے دلی سے چند  
لیے ہاں سائیں مالی نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ وہ براہ راست  
ہاتھوں سے کھاتا تھا اور جتنا کھاتا تھا اس سے بمست نہ  
فرما رہا تھا۔ کھاتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں کبھی کبھی  
رہتی تھیں اور وہ سوچے سوچے خودی سکڑانے لگتا تھا۔  
حد ملے کیلئے ہاتھوں سے اسے شوربے میں انگلیاں ڈبو ڈبو  
کھاتے دیکھنا بھی ایک انوکھا تجربہ تھا۔

یوں تو سفیر احمد دہلی سے ہماری آؤ بھگت کر رہا تھا  
اس کی آمد روٹی پریشانی اس کی آنکھوں سے ترشح تھی اور  
پریشانی صرف سفیر کی آنکھوں سے ہی نہیں یہاں موج  
تھیں کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ بستی کی فضا میں  
ہیجان سا رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو اور اس "ہوئی"  
خوشی سے ہر شخص کے لبوں میں اضطراب کا زہر پھینکا ہو  
شام پانچ بجے کے قریب مجھے حوالی کے کسی ختے  
گرنے پر بستی کی آوازیں آئیں۔ ان میں سردار ترا خا  
منج کی آوازیں صاف پہچانی جاتی تھیں۔ ترا خان بہ  
ہوئے لیجے میں کہہ رہا تھا۔ "جوش سے کام لیا ہے تو اب  
بھی۔ یوں منہ چھپا کر نکل جاؤ گے تو زندگی بھر کے لیے  
بڑی بڑی کی مرگ جائے گی۔ جدھر سے گزرو گے لوگ  
تھے" یہ ناخروں کا نوا جا رہا ہے۔  
منج بولا "سردار! یہ بڑی نہیں بڑی کتے پر  
کے میدان سے بھاگتے گے ہم بھاگ نہیں رہے ہیں۔ ہم  
پھاؤں کے لیے دقتی طور پر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔"  
سردار بولا "تم تو دقتی طور پر پیچھے ہٹ جاؤ گے اور  
بستی میں بچوں بوڑھوں کو ننگ کر جائیں گے" اس کا ذہن

کون ہو گا؟

سفیر احمد کی آواز آئی۔ "سردار! وہ نئے لوگوں کو مار دیں  
گے تو پھر ان کے نئے بھی محفوظ نہیں رہیں گے اور یہ بات  
ان کو بھی معلوم ہے۔ ہم نے ان کی کسی عورت اور بچے پر  
ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ آٹھائیں گے تو پھر ہم بھی دیکھ لیں گے۔"  
سردار گرجا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ جتنی تمہاری  
عمر ہے اتنا میرا تجربہ ہے۔ بمست لڑائیاں دیکھی ہیں میں نے  
میں جانتا ہوں لڑائیوں میں کیا ہوتا ہے اور کس طرح لوگ  
انسانوں سے جانور بنتے ہیں۔ سب جانتا ہوں میں" ایک لمحہ  
خاموشی رہی پھر سردار نے کہا۔ "میرے سامنے اب ایک ہی  
راستہ ہے میں مسازراج کو سندیا بھجواؤں کہ ڈال کر  
کے رست ہاؤس میں جو چھپا ہوا میری مرضی کے خلاف ہوا  
اور حملہ کرنے والے کروہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آندل  
ایٹھ والے ان کے خلاف جو بھی کارروائی کریں گے میں  
اس میں غیر جانبدار رہوں گا۔"

منج نے کہا۔ "ٹھیک ہے سردار! جو تمہاری سمجھ میں  
آتا ہے کرو۔ ہم اپنی لڑائی لڑتے ہیں اور لڑکر دکھائیں گے  
لیکن ہمیں ہمارے گھریلو کی حفاظت کرنا ہوگی"

"پتا گھریلو تم اپنے ساتھ لے کر جاؤ" سردار بے حد  
تعلقی سے بولا۔ "جب میں تم سے اپنا تعلق ختم کروں گا تو پھر  
کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ تم لوگوں نے جو کچھ کیا  
ہے میں دل سے اس کے خلاف ہوں۔ اگر میں تمہیں پکڑ کر  
مزا نہیں دے رہا یا آندل والوں کے حوالے نہیں کر رہا تو  
اسے میری رعایت سمجھو۔ اور اہل و عیال سمیت یہاں سے  
نکل جاؤ۔"

سفیر نے مخاطب لیجے میں کہا "سردار! ڈرنا ٹھنڈے دل سے  
نور کریں۔ اگر ہم "ایک دم آواز آتا بند ہوگی" کسی نے  
رسمانی دروازہ بند کر دیا تھا جس کے راستے یہ گفتگو سمجھ تک  
پہنچ رہی تھی۔

میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔  
لکھا ہوا تھا تو ان تشویشک حالات میں بھی کسی تان کر سوسکتا  
نا لیکن میرے ساتھ دو لڑکیاں تھیں اور مجھے ہر صورت ان  
کے حفاظت کا ذمہ بھی ادا کرنا تھا۔ یہی کردار تھا جس کے سبب  
لاری کے اندر بھی ایک شیطان کو جنم واصل نہیں کر سکا  
ما۔ بڑی کڑی آواز اٹھ رہی تھی وہ ایک طرف ایک بے بس  
ت حوالی چچ و پکار رہی اور دوسری طرف میری مصلحتیں۔  
آخر میں نے جھنجھٹوں کا دامن قلم کر ایک سفاک حقیقت  
کے سامنے گردن جھکا دی تھی۔ اگر کوئی خیال اس یاد کی تلخی

کو کم کر رہا تھا تو صرف یہ کہ میں نے وہ سب کچھ اپنے لیے  
نہیں کسی دوسرے کے لیے کیا تھا۔ غزال اور بٹائے کے لیے کیا  
تھا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ اب کیا ہوگا۔ یہ حقیقت تو  
بمست حد تک واضح ہو چکی تھی کہ رست ہاؤس کے خوزیر  
بنگالے سے مسازراج رتن سنگھ کسی طور پر نکلنا ہے۔ یقیناً وہ  
سیدھا اپنی راجہ خانی جو پڑ پڑا ہوگا۔ اس کے جو پڑ پڑتے ہی  
مواش قبیلے کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہوگی اور یہ  
آگ صرف آندل ایٹھ میں ہی نہیں بجھ کر ہوگی۔ اس کے  
شعلے جودھ پور سے بھی بلند ہوئے ہوں گے۔ کیپٹن آد کے  
بھوانی ان دنوں جودھ پور میں رہتا تھا۔ تاہم اس کا اصل  
تعلق کشن گڑھ سے تھا۔ اس حوالے سے لازم تھا کہ کشن  
گڑھ میں بھی طوفان اٹھایا ہوگا اور اب کوئی وقت جتنا تھا کہ  
مواش قبیلے کے دشمن آندھی اور طوفان کی طرح اس بستی پر  
وارد ہونے والے تھے۔ یہی سبب تھا جو ہر آنکھ میں  
اضطراب کوٹ لے رہا تھا اور کچھ بمست زیادہ مضطرب لوگ  
... سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھے۔

میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ جو بستی کے در و باہم کو  
تیرگی نے ڈھانپا، سفیر احمد میرے پاس آیا۔ سائیں مالی اس  
وقت قالین پر پاؤں پیارے خراٹے لے رہا تھا۔ سفیر احمد نے  
دلی آواز میں کہا۔ "تم سائیں جی کو چکاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں  
سے روانہ ہونا ہے۔"

"لیکن کہاں؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ یہاں بستی میں ہمارے لیے  
مخت خطروں سے تم فوراً تیار ہو جاؤ۔"

وہ اپنا ہوا سا سر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے سائیں  
مالی کا شانہ سمجھو سمجھو جھجھو کر اسے چکا۔ وہ گہری سرخ  
آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر "حق ہو" کا نعرہ بلند کر کے  
اٹھ بیٹھا۔ فوراً اپنی گڈی سیٹھتے ہوئے بولا "چلو چلو۔"  
اٹھو بھاگو یہاں سے۔ بڑا خطرہ ہے۔ چلو جلدی کرو۔"

کسی وقت سائیں مالی اسی طرح بڑے پتے کی بات کرتا  
تھا۔ ہمارے اٹھتے اٹھتے سفیر احمد زبان خانے سے غزال اور  
بٹائے کو لے آیا۔ دونوں سر ناپا چادروں میں لپی ہوئی تھیں۔ یہ  
نئی چادریں انہوں نے ہمیں سے حاصل کی تھیں۔ سفیر احمد  
کے ہاتھ میں مجھے ایک بڑی خاص شے نظر آئی۔ یہ وہی بریف  
کیس تھا جس کا ذکر میں نے سفیر احمد سے لاری میں کیا تھا اور  
اس نے اشارہ کیا تھا کہ بریف کیس محفوظ ہاتھوں میں  
ہے۔ سفیر احمد نے اندر آتے ہی کہا۔ "پلیس" "پلیس جی باہر



گاڑی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔  
 سائیں عالی پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آئے۔ میاں ایک چوراہے میں دیسی سرخ لاری موجود تھی۔ لاری میں بیٹیس تھیں افراد بیٹھے تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ ایک باپردہ عورت کے سوا وہ سب جوان یا درمیانی عمر کے مرد تھے۔ سائیں عالی لاری کے فرش پر اتنی پائی مار کر بیٹھ چکا تھا۔ ہم بھی سفیر احمد کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ ابھی لاری چلی نہیں تھی کہ ہستی کے کسی حصے میں فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے لاری میں موجود افراد کا جائزہ لیا۔ ان کے چہرے پر سکون تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ ہوائی فائرنگ ہے۔ بعد ازاں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ فائرنگ تقریباً تین چار منٹ جاری رہی پھر ایک گلی سے دس بارہ گھڑ سوار برآمد ہوئے اور ہستی سے نکل کر درپے بغیر سڑک کی طرف چل دیے۔ لاری بھی اشارت ہو کر ان کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لاری میں سبھی سائیں عالی کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ غالباً سفیر احمد نے ان سے سائیں کا تعارف بڑے اچھے الفاظ میں کرایا تھا۔  
 مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہماری منزل کہاں ہے۔ بس اتنا پتا تھا کہ مہاراج رتن سنگھ کے محلے کا خوف کچھ لوگوں کو ہستی چھوڑنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اور ہم بھی ان لوگوں کے ساتھ جو سفر ہیں۔ آدھ ہونے پہنچے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ لاری میں غزالہ اور نشا کے علاوہ جو تیسری عورت سوار ہے وہ پرہم ہے۔ میں نے اس کے برادران سینڈل سے پچھا کہ وہ اس کا سراپا بھی غزالہ اور نشا کی طرح ایک طویل چادر میں چھپا ہوا تھا۔ یہ طویل چادر میاں کے مقامی لباس کا جزو خاص تھی۔ اکثر خواتین مجھے اس چادر کے پیچھے اوچھل نظر آتی تھیں۔ میں نے سوچا اگر پرہم لاری میں موجود ہے تو یقیناً منون بھی ہوگا۔ میں نے لاری میں اچھی طرح دیکھا۔ منون لاری میں نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر سواروں میں شامل ہے۔ کچھ دیر بعد میرے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ لاری کی بیڈ لائٹس میں میں نے منون کو دیکھا۔ وہ ایک تازی گھوڑے پر سوار تھا۔ فاکسٹری پیٹ وارڈ پگزی سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اسے اس کے ذیل ڈول اور گلے کی طعانی "چچن" سے پچھا۔  
 رات کی تاریکی میں ہمارا یہ سنسن سفر قریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران ایک بار ٹائز تبدیل کرنا پڑا جب کہ دوبار انجن میں کوئی خرابی پیدا ہوئی گھڑ سوار لاری کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں مارچیں بھی

تھیں۔ لاری اونچے نیچے راستے پر بڑی طرح ہچکولے کھاری تھی۔ مختصر نشست پر میں غزالہ اور نشا ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے تھے۔ غزالہ میرے اور نشا کے درمیان تھی۔ اس کا گداز جسم میرے پہلو سے پست تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ اس کے لیے جسم چرانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔  
 اونچے نیچے نیلیں اور بھاڑیوں کے درمیان کچھوے کے رفتار سے دھنکتی ہوئی گاڑی ایک دھڑلان پر پہنچ کر رک گئی۔ سب لوگ نیچے اتر گئے۔ میاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس قافلے کا سربراہ منون خود ہے۔ وہی تمام افراد کو ہدایات جاری کر رہا تھا۔ سفیر احمد کی حیثیت منون کے مشیر خاص کی تھی۔ اس قافلے میں کل پچاس افراد شامل تھے۔ غزالہ، ز اور پرہم کھاری کے سوا کوئی عورت یا بچہ قافلے میں شامل نہیں تھا۔ مجھے وہ مکالمہ یاد آیا جو چند گھنٹے پہلے ہستی میں سردار ترخان اور منون کے درمیان ہوا تھا۔ سردار ترخان۔ منون کو ہدایت کی تھی کہ وہ اور ہستی چھوڑنے والے تمام افراد اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے جائیں کیونکہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول نہیں کی جائے گی۔ سردار کی اس ہدایت کے برعکس تمام مسیح افراد اہل خانہ کے بغیر میاں پہنچے تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس سلسلے میں سردار اور منون وہ جس کسی طرح کی مفاہمت ہو چکی ہے۔  
 جس جگہ لاری رکی وہاں سے پیدل سفر شروع ہو راستہ دشوار گزار تھا۔ لہذا کئی تبدیلیاں گھڑ سواروں کو پناہ پڑا۔ منون کے ایک کارندے نے اپنے گھوڑے پر اہم بت پڑا "کیں" لہذا رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس میں پہنچے "فوری طور پر اس پینڈول کا استعمال میری سمجھ میں آیا۔ قریباً ایک گھنٹے کی دشوار مسافت کے بعد ہم ایک گھاٹی میں پہنچے۔ یہ جگہ پڑاؤ اور پناہ کے لئے بہت مناسب تھی۔ تین اطراف سے درختوں اور نیلیں کے سبب ہم گھیرے ہوئے تھے۔ چوتھی جانب ایک کٹی ہوئی دھڑلان دور تک چلے تھے۔ ہم چونکہ بلندی پر تھے لہذا فاصلے تک نگاہ رکھ سکتے تھے۔ اگر کوئی کاشانی کی ہستی سے میاں تک کا سفر طے کر رہا ہے تو وہ دو دو ہاتھ کرتے آتا تو ہم اسے دور ہی سے دیکھ سکتے تھے۔  
 منون کی ہدایت یہ تھی کہ آج شب آہنگ بالکل جلائی جائے گی۔ روشنی کا واحد ذریعہ مارچیں تھیں۔ مارچوں کی مدد سے پڑاؤ کے لیے جگہ چنی گئی۔ عا بندوبست کے طور پر چھ سات خیمے کھڑے کر دیے گئے تھے۔

افراد نے کچھ غمازات پر ڈیرا بنالیا۔ سائیں عالی کے فضل مجھے اور غزالہ و دیو کو بھی ایک آرام دہ خیمے میں جگہ مل گئی۔ یہ خیمہ ہموار زمین پر نصب تھا۔ زمین پر موٹی دھری بھی تھی اور اس پر ایک آجلی چادر پھیلا دی گئی تھی۔  
 سفیر احمد نے کہا کہ ہم آرام کریں۔ اب ڈر فکری کوئی بات نہیں۔ میں نے سفیر احمد سے کہا "جہاں تک میں سمجھا ہوں تم لوگ مہاراج رتن کی جوانی کا ردوائی کے ذریعے میاں آئے ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کا غصہ ہستی کے نئے افراد پر اٹا رہا ہے۔ ان میں تمہارے اہل و عیال بھی شامل ہوں گے۔"  
 وہ بولا "میں ایسا نہیں ہو گا۔ میں مطمئن ہوں۔"  
 "لیکن کیوں؟"  
 اس نے سگریٹ کا گھراسل لیتے ہوئے کہا۔ "سردار ترخان سب کچھ سنبھال لے گا۔ ہستی سے روانہ ہوتے وقت تم نے فائرنگ کی آواز سنی تھی؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "اس فائرنگ کا مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے اور سردار ترخان کے درمیان مجھڑ ہوئی ہے۔ اس نے ہمیں ہستی میں لوکنا چاہا ہے لیکن ہم مار دھاڑ کر کے نکل جائے ہیں۔"  
 بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ غالباً منسوبہ سفیر احمد ی کا بنایا ہوا تھا۔ ہستی چھوڑنے والے مسیح افراد نے خود کو "بائی گمروہ" ظاہر کیا تھا اور ایک نورالزانی کے بعد کاشانی سے نکل آئے تھے۔  
 اس شب آرام ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔ انجانے بدشانت نے ذہن کو گھیر رکھا تھا۔ کان ہر گھڑی بیانی آہٹوں پر لگے تھے۔ اس کے علاوہ ایک انجانا اور تیرہ و تار یک جگہ پر باہر کا خوف بھی تھا۔ میاں مشرٹ الارض کی بھاری اور ایسے کی دیواروں پر دیکھتے نظر آتے تھے۔ یقیناً میاں زہریلے شرٹات بھی ہوں گے۔ وہ شب ہم نے آنکھوں میں کافی۔ نشا سرخاموش اور کم گم تھی اور نشا پر یہ کیا موقف ہم سب موش تھے۔ میری نگاہوں میں وہ وہ کرکچین آئے کہ ہوائی مکی پھیل لاش گھوم جاتی تھی۔ ایک نہایت با اثر و بار مسوخت مں نہایت بے بسی کی موت مرا تھا۔ اور اس کی موت کا یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس سے اس کا بڑا راست کوئی ن نہیں تھا۔ پرہم سے شادی مہاراج رتن نے کی تھی بلکہ ہائے بھی کہاں کی تھی۔ تیواری لال نے کوئی بھی۔ اس پرہم کے کھرانے سے پرانا بدلہ چکانے کے لیے پرہم کی ماں اس جنجال میں بھنپایا تھا۔ اس لحاظ سے مواض فیلیہ کا

اصل نشانہ تیواری لال ہونا چاہیے تھا لیکن دیسی چکا تھا۔ مہاراج جھکارتے آتی ہوئی اس تک گھاٹی میں ہم نے پورے تین روز گزار دیے۔ پہلے ۳۶ گھنٹے تو ہر شخص زبردست اعصابی تباہ کا شکار رہا تھا لیکن پھر میرے دھرمے یہ کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ اب پھر افراد کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ مہاراج رتن اور کچین آئے کے ہوائی کے درخان تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسرا بڑا خطرہ مشرٹ الارض اور جنگلی جانوروں کا تھا۔ لیکن اب چونکہ آہنگ جلائی جا رہی تھی لہذا پڑاؤ کافی حد تک محفوظ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی جہاں حضرت انسان کی چل پھل ہو جائے وہاں جنگلی حیات کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔  
 اب گھاٹی میں مختلف جگہوں پر چار پانچ چھوٹا اریاں مزید لگائی جا چکی تھیں۔ یوں خیموں اور چھوٹا اریوں کی تعداد ایک دو تین ہو گئی تھی۔ بحیثیت قافلہ سالار منون کھاری سابق محبوبہ اور موجودہ "قدیدی" کے ہمراہ سب سے بڑے خیمے میں قیام پزیر تھا۔ میرے تجزیے کی مطابق وہ ایک بڑا بھڑا امیر زادہ تھا۔ ممکن ہے کسی وقت وہ پرہم سے محبت کر تا ہو لیکن اب اس کے دل میں اس لڑکی کے لیے نفرت اور انتقام کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً یہ جذبہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب منون نے دیکھا تھا کہ پرہم نے اپنے حالات سے بغاوت نہیں کی اور اپنی ماں کی مرضی کے مطابق چپ چاپ مہاراج رتن کے ڈولے میں بیٹھ گئی ہے۔ جب بعد میں پرہم نے اپنے بیوی کے ساتھ ہمیں خوشی رہنے ملی اور اس نے بیوی کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار دینا شروع کیا تو منون کے رقیبانہ جذبات اور بھڑکے پرہم کی بے رحمی پارستانی اور شوہر پرستی کے سانپ اس کے سینے پر لوٹنے لگے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وقت کا بہانہ روک کر اسے اٹنا چلے پر مجبور کرے گا اور اپنی شکست کو فتح میں بدل دے گا۔ اس نے اپنی چرب زبانی اور عیاری کے کل بوتے پر اپنے قبیلے میں مہاراج رتن سنگھ کے بارے میں خالصانہ جذبات بھڑکائے اور نوبت میاں تک پہنچا دی کہ مواض فیلیہ کے بہت سے لوگ مہاراج رتن کے جانی دشمن بن گئے۔  
 ہم جب سے یہاں آئے تھے میں نے پرہم کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ زیادہ وقت اپنے خیمے میں رہتی تھی۔ کسی وقت ان کے خیمے سے لڑنے بجھنے کی آواز میں بھی آتی تھیں۔ یہ چوتھی شب کا واقعہ ہے۔ قریباً سب سے کا وقت تھا۔ ایک بار پھر منون کے خیمے سے لڑائی بجھنے کا غور مٹائی دینے لگا۔ اس مرتبہ یہ شور کافی بلند تھا۔ پرہم چیخ کر کہہ کر رہی



ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ گفتگو کے دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ سفیر احمد گمشدہ ٹرک کے حوالے سے سب کچھ جان چکا ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ اس ٹرک سے میرا اور سائیں عالی کا گہرا تعلق ہے۔ سفیر احمد تک یہ معلومات کیسے پہنچیں؟ یہ بہت اہم سوال تھا۔ اس سوال کا جواب بھی مجھے سفیر احمد نے ہی دے دیا۔ وہ بولا۔ ”مماراج رتن کے ملازمین میں ہمارا ایک مخبر موجود تھا۔ اس کے ذریعے پل پل کی خبریں ہم تک پہنچتی تھیں۔ اسی مخبر کے ذریعے ہمیں پتا چلا تھا کہ مزاراج رتن اپنی جتنی پر کم کماری سمیت ”ڈال کرئی“ والے رست ہاؤس میں موجود ہے اور وہاں اس سے دو دو ہاتھ کیے جاسکتے ہیں۔ رست ہاؤس کے محاصرے کے دوران بھی وہ مخبر ہمیں ہر پل کی خبریں پہنچاتا رہا ہے۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟“ میری سوالیہ نگاہیں سفیر احمد کے چہرے پر جمی تھیں۔ سفیر نے کہا۔ ”وہ عتیق خان تھا۔ وہی گورا چٹا نوجوان جو مزاراج کے خاص محافظوں میں شامل ہے“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عتیق خان کی شبیہ میری نگاہوں میں گھومی۔ یہ اندازہ تو مجھے شروع سے تھا کہ مزاراج کے ساتھیوں میں کوئی کالی بھیڑ ہے لیکن وہ بھیڑ عتیق خان ہو گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیسے کیسے چوہوں کے پیچھے کیسے کیسے لوگ چھپے رہتے ہیں۔ نگاہیں ہر مقام پر دھوکا کھاتی ہیں اور مشاہدات دھڑکے دھڑکے رہ جاتے ہیں۔

سفیر احمد کی گفتگو سے نتیجہ نکلا کہ اسے میرے بارے میں بتانے والا اور گمشدہ ٹرک کے معاملات سے آگاہ کرنے والا عتیق خان ہی تھا۔ بعد میں سفیر احمد نے وہ بریف کس بھی کھول کر دیکھ لیا جس میں کیپٹن بھوانی کے کاغذات تھے اور جسے میرے کہنے پر سفیر احمد اپنے ساتھ ہی میاں لے آیا تھا۔ سفیر احمد ایک بڑھا کھسا ذریک شخص تھا۔ کاغذات دیکھنے کے بعد اس کے لیے بات کی ایک پہچاننا مشکل نہیں رہا تھا۔ بے حساب و شمار دولت کی کشش نے اس پر بھی اثر کیا تھا اور اب۔ وہ ہمارے ساتھ فرید کوٹ جاتے پر مصر تھا۔ اس نے انجینئر کا اٹھارہ گھنٹے الفاظ میں تو نہیں کیا لیکن جو کچھ اس نے کہا اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے رست ہاؤس کے معرکے میں ہماری جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور اب اس احسان کے بدلے وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ سفیر احمد ایک اعلیٰ پولیس افسر کا بھائی تھا اور اس حوالے سے اسے ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا یہ اثر و رسوخ ہمارے کام آسکتا تھا۔ راجستھان کے اس دور دراز علاقے سے فرید کوٹ

پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ راستے میں بہت سے اندیشے من پھارے کھڑے تھے۔ اگر سفیر احمد جیسا شخص ہمارے ساتھ ہو تا تو کئی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے سفیر احمد کی شرط قبول کر لی۔

فیصلہ ہوا کہ ہم اتوار کی شب یعنی قریباً ۳ بجے بعد پراؤ سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں سفیر احمد نے قافلہ سے پہلے یعنی بننے کی شب بھی روانہ ہو سکتے تھے لیکن میں نے جان بوجھ کر اتوار کا انتخاب کیا تھا۔ درحقیقت میں پراؤ چھوڑنے سے پہلے ایک اہم کام نشتا چاہتا تھا۔ یہ کام بہت ضروری تو نہیں تھا اور میں چاہتا تو اسے پس پشت بھی ڈال سکتا تھا لیکن نجانے کیوں پس پشت ڈالنے کو میرا ذہن نہیں مان رہا تھا۔ ایک عجیب سی گرہ پڑی ہوئی تھی دل میں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں دل و دماغ سے یہ بوجھ اتارنے بغیر چلا گیا تو دیر تک اپنے منیر کے کچھ کے ستاروں نگاہ میں نے جو کچھ لاری میں دیکھا تھا یا یوں کہنے کا جو کچھ دیکھنے پر مجبور ہوا تھا وہ کسی آسیب کی طرح میرے ذہن سے چٹا ہوا تھا۔ ایک عورت کی بے بسی، ایک وحشی کا شیطانی رقص اور پھل کی لہلی پر کاپتی ہوئی میری انگلی، ان بے رحم حالت کو میں تاحیات فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ میں تیرہ کرکٹ کا تھا کہ یہ پراؤ چھوڑنے سے پہلے منوع کو جنم دامل کر دوں گا۔ بے شک یہ ایک قتل تھا لیکن ایسے قتل میں نے پہلے بھی کیے تھے اور جی بات یہ ہے کہ مجھے ایسے قاتلوں کو قتل کر کے دلی راحت ہوتی تھی۔ شاید یہ اسی قسم کی راحت تھی جو مزاراج رتن اور کیپٹن بھوانی جیسے شکاری خطرناک جنگی جانوروں سے دوید و متاہلہ کر کے حاصل کرتے تھے۔

پچھلے تین روز میں میرے ذہن نے چپکے چپکے ایک منصوبہ بنا ڈالا تھا۔ یہ منوع کے قتل کا منصوبہ تھا۔ تین روز پہلے جب پریم اور منوع کی لڑائی کے دوران ہم خیمے میں داخل ہوئے تھے تو مجھے وہاں پیڑوں سے بھری ہوئی پانچ چھ بوتلیں نظر آئی تھیں۔ یہ پیڑوں ہم تھے چند مزید بیوں کا ساں اور اوپر بکھرا پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ منوع کے خیمے میں کم از کم ایک درجن اسلیمے ہم موجود ہیں۔ وہ ایک خطرناک کام کر رہا تھا اور بہت بے احتیاجی سے کر رہا تھا۔ اسے کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آسکتا تھا۔ مگر یہ ایک عکرا یا جیٹی ماچس کی ایک چنگاری اس کے خیمے کو بھگ سے آڑا سکتی تھی۔ منوع خیمہ دوسرے خیموں سے قدرے ہٹ کر تھا۔ ہمارے خیمے سے اس کا فاصلہ دس یا دھہ گز کے قریب تھا۔ میرے لیے یہ

مشکل نہیں تھا کہ رات کے وقت پہرے دار کی نگاہ بچا کر اس کے خیمے میں داخل ہو جاؤں اور کسی تیز دھار آلے سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالوں، بعد ازاں اس کے خیمے کو آگ دلا کر ”واردات“ کا نام و نشان مٹایا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ قابل عمل منصوبہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد سے جو پس منظر پہلے ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا کہ ہمیں فوری طور پر اور بہت افراتفری میں پراؤ چھوڑنا پڑا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ سائیں عالی سمیت ہم سب اپنے آرام وہ خیمے میں تھے۔ غزالہ اور نشا آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ سائیں عالی انہیں بند کیے بیٹھا تھا اور آگے پیچھے بھول رہا تھا۔ لگتا تھا کہ گھرے مرانے میں ہے۔ میں سفیر احمد سے پر کم کماری کا احوال پوچھ رہا تھا۔ سفیر احمد نے بتایا ”وہ برسوں سے خیمے ہوش پڑی ہے۔ تو احوال پوچھ کر ہی طرح بھگ گیا ہے۔“ ایک ہاتھ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ میں نے کہا ”ہاتھ تو منوع کا بھی مل گیا تھا۔“

سفیر نے میرے اس خیال کی تصدیق کی اور بولا ”اس کی گردن پر بھی جھینٹے پڑے تھے۔ اب وہاں زخم بن گئے ہیں۔ بہت تیز خیم کا خیراب تھا۔“

ایک لمحے مجھے گھوڑے کی ہنسا ہٹ سٹائی دی۔ گھوڑے پراؤ سے کچھ فاصلے پر باندھے گئے تھے۔ حیرانی ہوئی کہ یہ کس کا گھوڑا میاں پہنچ گیا ہے۔ میں نے خیمے کے دروازے سے باہر بھاٹکا۔ لاڈ کے پاس تین افراد گھوڑوں سے اتر رہے تھے۔ ان میں سے دو مقامی لباس شلوار قمیض اور پکڑی میں تھے۔ تیسرے نے چٹوٹن قمیض پن رکھی تھی۔ میں نے اس کی صورت دیکھی اور سکتے میں رہ گیا۔ وہ شخص تھا۔ وہی پڑانا دشمن جاں جس سے مزاراج کے عالی شان نمبر میں ٹھہر بیٹھ ہوئی تھی۔ اس ٹھہر بیٹھ کا نتیجہ شیخ عاصم بن ارشد کی ہمدستان آمد کی صورت میں نکلا تھا۔ اب وہ بد بخت اس پراؤ میں نظر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر خطبے کی لاف و فنیانیں بج اٹھیں۔ نگاہوں میں شیخ عاصم بن ارشد کا کشت چہرہ ٹوٹ گیا۔ بے شک مزاراج رتن خیمے شیخ کے چنگل سے ٹکڑ کر ”ڈال کرئی“ کے رست ہاؤس میں لے گیا تھا لیکن میری پہچانی جس مجھے مسلسل خبردار کرتی رہی تھی کہ میں خود کو شیخ کے چنگل سے آزاد نہ سمجھوں۔ ذہن یہ بات مانتا ہی نہیں تھا کہ شیخ عاصم جیسا شخص اتنی آسانی سے میرا بچا چھوڑ کر واپس وہی چلا جائے گا۔ اور اب اس امر کا جیتا جا شوت میں دشمن کی صورت اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں یہ بد روح کیسے اور کیوں کر میاں پہنچی تھی اور اس کے ساتھ اور کون کون سی امداد خیمہ تھیں، ہر حال حقیقت پہرے سامنے تھی۔ دشمن اور اس کے ساتھیوں کے گرد بہت سے افراد جمع ہو گئے۔ پھر میں نے انہیں منوع کے سرخ خیمے کی طرف جاتے دیکھا۔ سفیر احمد بھی روزن میں سے میرے ساتھ ہی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے کا بدلہ رنگ دیکھ کر وہ چونک گیا۔ ”کیا بات ہے استاد جانی؟“

میں نے اس کا کدھ کاٹھا اور اندرونی پہچان کو چھپاتے ہوئے کہا ”سفیر احمد! ہمیں کل کے بجائے ابھی میاں سے نکلتا ہو گا۔ اسی وقت۔۔۔ رات بہت گزر چکا ہو جائے گی۔“ لیکن۔۔۔ بات کیا ہے؟“ ”سفیر نے پوچھا۔ ”یہ لوگ جو میاں آئے ہیں ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہمارے سارے پروگرام پر پانی پھرنے والا ہے۔“

”لیکن کچھ نہیں۔“ اگر تم چاہتے ہو کہ سائیں عالی اور ہم تینوں کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ہم میاں سے نکلیں کہ بھلائی فرید کوٹ پہنچیں تو پھر ایک سینکڑی تاخیر نہ کرو۔“ میں اسے خفیہ طور پر دواؤں سے پرلے آیا۔

غزالہ اور نشا کے لیے دو بوسیدہ لباس اور پچھلی پرانی چادروں کا انتظام سفیر احمد نے ہی کر لیا تھا۔ میرے ساتھ پر غزالہ اور نشا نے لباس تبدیل کر لیے۔ قمیض تو وحشی آستین والی تھی۔ مقامی رواج کے مطابق انہوں نے بازوؤں پر پلاسٹک کے پتے ہوئے درجن درجن کڑے پہرے چھالے۔ ناک میں بڑی بڑی تمھیلیاں اور پاؤں میں چھپیل تھیں۔ ان کے سروں پر دو دو گھڑے رکھ دیے جاتے تو وہ ہو ہو دستانی عورتیں نظر آتیں۔

صرف دس منٹ بعد میں ”غزالہ“ نشا اور سائیں عالی گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ سفیر احمد اور اس کا ایک ساتھی ہمارے ساتھ تھا۔ سامان کے نام پر ہمارے پاس فقط ایک بریف کیس تھا۔ یہ وہی بریف کیس تھا جس پر کیپٹن آر کے بھوانی کا نام پڑے۔ خوبصورت حریف میں درجن تھا۔ سفیر احمد اس خانے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ہمیں محفوظ اور نسبتاً کم دشوار راستوں پر چلا تا رات قریب تین بجے پختہ مرکز پرلے آیا۔ سفیر احمد کی اطاعت کے مطابق اس براجم روزیروں کے وقت ”ٹرٹک“ چلتا تھا۔ پتہ آئے گا۔ یہ براجم روزیروں کے لیے بکائیے جانے والی بڑی مرکز سے مل

جاتی تھی۔ حساب کتاب جو ذکر سفر نے اندازہ لگایا تھا کہ پہلی بس جو صبح چار بجے کے قریب ”کھڑی“ مانی گئی تھی وہاں سے روانہ ہوئی ہے پانچ بجے کے گنگ بنگ اس مقام سے گزرے گی۔ ہم اس پر سوار ہو کر دوں بجے بیکانیر پہنچ سکتے تھے۔ اس مقام سے سفیر احمد نے گھوڑے والوں کو روانہ کر دیے۔ سفیر احمد کے ساتھ آئے ہوئے شخص نے گھوڑوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے بانٹیں اور سب سے اگلے گھوڑے پر خود سوار ہو کر تاریکی میں او جھل ہو گیا۔ ہم سڑک سے کچھ ہٹ کر بنجر اور بھول کی گھنی جھاڑیوں میں بیٹھ گئے اور بس کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور سفیر احمد کے ”حساب کتاب“ کے عین مطابق پانچ بجے شرقی جانب سے بس کی روشنیاں ظاہر ہوئیں۔ سفیر احمد اور میں سڑک کے اوپر جا کھڑے ہوئے اور ہاتھ دے کر بس روک لی۔ یہ لوکل روٹ پر چلنے والی کار بائیں تھی۔ رش اتنا تھا کہ چھت پر بھی لوگ نظر آ رہے تھے اس کے علاوہ بت سا ساندو سامان تھا جو انبار کی صورت بس کی چھت پر پڑا تھا۔ میلے کیلے کنڈیکٹر نے بے رخی سے کہا کہ اگر ہم ضرور سوار ہونا چاہتے ہیں تو پھر چھت پر چڑھنا ہو گا۔ اگلی بس تین چار گھنٹے بعد آنا تھی۔ لہذا مجبوراً یہ شرط ماننا پڑی۔ میں اور ”سفر“ سامنے عالی کو سارا دے کر چھت پر لے گئے۔ غزالہ اور ریشا کو منصف نازک ہونے کی رعایت دی گئی اور کنڈیکٹر نے انہیں کسی نہ کسی طرح بس میں گھسیڑ دیا۔ اکثر کنڈیکٹر حضرات ایسے کاموں میں ماہر ہوتے ہیں۔ خاص طور پر خواتین کے لیے جب بیاتے میں انہیں کمال حاصل ہوتا ہے۔ جہاں مل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی وہاں وہ پوری پوری خواتین دھردیتے ہیں اور پھر اسی مختصر ترین جگہ میں خود بھی گھس کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے کنڈیکٹر حضرات کو کچھ اور آنا ہوتا نہ وہ دو دن سے بس میں رنگ برنگ ضرور آتا ہے۔ بس کی چھت پر سفر کرتے ہوئے اس سفر کی یاد تازہ ہو گئی جو ہم نے جنگ سے فاشنگ کے نواح تک بذریعہ ٹرک کیا تھا۔ مجھے وہ خوفناک مشین مگن یاد آتی جو ایک منٹ میں قریباً 600 راؤنڈ فائر کرتی تھی اور ایک میل کے دائرے میں ہر شے کا مفلایا کر دیتی تھی۔ اور پھر زبردیں کل یاد آیا جس نے اس مشین گن کی مدد سے جنگ سے فاشنگ تک اپنا اور ہم سب کا زبردست دفاع کیا تھا۔ اس ٹرک کی چھت اور مسافر بس کی چھت میں بہت فرق تھا لیکن محسوسات ایک ہی طرح کے تھے وہی سامنے سے ٹکرائی ہوئی تیز ہوا، ٹکڑی کی ”بازی“ سے ابھرنے والی

چوں چوں کی آوازیں، دور دور تک دکھائی دیتے ہوئے مناظر، ہمارے ساتھ چھت پر سواری کرنے والوں میں کسی سائیکل کیشنری کے دس بارہ ملازم تھے کچھ دودھ فروش اپنے بڑے بڑے برتنوں کے قریب بیٹھے تھے کچھ سبزی فروش تھے جو تازہ سبزی لے کر بیکانیر جا رہے تھے انہیں میں گفتگو اور ہنسی مذاق بھی جاری تھا۔ باتوں باتوں میں ایک دودھ فروش نے ایک ایسا موضوع چھیڑا کہ ہماری رگوں میں لو سنسٹا آگیا۔ یہ دودھ فروش کھڑی سے آیا تھا۔ کھڑی سے سواش قبیلے کی بستی ”کاشانی“ دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ دودھ فروش نے بتایا کہ ایک دوڑ پلے کاشانی میں زبردست ہنگامہ ہوا ہے سنا ہے کہ چھ سات آدمی مارے بھر گئے ہیں۔ ایک دوسرے دودھ فروش نے اس خبر کی تصدیق کی اور پرجوش لہجے میں بتایا کہ اس کا سنا بھائی ہنگامے کے وقت کاشانی کے ساتھ والے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ اس نے کہا ”اس گاؤں کا نام داس پور ہے وہاں بھی سواش قبیلے کے لوگ رہتے ہیں۔ جس وقت ہنگامہ ہوا داس پور سے بچ بچاں ساتھ بندے ٹرک پر زالیوں پر سوار ہو کر ”کاشانی“ گئے تھے لیکن وہ راستے سے ہی واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ کاشانی کو پولیس کی دو جنوں گاڑیوں نے گھیرے میں لے کر ہے۔ اس کے علاوہ آئندہ اسٹیٹ کے ہمارا راج رتن سنگھ ڈاٹی فورس اور کشن گڑھ سے آئے ہوئے بہت سے لوگ بھی کاشانی میں موجود ہیں۔ شام کے وقت پتا چلا بستی میں سات آٹھ بندے مارے گئے ہیں اس کے علاوہ پولیس قریب ایک سو بندوں کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔“ بعد ازاں اس خبر پر مگر مگر میرے متوجہ ہو گئے کسی نے کہا کہ یہ زین کا بھنگو ہے کسی نے کہا لڑکی کا مچا ہے کسی کے خیال میں یہ پرانی رقابت تھی۔ صحیح بات کا ابھی تک کسی کو بھی نہیں تھا۔ صرف ایک شخص نے قدر معقول بات کی۔ اس نے کہا ”ہمارا راج رتن سنگھ کی بیٹی سواش ہے۔ وہ سوکتا ہے وہی اس بھنگوے کا سبب بنی ہو۔ اس کا مطلب تھا سردار تزا خان کے تمام اندبا درست ثابت ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ رشتہ باز والے واقعے کے اصل ذمے دار بستی چھوڑ چکے تھے اس آٹھ افراد پولیس مقابلے کے بہانے مار دیے گئے تھے اور افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ ان خبروں میں مبالغہ آرائی ہو لیکن انہیں سرے سے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس پتھر میں نے ست رفتاری کے نئے دیکھا

کرتے ہوئے ہمیں قریباً بارہ بجے بیکانیر پہنچا۔ بیکانیر سے ہم نے دوسری بس چڑھی اور سورت غمزدانہ ہو گئے۔ سورت گھر سے فرید کوٹ تک کا پانی ماندہ سفر میں بے چارے چوہیں گھٹنے میں لے لیا۔ یہ ایک دشوار اور پُر خطر سفر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دشمن ہر جگہ گمات لگائے ہوئے ہیں۔ اور وہ کوئی معمولی دشمن نہیں تھے ان میں شکر شکر ایسے قاتل، بیٹنی جان جیسے ڈاکو اور آغا قادر زماں جیسے سفاک جاگیردار تھے۔ وہ سب دولت کی ہوس میں دیوانے ہو رہے تھے اور میں اتفاقی طور پر ان کے نشانے پر آ گیا تھا۔ اور پھر میرا دھیان شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔ ایک اور گھوسال پر پڑا۔ میں شیخ کو کیوں فراموش کر رہا تھا۔ اب وہ بھی تو میرے شکاریوں میں نابل ہو گیا تھا اور وہ اس لحاظ سے خطرناک ترین شکاری تھا کہ اسے کسی دھننے کی نہیں میری لاش کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بغیر کسی سوال جواب کے کوئی سے آڑا سکتا تھا۔ ایک مدت سے میرے خون کا پیاسا تھا۔ گزرنے والے ہر نا اور ہر مل کے ساتھ اس کی پیاس میں شدت آتی تھی اور اب وہ مجھے اسے نوکیلا بچوں اور تیز دانتوں سے چھانڈنے کے لیے فراری کی کوششیں چھوڑ رہا تھا۔ مختصر الفاظ میں بیکانیر سے فرید کوٹ تک کا ہمارا وہ سفر راج کا سفر تھا۔ ہم گھوڑے تیز اور بال سے باریک راستے چل رہے تھے اور کوئی بھی اعتراض ہمیں کاٹ کر دوڑنے کی مرائی میں پھینک سکتی تھی۔ میں نے سکھوں کی طرح پگڑی پٹ رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا ستا سا چشمہ تھا۔ ایک ٹی چادر میں نے پگڑی کے اوپر سے گزار کر یوں کندھے پر لی تھی کہ چہرے کا زیریں حصہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ دوران سفر سفیر احمد نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ ”اس سے پتا چلا کہ وہ پنجاب ہی کا رہنے والا ہے۔ اس کے بڑے بھائی حاجی نذیر احمد فیروز پور کے ایس ایس بی تھے۔ بڑے دھانسو قسم کے آفسر تھے اور پولیس لائن میں انہیں نے بادشاہ کہا جاتا تھا۔ حاجی بادشاہ کے جہاں دوست بہت وہاں دشمن بھی بہت تھے۔ ایک برس پہلے ایس ایس بی نے بادشاہ جب ایک جنازے میں شرکت کے لیے اپنے لڑکوں گئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ اسلحے میں حاجی بادشاہ کو تعجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ تاہم احمد کے ہاتھوں مخالف فریق کا ایک کوجوان قتل ہو گیا۔ سفیر احمد پر قانون کے مطابق کس پلاؤ دار جیشیں ہی اس کی ضمانت ہو گئی۔ اس ضمانت نے مخالفین کی جلتی ل کا کام کیا اور وہ سفیر احمد کی ناک میں رہنے لگے۔ دو ماہ

کے قلیل عرصے میں سفیر تین مرتبہ حملہ ہوا۔ حاجی بادشاہ نے خضر بھانپ کر سفیر کو کچلنے سے راجستان بچ گیا۔ سواش قبیلے کے سردار تزا خان کا شمار حاجی بادشاہ کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ اس نے سفیر احمد کو خوش آمدید کہا اور بیکانیر کی کہ جب تک فیروز پور میں حالات ٹھیک نہیں ہوتے وہ ان ہی کے پاس قیام کرے۔ پچھلے چھ ماہ میں سفیر احمد صرف چھوٹی اور بڑی عید کے موقع پر فیروز پور گیا تھا لیکن دونوں مرتبہ حاجی بادشاہ نے اسے تین چار دن سے زیادہ وہاں نہیں رہنے دیا تھا۔ سفیر احمد میرے لیے ”کام کا آدمی“ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حاجی بادشاہ اسے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتا ہے کیونکہ اس کے سوا حاجی بادشاہ کا کوئی قریبی عزیز اس ریش میں موجود نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کرنا اپنا فرض اولیٰ سمجھتا تھا۔ اگر سفیر احمد میرے ساتھ چلے گا تو میری تو مجھے حاجی بادشاہ کی اعانت و حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔ سورت گھر سے فرید کوٹ تک ہم نے زمین میں سفر کیا۔ اس سفر کے دوران میں نے سفیر احمد کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ ٹرک اور ٹرک کو پیش آنے والے حالات کے بارے میں وہ پہلے بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے اسے کچھ مزید تفصیلات بتائیں۔ عشرت فارم سے ٹرک کی پراسرار گمشدگی کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ وہاں ایک قاتل بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسی کوئی لڑکی لی ہے جس کی عصمت درہ کی گئی ہے۔ وہ بد نصیب دہنی مرتضیٰ نظر آئے گی ہے اور جتنی سوچوں والے ہر شخص کو دیکھ کر کھجانی انداز میں جینے لگتی ہے۔ میں نے سفیر احمد کو ان عجیب شواہد کے بارے میں بھی بتایا جو سوتے سے ملے تھے۔ زہر میں بیٹھے ہوئے تھیوں اور پراسرار خجے کے بارے میں سن کر وہ بھی حیران ہوا۔ میں نے سفیر احمد سے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس پولیس آفسر سے ہمارا رابطہ ہو جائے جو اس واردات کی تفتیش کر رہا ہے۔ یقیناً اس حوالے سے کچھ نہ کچھ پیش رفت تو اس نے کی ہوگی۔“ سفیر احمد نے کہا۔ ”پولیس آفسر کا نام تم جانتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”میں نے بتایا ہے مگر واردات کے صرف آٹھ گھنٹے بعد میرے ساتھ سامنے عالی والا واقعہ پیش آیا تھا۔ سامنے نے میرے سر پر پتھر مار گئے۔ بے دوش کردیا۔ دوبارہ ہوش آیا تو میں جو پور کے نواح میں تھا۔“ سفیر احمد نے سگریٹ کا کھرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”پہلے



میزی لے کر فارم پر پہنچا تھا۔ یہ کئی سڑی سڑی مچھلیوں کو خوراک کے طور پر ڈالی جاتی ہے۔ رمضان نے بتایا کہ ڈیرے پر ہو گا عالم عادی تھا۔ کہیں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا۔ میزچیوں کے پاس چوکیدار کا کھانگھہ کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سر پر کئی تیزو حار آٹے سے زخم لگایا گیا تھا۔ لاش کے پاس ہی ایک کتا بھی مر چکا تھا۔ اس کی گردن خوفناک انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ نمبردار عشرت اور اس کے ملازمین میں سے کوئی بھی ڈیرے پر نظر نہیں آیا۔ رمضان کے بقول ایک رات پہلے ڈیرے پر بگنوں سے لدا ہوا لڑک موندو تھا اور نمبردار صاحب کی کئی کھوکھریاں ڈیرے پر پھڑکی تھیں۔ یہ دونوں گاڑیاں ڈیرے پر نظر نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ اندرونی کمرے میں ایک دو الماریوں کے نالے بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایک الماری میں سے ستراتی ہزار کے زیو رات اور دس ہزار روپے نقد نکال لیا گیا۔ رمضان علی سے پوچھا گیا کہ وہ اس واردات کے سلسلے میں کس پر شک کر سکتا ہے۔ اس نے ایک ہڑوسی زمیندار کا نام لے دیا۔ اس زمیندار کی نمبردار عشرت سے عداوت چلی آ رہی ہے اور کئی مرتبہ دونوں پارٹیوں میں سر پھول بھی ہو چکی ہے۔ واردات سے چند روز پہلے اس زمیندار کی کچھ بیٹنیں مچھلی فارم کی حد بندی توڑ کر تالاب میں گھس آئی تھیں۔ یہ بیٹنیں نمبردار عشرت کے کارندوں نے انہی تک واپس نہیں کی تھیں۔

انسپکٹر دربار سنگھ نے جب سے سگریٹ کی دنیا نکال کر ایک سگریٹ پیجے اور سفیر احمد کو پیش کیا پھر سلسلہ کام جوڑنے ہوئے بولا "اسی دوران ہمارے ایس پی صاحب کو ایک فون کال ملی اور اس میں بتایا گیا کہ گنڈارا پور کے عشرت فارم میں ہونے والی قتل کی واردات کوئی معمولی واردات نہیں ہے۔ وہ ٹرک غیر معمولی ہے جو فارم سے غائب ہوا ہے۔ یہ وی پاکستانی ٹرک ہے جس میں صندوق لدے ہوئے ہیں اور جس کے پیچھے پورے ضلع کی پولیس پانگل ہو رہی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی صورت حال ایک دم بدل گئی۔ ایس پی اور ڈی ایس پی سمیت کئی انسپکٹر اور پور گاؤں پہنچ گئے اور کس کی تفتیش تبدیل کر کے میرے سپرد کر دی گئی۔ میں نے ایک ہی روز میں اندازہ لگایا کہ اس سے پہلے پرانے نام تفتیش ہوتی ہے اور جتنی ہوتی ہے وہ بھی عام سے انداز میں ہوتی ہے میں نے سنے سرے سے کام کا آغاز کیا۔ جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ عشرت فارم پر آنے والا ٹرک وہی ٹرک تھا جس پر بموں کے نیچے صندوق لدے ہوئے ہیں اور جسے تین افراد پاکستان سے چلا کر یہاں لائے ہیں۔ ان میں

دار ہو چکا تھا۔ بابو کی فیکٹری سے ہمیں ایک بوئے کی لاش ملی۔ یہ آغا قادر زمان کا بازی گاڑو تھا اور اسے پانچ دو سرے افراد کے ساتھ استاد جانی نے شکر شرکا کے ٹھکانے سے انوا کیا تھا۔ ہمارے کھوجیوں نے فیکٹری میں بھی سخت محنت کی اور کئی اہم کمرے اٹھائے۔ ان میں استاد جانی کا کمرہ بھی تھا۔

میں نے پوچھا "اب تمہارا کیا خیال ہے؟ استاد جانی کہاں ہے اور نمبردار عشرت وغیرہ کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "مجھے دشواری ہے کہ استاد جانی بابو لیاقت اور اس کے تمام قریبی ساتھی زیر زمین چاہتے ہیں اور انہیں ان کی پناہ گاہوں سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ جہاں تک نمبردار عشرت کا تعلق ہے، ممکن ہے اسے سوڈے بازی کے لیے برغمال بنالیا گیا ہو۔ نمبردار عشرت کے علاوہ ایک کو کئی لڑکی چھپس اور دو عمو لازم بھی موقع سے غائب ہیں اور میں ممکن ہے کہ وہ بھی بابو لیاقت اور استاد جانی کی جگہ سے جا میں ہوں۔ درحقیقت میں تین چار افراد تھے جو 22 مارچ کی رات عشرت فارم میں موجود تھے۔ ان میں سے چوکیدار کا کھانگھہ کے موقع پر ہلاک ہو گیا تھا بانی تیزوں کو حملہ آور ہانڈ کر اپنے ساتھ لے گئے تاکہ واردات کا کھوج کرا مٹایا جائے۔"

میں دربار سنگھ پر دل ہی دل میں لعنت بھیج رہا تھا۔ وہ بہت عیار اور گماں شخص نظر آتا تھا لیکن اس معاملے میں بڑی طرح مات کھایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بابو لیاقت جیسا با اثر شخص اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت صرف اس کے خوف سے روپوش ہو گیا ہے حالانکہ صورت حال مختلف تھی۔ میں بہت پہلے سے بمبار چکا تھا کہ اگر وہ نہ بانو بابو لیاقت اور ڈیرے میں روپوش ہو گیا ہے تو پھر اس کے لیے ٹھکانے پر نظر نہیں آئیں گے اور واقعی وہ غائب تھے۔ لیکن ان کی روپوشی کی وجہ قانونی کارروائی کا خوف نہیں شکر شرکا کی شیطانت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شیطان ابن شیطان اپنی اصلیت پر اتر آیا ہے اور اب وہ جتنی بھی محنت پھیلانے کم ہے۔ انہوں نے بہتر جانا تھا کہ عارضی طور پر مختصر سے ہٹ جائیں۔

میں نے انسپکٹر دربار سنگھ سے پوچھا۔ "کیا تم مجھے موقع واردات دکھا سکتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا۔ آپ سے کیا چاہا ہے۔ حکم ہو تو ابھی چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو چلو۔ میں صرف پانچ منٹ میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد میں اور سفیر احمد انسپکٹر دربار سنگھ کے ساتھ ایک جپ میں سوار گنڈارا پور گاؤں کی طرف جارہے تھے۔ میں نے غلط فہمیں پن کر اوپر سے سوئی چادر لے لی تھی اور اس چادر کے پلو سے چو اس طرح چھپایا تھا کہ پہلی نگاہ میں مجھے پہچانا جانا ممکن نہیں تھا۔ گنڈارا پور گاؤں کا فاصلہ قریباً پندرہ میل تھا لیکن رات کا وقت تھا اور سڑکیں خالی تھیں۔ ہم صرف آدھ گھنٹے میں گنڈارا پور پہنچ گئے۔ 22 مارچ کی رات بھی قریباً یہی وقت تھا۔ جب میں ڈیرے میں گل اور بابو لیاقت ٹریکٹر ٹرائی پر سوار میاں پیچے تھے۔ اس تاریک رات میں جوش آنے والے تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ چوکیدار کی لاش اور اس کے دو سسرے بتا ہوا سیاہی مائل خون اور ڈیرے میں بیٹھے ہوئے تیرے اجڑا ہوا سترخون اور ایک اجڑی بکری کے زبان لڑکی۔ ہم صدر کے بلانے پر عشرت فارم پہنچے تھے لیکن وہاں نہ صدر تھا نہ ولایت اور نہ ٹرک۔ اس رات ہم نے عشرت فارم کے گرد و نواح میں ٹرک کو بہت تلاش کیا تھا لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ آخر علی الصباح ہم واپس فرید کوٹ روانہ ہو گئے تھے۔ آج میں بائیس روز بعد میں پھر عشرت فارم کا رخ کر رہا تھا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے تو دو مسلح کاشیلوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈیرے کے اندرونی دروازوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ انسپکٹر دربار سنگھ نے ایک تالا کھولا اور ہمیں اندر لے آیا۔ اس نے میزچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھئے۔ یہاں ایک جگہ ہے جہاں چوکیدار کا کھانگھہ کی لاش پائی گئی تھی۔ اس کے سر پر کئی دھنکی دھنکی سے ضرب لگائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کھانگھے کا پھل ڈیرے میں بچھا ہوا تھا۔ جس تیزو حار آٹے سے ال سیشن گئے کو فنگ کیا گیا وہ بھی ڈیرے میں بچھا ہوا تھا۔" پھر وہ ہمیں ایک بنٹلی کمرے میں لایا۔ اوڑ بولا۔ "میاں ایک چار پائی ملی تھی جس کے قریب اور ان کی رتی پڑی تھی۔ شاید سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کسی عورت کو بانڈھا گیا تھا۔ میں ممکن ہے کہ وہ چھپو رہی ہو۔"

وہ ہمیں کوٹھی فرما حولی کے مختلف حصوں میں ٹھہراتا رہا اور ساتھ ساتھ "کٹری" کمرہ بنا۔ "میاں سے کھرا اٹھایا گیا تھا، میاں خون کے وجہ سے تھے، میاں شراب کی بوتلیں فونی پڑی تھیں" میں اس کی باتیں سنتا رہا لیکن میرا دھیان اور نہیں تھا۔ جو کچھ دربار سنگھ بتا رہا تھا وہ تو میں بہت پہلے

تے جانتا تھا میں کوئی نیا سراغ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ایسی چیز کوئی ایسا منظر جواب تک نگاہ سے پوشیدہ ہو اور جس سے تفتیش کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکے۔ پوری عمارت سنسان تھی۔ دو دیوار سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے احاطے کے بیچوں بیچ اس گھنے برگد کو دیکھا جس کی شاخیں پھیلی فارم کی حد بندی کو چھو رہی تھیں۔ زریں گل اور مخم خان کے بقول نرگ اسی برگد سے پارک کیا گیا تھا۔ اب وہ جگہ خالی تھی۔ برگد خاموش کھڑا تھا جیسے اپنے اندر کوئی بے حد اہم راز چھپائے ہوئے ہو۔

قریباً ایک گھنٹا عشرت فارم میں گزارنے کے بعد ہم فرید کوٹ واپس آ گئے۔ راستے میں بھی انپیکٹر دربار سنگھ سے سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ انپیکٹر دربار سنگھ نے بتایا کہ وہ تین لائون پر تفتیش کر رہا ہے۔ پہلی "لائون" قوسی تھی جس کا تذکرہ وہ پہلے کر چکا تھا۔ یعنی اس کا خیال تھا کہ لیاقت علی اور "استاد جانی" اپنے ساتھیوں کے ساتھ فارم میں داخل ہوئے اور ٹرک کے ساتھ ساتھ یہاں کے کینوں کو بھی بطور یہ فعال لے گئے ہیں۔ تفتیش کی دوسری لائن یہ تھی کہ یہ کارروائی اس زمیندار نے کرائے کے بعد معاشرے سے کروائی ہے جس کے ساتھ بنبردار عشرت کا پرانا بھڑا چل رہا تھا اور جس کے کچھ موٹی نبھوار کے کارندوں نے پکڑ رکھے تھے۔ تفتیش کا تیسرا رخ قدرے مختلف تھا۔ تفتیشی ٹیم کے ایک ایس آئی کا خیال تھا کہ یہ ڈپٹی کی عام واردات ہے۔ ڈاکا مارنے والے اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ وہ دیگر سامان کے علاوہ جو ٹرک یہاں سے لے جا رہے ہیں اس میں انتہائی بیش قیمت سامان لدا ہے۔ انہوں نے ٹرک کو صرف فرار ہونے کے لیے استعمال کیا، کیونکہ اس وقت فارم پر کوئی ایسی گاڑی نہیں تھی جسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا۔ یہ دلیل بھی کافی وزنی تھی۔ شاید سے اندازہ ہوتا تھا کہ فارم میں گھسنے والوں کو افرا تفری میں یہاں سے بھگانا پڑا تھا۔ انہوں نے دسڑنوں پر کھانا اور چھوڑ دیا تھا۔ جہاں نرگ کھڑا تھا وہاں زمین پر ٹائر گھسنے کے نشانات تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ ٹرک بہت تیزی کے ساتھ نکلا ہے۔ پھر جو سب سے اہم چیز اس دلیل کے حق میں جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اگر نرگ کو یہاں سے لے جانے والے اس کی قدر قیمت سے آگاہ تھے تو پھر انہیں سترائی ہزار کے زیورات اور نقدی وغیرہ پر ہاتھ صاف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

فرید کوٹ میں ہمیں ہمارے ٹھکانے پر پہنچا کہ انپیکٹر دربار سنگھ واپس چلا گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ

ہمارے ساتھ ہی رہتا اور اس وقت تک مجھ سے ہٹا رہتا جب تک میں اسے یہ کیس "حل" نہ کر دیتا۔ بے حد مرعوب نظر آ رہا تھا وہ مجھ سے اور اسے توقع تھی کہ ایک آدھ روز میں میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر کوئی ایسی مویشی کروں گا کہ سارے عقدے حل جائیں گے۔ حسب وعدہ وہ اگلی رات پھر آدھ کا۔ اس مرتبہ وہ کیس فائل بھی ساتھ لے آیا تھا۔ ایک بار پھر کیس کے مختلف پسلوں پر تبادلہ خیال شروع ہوا۔ دربار سنگھ کا زیادہ زور اس بات پر تھا کہ 22 مارچ کی رات ہونے والی واردات میں بابو لیاقت اور استاد جانی ملوث ہیں۔ خاص طور پر "استاد جانی" کی طرف سے وہ بے حد بے وطن تھا اور اسے ایک نہایت خطرناک طرز قرار دے رہا تھا۔ اس نے مجھ پر "انکشافات" کی بارش کرتے ہوئے بتایا کہ استاد جانی انک جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے اور اپنے بڑے حریف شکر شرکا سے اس کا ایک زوردار تصادم فرید کوٹ کے مضافاتی علاقے میں ہو چکا ہے۔ (اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس تصادم میں شکر شرکا ایک گھرے کنوئیں میں گر گیا تھا) اس نے "استاد جانی" کی کئی سرگرمیوں سے پردہ ہٹایا اور یہ بڑھک بھی ماری کہ استاد جانی کتنا بھی چھپے اس کی عقلی نظروں سے بچ نہیں سکے گا۔ "میں جانتا ہوں جناب کہ اس فیث پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک وہ بھڑا نہیں جاتا فرید کوٹ میں اسن وان کی نفا خراب ہی رہے گی۔ وہ جڑے اس سارے فساد کی۔"

میں نے کہا "اور شکر شرکا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بولا۔ "شکر شرکا بھی کوئی شریف بندہ نہیں ہے۔ مگر وہ دھماکا کرنے پاکستان نہیں گیا" استاد جانی پاکستان سے یہاں آیا ہے۔"

گفت و شنید کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ تکلف کے ایک دو پردے مزید اٹھ گئے تھے۔ اب دربار سنگھ میرے سامنے سگریٹ منگا کر بیٹھا تھا اور گاے گاے ایک گلاس سے پینر کی چسکی بھی لے لیتا تھا۔ تھوڑا سا نشہ چڑھا تو وہ مسکرا کر بولا

"ٹھاکرنا سرجی! آپ کی فریڈ بڑی سندر ہے۔ بالکل کھوئے ملائی کی طرح۔ سمجھو ان کرے آپ دونوں کی تہی رہے۔ ایسی فریڈ کے ساتھ بندہ سو بیزر لپٹا جائے اور کسی خوبصورت وادی کے کنارے خوبصورت سامان لے کر دل پٹوری کرتا رہے۔ جیون میں بھلا اس سے بڑا سوا اور کیا

ہوگا۔ لیکن بات تو پیسے کی ہے جی بیسہ ہو تو فرید کوٹ بھی سو بیزر لینڈ ہے ورنہ بندہ جس میں بھی دھکے کھاتا ہے۔"

"تو بیسہ پیدا کروانا" میں نے سنی خیر لیے میں کہا "ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں لے گا۔"

میرے لب و لہجے نے دربار سنگھ کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے محل کر حلیم کر لیا کہ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی ان بیچیں عدد مندوقوں کے خواب دیکھنے لگی ہیں جو ایک نرگ پر لدے ہیں اور کیس فرید کوٹ کے گرد نواح میں موجود ہیں۔

اچانک کچھ آوازوں نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ ٹانوس آوازیں کوٹھی کے کیراج کی سمت سے آئی تھیں۔ سفیر احمد جلدی سے اٹھ کر باہر گیا۔ انپیکٹر دربار سنگھ بھی چونکا نظر آنے لگا۔ یکایک دھماکا شستی کی آوازیں ابھریں۔ پھر کوئی دھڑام سے آہنی گیٹ کے ساتھ ٹکرایا۔ انپیکٹر دربار سنگھ نے اپنی قیص کے نیچے سے ہتھول برآمد کیا اور تیزی سے آوازوں کی سمت پکا۔ یقیناً کوئی عین شستی کی ٹرڈ ہو چکی تھی۔ یوں لگا کہ چند افراد زبردستی کوٹھی میں کھس آئے ہیں۔ انہوں نے سفیر کو پکڑ لیا ہے اور اب اندرونی حصے کی طرف آرہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا ریو اور نکال لیا اور ایک دفعہ آدم الماری کی اوٹ میں ہو گیا۔ کمرے کے اندر چھپنے کے لیے یہ جگہ موڈوں ترین تھی۔ ابھی میں نے بمشکل اپنی پوزیشن سنہائی ہی تھی کہ تین افراد انپیکٹر دربار سنگھ کو مارنے اور دھکیلنے ہوئے اندر لے آئے۔ پھول انپیکٹر دربار سنگھ سے چھینا جا چکا تھا اور اس کا ایک رخسار گرا سرخ ہو رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس رخسار پر ایک حملہ آور نے دھواں دھار نگر رسید کی تھی۔ انپیکٹر دربار کی قیص پھٹ چکی تھی اور نیچے سے اس کی جالی دار بنیان نظر آ رہی تھی اندر آنے والوں میں سے دو افراد نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے جب کہ تیسرے نوجوان نے منہ پر دو بال باندھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا جب کہ دونوں پگڑی پوش ریو اوروں سے مسلح تھے۔ پگڑی والے ایک شخص نے انپیکٹر دربار کا گریبان پکڑا اور میرے سامنے ایک اور خوفناک نگر اس کے چہرے پر رسید کی۔ انپیکٹر لکھڑا کر میز پر گرا اور وہ گلاس پکنا چور ہو گیا جس سے تھوڑی دیر پہلے وہ پینر کی چسکیاں لے رہا تھا۔ نگر لپٹے اور گرنے کے عمل کے دوران انپیکٹر دربار سنگھ کی پگڑی کھل گئی تھی اور اس کا ایک طول پلو زمین سے چھوٹنے لگا تھا۔ غمراہنے والے نے انپیکٹر کے کپس منھی میں جکڑے اور بڑی لڑکی کے ساتھ ریو اور اس کی کینٹی سے لگا دیا۔ "بتا

راجا دے۔ کہاں ہے بابو کی ماں۔ بتا کہاں رکھا ہے انہیں؟" پگڑی پوش نے چلا کر کہا۔

اس کی آواز سن کر میں سٹانے میں رہ گیا۔ یہ آواز میرے لیے ابھی نہیں تھی۔ میں اسے سیکڑوں میں پھانسیں سن رہا تھا۔ یہ ہوتا سنگھ کی آواز تھی۔ وہی ہوتا سنگھ جوالی کے گروہ میں شامل تھا اور جس سے میری آخری ملاقات بابو لیاقت کی فیکٹری میں ہوئی تھی۔ اچانک انپیکٹر دربار سنگھ نے جوالی دار کہا۔ "نجانے کس وقت اس نے اپنے لباس میں سے ایک کمانی دار چاقو نکال لیا تھا۔ چاقو جس پگڑی سے نکلا گیا تھا اس سے کوئی پگڑی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ انپیکٹر دربار سنگھ نے بڑے خطرناک انداز میں ہوتا سنگھ کی ناف کو نشانہ بنایا۔ یہ بڑا کارگر دار تھا۔ ہوتا کی آنکھیں باہر آسکتی تھیں لیکن اس نے اپنے مختصر جسم کو بجلی کی طرح حرکت دے کر خود کو بچالیا اس سے پہلے کہ انپیکٹر ہاتھ کو منکوس حرکت دے کر دوسری بار ہوتا سنگھ کے پیٹ کو نشانہ بناتا۔ دوسرے پگڑی پوش نے ہتھول سے ایک بھر پور ٹانگ انپیکٹر کے کولے پر جھانسی۔ وہ اچھل کر اس الماری کے عین سامنے آگرا جہاں میں چھپا کھڑا تھا۔ دوسرے پگڑی پوش کے انداز نے مجھے ایک لمحے میں سمجھا دیا کہ وہ زریں گل ہے۔ مزید تصدیق زریں گل کی پڑاؤ چیل سے ہو رہی تھی۔ جونی انپیکٹر نیچے گرا "زریں گل نے کسی جنگلی لپے کی طرح اس پر چڑھائی کر دی۔" گے "ٹھو کریں" ٹھو کریں "آؤس منٹ میں اس نے انپیکٹر کو دھک کر رکھ دیا ساتھ ساتھ وہ اسے پشت اور اردو کی منتخب گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔ انپیکٹر دربار سنگھ مار کھانے کے ساتھ ساتھ جچ بھی رہا تھا۔ غالباً اس جچ و پکار کے ذریعہ وہ مجھے موجود کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نہیں آس پاس موجود ہوں اور اس کی مدد کے لیے میدان میں کودوں گا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے انپیکٹر کی دھٹائی میں کوئی مداخلت نہیں کی اور جب اس کے ٹانگ منہ سے خون جاری ہو گیا اور انپیکٹر کی تن من دم توڑ دھمکی تو میں الماری کی اوٹ سے نکل آیا۔

دیکھتے ساتھ ہی ہوتا سنگھ اور زریں گل نے مجھے پھانسی لپا۔ مجھے یہاں دیکھ کر انہیں بھی اتنی ہی حیرت ہوئی جتنی مجھے انہیں دیکھ کر ہوئی تھی۔ زریں گل کی پگڑی توڑائی مار کھائی کے دوران ہی کھل گئی تھی "ہوتا سنگھ نے بھی مجھے دیکھ کر چہرے سے پلو ہٹالیا۔ زریں گل نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "استاد! یہ ام کیا دیکھ رہا ہے۔ آپ یہاں کیسے" میں نے نیچے جھک کر انپیکٹر دربار سنگھ کا کمانی دار چاقو اٹھایا اور کہا "یہی سوال میں بھی تم دونوں سے پوچھ سکتا



نہیں آ رہا تھا کہ اس موٹے پر کیا کئے اور کس سے کہے۔ وہ مجھے ڈی ایس بی کی گروت سمجھ کر ڈیکھیں مارا رہا تھا یہ دعوے کرتا رہا تھا کہ استاد جانی اور بابو لیاقت جیسے لوگ اس کی تفتیش سے خوفزدہ ہو کر روپوش ہو گئے ہیں اور وہ جھٹکڑیاں لے کر انہیں ڈھونڈنا چاہ رہا ہے۔ اب ایک مجھے اپنے دوہو دیکھ کر وہ جیسے حواس کھو بیٹھا تھا۔ یہ جانتے ہو جیتے بھی کہ اس دست و پاز کو غمی سے اس کی چیخ و پکار یا ہر نہیں جانے گی اور نہ کوئی اس کی مدد کو میاں پہنچے گا وہ بدستور آکر خان بنا ہوا تھا اور تھانے داری لیے میں نہیں دھکا رہا تھا۔

زیریں گل ایک دم آپنے سے باہر ہو گیا۔ وہ انپکڑ پر جھپٹا اور ایک بار پھر اس پر جھپٹوں اور کھونٹوں کی بارش کر دی۔ میں نے آگے بڑھ کر بمشکل اسے پیچھے ہٹایا۔ وہ غرا رہا تھا۔ "ام کو چھوڑو استاد جی۔ ام اس حرامی کا قیسمے بنائے گا۔ اس نے بابو جی کی والدہ صاحبہ کو دوہنے سے حالات میں رکھا ہوا ہے۔ ان کو گندی گالیاں دیتا ہے اور ٹھوکر کیں مارتا ہے۔ ام اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے زیریں گل کو بمشکل کمرے سے باہر دھکیلا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ بار کھڑا ہو کر بڑبڑانے لگا۔ غور سے سمجھنے پر اندازہ ہوا کہ اپنی مادری زبان میں انپکڑ و بار سنگ کی ماں بہن ایک کر رہا ہے۔ میں نے بوٹا سنگ سے پوچھا۔

"یہ کیا پکڑ ہے؟"

بوٹا سنگ اپنی باریک آواز میں بولا "جانی صاحب! یہ انپکڑ و بار سنگ ہے۔ ہم تین چار دن سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے شاید آپ کو پتا ہو کہ یہی حراجا وہ ہے جو فحشٹ فارم پر ہونے والے قتل کا کھوج لگا رہا ہے۔ اس نے آپ سمیت ہم سب کی تلاش میں چھاپے شاپے بھی مارے ہیں۔ بالکل پاگل ہوا پھر تا ہے اس پکڑ میں۔ دوہنے کل اس نے بابو لیاقت صاحب کو سامنے لانے کے لیے ان کی بوٹھی مانا جی کو پکڑ لیا۔ ان پر جھوٹے الجہات لگا کر حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ حرام کا تم سمجھتا ہے کہ ایک بوٹھی عورت پر جملہ کر کے پڑا تیر مارا ہے۔ آج ہم نے اس کو جھونڈ چھوڑا تو ہمارا نام نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے لگا کہ بوٹا سنگ مجھے قابو ہو کر انپکڑ و بار سنگ پر جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور صرف ایک دو گالیاں نکالنے پر اکتفا کیا۔ اب بات انہی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ انپکڑ و بار سنگ کی تفتیش کی بنیادی یہ تھی کہ فحشٹ فارم پر ہونے والی واردات میں بابو لیاقت اور میں ملوث ہیں۔ ہم دونوں روپوش تھے۔ لہذا پڑا

پتہ و بار بھی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ زیریں گل نے میرے لیے استاد کا لقب استعمال کر کے اسے مجھے میں ڈال دیا تھا۔ "وہ دوسرا بندہ کہاں ہے؟" میں نے زیریں گل سے پوچھا۔

"اس کے بارے میں فحشٹ کرو۔ ام نے اس کا کھوپڑا تو زکرا ساتھ والے کمرے میں پھینک دیا ہے۔"

"اوئے تمہارا بیڑا غرق زیریں گل" میں نے تمہارا کمرہ۔ "وہ بہت بڑے پولیس افسر کا گناہ جانی ہے۔ مر گیا تو پولیس والے تمہاری کھال میں جس بھوادیوں گئے۔ اور ویسے بھی وہ اپنا بندہ ہے۔ یہ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

بوٹا سنگ بولا "اس نے کچھ نہیں کیا جی۔ میں نے ہی اس کے سر پر پتھر مارا ہے۔ پڑا ہوا رکھا ہے۔ وہ مرے شرے کا نہیں۔"

"ہاں جی، مرے شرے کا نہیں" زیریں گل نے تصدیق کی۔

میں نے زیریں گل کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے میں رہے اور انپکڑ و بار سنگ پر نگاہ رکھنے پھر میں بوٹا سنگ کے ساتھ بھاک بھاک کو غمی کے حیراج میں پھنسا۔ وہاں ایک جانب لکڑی کا سادہ سا دروازہ تھا۔ یہ اسٹور میں کھلتا تھا۔ بوٹا سنگ نے دروازے کو باہر سے کھنڈی چڑھا دی تھی۔ کھنڈی آٹار کر ہم اندر داخل ہوئے، میاں فرش پر سفیر احمد نیم بے ہوش پڑا تھا۔

وہ کراہ رہا تھا اور اس کے سر سے پینے والا خون اس کی قمیص اور فرش پر جھونپ کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ ہم اسے سوارادے کر اس کمرے میں لے آئے جہاں زیریں گل بڑے فکری انداز میں اعشاریہ ڈیکھیں کر رہا اور تھا اسے انپکڑ کا پترا دے رہا تھا۔ دونوں میں تندو تیز مکالمہ چل رہا تھا۔ انپکڑ اپنی انپکڑی کے زعم میں زیریں گل کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا جب کہ زیریں گل دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ بندے کو چوبنی کی طرح مسل کر رکھ دیتا ہے اور اگر اسے "استاد جانی" حکم دیں تو وہ ابھی اسے بھی مسل کر کھادے گا۔

سفیر احمد کو دیکھ کر انپکڑ و بار و بار "تو یہ کیا ہے سفیر! تم تو کتے تھے یہ دلی کا ڈی ایس بی کی گروت ہے۔ یہ تو ہے تو۔ یہ تو۔" میں نے انپکڑ و بار سنگ کی بات مکمل کی۔ انپکڑ و بار سنگ کے چہرے پر سرفرشی لرائی لیکن وہ منہ سے بولا کچھ نہیں۔ شاید اس کی سمجھ میں

تھانے داری جھٹکا استعمال کرتے ہوئے انپکڑ و بار سنگ نے بابو کی والدہ کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔

میں زخمی سفیر احمد کو سوارادے کر کمرے سے باہر لے آیا۔ باہر زیریں گل زخمی چیتے کی طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کمرے میں جائے اور انپکڑ و بار سنگ پر نگاہ رکھے لیکن ساتھ ہی جتنی سے یہ ناکہ بھی کر دی کہ وہ اور بوٹا سنگ کی الجال انپکڑ سے الجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

سفیر احمد کی کچنی پر ایک بڑا سا کوڑھل نکلا تھا۔ اسی کوڑھل کے سبب اسے ابھی تک پکڑا رہے تھے اور وہ بار بار پیشانی تھام لیتا تھا۔ کو غمی کے ایک کمرے میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ میں اس کمرے کی جانب آیا تو دروازے میں پٹا اور غزال سے ملاقات ہوئی۔ شور و غل کی آوازیں نے انہیں جگا دیا تھا اور وہ ڈری سہی اس جگہ کھڑی تھیں۔ سفیر احمد کے سر سے پینے خون کو دیکھ کر وہ اور گھبرا گئیں۔ "کیا ہوا انیس؟" غزال نے رو باہمی آوازیں پوچھا۔

"چوٹ لگ گئی ہے، تم زرا دیکھ کر پنی کر دو۔"

ایک دم غزال کے اندر کی ڈانٹ اس کے خوف دہراس پر غالب آگئی۔ اس نے سفیر کو بازو سے تھاما اور اپنے ساتھ اس کمرے میں لے آئی جہاں فرسٹ ایڈ کا سامان پڑا تھا۔ جب وہ سر کی "میڈیٹ" کرنے کے بعد دروازے کا انکش تیار کر رہی تھی تو میں نے سفیر احمد سے کہا۔ "اس الو کے پیچھے انپکڑ کو سمجھاؤ، ورنہ بہت برا اثر ہونے والا ہے اس کا۔ اسے سمجھاؤ کہ بابو لیاقت کی والدہ کو چھوڑوے اور ان سب لوگوں کو بھی جنہیں وہ بابو کے ساتھی قرار دے رہا ہے اور ان پر تشدد کر رہا ہے۔"

سفیر احمد نے کراہتے ہوئے کہا "میں کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہ بات میں تمہیں پہلے بتا دیا ہوں کہ و بار سنگ بہت کا بڑا پکا ہے۔ اس کے مزاج کی خاص بات یہ ہے کہ اپنے اختیارات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔ بے شک وہ میرا دوست ہے لیکن دفتری معاملات میں میرے ساتھ بھی بہت کم بات کرتا ہے۔ اگر اس نے تمہیں فحشٹ فارم کیس کی تفصیلات بتائی ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ تمہیں ڈی ایس بی کی گروت سمجھ رہا تھا۔ میں لاکھ کوشش کرتا لیکن اس سے کچھ اٹھوا نہیں سکتا تھا۔"

میں نے کہا "تم میں اور ہم میں بہت فرق ہے، ہم کچھ اٹھوانے یا منوانے پر آمیں گے تو و بار سنگ کو نالی یاد آئے گی۔ ویسے بھی وہ اب ہمارے سامنے بچا ہو چکا ہے، میرا خیال ہے کہ تمہاری بات ماننے میں زیادہ پسند نہیں

کرے گا۔"

میں نے سفیر احمد کو سمجھا بھکا کہ اس کمرے میں بیٹھ دیا جہاں انپکڑ و بار سنگ بیٹھ ہوئے مرے کی طرح لبو لمان بیٹھا تھا۔ سفیر احمد نے اندر جا کر زیریں گل اور بوٹا سنگ کو باہر بھیج دیا اور اندر سے کھنڈی چڑھا لی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔ چند ہی لمحے بعد اندر سے انپکڑ و بار سنگ کے گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سفیر احمد سے کہہ رہا تھا۔ "یہ سب تمہاری سازش ہے تم نے ہوئے ہو ان لوگوں سے۔ اگر تم جانتے تھے کہ یہ ڈی ایس بی کی گروت نہیں تو پھر کیوں تم نے مجھے دھوکا دیا؟"

سفیر احمد نے کہا "میرا دوش اس کو دیا ہے! تمہاری طرح میں بھی بے خبر تھا۔ مجھ سے بھی دھوکا ہوا ہے۔ لیکن اب ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں۔ اب ہمارے اور استاد جانی کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا۔ ہم ایک دوسرے کو کچی طرح سمجھ گئے ہیں۔ خاص طور پر میں نے استاد کو بہت قریب سے دیکھ لیا ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے لیکن قول کا پکا ہے اور اس کے ساتھی اس کے حکم کے خلاف ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔"

"صاف سیدم بات کرو۔ تم کتنا کیا چاہ رہے ہو؟"

سفیر احمد نے کہا "جی کہ ہمیں استاد جانی کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ فید کوٹ میں اس وقت جیتنے بھی لوگ ٹرک کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ان میں استاد جانی کی کامیابی کے امکانات سب سے روشن ہیں۔ وہ اس معاملے میں شروع سے ملوث ہے اور ہر اونچ نیچ کو سمجھتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرک اس وقت بھی جانی کے ساتھیوں کی تحویل میں ہو۔"

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی پھر انپکڑ و بار سنگ کی مدھم آواز ابھری۔ "لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ مطلب نکل جائے؟ استاد ہمیں جھنڈی نہیں دکھائے گا۔" "جی، میں نے تمہیں کہا ہے تاکہ وہ جتن کا پکا شخص ہے۔ مجھے پورا دوش اس کے کہ اگر ہماری خیتیں ٹھیک رہیں تو ہم اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔"

"فائدے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔؟ کیا وہ ہمارا حصہ وغیرہ مقرر کرے گا۔"

"ضرور کرے گا۔ اس بارے میں اس سے ٹھیک کر بات کر لیتے ہیں۔"

گھنٹوں میں سوچ بچار کا مختصر وقفہ آیا۔ پھر انپکڑ کی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے اپنا لہجہ کچھ اور دھما کر لیا تھا۔ "میرے پاس کچھ ایسی اطلاعات ہیں جو ٹرک کی تلاش میں

جہ حد مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر استاد جانی سے ہمارا معاملہ ہو جاتا ہے تو پھر میں اسے ان معلومات میں شریک کر سکتا ہوں۔

جوں جوں گفتگو کی نوعیت خاص ہو رہی تھی، آوازیں بھیجی ہوئی جاری تھیں۔ حتیٰ کہ بند دروازے کے پیچھے صرف کھسکھسائی سنائی دینے لگی۔ میں دروازے سے ہٹ کر دریں محل اور پوٹا سنگھ کے پاس گیا۔ ان دونوں کے ساتھ آنے والا نو جوان باغیچے کی گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔ دریں محل اور پوٹا یہ جانتے کے لیے بے قرار نظر آتے تھے کہ میں بائیس روز پہلے میں انہیں سراسر فیکٹری میں چھوڑ کر چاکا کماں چلا گیا تھا۔

میں نے کہا: ”بھائیو! یہ آرام سے بیٹھ کر کرنے والی باتیں ہیں۔ میں سب کچھ تمہارے گوش گزار کروں گا لیکن کچھ دیر چھری تلے سانس لو۔“

زیریں گل بولا: ”اگر آپ نے نہیں بتانا تو ام سے ہی پوچھ لیں کہ ام پر کیا جتی ہے؟“

میں نے کہا: ”اگر جلدی ہے تو بڑے شوق سے بتا سکتے ہو۔“

وہ بولا: ”خرچے جلدی تو واقعی ہے۔ آپ کے پاؤں میں چکر ہے توڑی دیر کے لیے ہلتا ہے پھر کھسکھسک کر نکل جاتا ہے۔ کیا معلوم ابھی پھر تائب ہو جائے اور ام نہ حکما رہ جائے۔“

”ہاں تو پھر کونسا کیا بات ہے؟“

وہ بولا: ”آپ کے جانے کے بعد امارا جان ایک دم مصیبت میں آگیا۔ بالکل جیسے قلم ”دولت اور دنیا“ میں وحید مراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ بابو لیاقت صاحب کے ایک تجربے بتایا کہ شکر شکر اور اس کا غنڈا لوگ سخت غصے میں ہے اور بابو کی فیکٹری کو گھیرے میں لینے والا ہے۔ بابو صاحب بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ خطرے کو دوس کوں دور سے دیکھ لیتا ہے۔ اس نے شرمیلہ دو تین جگہ فون کیا اور اپنے خاص آدمیوں سے بولا کہ وہ لوگ چند دن کے لیے روپوش ہو جائیں۔ اس کے بعد فیکٹری میں موجود سب لوگ بھی ایک بڑی لاری میں بیٹھ گیا۔ شکر کا وہ تمام سامی بھی لاری میں بٹھالیا گیا۔ جنہیں آپ شکر کے نمکائے سے پکڑ کر لایا تھا۔“ ایک گہری سانس لے کر اس نے پوٹا سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا: ”اس کے بعد کا بات آپ کو براہ روٹا سنگھ بتائے گا۔ کیونکہ بعد میں جو کچھ کیا اس نے کیا۔“

پوٹا سنگھ نے کہا: ”بات کوئی جادو لمبی نہیں ہے جی۔ بس جریں محل پر چڑھا کر تیار رہا ہے۔ جب مجھ کو پتا چلا کہ بابو

لیاقت کو کسی خفیہ ٹھکانے کی لوڑ ہے تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کو اپنے ٹھکانے پر لے جاتا ہوں۔ ہم لاری میں بیٹھے اور سیدھے ڈوگر گاؤں پہنچ گئے۔ یہ جگہ فرید کوٹ سے چند روپے میل فاصلہ کی طرف ہے۔ یہاں ہمارے سردار لاسی کا بڑا مخفون ٹھکانا ہے۔ دریا کا کنارہ ہے۔ چاروں طرف بڑے گھنے درخت ہیں۔ عام بندہ دن روزا سے بھی اس طرف آتے گھبراتا ہے۔ رات کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں ایک پڑانا ڈاک بنگلا تھا۔ دریا کے کنارے میں اگر بالکل برباد ہو چکا ہے۔ اس بنگلے کے نیچے بڑا لمبا چوڑا خانہ ہے۔ یہ خانہ مدت سے ویران پڑا تھا۔ اندر سانپوں اور چکاڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک برس پہلے سردار لالی نے یہ خانہ صاف کروایا تھا۔ اس وقت سے ہم کبھی کبھی اس جگہ کو اپنے کام میں لے آتے ہیں۔ میں بابو لیاقت صاحب کو لے کر سیدھا اس بنگلے میں چلا گیا۔ بعد میں میں نے سردار لالی سے اس بات کی انکوائری کی کہ بابو جی اور ان کے ساتھی چند بیٹھے وہاں بھرا کر لیں۔ آج کل ہم اسی ٹھکانے پر ہیں۔ پانچ چھ دو بج پہلے ہم کو پتا چلا کہ عشرت فارم میں ہونے والے نکل کی تفتیش میں بابو صاحب کی ماما جی کو بٹھالیا گیا ہے اور ان پر سختی کی جارہی ہے۔ میں نے بابو صاحب سے کہا کہ اگر ان کا حکم ہو تو ہم اس انکوائری کی طبیعت صاف تھری کر دیتے ہیں۔ انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کوئی غلط شے کام کرنا نہیں چاہتے لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ ماں کی مصیبت پر ان کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں نے زیریں محل سے مشورہ کیا اور ہم دونوں انکوائری دہر بار سنگھ سے دو دو ہاتھ کرتے نکل کھڑے ہوئے۔ چار پانچ روپے سے ہم ایتھے موقع کی کھوج میں تھے۔ آخر آج یہ موقع مل گیا۔ ہم تھانے سے ہی دربار سنگھ کے پیچھے تھے۔ پہلے ہم نے اس کو کسی کا جانچا (جائزہ) لیا۔ پھر اچھی طرح دھواں کر کے کام بن سکتا ہے، ہم اندر ٹھس آئے۔“

میں نے پوچھا: ”ارجند بانو بھی تمہارے ساتھ ہی فیکٹری سے گئی تھی؟“

پوٹا سنگھ سے پہلے زیریں محل بول اٹھا: ”بالکل جناب! وہ بھی ساتھ ہی ہے۔ ام نے میڈم صاحبہ کا دست خیال رکھا ہے جی۔ میڈم صاحبہ بہت پریشان تھیں۔ رات دن روتا رہتا تھا۔ سوئے میں جیج مار کر اٹھ بیٹھتا تھا اور کتا تھا۔“ ”بجائے بجائے“ ”دراصل جی اس کے دل پر اس جیبتی ہونے کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ جو اس کے کندھے پر سوار ہو گیا تھا۔ کئی دن تو وہ بخار میں مبتلا رہا ہے۔ اب بخار اترتا ہے تو پیلا پڑ گیا ہے۔“

بت کمزوری محسوس کرتا ہے۔“

میں نے کہا: ”کیا بات ہے۔ خوبصورت عورتوں کی طبیعت کے بارے میں تمہیں بڑی اطلاع رہتی ہے؟“

اس کے چہرے پر رنگ سا لڑا گیا۔ سنبھل کر بولا: ”دراصل جی۔ میڈم صاحبہ ہندو سے مسلمان ہوا ہے۔ ابھی پتا مسلمان تو نہیں ہے۔ تاہم کیا پتا وہ پھر ”کافری“ کی طرف چلا جائے۔ ایسے بندے کا دل بولی کرنا تو بہت ضروری ہوتا ہے۔ ویسے ایک بات ہے، وہ آپ کو بڑا یاد کرتا ہے۔ دن رات یہی کہتا ہے ”استاد جانی صاحب کماں ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی کام کا نہیں۔“ ایک دن ام نے پوچھا: ”استاد جانی کے بغیر تم کسی کام کا کیوں نہیں۔“ وہ بولا: ”اس لیے کہ ام کو سائیں صاحب نے فرمایا ہے۔ امارا جینا مرنا اب استاد جانی کے ساتھ ہے۔“

ہماری گفتگو کے دوران ہی سفیر احمد اور انکوائری دہر بار سنگھ کمرے سے باہر نکل آئے۔ سفیر احمد مجھے سمجھنے کے ایک گوشے میں لے گیا۔ ”اس نے کہا: ”جہانی صاحبہ بات بن گئی ہے۔ انکوائری کہتا ہے کہ وہ جگہ تک بابو لیاقت صاحب کی والدہ کو رہا کرے گا۔ اس کے علاوہ ایک دو روز میں وہ سارے افراد بھی چھوڑ دے گا جس کے جنہیں شے میں پکڑا گیا ہے۔ آئندہ بھی وہ ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہے لیکن اس تعاون کے لیے وہ صلہ نکالتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس سے دو ٹوک بات کر لی جائے اور برآمد ہونے والے مال میں اس کا حصہ مقرر کر دیا جائے۔“

میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ دولت کی ہوس نے ایتھے بیٹھے ذہنوں کو مفلوج کر رکھا تھا۔ پتا نہیں کتنے لوگ تھے جنہوں نے ان دیکھی دولت میں سے اپنے اپنے حصے مقرر کیے ہوئے تھے۔ نہ انہوں نے ابھی تک وہ ٹرک دیکھا تھا اور نہ اس میں لدے ہوئے صندوق، بس وہ اٹا جانتے تھے کہ اس رگ میں بے انتہا دولت ہے اور اس دولت کا کوئی حقیقی وارث نہیں۔ بس وہ سب کے سب اس کے حقدار بنے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ”افراہیم“ ارجند بانو، قادر زباں، شکر شکر، ماراج رتن سنگھ، ”نہرواد عشرت“ انکوائری دہر بار سنگھ، یہ صرف بدنام تھے جو میرے علم میں تھے۔ ان افراد کی فہرست بہت بڑھ چکی جو میری نگاہوں سے اوچھل تھے لیکن جو پاؤں لگیں کی طرح فرید کوٹ کی گلیوں میں پھرا رہے تھے اور لشکر و ترک کی بوس گھٹتے پھرتے تھے۔

میں نے سفیر احمد سے کہا: ”میرے لیے تو انکوائری دہر بار

سنگھ اجنبی ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس کی زبان پر دی ہے جو اس کے دل میں ہے تو پھر اس سے بات کرو۔ وہ درودن کے اندر اندر تمام گرفتار شدہ افراد کو رہا کرے اور اپنی ”تفتیشی قوت“ کا رخ ہماری طرف سے موڑے۔ اس کے بعد ہم اس سے معاملہ طے کر لیں گے۔“

سفیر احمد نے کہا: ”اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس کسی کے حوالے سے کچھ اہم اطلاعات ہیں جو اس نے اب تک چھپا رکھی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ معاملہ طے ہو جائے تو ہم ان اطلاعات سے آگاہ کر دے گا۔“

میں نے سگریٹ ملگاوتے ہوئے کہا: ”جی بات ہے۔ سفیر احمد کہ میں اتنی جلدی انکوائری دہر بار سنگھ پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ وہ ایک خزانہ شخص ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔“

سفیر احمد سوچ میں پڑ گیا۔ ”تو پھر کیا کیا جائے؟“

میں نے کہا: ”یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ لیکن اتنی بات میری سمجھ میں بھی آ رہی ہے کہ انکوائری کو اتنی جلدی یہاں سے جانے کی آزادی نہیں ملنی چاہیے۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فورہ ہے تو وہ ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر واپس آکر ہمیں اس کو سختی میں گھیر لے گا۔ ہمارے ساتھ سائیں عالی ہے اور عورتیں بھی ہیں۔ تنہائیں ہیں ہم کو پولیس کے نرسے سے نکل بھاگیں گے۔“

سفیر احمد نے کہا: ”کیوں نہ ایک بار تم ہی اس سے بات کر کے دیکھ لو۔“

میں نے کہا: ”اس میں بڑائی تو کوئی نہیں لیکن اس سے بات کیا کروں گا؟“

وہ بولا: ”وہی باتیں جو میں اور تم کرتے رہے ہیں۔ اصل مقصد تو اس کے تاثرات دیکھنا ہے۔“

میں سفیر احمد کے ساتھ ہولیا۔ انکوائری دہر بار کو سختی کے ٹی دی لاؤنگ میں ایک صوفے پر ٹانگیں بچھائے بیٹھا تھا اور بیڑ کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کا ٹیکہ اب پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوا تھا اور ہونٹوں سے سینے والے خون کو کسی طور روکنے میں کامیاب رہا تھا۔

اس کی ایک آنکھ سوچ کر گہری نیلی ہو گئی تھی، اس دم زہر آنکھ کے سبب اس کی صورت پر کچھ اور خباثت جھلکنے لگی تھی۔

میں نے دس چندہ منٹ اس سے گفتگو کی۔ بظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی چیخ میں تھک چکا ہے۔ اس کا کتا تھا کہ خیر سگالی کے طور پر وہ بابو لیاقت کی والدہ سمیت تمام

متعلقہ حوالہ تو اس کو رہا کرتا ہے اور تفتیش کا رخ ایسی سمت میں موڑتا ہے کہ باہولیات اور اس کے ساتھیوں کے لیے مشکلات کم سے کم ہو جائیں۔ اس کے بعد معاملہ طے کر لیا جائے گا اور ٹرک کی تلاش کا کام طے کر لیا جائے گا۔ تاہم باتوں کے دوران کہیں کہیں اس کے منہ سے ایسی باتیں بھی نکلیں جنہوں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ مثلاً یہ کہ باہر مطاب ابر اکوہ تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اس کے باوجود وہی الغور میاں سے لکنا چاہ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا کہ اس کو بھی میں زریں گل کے بارے میں ڈولی اور یہ پوچھا کہ اس کو بھی میں میرا کوئی اور ساتھی تو موجود نہیں۔ وہ بات سے بات نکالنے کا فن جانتا تھا اور اپنے مخاطب کو بڑے غیر محسوس طریقے سے اُلجھا لیتا تھا۔ بارش بتدریج شدت اختیار کر رہی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا ”دربار سنگھ تمہارے پاس کبھی جیب ہے میرا تو خیال ہے کہ وہاں کچھ کچھ ہیں آرم کرلو۔ صبح سویرے نکل جانا۔“

اس نے ہنس دینا شروع کیا۔ لیکن جب محسوس کیا کہ میں اسے صبح تک کے لیے میاں روکنا چاہ رہا ہوں اور اگر اس نے اصرار کیا تو میں شک میں پڑ جاؤں گا تو وہ ہم رضا مند ہو گیا۔ مسکرا کر کہنے لگا ”ٹھیک ہے جہانی صاحب! جیسے آپ کی مرضی۔ ہم تو شواہد کرنے والے اور شواہد دینے والے لوگ ہیں۔ ایک بار جس کے ساتھ چل پڑے سو چل پڑے۔ رات گنتا بھی نہیں ہو پھر جیسے نہیں بنتے۔“

میں نے کہا۔ ”جیسے بننے والا تو میں بھی نہیں ہوں۔ باقی بندے کی پہچان تو وقت پڑنے پر ہوتی ہے، پہلے تو خالی غلی باتیں ہوتی ہیں۔“

بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ جوں جوں بارش تیز ہو رہی تھی، دربار سنگھ کے بچنے کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ کم لٹنے والی بیڑی رہا تھا لہذا انھوں میں ہلکی سی سرخی کے سوا غبار کے کوئی آثار نہیں تھے کہنے لگا۔ ”جہانی صاحب! ایسے آپ کی گرل فرینڈ بڑی سندر ہے۔ بالکل۔ کھوئے ملائی والی تھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”گلتا ہے“ جس میں کچھ زیادہ ہی اچھی لگی ہے۔ میرے لیے نے دربار سنگھ کی حوصلہ افزائی کی و انت نکال کر بولا ”مجیڑی ایسی باری ہے آپ نے جو دیکھ گاہ، کیجیہ کو پکڑ لے گا۔“

اس انداز میں اس نے آپ کی طرف کی جاتی ہے جسے لچائی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں خوشی ہوتی ہے کہ یہ چیز

میں مل جائے یا دے دی جائے۔ نسا کو دیکھ کر دربار سنگھ کی آنکھوں سے پہلے بھی رال ٹپکی تھی، لیکن جب اس کے لیے ڈی ایس بی گرودت کی محبوبہ تھی اس لیے وہ زیادہ حیل کر نہیں بولا تھا، میں نے اس کی فضا سمجھتے ہوئے کہا۔ ”بھئی گرا فرینڈ تو وہ میری ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ جو اس کی طرف دیکھے میں اس کی آنکھیں نکال لوں۔ تم اسے جی بھر کر دیکھ سکتے ہو۔ اس کی تعریف کر سکتے ہو۔ بلکہ تعریفوں کے پل باندھ سکتے ہو۔ اور اگر وہ تمہاری تعریفوں کا ”عملی شکر“ ادا کرنا چاہے تو بھئی ہم جیسے بھی ہٹ سکتے ہیں یہ گرل فرینڈ کی چیزیں تو ہوتی ہی ایسے کاموں کے لیے ہیں۔“

دربار سنگھ مسکرایا تو اس کی سوتی ہوئی آنکھ بالکل ہو گئی۔ خیانت بھرے لیے میں بولا۔ ”ویسے آپ آؤ دلچسپ ہیں۔ اپنے ہی قبیلے کے لگتے ہیں۔“

”قبیلہ دوی ہیں بھئی“ میں نے فلسفہ مگھارا ”ایک وہ زندگی کو بڑھ سکون بنانا چاہتے ہیں“ اور ہر قسم کی لذت سے موڑے بیٹھے رہتے ہیں“ دوسرے وہ جن کے نزدیک سکوا موت کا دوسرا نام ہے۔ وہ زندگی کو زندگی سمجھ کر گزارا ہیں۔ تکلیفیں جھیلنے میں اور خوشیاں بھی سینٹے ہیں۔ اور بات یہ ہے کہ انہی لوگوں کو جینے کا حق ہے جو کسی دُشمن۔ خواب کے لیے زندگی کو ضائع نہیں کرتے۔“

”ارے باپ رے۔ آپ تو جویوں اور سادھوؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو ذرگ رہا ہے کہ کہیں آپ روپ بھی بہو پ نہ لگے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”جی کہ پہلے آپ ڈی ایس بی گرودت تھے پھر کہ آپ گرودت نہیں استاد جہانی ہیں۔ ابھی توڑی دی جا چلے گئے آپ استاد جہانی بھی نہیں ہوئے گرودوار۔ کوئی جیجی ہوئی ہستی ہیں۔“

کچھ دیر انسپکٹر دربار سنگھ سے ہلکی جھلکی گفتگو جاری پھر سفیر احمد نے اگر دربار سنگھ کو بتایا کہ اس کا بستر لگا ہے اگر وہ آرام کرنا چاہے تو اپنے کمرے میں جا سکتا ہے انسپکٹر دربار سنگھ اٹھتے ہوئے بولا ”اچھا جہانی سادھو اب آگیا دو“ باتیں تو اب ہوتی ہی رہیں گی اور یہی چلا تائیں گی۔ ”وہ اٹھا تو منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی ساتھ ہی ہاتھ دائیں کو لٹھے پر چلا گیا۔ یہ وہی کولہا تھا۔“

زریں گل نے زوردار ٹانگ جھانکی تھی۔ میں نے کہا۔ ”دربار سنگھ جو کچھ بھی میاں ہوا ہوا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سفیر احمد کو بھی جو چیز

ہیں۔ بہر حال مجھے اس پر افسوس ہے۔ میں صبح اپنے ساتھیوں سے کہوں گا کہ وہ تم سے معافی مانگیں۔“

وہ خوش دلی سے بولا ”معافی ہی معافی ہے جہانی صاحب! جب ایک ساتھ چلنا ہو تو دل و دماغ ٹکنا پڑتا ہے۔ ہم روز تین چار بندوں کی چہرے اُوپر کر سکتے ہیں۔ آج خود کو توڑی سی پھینکی گئی تو کون سی قیامت آگئی اور پھر دیکھیں جی میں نے بھی تو بے خبری میں آپ کے خلاف آپ ہی کے سامنے بہت اٹنی سیدھی باتیں کی ہیں۔ لہذا سنجیدگی کے حساب برابر ہو گیا۔ اچھا جی! بانی گل بات کل ہو گئی۔ رب را کھا۔“

انسپکٹر سونے کے لیے بالائی کمرے میں چلا گیا تو میں سنبھلنے پر ہی لیٹ کر سرگرت پھونکنے لگا۔ کافی کرا ٹھنک تھا انسپکٹر دربار سنگھ۔ ابھی تک میں اس کے ذہن میں نہیں تھا کہ سا تھا۔ بہر حال یہ بات طے تھی کہ آج کی شب اسے اپنا مسلمان رکھ کر ہم نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ عین ٹھنک تھا کہ وہ کل صبح تک ٹھنڈے دل سے سوچے اور اس کی نیت میں کوئی خرابی ہے بھی تو ٹھیک ہو جائے لیکن اگر خرابی ٹھیک نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ یہ کافی اہم سوال تھا۔ اگر وہ ہمارے خلاف کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کرنا تو میرے خیال میں اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ پولیس فورس جمع کر کے اس کو بھی پر آئے اور ہمیں پکڑ کر باقاعدہ گرفتاری ڈال دے۔ اس کے بعد ہم سے ”مفت“ فارم قتل کیس“ اور دوسرے الزامات کے سلسلے میں پوچھ گچھ شروع کر دی جائے لیکن اس کام سے انسپکٹر دربار سنگھ جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ شاہی یا ترقی تھی۔ انسپکٹر دربار سنگھ کی نگاہیں اس سے بہت آگے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ٹرک پر لدے زدو جوا ہر تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہذا اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ ہم پر ”باقاعدہ“ ہاتھ نہ ڈالے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ہم پر قابو پانے کے لیے ذاتی ذرائع استعمال کرے۔ اس جیسے شخص کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ میں سے غندے بیج کر لے یا اپنے ہم نواز وہ ہم پالہ ساتھیوں کے تعاون سے ہم پر چھ دوڑے۔ وہ ہمیں اپنی ذاتی تحویل میں رکھ کر ہم سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا اور مجبور کر سکتا تھا کہ ہم ٹرک کی تلاش میں اس کی مدد کریں۔

اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چرکنا پڑا۔ کوئی کے شامی حصے سے چڑو پکار سنائی دی۔ چیتنے والی عورتیں تھیں اور یقیناً غزال دینا تھیں۔ میں اٹھا اور ایک طویل راہداری سے

مگر زریں گل اس خواب کے ساتھ پہنچا جو غزال اور نسا کے لیے مخصوص تھی۔ مجھے دو دونوں خواب گاہ سے باہر نظر نہیں۔ موسلا دھار بارش کی پڑاوی کے بغیر وہ ممکن میں کھڑی تھیں اور خواب گاہ کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ مجھے خواب گاہ کے اندر سے دھماکے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کوئی قوپ کے گولے کی مانند دروازے سے نکلا اور کھنک کی طرف بھاگا۔ وہ زریں گل تھا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ شوار کے اوپر اس کا بالائی جسم نکلا تھا۔ زریں گل کے پیچھے ہی پیچھے سامنے خالی خواب گاہ سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کبھی آہنی راڈ تھی۔ یہ وہ بار تھی جو ویت لفٹنگ میں چلیوں کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ سامنے خالی نے یہ بار دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر سے بلند کر رکھی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا کہ زریں گل کے نزدیک پہنچے ہی اس کا کھوپڑا توڑ دے گا۔ ایک سینکڑ میں ان دونوں نے وسیع کھنک عبور کیا اور کوئی کے سامنے والے حصے کی طرف چلے گئے۔ میں بھانپتا ہوا ان کے پیچھے گیا۔ بارش کی پوچھا نے ایک لمحے میں مجھے شرابور کر دیا۔ کوئی کے سامنے والے حصے میں پہنچا تو وہ ہاتھ نظر آیا۔ وہ بڑی جراتی سے بیڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ زریں گل اور سامنے خالی اور چلے گئے ہیں۔ میں بھی دو دو ذریعے پھلتا چھت کی طرف پکا۔ پہلی منزل کے دروازے پر میرا کراؤ انسپکٹر دربار سنگھ سے ہوا۔ اس نے پکڑی آتار کھی تھی ناہا بستر سے نکلا تھا۔ ”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ اس نے خبرا کر پوچھا۔ میں جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

چھت پر پہنچا تو منہ کھنک سے منظر نظر آیا۔ سامنے خالی اور زریں گل میں زبردست گفتگو ہو رہی تھی۔ زریں گل جھانکیاں دے دے کر سامنے خالی کی زد سے نکل رہا تھا اور سامنے خالی اسے گھبرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ پھر زریں گل پکڑتی کا مٹا ہر کر کے برساتی پر چڑھ گیا۔ سامنے خالی نے بھی ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی اور برساتی پر پہنچ گیا۔ برساتی پر سے زریں گل کا پاؤں پھسلا اور وہ ہاتھ پاؤں چلاتا خنثی میں گر گیا۔ یہ کوئی کا پھجواڑا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ سیدھا پھنک مڑک پر گرے گا اور گرتے ساتھ ہی اپنے آباد ابدال کے پاس پہنچ جائے گا لیکن پھر میری دھار سے بندھی زریں گل راستے ہی میں کہیں ایک گنا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ایک گیلری کی چھت تھی جو بالکل کھلی چھت سے قریب پندرہ فٹ کی گہرائی پر تھی۔ چھت پر گرتے ہی زریں گل اٹھا اور لنگراتا ہوا میری نگاہ سے اونچا ہوا۔ سامنے خالی

پہچان ایک دم ختم ہو گیا تھا۔ وہ برساتی کے کنارے کھڑا ہو کر  
 قہقہے لگانے لگا۔ اس کا اندازہ سن کر اڑانے والا تھا۔ چند لمبے  
 بعد اس نے اپنی بار ایک طرف پھینک دی اور خود بھی  
 برساتی کی جھٹ سے ٹکری کی جھٹ پر چلا گیا۔ لہجے  
 بالوں اور ٹھکی آستینوں والے لمباوے کے ساتھ اس کا  
 برساتی سے ٹکری پر چلا گیا لگا بڑا آسیب زدہ سا منظر تھا۔  
 ٹکری کی جھٹ پر پہنچنے سے پہلے وہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ یا  
 شاید جھول سا گیا۔ پھر ”پٹاخ“ کی آواز آئی اور وہ ٹکری کی  
 جھٹ پر گر۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسے مٹھنوں پر معمولی  
 چوٹ آئی تھی لیکن اپنی وجدانی کیفیت میں اس نے چوٹ کی  
 پروا نہیں کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ”پٹاخ“ کی آواز کوئی تار  
 نوسنے کی آواز تھی۔ ظاہر ہے وہ بجلی کا تار نہیں تھا ورنہ  
 سامین عالی کو نقصان پہنچتا یا کم از کم بگڑا چھوٹی نظر آتی۔  
 سامین عالی کچھ دیر ٹکری کی جھٹ پر کھڑا ”حق ہو“ کے نعرے  
 لگاتا رہا پھر بڑے تلاش کر کے نیچے اتر گیا۔

سفیر احمد اور انسپکٹر دربار سنگھ کے علاوہ گھر کے دو ملازم بھی جہت پر پہنچ چکے تھے وہ سب بڑبڑتے نظروں سے گزریں گی کی جہت کی طرف دیکھ رہے تھے اور بارش میں بجگ رہے تھے میں نے انہیں بتایا کہ درس گلی اور سائیں عالی دونوں نیچے جلتے ہیں۔ درس گلی کو میں نے بیوی گیٹ سے باہر نکلے دیکھ لیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ وہ سائیں عالی کی بارش سے محفوظ ہو گیا ہے ہم بڑی میزبوں سے نیچے اترے اور سائیں عالی کو دھونڈنا شروع کیا۔ غزال نے انکرتایا کہ سائیں والدین اپنے کمرے میں پہنچ گیا ہے اور چادر اوڑھ کر سونے لگا ہے۔

انہیں زوردار شکمہ بہت حیران نظر آ رہا تھا۔ پوچھنے لگا "کون ہے یہ ملک؟ مجھے تو کوئی بڑا خطرناک شخص لگا ہے۔" سفیر احمد نے بتایا۔ "یہ بیرو مشرق ہیں۔ میں نے ایک بار جہیں بتایا بھی تھا۔ یہی جہاں میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ سامعین عالی نامہ سے ان کا۔"

آنکسٹورڈ بار سنگھ کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ”یہ وہی ہیں جن کے پاس ایکسٹریس آتی ہیں۔ ان کے پاؤں دہاتی ہیں اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھاتی ہیں؟“

سفر یروا ”صرف ایک تریس اور ایک تریس نہیں بہت بڑے بڑے فنکار اور شاعر کے جانے پہچانے لوگ ان کی جو کھٹ پر حاضری دیتے ہیں اور ان کے چرن چھوٹا اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔“

اٹپنڈر دربار سنگھ اب قدرے مرعوب نظر آنے لگا تھا۔

تاہم اس کے چہرے پر ابھیں اب بھی بانی تھی۔ پوچھنے لگا۔  
 ”لیکن سائنس صاحب اتنے شعبے میں کیوں آگئے تھے۔ اس  
 مونے کے پیچھے یوں بھاگ رہے تھے جسے مار چھوڑیں گے۔“  
 فزائل اور بشا دور پر آئے۔ میں ٹھڑی تھیں اور سٹین  
 صورت حال کے باوجود مسکرا رہی تھیں، مجھے شک ہوا کہ وہ  
 اصل بات سے آگاہ ہیں۔ میں انکیلور اور سینرونیو کو مصروف  
 گفتگو چھوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔ فزائل نے سنجیدہ ہوتے  
 ہوئے کہا۔ ”ہمیں بت ڈر لگ رہا ہے۔ اب ہم اس بینڈ روم  
 میں نہیں سوئیں گی۔ یہ سائنس عالمی بہت خطرناک شخص  
 ہے۔ پتا نہیں کسی وقت کیا کرے۔“

”اس نے تمہیں کچھ کہا ہے؟“ میں نے غزالہ اور ریشا سے ایک ساتھ پوچھا۔  
غزالہ نے کہا۔ ”ابھی تو صرف اتنا ہی کیا ہے کہ ہمارے بیٹہ دوم میں مٹسے اور ہماری نیند برباد کی ہے۔ اس کے بعد کیا کرنے، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دو قدم کے قافلے پر تو اس کا کمر اڑے اس کے خزانے تک ہمیں سنائی دیتے ہیں۔“  
”لیکن ہو ا کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

غزالہ بولی "ہمیں تو کچھ خبر نہیں۔ ہم سونے کی تیار کر رہی تھیں۔ اچانک سائیں عالی کی آواز آئی۔ وہ کھڑکی کے عین سامنے آپ کے چھان سامنے سے جھڑپا تھا۔ قیص کا کوئی چکر تھا، کہ رہا تھا کہ اس نے اس رنگ کی قیص کیوں پہنی ہے، پھر ایک دم وہ مشتعل ہو گیا۔ چھان کو مارنے کے لیے بھاگا۔ اس سامنے والے برآمدے میں کچھ دیر وہ آگے پیچھے بھاگتے رہے، پھر آپ کا چھان سامنے جان بچانے کے لیے ہمارے بیڈ روم کی طرف آ گیا۔ پانچویں اس کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے بیڈ روم کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس نے کھڑکی کو دھکا مارا اور اندر آ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی بند کرنا، سائیں عالی بھی کسی چھلاوے کی مانند اندر گھس آیا۔ بڑا خطرناک نظر آ رہا تھا وہ۔ آنکھیں انگوٹھوں کی طرح دھب دی تھیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ خان کو مارنا نہیں صرف ڈرا چاہتا تھا اگر وہ مارنا چاہتا تو مختصر سے بیڈ روم میں ایک نہ ایک ضرب خان کو ضرور لگتی اور اس آہنی راڈ کی ایک ضرب بھی بدست تھی۔ ہم جتنی جلدانی بیڈ روم سے باہر نکل آئیں۔ باہر نکلنے ہوئے میں نے دیکھا کہ خان نے اپنی زرد قیص اتار کر پھینک دی ہے لیکن سائیں عالی نے پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور جھٹ جھٹ کر اسے مارنے کی کوشش کرنا رہا۔ آخر وہ دونوں آگے پیچھے بھاگتے باہر نکل آئے۔"

بنائے بیدارم کا دواؤں کوکل کر مجھے اندر کا نقش دکھایا۔ کافی نقصان ہوا تھا۔ ایک تہہ آدم آئینہ ٹوٹ گیا تھا۔ کارٹس پر رکے ڈیکوریشن ہیں چٹا چور ہو گئے تھے۔ آئنی بار کی ایک جھروڑ ضرب نے الماری کا پلائی ووڈ زور برباد کر دیا تھا۔ ایک کونے میں زریں گل کا زور کرت پڑا تھا جو اس نے سانپ کی مار سے بچنے کے لیے آئنا کر چھبک رہا تھا۔ زریں گل کی پست کڈائی یاد کر کے مجھے ہنسی آگئی۔ میرے خیال میں غلطی زریں گل کی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ایسا ہی واقعہ بابولیات کی ٹیکسٹری میں بھی ہو چکا تھا۔ زریں گل کی بکری زرد قیض دیکھ کر سانپ آپے سے باہر ہو گیا تھا اور اسے بشکل سنبھلا گیا تھا۔ اس وقت میں نے زریں گل کو تباہ کیا تھا کہ سانپ عالی زرد دیکھ کر اشتعال میں آ جاتا ہے۔ لہذا آئندہ وہ احتیاط کرے۔ غالباً زریں گل کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی اور نتیجے کے طور پر اسے موسلا حار بارش میں اچھی بجلی ورزش کرنی پڑی تھی۔ ”ورزش“ بے حد عین بھی ثابت ہو سکتی تھی اگر زریں گل برساتی کی پست سے چھلنے کے بعد سر کے بل کیڑی برگر ٹاور منکا تروا بیٹھتا۔

بیز روم کی روشنی میں میں نے غزالہ کو دیکھا اور بے اختیار دوسری بار دیکھنے پر مجبور ہوا۔ بارش میں بیٹھنے کے بعد اس کا ہلکا چمکا لباس جسم ہی کا حصہ بن گیا تھا۔ لمبے گھس گردن اور چہرے سے چپکے ہوئے تھے۔ دیکھنا اس کے سر پر تھا لیکن اس کا ہونا نہ ہونا براہِ راقہ۔ صحرائی لڑکے کو "سرگرم عمل" دیکھ کر عورت کی چمٹی جس بڑی سرعت سے کام کرتی ہے۔ میری آنکھوں کی صرف ایک غیر ضروری جنبش نے غزالہ کو سینے پر مجبور کر دیا۔ وہ غیر محسوس طور پر نشا کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر کئی برس پہلے کی غزالہ میرے تصور میں آن کھڑی ہو گئی۔ ایسی ہی بارشوں میں اپنے گھر کی بوسیدہ پھت پر کھڑے ہو کر میں غزالہ کے خوشنما سخن میں جھانک رہا تھا۔ اس وقت وہ دست چھری سے جسم کی مالک بھی لیکن اس کے بال ایسے ہی لمبے تھے اور اس کے سرخ رخساروں پر ایسے ہی دھبے چلتے تھے۔ میں ان شعلوں پر لب رکھنے کو کتنا ترستا تھا۔ اور میری انگلیاں ان روشنی بالوں میں سرسرا کر کیسے چلا کرتی تھیں۔ آج یہ سب کچھ میری دسترس میں تھا لیکن میرے دل میں ایک ایسی گرہ بچ گئی تھی جو کھولے نہیں چکی تھی۔ میں سب کچھ جانتے ہو جیتے بھی مجبور تھا۔

رات کے بارونچ چکے تھے۔ بارش کا زور کم ہو گیا تھا۔ لیکن وہ رکنی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد زریں گل بھی دھاک دھاک آگیا۔ اس نے اپنی اور سامین عالی کی زبردست بھاگ دو

کے بارے میں وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے غزالہ ہمیں بتا چکی تھی۔ سائنس عالی کے اشتغال کا سبب وہی زرد قیسی بنی تھی جو اس سے پہلے بھی ایک وفدہ سائنس کو بھڑکانا چکی تھی۔

میں نے سنفر احمد سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ زریں گل جیونی گیٹ پر ہمارے گاجب کو بڑا کچھ اور اور لیں تاہی ایک ملازم بالائی منزل پر موجود رہیں گے۔ سنفر احمد جانتا تھا کہ صبح تک ہر طرح خیریت رہے۔ علی الصباح انکسز و بار کچھ کے یہاں سے جاتے ہی وہ ہم کو اپنے ایک دوست کے گھر منتقل کر سکتا تھا۔ اگر انکسز و بار کچھ تھانے واپس پہنچ کر کوئی پکڑ چلائے کی کو شش کرتا بھی تو ہم اسے اس کو بھی میں نہ دیتے۔

میں اس کمرے میں آکر لیٹ گیا جہاں دو ذری سوتا تھا۔  
لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بہت دیر تک بستر پر کھڑی رہا۔ پھر اٹھ کر سرنگھٹ لیٹ گیا اور کمرے میں چل تدی کرنے لگا۔ نیند وہیں منٹ بعد چھل تدی سے بھی آگئی۔ کیا۔ زریں گل بیوی لیٹ پر موجود تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اسے اپنے پاس بلایا کہ گفتگو کے ذریعے وقت کاٹنے کی کوشش کی جائے میں زریں گل سے گوی لڑکی اور ان دو ملازمین کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ جنہیں ہم عشرت فارم سے اپنے ساتھ بابو کی فیکٹری میں لے آئے تھے۔ زریں گل سے باتیں کرتے ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک میں چونک گیا۔ یوں لگا کہ اپنی بے قراری کا سبب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ بالائی منزل پر ایک ٹیلی فون سیٹ موجود ہے۔ وہ چالو حالت میں تھا۔ اگر اسٹینڈر دہار سنگھ کی نیت واقعی خراب ہوتی اور وہ کسی طرح اس ٹیلی فون تک رسائی حاصل کر لیتا تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جانا تھا۔ ہم سے ایک سنگھین غلطی ہو چکی تھی میں نے اپنی نم ٹکڑی پتلون نخل کرپسٹول کی موجودگی کا یقین کیا اور تیرہ قدسوں سے دو دروازے کی طرف بڑھا "استاد صاحب، کدھر جاتا ہے؟" زریں گل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تم گیت پر پہنچو“ میں ابھی آ رہا ہوں“ میں نے تیزی سے کہا اور باہر نکل آیا۔

یہڑ حیاں چلا گئے ہوا میں بالائی منزل پر پہنچا۔ ایک کمرے میں ہوتا نکھ صوفے پر نیم دراز تھا اور باریک آواز میں کوئی پختائی لوگ گیت گنگنا رہا تھا۔ اس کے سامنے الٹے زبے میں سکرٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس راہداری کی طرف بڑھا جو اندرونی کمرہ

کی سست جاتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ٹیلی فون جس کمرے میں رکھا تھا اس کے عین سامنے والا کمرہ انسپکٹر دربار سنگھ بیدوم کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ ٹیلی فون والا کمرہ منقل تھا۔ اگر دربار سنگھ فون والے کمرے میں ٹھٹھا جاتا تو اس کے لیے تالا ضرور ضروری تھا۔ میں دبے پاؤں چلا انسپکٹر دربار سنگھ کے کمرے کے سامنے سے گزرا اور ٹیلی فون والے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہاں روشنی بہت مدھم تھی میں نے نیچے جھک کر نالے کا جائزہ لیا اور سنانے میں رہ گیا۔ تمام تر اندیشے ایک ہی بل میں درست ثابت ہو گئے تھے۔ تالا اپنی جگہ موجود تھا لیکن جس گندی میں وہ لگا ہوا تھا اسے بچھوٹ کر اکھاڑ لیا گیا تھا۔ یہ کام اسکو پڑا ہو کر کے ساتھ مہارت اور طاقت سے کیا گیا تھا۔ میں نے اپنا تالا ڈھونڈا تو ہاتھ میں لے لیا اور کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر تاریکی تھی کوئی آواز یا آہٹ سنائی نہیں دی۔ میں نے یہ نہ سہی کہ دو ازبے پر دباؤ ڈالا اور اسے کھولتے ہوئے اندر چلا گیا۔ ایک دو لمحوں کے لیے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی ہے لیکن پھر یہ انداز غلط ثابت ہو گیا۔ کمرہ مکمل طور پر خالی تھا۔ صحن کی جانب سے آنے والی روشنی میں کمرے کے خدو خال پہچانا مشکل نہیں تھا۔ میں محتاط قدموں سے ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ ٹیلی فون کے ڈائل پر ایک چھوٹا سا خوبصورت تالا لگا تھا۔ یہ تالا بھی کھلا ہوا تھا۔ اسے چابی سے نہیں کھولا گیا تھا۔ کیونکہ تالے کا میکینزم اس طرح کا تھا کہ تالا کھلنے کے بعد چابی اس میں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ تالے کو کھولنے کے لیے کوئی تار یا پین وغیرہ استعمال کی گئی تھی۔ اب اس بات میں شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ تھوڑے دیر پہلے انسپکٹر دربار سنگھ یہاں داخل ہوا ہے اور اس نے فون کیا ہے۔ صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر آہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ادریس ٹائی لازم اندر جھانک رہا ہے۔ اس کے کندھے سے ہندوئی لنگ رہی تھی جسے بارش سے بچانے کے لیے اس نے پٹی خیمین سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ کھلی کھڑکی میں سے اس نے ماتمی کی روشنی پہنچی اور مجھے چاہا لیا۔

”کیا بات ہے صاحب؟“ اس نے دبے لہجے میں کہا۔  
”کچھ نہیں۔ تم بوشیاری سے ہزاروں کسی کو کوٹھی سے لٹا چاہیے اور نہ اندر آنا چاہیے۔“  
”بہتر صاحب“ اس نے سر اسی لہجے میں کہا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی بیٹنے لگی تھیں۔ اگر دربار سنگھ فون کر چکا تھا تو مغرب ہم

سب سخت مصیبت سے دوچار ہونے والے تھے میں نے ریپورٹ کیا اور فون ٹھٹھا چلی۔ ایک دم آنکھوں کے سامنے اُمید کی کرن طلوع ہوئی۔ ذہن میں سراخانے والے میب خدشات پس منظر میں چلے گئے میں نے تین چار بار کریڈل دیا اور اس نیچے پر پتھار کی فون ”ڈیڈ“ ہے۔ بے حد خوش آئند صورت حال تھی۔ فون تک پہنچ جانے کے باوجود انسپکٹر اسے استعمال کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اسے ایک خوبصورت اتفاق ہی کہا جاسکتا تھا۔ صرف سات آٹھ گھنٹے پہلے میں نے خود یہ فون استعمال کیا تھا۔ اس وقت یہ بالکل ٹھیک تھا۔ اچانک میری نگاہ کھڑکی سے باہر جھولنے ہوئے ایک پڑی۔ میں نے قریب باگرو کھانے کی ٹیلی فون کا تار تھوڑے دن کی چھت سے ٹوٹ کر پچھلے لنگ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر محسوس کیا جب سائیں عالی نے برساتی کی چھت سے چلائنگ لگائی تھی اور ایک تار کو تھوڑا ہوا نیچے آیا تھا۔ یہ تار وہی تار تھا۔ میں کچھ دیر حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ سائیں عالی کی ہر حرکت اور بات کے پیچھے کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا نادرست کرتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے اکثر افعال میں معنی و مقصد ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ہر اسرار قوت اس کے سنگ سنگ چلتی ہو اور اس سے کرشمہ سازیاں کرواتا ہو۔ میں فطرتاً حقیقت پسند ہوں اور زندگی کے محسوس پہلوؤں پر یقین رکھتا ہوں۔ بالفاظ دیگر ہر معاملے میں میرا نقطہ نظر سائنسی ہوتا ہے لیکن نچانے کیوں سائیں عالی کو دیکھ کر میں ایک عجیب سی کشش کا شکار ہو جاتا تھا۔ اب یہ تار والا معاملہ بھی غور و فکر کا تقاضا کرتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ صرف ایک اتفاق ہی ہو لیکن اگر اتفاق بھی تھا تو بہت حیرت انگیز تھا۔

میں چند لمحوں ”مرہو ٹیلی فون“ کے قریب کھڑا سوچ رہا پھر دبے پاؤں چلا کمرے سے نکلا اور اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جو آج رات انسپکٹر کے بیدوم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

اپنا ہنسل لاک کر کے چٹون کی جیب میں کھینچ لیا اور خم ٹھونک کر انسپکٹر دربار سنگھ کے سامنے آگیا۔ اسے اپنے کمرے کا علم تھا فزاد میرے دہانے پر زیادہ حیران نہیں ہوا۔ قاتلین پر گرتے ہی وہ اس پرگ کی مانند اچھل کر کھڑا ہوا اور بڑے دھیانہ انداز میں مجھ پر بھجنا۔ اگر مجھے اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو دربار سنگھ کا بوی دیوٹ مکا مجھے شب تاریکی میں خورشید کا دیدار کرنا دے۔ وار خانی کیا تو دربار سنگھ اپنے ہی زور میں سائیں فیکل سے جا کھڑا۔ فیکل پر رکھی ہوئی شیشے کی ایک خوبصورت مورتی کا تصادم دیوار سے ہوا اور مورتی دو ٹکڑوں میں ٹوٹ گئی۔ مورتی کا قریب ایک فٹ لمبا کھڑا دربار سنگھ کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ کھڑا آگے سے برہم کی طرح ٹوٹا اور سخت تھا۔ بے حد جنونی انداز میں دربار سنگھ نے اس ”برہمچی“ کو مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے دو وار بمشکل بچائے اور تیسرا وار ایک ٹکڑے پر روک کر دربار سنگھ کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ کراہتیں مورتی کا خطرناک کھڑا بدستور اس کے ہاتھ میں رہا۔ یہ سسٹیم کی بی بی ہوئی ہے حسین مورتی میں نے اس کمرے میں دو تین دفعہ دیکھی تھی۔ ایک ہندوستانی دیوتا کو مجسم کیا گیا تھا۔ وہ نہایت مہین لباس پہنے کھڑے پانی کا کھڑا نکالے کھڑی تھی۔ مجسمہ ساز نے بڑی بے باکی سے اس کے جسمانی خبیث و فراز کو قیامت بنا دیا تھا۔ ایسے سراپا کو شاعر لوگ ”قاتل“ کہتے ہیں۔ اس وقت یہ سراپا میرے لیے حقیقی معنوں میں ”قاتل“ بنا ہوا تھا۔ اس بلوری برہمچی کی ایک بچی تکی ضرب کسی بھی شخص کو موت کے کھاتے آوارہ سکتی تھی۔ قاتلین پر گرتے ہی وہ دربار سنگھ نے پھرتی سے کمرے کی اوڑھ کھڑا ہونا چاہا۔ میں اس لمحے کی قدر و قیمت کو سمجھتا تھا۔ دو قدم بھاگ کر میں نے جست کی اور ڈبل بند کے اوپر سے ہوتا ہوا یوں انسپکٹر پر گرا جیسے ”ہیراک“ سو نمک پول میں گرتا ہے۔ دربار سنگھ آہٹ آہٹ پھر ”قاتلین بوس“ ہو گیا میرے وزن اور ”مومیٹم“ نے اسے اچھا خاصا نقصان پہنچایا۔ اس کا سر بند کے کنارے سے کھرایا اور اس کے جوڑے میں سر سے پھول کھل اٹھا۔ دربار سنگھ کے ہونٹوں سے مغلقات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ میرے نیچے دبا ہونے کے باوجود وہ اندھا دھند مزاحمت کرنے لگا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے مورتی کا کھڑا چھوڑ دیا پھر گھونٹوں اور ٹھوکروں پر کھل لیا۔ شور و غل نے کوٹھی کے سارے کیمینوں کو اس کمرے میں جھنجھکیا تھا اور اب وہ انسپکٹر دربار سنگھ کی درگت بننے دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر ایک خطرناک تہ متقابل تھا۔ مجھے اس کے پہلے داری سے اس کا ہونٹا تھا کہ اگر میں

نے اسے ذرا سی بھی مہلت دی تو مکمل مجھ جائے گا۔ میں نے پہلی فرصت میں اسے ہاتھ آٹھ کیا اور ذریں گل کے ساتھ ٹل کر اس کے ہاتھ پٹ پر باندھ دیے۔ ہاتھ باندھنے کے لیے وہ چڑی استعمال کی گئی جس میں ذریں گل اپنا سرخ روشن چھپا کر سیاں پہنچا تھا۔

انسپکٹر دربار سنگھ کاٹ ایک گھڑ کا دانہ تھا جس میں سے غلاعت کا بوی کی شکل میں اٹل رہی تھی۔ وہ ہم سب کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ پہلے سفیر احمد کو لگا کر تار ہا کہ اس نے دوست ہو کر اس سے دھوکا کیا ہے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ”تھ“ بڑا استاد بنا پھر تار ہا ہمارے لیے کل کا پچھلے دوست ہو کر اس سے دھوکا کیا ہے پھر راستہ نہ نکال دی تو اپنے باپ کا نہیں میں۔ پتا نہیں تھرا واسطے اب تک کن پولیس والوں سے بڑنا رہا ہے۔ میں بھاگنے والا بیڑا تھا نے دار میں ہوں، ٹانگیں جبر کر پیچک دینے والا تھا نے دار ہوں۔ ہم لوگ تین نسلوں سے پولیس میں ہیں اور تھیرے جیسے گھمنڈیوں سے اپنے جوتے چنوا رہے ہیں۔“

انسپکٹر دربار سنگھ کی بیانی بڑھکوں کا مجھ پر کیا اثر ہونا تھا۔ ایسی بہت بڑھکیں سنی تھیں میں نے۔ پچھلی جب پتھرے میں آتا ہے تو کچھ دیر بہت پڑ پڑاتا ہے چوں چوں کرتا ہے پھر نر حال ہو جاتا ہے اور سر زوال کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ انسپکٹر دربار سنگھ کے ساتھ کسی بھی کچھ ہونے والا ہے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی اہلیت ظاہر ہو گئی ہے اور وہ بڑی طرح جھس گیا ہے۔ یہ شور و غل جو وہ چا رہا تھا شور و غل نہیں تھا وہ ماتم تھا اس بد بختی کا جو اس سیاہ شب کی بطن سے اس کے لیے پھوٹی تھی اور اس رات کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی۔

صبح کے تین بجتے والے تھے۔ دربار سنگھ کی گالیاں مٹن کر مجھ پر عجب سی وحشت طاری ہو چکی تھی۔ میں نے ذریں گل اور ملازم ادریس کے سوا سب کو کمرے سے نکال دیا۔ ہم نے دربار سنگھ پر صرف آٹھ گھنٹا صرف کیا۔ یہ بہت تھوڑا وقت تھا لیکن بڑی دلجوئی اور توجہ سے لگایا گیا تھا۔ اس آٹھ گھنٹے کے اندر دربار سنگھ کے رگ و پے میں ”تین نسلوں“ سے بھی ہوئی ساری اکثر فون پانی کی طرح برہم گئی۔ مسلسل غلاعت اٹھنے والا گھبرند ہو گیا اور اس کی شعلہ نشان آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔ اس کا پلٹ کی قیمت صرف ڈھائی انگلیاں تھیں۔ ڈیڑھ بائیں ہاتھ کی اور ایک دائیں ہاتھ کی۔ یہ انسپکٹر دربار سنگھ کی

انگلیاں تھیں جو میں نے اسے اونٹ ہانکا کر پوتا سنگھ کی تیز  
دھار کرپاں سے کاٹی تھیں۔ دوسروں پر تشدد کی انتہا کرنے  
والا اور انہیں قہر زدگی کی جنگی میں پینے والا جب خود اذیت  
کے گلیتھ میں کسی گھاسا تھا تو قہر زدگی ہی دیر میں ریزہ ریزہ ہو گیا  
تھا۔ انسان لاکھ حساس اور زخم زد ہو لیکن کسی کیفیت کا صحیح  
ادراک اس وقت تک نہیں ہو پا تا جب تک وہ کیفیت خود پر  
نہ گزرتے۔ دربار سنگھ کو بھی آج احساس ہوا تھا کہ اذیت  
کے کہتے ہیں اور اس کی بلند دھالوں کے سامنے تین نسل  
ہو گیا "پلیسا" کس طرح کھٹے پیتا ہے۔

دربارِ سنگھ کے ہاتھوں سے بہتا خون روکنے کے لیے پوتا  
سنگھ کی پگڑی استعمال کی گئی تھی۔ پھر اسی پگڑی کی پٹیاں چھڑ  
کر اس کی انگلیوں پر باندھ دی گئی تھیں۔ اب دربارِ سنگھ کے  
دونوں ہاتھ دو بڑی پٹیوں کے ذریعے گردن میں جھول رہے  
تھے اور قہرِ قمار کا نئے جا رہے تھے۔ اس کا رنگ سرسوں کی  
طرح زور تھا۔ وہ انکس پھیلائے خون آلود قالین پر بیٹھا تھا  
اور دربار سے ٹپک ٹپک لگا رہی تھی۔

میں نے کرسی اس کے قریب کھکھکاتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ چیخ کس کہاں ہے جس سے تم نے کنڈی لکھاڑی؟“  
 اس نے آنکھوں سے اس کیجی کی طرف اشارہ کیا جس  
 پر ایک کھٹنا پیلے میں سے دربار کھکھکا ایک جان لیوا دروا کا  
 تھا۔ وہ پھٹا ہوا کتبہ ایک بیڑی دروازے کے پاس بڑا تھا۔  
 میرے اشارے پر زین گل آگے بڑھا اور اس نے کیجی کے  
 خلاف میں سے چیخ کس نکال لیا۔ میں نے پوچھا۔ ”میل فون کا  
 تالا کسے کھولا؟“

”کمرے کے اندر سے ہی لوہے کا تار اُٹ گیا تھا۔“ دربار  
سکھ نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں اس نے  
جو لرزہ خیز جھجک دیکھا رکھی تھی اس کے سبب اس کی آواز بالکل  
بندھ گئی تھی۔

”تم کہتے ہو کہ فون ڈیڈ تھا پھر تمہیں تالا کھولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔“ میں نے پوچھا۔  
”مجھے بعد میں پتا چلا کہ فون ڈیڈ ہے“ دربار سنگھ نے کراچے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بات تو سمجھ میں آئی ہے“ زہراں کل نے لقمہ دیا۔ ”اگر خیال ہے کہ وہ بارہ بجے کے کچھ بج چکا ہو گا۔ اور بارہ بجے تو۔۔۔ ایسے ہی کام ہو سکتے ہیں“

میں نے خون اکود کرپان دربار کھجی کے ہی رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا، ”ابھی تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم یہ فون قمار میں نہیں اپنے گنہگار دوست کو کر رہے تھے،

اے بیان بٹانے سے کیا مقصد تھا؟  
دوبارہ سنگھ نے کرپان سے نظریں چراتے ہوئے کہا "میں  
تمہیں ذاتی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا" لہذا میں نے سوچا کہ  
تم لوگوں کو محلے کی مدد سے گرفتار نہ کروں۔  
"ذاتی تحویل میں رکھ کر تم کیسے کرتے؟"  
"تم سے نرک کے بارے میں پوچھ چکے کرتا۔ اور۔  
اور کوشش کرتا کہ تم لوگ۔۔۔ میرے ساتھ مل کر نرک  
تلاش کرو۔"  
"تمہارے ساتھ مل کر تو ہم کر رہے تھے اور رات پہلے  
پہر کی بات ہوئی تھی۔"

”لیکن مجھے دشواریاں نہیں تھیں۔ میرا دھار تھا کہ مجھ سے دھوکا ہوگا۔“

میں نے دو سکریٹس لگا کر ایک اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور کہا "تم نے اعتراف کیا ہے کہ ٹرک کے حوالے سے تمہارے پاس کچھ ایسی معلومات ہیں جن کا ذکر تم نے اپنی تحقیقی رپورٹ میں کہیں نہیں کیا۔"

وہ بولا "میں نے یہ بات ٹرک کے بارے میں نہیں" 22  
مارچ والی واردات کے بارے میں کسی شخص۔  
"پلو" واردات کے بارے میں ہی سہی۔ کیا معلومات  
تھیں وہ؟

وہ بولا ”میں اپنے من میں کوئی بھی کھوٹ لائے بغیر  
جسیں وہ معلومات دینے کو تیار ہوں اور یہ وٹو اس بھی دلاتا  
ہوں کہ جو جانکاری میں دوں گا وہ تمہارے لیے فائدہ مند  
 ثابت ہوگی لیکن اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟“

میں نے زہریں کھلے کہا۔ ”کلتاے“ اس کی ایک آواز انگلی اور کانٹا بڑے کی ”میری بات سن کر دوبارہ کھٹکا زور دے گا۔ کچھ اور زور دے گا۔ تاہم وہ منہ سے بولا کچھ نہیں۔ میں نے اس کی طرف جھپٹتے ہوئے سفاک لمبے میں کہا۔ ”دوبارہ کھٹکا! تو اس وقت کوئی شرط نہ رکھ دو نہ میرا داغ بھر الٹ جائے گا۔“

زیریں گل نے لقمہ دیا "تمہارے لیے سووے بازی کا وقت گزر چکا ہے خرچہ۔ اب جو امارا استاد صاحب پرچھا ہے وہ چپ چاپ ہوتا جا۔ چل شاہاں۔ اللہ تجھے فتح کرائے گا۔"

دوبارہ سگم نے خنک ہونٹوں پر زبان بھیری۔ پہلو بدل کر بولا۔ ”میں اپنی جان چھڑانے کے لیے تمہیں غلط سلط بھی بتا سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ۔“

کمال ہے چڑا اور رخسار پر پنجاب کا نقشہ بن گیا۔ ”تو غلط ہمارے  
 دیکھ۔ اُن اُنکا کہ مومنیائی نہ نکال دوں تو کھاتا تو خین نسلوں سے  
 تھانے دار سے تو میں نے بھی بڑی بڑی میز میز نسل کے کتوں  
 کو موم سیدھی کی ہے۔“

ایک جھلکے کے ساتھ میں نے اس کے راس میں ہاتھ سے  
پتی آثار کمر چسکی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور کئی ہوئی  
انہی کے نصف اچھے لے منڈ سے گامزا خون پینے لگا۔ دربار  
سمنے نے بے ساختہ اپنا ہاتھ عقب میں چپانے کی کوشش کی۔  
اس کے چہرے کی زردی اب اتنا کچھوڑھی تھی۔ کسی ایسے  
مردے سا چوتھا جس کا سارا الو اس کے زخموں کے راستے  
بہہ گیا ہو۔ میں نے کہاں سنبھالی اور ذریں گل سے کہا  
”ذریں! ذرا بچاؤ اس پائے خاں کو قاتلین پر“ اس جھلے میں  
ایک ذلت آمیز گالی بھی شامل تھی۔ ایک لمبے کے لیے  
عموس ہوا کہ دربار سمنے اپنی رہی سہی بہت بیچ کر کے مجھ پر  
ٹوٹ پڑے گا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں مجھ کے والی چنگاری  
شعلہ بنے بغیر بجھ گئی۔

میں نے کہا۔ ”وہی جو تیس 22 مارچ والی واردات کے حوالے سے معلوم ہے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھو“ کاٹھ کے آئوٹس ہیں ہم۔ جو کچھ تمہاری کتنی زنان سے ادا ہوگا۔ ہم اس کی پوری تصدیق کریں گے“ اس کے بعد ہی جمیں رہا مگر نہ پانہ کرنے کے بارے میں سوچا جائے گا۔“

دوبارہ سنگھ نے راہِ راست پر آنے میں تین چار منٹ مزید صرف کیے۔ آخر وہ بات اس کی زبان پر آگئی جسے وہ نہ جانے کب سے چھپائے چھڑا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور میں نے اپنے سوالات کی مدد سے جو کچھ پوچھا اس کا خلاصہ یہ ہے: ”قریباً پندرہ روز پہلے فزک کولٹ تھانے کے ایڈریس پر انسپکٹر دوبارہ سنگھ کو ایک خط موصول ہوا تھا۔ ڈاک کے ذریعے آنے والا یہ خط ایک مکتبہ عورت کی طرف سے تھا۔ عورت پڑھی لکھی محسوس ہوتی تھی اور اس نے مناسب الفاظ میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ اپنے خط میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس شخص کو جانتی ہے۔ جو اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ 22 مارچ کی شب محشر قارم میں داخل ہوا اور لوٹ مار کی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک دو روز میں خود پولیس اسٹیشن آکر ساری بات بتائے گی، لیکن اس شرط پر کہ اس کا نام سینڈ راز میں رکھا جائے اور اس سارے معاملے میں مکمل رازداری برتی جائے۔ یہ خط 27 مارچ کو لکھا گیا تھا لیکن دو روز بعد اطلاع دینے والی نے نامعلوم وجہ سے اپنا ارادہ تبدیل

کر لیا تھا اور وہ سراخدا انپکڑو بار سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر بھی فیروز پور کے ایک نوابی ڈاک خانے کی منرگی تھی۔ تحریر پہلے خط کی طرح شکستہ تھی اور اندازہ وہ تھا کہ لکھنے والی نے اپنی "تحریر" تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے اس خط میں لکھا گیا تھا کہ اپنی مجبوروں کے سبب دو بلیس اسٹیشن نہیں آسکتی اور نہ ہی کسی اور طریقے سے انپکڑو بار کے ساتھ رابطہ کر سکتی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ جس شخص کے متعلق اطلاع دینا چاہتی ہے وہ پیر نگر شاہ کے لیے میں آئے گا اور میلے کے آخری روز تاغوں کی دوڑ میں شرکت کرے گا۔ اطلاع دینے والی نے اس شخص کا نام پتا نہیں لکھا تھا۔ لیکن اس کی اتنی واضح نشانیاں بتادی تھیں کہ اسے ان نشانوں کی مدد سے پہچاننا بہت آسان تھا۔ اس نے پورے یمن سے لکھا تھا کہ پہلے کے آخری روز وہ شخص سرخ تہ بند قمیص اور سنہری واسٹ میں آئے گا۔ اس کے سر پر کسی تاغوں والی سرخ چکڑی ہوگی۔ وہ تیس بیس سال کا لمبا چوڑا شخص ہے۔ بال چھوٹے، مونچھیں گہنی اور رنگ سرخ دھبہ ہے۔ مزید بتایا گیا تھا کہ اس کے پاس کر بان یا لامچی ہوگی لیکن اس کا اصل اسلحہ وہ ماؤزر ہوگا جو اکثر اس کے لباس میں چھپا رہتا ہے۔ خط کے آخر میں لکھا گیا تھا کہ اس تحریر کو ذرا قے سمجھا جائے۔ وہ شخص آخری روز پہلے میں ضرور آئے گا اور وہی اس راہوں کا اصل مجرم ہے۔ ان دونوں خطوط کی موصولی کے بعد انپکڑو بار سنگھ نے ٹونڈا گائے کی کوشش کی تھی کہ خط کس نے لکھے ہیں اور کس کے بارے میں لیکن اسے مکمل ناکامی ہوئی تھی۔ پھر اس نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے جس شخص کے بارے میں خبر کی گئی ہے وہ ہر سال تاغوں اور ریڑھوں کی دوڑ میں حصہ لیتا ہو۔ اس نے پہلے کے منتظمین سے رابطہ کیا تھا اور کونین لگائے کی کوشش کی تھی مگر ساراں بھی تفتیش آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

یہ میلہ ہر سال اپریل کے شروع میں فریڈ کوٹ کے ایک قومی گاؤں لشکر وال میں ہوتا تھا۔ موبیوں کی ایک بڑی منڈی بھی لگتی تھی۔ رستاشی اور آٹا گاہ ریس اس میلے کے دو اہم اقسام تصور کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مکمل قماشے اور رنگا رنگ دھوپیاں اس میلے کا خاصہ تھیں۔ اس واقعہ سے پہلے ۱۱ سے ۲۳ تاریخ تک لگ رہا تھا۔ اس حساب سے میلے کی اصل گہما گہما شروع ہونے میں بھی سات آٹھ روز باقی تھے۔"

یہ ساری باتیں بتانے کے بعد انسپکٹر دربار سنگھ نے مجھے دو دونوں خطوط بھی رکھا دیے جو اسے گتہام عورت کی طرف

○☆☆○

مرکی جوت کے سبب مج تک سیراچہ کا چہرہ سوج چکا تھا۔ وہ کچھ شکر بھی نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے فکر اسی بات کی تھی کہ میں نے ایک آن ڈیول پولیس انسپکٹر کو بڑی طرح مار پیٹ کر اور زخمی کر کے "سہمان باجر" بنالیا تھا۔ یہ ایک طرح سے مقامی پولیس کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ سیراچہ نے انسپکٹر دربار سنگھ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ پوری قبیلہ پولیس لائن میں ہے۔ کوئی انسپکٹر ہے کوئی ڈی ایئر۔ بہت سخت لوگ تھے۔ ایک بار جس کے پیچھے پڑ جاتے تھے اسے جبری دیواروں تک پہنچاتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ باتیں ایک ایسا شخص غرور تھا جس کا اپنا بھائی (جانی بادشاہ) پولیس کا ایک صوف اور دیگ افسر تھا۔ ناشتے کے بعد میں "ذریں گل" اور پوتا سنگھ کے ساتھ علیحدہ کمرے میں جا بیٹھا۔ میں پوچھتا جا پتا تھا کہ ان لوگوں کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ ۲۳ مارچ کو ہونے والی واردات کی انکوئی گواہی کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ ہم عسرت فارم سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ کوئی بری ہونے کے علاوہ وہ آن پڑھ بھی تھی۔ ایسے شخص سے کچھ پوچھ لینا کاردار ہوتا ہے۔ اور پھر وہ لڑکی تو ہم باگل بھی ہو رہی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ وہ کبھی موچنوں والے کسی شخص کو دیکھ کر کیسے روٹی چلاتی تھی۔

میرے پوچھنے پر ذریں گل نے بتایا "لڑکی کا حالت اب کافی سنبھل گیا ہے۔ وہ امارے ساتھ ہی ڈاک بیٹھے کے خانے میں رہ رہ رہے۔ وہ دونوں آوی بھی ساتھ ہے جسے ام عسرت فارم سے پکڑ کر لایا تھا۔ ان میں سے ہر سنگھ کو ایک روز باولیات نے کافی تہنیز بھی مارا تھا لیکن وہ بھی کھتا رہا ہے کہ اسے واردات کا کچھ پتا نہیں۔ باولیات کو گولی لڑکی سے بھی پوچھ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ کبھی کبھی ہاتھوں کے اشاروں اور "خون عاں" کی آوازوں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جلد ہی روئے لگ جاتا ہے۔"

پوتا سنگھ نے اپنے بیٹے کیلئے کرتے سے آنکھوں کی گینڈ صاف کرتے ہوئے کہا "بڑی عجیب لڑکی ہے جی لڑکی کیا ہے نرالیسا ہے۔ کوئی دانے تو بھی روٹی ہے پریم سے بات کرے تو بھی روٹی ہے اور خود کچھ کھنے کا جتن کرے تو بھی اس کا دوتا نکل جاتا ہے۔ باولیات صاحب نے بڑا مغز کھپایا ہے اس سے۔ لیکن لگتا ہے کہ کوئی کام کی بات انہیں بھی بالوم نہیں ہو سکتی۔"

میں نے کہا "اس لڑکے پر سنگھ اور اس کے چاچے نے

سے موصول ہوئے تھے۔ کالی سائز کے منے پر بال پوائنٹ سے لکھا گیا تھا۔ الفاظ اس فصل کی مانند دکھائی دیتے تھے جو بے حد تیز ہوا کے سبب کھیت میں کھینچ نظر آ رہی ہو۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر پینڈر رائٹنگ گاڑی گئی ہے۔ انسپکٹر دربار سنگھ نے دونوں خطوط تو فیڈوں کی طرح پڑھ کر کھینچے ہوئے کی ایک خفیہ میں چھپا رکھے تھے۔ میں نے پڑھنے کے بعد یہ خطوط اپنے پاس رکھ لیے۔

دوبار سنگھ میرے اشاروں پر تاج رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جو زیادہ سے زیادہ فائدہ اس سے حاصل کیا جا سکا ہے کر لیا جائے۔ وہ ایک بد معاشر تھا۔ دار تھا اور شرافت کے ساتھ اس پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ میں نے اس سے چند سادہ کاندھات پر دستخط کرا لیے پھر ایک ایسے ہی کاندھ پر اس سے ایک رقعہ لکھوایا۔ یہ رقعہ اس کے سب انسپکٹر کے نام تھا۔ رقعے میں لکھا گیا تھا کہ فلاں فلاں حوالاتیوں کو معافی مانگتا ہوں پھر چھوڑ دیا جائے اور تاہم ثانی ان کو کسی طرح سنگ نہ کیا جائے۔ ان حوالاتیوں میں باولیات کی والدہ۔ اس کا ایک بھائی "دوبار" بھی تھی اور چند قریبی ساتھی شامل تھے۔ رقعے میں انسپکٹر دربار سنگھ کی طرف سے یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اسے تفتیش کے سلسلے میں فوری طور پر فرید کوٹ سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ دو تین روز لگ جائیں۔

یہ رقعہ میں نے علی الصبح اس فوجوان کے ہاتھ تھامے بھیج دیا جس نے رات پوتا سنگھ اور ذریں گل کے ساتھ مل کر کوٹھی پر دھاوا بولا تھا۔ یہ فوجوان ابھی تک پولیس کے لیے ابھری تھا۔ رقعہ بھیجنے کے چند روز میں منٹ بعد میں نے انسپکٹر دربار سنگھ سے تھامے میں فون بھی کر دیا۔ فون پر بھی مختصراً وہی باتیں کہی گئیں جو رقعے میں لکھی گئی تھیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ نہ صرف باولی کی والدہ اور خیر خواہ رہا ہو جائیں گے بلکہ ایک دو دن انسپکٹر دربار سنگھ کی گمشدگی کا نوٹس بھی نہیں لیا جائے گا۔ انسپکٹر کی جیب ابھی تک باہر پوچھ میں کھڑی تھی۔ میں نے جیب ایک گیراج میں بند کروا کے باہر سے آلا لگوایا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر میں نے غزالہ سے دوبار سنگھ کے زخمی ہاتھوں کی مرہم بنی کر دوائی۔ غزالہ جیران تھی کہ زخمی کی انگلیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے ذریں گل کے ہاتھوں سے ایک تیز دھار کپان چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس جواب سے غزالہ کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ بینڈیج کرتے ہوئے گاے گاے مٹھوک نظر دے میری طرف دیکھتی رہی تاہم اتنی بہت اسے نہیں ہوئی کہ مجھ سے سوال جواب کر لے۔

کہا بتایا ہے؟

پوتا سنگھ اپنی باریک آواز میں بولا "وہ دونوں وہی کہہ رہے ہیں جو پہلے بول چکا تھا۔ یعنی وہ کل کی رات شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک پہلے رہے ہیں اور انہیں کچھ کھبر نہیں کہ ان کے بعد ذریں گل کیا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ گولی ہی کچھ تاسکتی ہے لیکن ابھی اس کے حواس ٹھیک نہیں۔ اس کے ہوش حواس ٹھکانے آئے تک انتظار کرنا ہوگا۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اچانک ایک خیال آیا تھا۔ دوبار سنگھ کو بخبری کرنے والی عورت نے اپنے خط میں اس شخص کا خلیہ لکھا تھا جو اس کے نزدیک ۲۳ مارچ کی واردات کا ذمہ دار تھا۔ اس خطے میں سرخ تہنیز قبیلے اور پکڑی کے علاوہ کبھی اور پکڑی پڑی "مومچوں" کا ذکر بھی آیا تھا۔ کیا یہ شخص اتفاق تھا یا واقعی کوئی لڑکی اور گمنام خطوط میں کوئی تعلق تھا۔ میرا ذہن سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ انھوں کے سامنے بار بار خطوط کے الفاظ گھومتے گئے۔ میں نے دوبار پر آویزاں کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ یہ ۳۱ مارچ تھی۔ غروال گاؤں میں میرے نظر شاہ کا سیلہ شروع ہونے میں ابھی آٹھ دن باقی تھے۔

آٹھ روز ہم نے اسی کوٹھی میں گزارے۔ انسپکٹر دربار سنگھ اس کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں مقیم تھا اور ارا سارا دن یہی تان کر سو رہا تھا۔ سامنے عالی اور ذریں گل میں آنکھ پھٹی جا رہی تھی۔ ذریں گل نے اس روز سے کوئی ذمہ پکڑا پھینے سے توبہ کر لی تھی تاہم سائیں عالی اب کی اسے دیکھ کر جلال میں آجاتا تھا۔ غزالہ اور دیشاؤ مختلف راج اور کروا کی لڑکیاں تھیں لیکن وقت کی مجبوری تھی۔ ناندوں کے ہر وقت ایک ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ نجائے بنائے سے کہیں نہ کہہ رہا تھا کہ میرے اور غزالہ کے درمیان کوئی دانی تعلق تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شرمی سی آنکھ لگی تھی اور وہ بہانے بہانے سے غزالہ کا ذکر کرتے لگتی تھی۔

لیکن اس نے مجھ سے کہہ ہی دیا "جہانی بی! اتنی سندر اور بھی جیون ساتھی آپ کو ہیں جنم میں بھی نہیں ملے گی۔ تیرے خوش قسمت ہیں آپ کہ وہ آپ سے پیار کرتی ہے۔ میں کہتی ہوں اسے جلدی سے شادی کی بھٹکری پتا کر دل کے لاپ میں بند کر لیجئے۔"

میں نے اس شرع بات کا جواب سرد مری سے دیا تو نشا انہی کی کہ وال میں کچھ کالا ہے اور آنکھ کے لیے خطا لگے۔

ان آٹھ دنوں میں مجھے جس فکر نے سب سے زیادہ تک کیا وہ "تمن" کی فکر تھی۔ اس کا سنوس چہو بار بار میری نگاہوں میں آتا تھا اور اس کے ساتھ شیخ عاصم کی کرفت صورت بھی نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ میں نے "تمن" کو "کمزیر" کے نواسی پڑاؤ میں دیکھا تھا اور اس کے فوراً بعد میں نے پڑاؤ چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ شیخ عاصم کے اس ہر کارنے نے کہاں تک میرا پیچھا کیا ہے۔ ظاہر تھا کہ پڑاؤ سے اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں اور غزالہ پڑاؤ میں رہائش پزیر رہے ہیں اور وہاں سے سیراچہ کے ساتھ نکلے ہیں۔ سیراچہ کے حوالے سے تمن فیروز پور پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے ٹھہر لگتا ہوا فرید کوٹ اور پھر اس کوٹھی تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ تمن کے اس کوٹھی تک پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص بھی یہاں پہنچ گیا ہے جس نے پچھلے چند برسوں میں میری تلاش پر کروڑوں روپے خرچ کیے ہیں اور مجھے اذیت ناک موت دینا جس کی زندگی کا اولین مقصد بنا ہوا ہے۔

ایک روز میں نے سیراچہ کو ٹھہر لینے کے لیے فیروز پور بھیجا۔ سیراچہ اور اس کے بھائی جانی بادشاہ کی رہائش فیروز پور میں تھی اور یہ سامنے کی بات تھی کہ اگر تمن مجھے "پولیس" کرنا ہوا پنجاب آیا ہے تو فیروز پور میں سیراچہ کے گھر ضرور پہنچے گا۔ سیراچہ جو کچھ خود بھی دیکھنی دار تھا وہ کوٹھی سے باہر نکلنے میں بہت محتاط رہتا تھا اور فیروز پور جاتے ہوئے تو اس کے لیے خصوصی احتیاط لازم تھی۔

وہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ساتھ رات کے وقت نکلا اور ایک دن فیروز پور میں وہ کرات ہی کو واپس آیا۔ اس نے خیریت کی اطلاع دی اور کہا کہ ایسے کوئی آثار نہیں ملے جن سے اندیشہ پیدا ہو کہ راجستان سے کوئی ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ اس نے کہا "میں اپنے ایک خاص بندے کی ڈیوٹی لگا گیا ہوں۔ وہ میرے ملنے ملنے والوں پر نگاہ رکھے گا اور کہیں کوئی مشکوک بندہ نظر آیا تو فوراً اطلاع دے گا۔"

فیروز پور سے سیراچہ ایک اہم اطلاع بھی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ "کمزیر" کے نواح میں ہم جس پڑاؤ کو چھوڑ کر آئے تھے وہاں سارا راج رتن سنگھ کے آدمیوں اور منہج کار کے ساتھیوں میں شدید جھڑپ ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلسل چھ گھنٹے فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ دونوں طرف کے کئی افراد ہلاک و زخمی ہوئے ہیں تاہم منہج کار کے اکثر ساتھی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ منہج کار خود بھی



شہید زخمی ہوا ہے۔ اس کی آنکھ میں گولی لگی ہے اور وہ بیکانہر کے اسپتال میں زیر علاج ہے۔ اس کی ساقیں مجھ پر اور مہاراج رتن کی دھرم پتی پر کماری کا کچھ پانسے چلا کر وہ کھان گئی ہے۔

میری نگاہ میں ہم کا جلا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ کتنا عبرتناک انجام ہوا تھا اس خود لڑکی کی کتنا گمانی کا۔ اس نے پکار کیا لیکن جب افسانے کو انجام تک پہنچانا ممکن نہ ہوا تو اسے ایک خوبصورت موڑ سے کرچھوڑنا چاہا۔ اپنے پیار کی قربانی دے کر وہ خاموشی سے اس دُلوے میں بیٹھ گئی جس میں اسے بٹھایا گیا۔ اس نے اپنے بچی کو اپنا سب کچھ جان لیا اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا چاہنے والا اس سے کبھی محبت کرتا ہے اور اب باقی باقی کا آئینہ لے کر بھی اس کے سامنے نہیں آئے گا۔ وہ اس کی رسوائی کو اپنی رسوائی سمجھے گا اور ان رسوائیوں سے بچنے کے لیے بیٹھ کے لیے اس کی دنیا سے نکل جائے گا۔ لیکن یہاں کمانی خوجہ قلمی کمانیوں سے مختلف ہو گئی تھی۔ پیار میں چوٹ کھا کر منوج زہر پڑا سانپ بن گیا تھا۔ اس نے نہ صرف پرک اذہدوئی زندگی کو ڈسٹا تھا بلکہ خود بھی جاہ و بابر ہو گیا تھا۔ اس دودا میں ایک موڑا ایسا بھی آیا تھا جب منوج کی منظر نظر اس کے سامنے تھی۔ اس کی دسترس میں تھی لیکن وہ اس سے دور رہنے پر مجبور تھا اس کے بلے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اور کمانی کا کسی موڑو زناہ اثر انگیز تھا۔

آخروہ دن آہیا جس کا انتظار تھا۔ میرا مطلب نگر وال میں لگنے والے بلے کے آخری روز سے ہے۔ یوں تو سبیلہ باج چھ روز پہلے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن آج اس کی دو تئیں صبح پر تھیں۔ ہم فرید کوٹ سے صبح سویرے چل نکلے تھے اس لیے دس بجے کے قریب پہلے میں پہنچ گئے۔ خالص رسوائی میلہ تھا۔ گردوری سے آؤنی نظر آرہی تھی۔ کیمڑوں کے درمیان کے کے راستوں پر بے چارے رنگ برنگ لباس پہنے پہلے کی طرف جاتے نظر آتے تھے ایک دو ٹولیاں دھل جاتی نظر آئیں۔ یہ سن چلے ایک بہت بڑی سبز چادر میں چندہ بھی جمع کرتے جا رہے تھے کچھ لوگ آنگوں اور بیل گاڑیوں پر سوار تھے۔ دور دور گندم کے بکے ہوئے کھیتوں میں بھی لال پہلے آجمل لہرا رہے تھے۔ پہلے میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں پورے علاقے میں گونج رہی تھیں۔ مویشیوں کی منڈی میلے کے اصل مقام سے کچھ ہٹ کر کھڑی لیکن اذہدام کے سب سے کچھ گندہ ہو چکا تھا۔ انسان مویشیوں میں اور

موسیقی بازاروں میں گھمے ہوئے تھے۔ ایسا بھرپور رسوائی میلہ دیکھنے کا بہت عرصے بعد اتفاق ہوا تھا۔ سیرا امہ کے علاوہ زریں گل اور بوہنگہ بھی میرے ساتھ تھے۔ زریں گل خاص طور پر اس پنجابی میلے کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ ہم دیر تک میلے کی گھما گھمی میں بچے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے میلوں غلیوں میں پولیس کے سادہ پوش کھوتے رہتے ہیں اور مشکوک افراد پر کڑی نظر رکھتے ہیں لہذا میں نے زریں گل اور بوہنگہ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ کوئی ایسے کام نہ کریں جس سے لوگ خاص طور پر ان کی طرف توجہ ہوں۔ اس کے باوجود زریں گل نے ایک جگہ جھگڑا مول لینے کی کوشش کی۔ تاہم بوہنگہ نے بڑی ذہانت سے معاملہ سنبھال لیا۔ موٹے تازے ٹوکوں کی ایک شوخ ٹولہ سامنے سے آ رہی تھی۔ پولیس کے کڑکھانی دار کرتے۔ گلے میں موچے کے ہار منہ میں بان دبائے ہوئے۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ایک چوڑے چلے لوکے نے مدھون بوٹھ کو یوں کندھا مارا کہ وہ دودھ کے ایک بڑے گڑا ہے۔ مگر گرتے گرجا۔ اس کا ایک ہاتھ دودھ میں گیا لیکن دودھ لٹھا تھا اس لیے بچاؤ ہو گیا۔ زریں گل نے بھی لوکے کی حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ تھیرکی طرح اس کے پیچھے لپکا اور اس گریبان تھام لیا۔ "سوئے تھامی کا پچھو تم کیا سمجھتا ہے۔ اب گوشت بہت بڑی پھلوان ہے تم" اس نے لوکے کو زور۔ "جھگڑو۔ لوکے کے جھگڑا ساعی" "ارٹ" ہو گئے۔ اسے پہلے کے رنگ ہو جاتا۔ بوہنگہ ان کے پیچ آ گیا۔

اپنی سین آواز میں بولا۔ "میں بھرا جی جھگڑا نہیں نہیں نہیں یہ کام نہیں کرنا۔" پھر زریں گل سے مخاطب ہو کر بولا "خان یار غلطی میری تھی۔ میں دوسری طرف رہا تھا۔"

اس نے زور لگا کر جٹ لوکے کا گریبان زریں گل چھڑا دیا اور لوکے کو دھکیل کر دھڑلے کیا۔ میں نے زریں گل کو ڈانٹا اور اسے پیچھے ہٹا دیا۔ یوں یہ مصیبت ٹل گئی۔ کچھ کے بارے میں میں نے جو اندازے لگائے تھے وہ ایک کر کے درست ثابت ہو رہے تھے۔ بظاہر معمولی آنے کے باوجود وہ معمولی نہیں تھا۔ بہت گہرائی تھی۔ محض کے اندر ایک بہت بڑے آسانی جھولے کے قریب سے گزر کر ہم ایک خیر بازار میں داخل ہوئے یہاں زنا فروشوں کی دھجی "کاسمان تھا۔ بہت سستی چیزیں لیکن یہ سستی اسیا خریدنے والی دھانوں کے چہرے پر۔ مسرت دکھائی دی وہ دھن "جیس" ہانگ کاک اور لند

ہم سینئر میں شاہک کرتی ہوئی بیگمات کے چہرے پر دکھائی دے رہی۔ قریب آنکھوں کی مصوم مصوم سی خوشیاں۔ کالج کی چڑیاں، بیٹل کے زیورات، پلاسٹک کے نائلی کے ڈکوریٹن ہیں۔

اس "پرسرت" بازار میں سے گزر کر ہم ایک سرس جھگڑا سے پہنچ گئے۔ یہاں ہاتھیوں کی ایک جوڑی اپنا ری بھرک لچ کر رہی تھی اور لوگ دلچسپی سے اسے دیکھ رہے۔ اچانک ایک شخص نے سیرا امہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس سے کھسک پھرنے لگا۔ وہ سیرا امہ کا شناسا نظر آتا تھا۔ اس سے مل کر سیرا امہ کو کوئی خاص خوشی نہیں۔ وہ سانولے رنگ کا تھیں بیس سالہ شخص تھا۔ لوگوں سے عیاری عیاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ سیرا امہ چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ اب وہ بہت توجہ سے دے شخص کی بات سن رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد یہ منتھو ہوئی اور سیرا امہ نے اٹھے ہوئے کچھ میں مجھ سے کہا "بھئی اذہر مارا رنگ چلتے ہیں۔"

ہم چاروں سانولے شخص کے ساتھ ہو لیے۔ تاہم کچھ لمے جا کر میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ ہم سے علیحدہ ہائے اور اذہر گرد نظر رکھے۔ پہلے کے شالی حصے میں بکے ہر۔ کانگید نظر آ رہا تھا، بیس پر نظر شمار کا مزار تھا۔ مزار کے اڑے چھوٹے بڑے خیمے تھے اور جھکیاں سی بنی ہوئی۔ بہت دھواں دھار اور میلا جھگڑا ماحول تھا۔ تل والی ٹیوں کی خوشبو چار سو پھیل ہوئی تھی۔ سانولا شخص ہمیں رے قریب ہی ایک دھانے میں لے گیا۔ دھانے میں لہ ہونے کے لیے ایک تنگ سارا راستہ تھا۔ اس راستے پر ہانکا شخص پراسرے والے انداز میں کڑا تھا۔ اندر "پال" پھی ہوئی تھی۔ بہت سے بے فکرے یہاں بائیسے سرگٹ نوشی میں مصروف تھے۔ سرگٹ کے میں میں چرس کی بورجی بنی تھی۔ کچھ لوگ بھگ گونے مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں لے لے چو غوں والے نا سمنڈے سے بھی تھے۔

سانولا ہمیں لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ ہم نے لا کا حصہ نظر آنے کے لیے سرگٹ ٹنگا کے سیرنے لے شخص کا خلاف کراتے ہوئے کہا کہ یہ اے ایس قیانت ہے۔ اسی تھانے میں کام کرتا ہے جہاں اسپیکر رکھ کر ایس ایچ او ہے۔ یہ اے ایس آئی قیانت ایک بار چلا کہ شخص تھا اور اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا بہت باخبر بھی ہے۔ باتوں کے دوران وہ مسلسل چرس کے

"سوئے" لگا رہا تھا اور باوجود اس کے کہ آنکھیں نشے سے سرخ ہو رہی تھیں، ملائی چرس پیٹنے والوں کو ماں بہن کی گالیاں بھی دے جا رہا تھا۔ اپنی باخبری ثابت کرنے کے لیے اس نے ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ ہم رنگ رہ گئے۔ اس نے کہا "سیرا صاحب! ہمارا تھانہ، تھانہ نہیں گند کی کاڑھیر ہے۔ ہر جرم دہاں ہوتا ہے۔ رشت میں نہرا ایک ہے جو بے کاوا دہاں ہے، شراب نوشی دہاں ہوتی ہے، کوئی ہی رات جاتی ہوئی جب دہاں کسی عورت کو خراب نہیں کیا جاتا۔ اسپیکر دربار اور سب اسپیکر کپال ایسے کاسوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی آپس میں بھی غشی رہتی ہے۔ دونوں کا کھد مضبوط ہے۔ اسپیکر دربار کھ کی تو پوری جلی پولیس لائن میں ہے۔ اس کھ میں یہ لوگ بہت بڑے ہیں۔ دوسری طرف سب اسپیکر کپال بھی آئی جی کا سالا ہے۔" اس نے بتایا "اسپیکر جھیلے آٹھ دس روز سے غائب ہے لگتا ہے کسی خاص جگہ میں ہے یہ بات اب بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ اسپیکر دربار کھ کے جرائم پیشہ لوگوں سے کھرے رابطے ہیں۔ ترک والے معاملے کا تو آپ کو بھی پتا ہو گا۔ اس میں کچھ اور لوگوں کے علاوہ استاد جانی کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ استاد جانی جرائم پیشہ لوگوں کے ایک نہایت خطرناک گروہ کا سرغنہ ہے۔ چند ماہ پہلے پاکستان سے جیل توڑ کر بھاگا ہے اور اب فرید کوٹ کے آس پاس کہیں موجود ہے۔ یہ ایک معتبر اطلاع ہے کہ اسپیکر دربار نے استاد جانی کو پکڑوانے کے لیے کسی گروہ سے پچاس لاکھ میں سودا کیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سودا شکر شکر کے گروہ سے ہوا ہے۔"

میں یہ باتیں سن رہا تھا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو رہی تھی۔ اس شخص کی باتوں سے سچائی جھک رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے فوڈا نہیں آ گیا کہ اس شخص نے "پچاس لاکھ" کی جو بات کی ہے وہ سچ رہی ہوگی۔ اپنے اقبالی بیانات میں اسپیکر دربار کھ نے یہ کہا تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر اپنی ذاتی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ ترک کی تلاش میں مجھ سے مدد لے سکے۔ یہ بات اس وقت بھی میرے دل کو نہیں کھلی تھی اور مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید دربار کھ کبھی منصوبہ بندی کے بجائے فوری منافع کو ترجیح دے اور میری گرفتاری کو کسی "ضرورت مند" سے کیش کر دے۔

اس دھواں دھواں پنڈو خانے میں بیٹھ کر اے ایس آئی قیانت نے جو دھواں اکشاف کیا وہ زیادہ سنسنی خیز اور جرت ناک تھا۔ اس "اکشاف" سے یہ امر بایہ ثبوت ہو چکا کہ

گناہم غفلوں والے جس معاملے کو ہم "ٹاپ سیکرٹ" سمجھ رہے ہیں وہ "ٹاپ سیکرٹ" نہیں رہا۔ کسی استھانی پر بے کسی مانند یہ راز بھی آؤٹ ہو گیا تھا اور اسے آؤٹ کرنے والا وہی سب انسپکٹر کوپال تھا جس کی انسپکٹر دہراز سے غنی رہتی تھی۔ فیتانہ نے بتایا "سب انسپکٹر کو کسی طرح دوسرے خط کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اس نے سوچا جب انسپکٹر دربار سنگھ اپنی جانکاریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو وہ کیوں بھیجے رہے اس نے فریڈ کوٹ میں موجود ایک شخص سے رابطہ کیا اور اس سے کافی رقم لے کر یہ "جانکاری" دے دی۔ بعد میں شکر شکر کے گردہ کو بھی کسی طرح پتا چل گیا۔"

"یہی۔ اب وہ لوگ یہاں موجود ہیں؟" سفیر احمد نے پٹکا کر پوچھا۔

"بالکل موجود ہیں" فیتانہ نے پورے یقین سے جواب دیا۔ "میرا چار ہے کہ اس وقت مختلف گروہوں کے کم از کم سو مسلح افراد میلے ہیں، موجود ہیں اور وہ سب کے سب نہایت خطرناک لوگ ہیں۔ وہ سب اس "کلیو" کی تلاش میں ہیں جو گناہم چنسی کے ذریعے انسپکٹر دربار سنگھ کو ملتا تھا۔ میں ممکن ہے کہ ان لوگوں میں شکر شکر اور استاد جانی بھی شامل ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میلہ ایک خونریز جنگ سے کی نذر ہونے والا ہے۔"

"اور پولیس کیا کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

فیتانہ جس کی گولی کو تھما کر میں ملتا ہوا ہوا۔ "پولیس بے بس تماشائی ہے۔ آج سو رہے تک تو انہیں خبری نہیں تھی کہ صورت حال کتنی سنگین ہے" اب وہ کچھ الٹ ہوئے ہیں۔ مگر کیا کریں گے؟ وہ آئے ہیں ملک کی طرح ہیں۔"

اچانک مجھے ذہن گلی کی صورت نظر آئی۔ وہ اس نے خانے کے دروازے پر کھڑا تھا مجھ سے نگاہ ملنے ہی اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز چڑکنا دینے والا تھا۔ میں نے سفیر احمد اور بونا سنگھ کو فیتانہ سے باتیں کرتے چھوڑا اور خود باہر گیا۔ مجھ سے بات کیے بغیر ذہن گلی ایک طرف جا رہا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ میں اس سے تعلق ظاہر کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے آؤں۔

ایک بڑے فیملی کے سامنے لوگوں کا جھوم تھا۔ حمیرے باہر گٹ پیچ والا ایک اونچے چان بدیشا تھا۔ اسی چان کے ایک حصے پر دو لڑکیاں اور لڑکے رقص کر رہے تھے۔ ایک جوڑا دھاتی لباس میں تھا اور دوسرا شہری میں۔ بے یک میں گانا بجا رہا تھا۔ "جب پیار کیا تو ڈرتا کیا۔ پیار کیا کوئی چوری نہیں کی، چُپ چُپ آپیں بھرتا کیا" ناچنے والے جوڑے

واقعی اس گانے کا حق ادا کر رہے تھے۔ لوگوں کے ہاتھوں "ادارگی" دینی تھی اور لڑکیاں اپنے جسموں کو روبرو کر تھیں اور ہر کسی کے لیے یہ حرکات سرعام اور علی الاعلان ہو رہی تھیں اور پولیس والے بھی اس پاس ہی محکوم رہے تھے ظاہر ہے ان کی جیبیں گرم تھیں۔

ذہن گلی تماشائیوں کے درمیان جا کھڑا ہوا اور "اٹھا کر لگا" رنگ ناچ گانا دیکھنے لگا۔ میں حیران ہوا رہا تھا کہ وہ صرف یہ بدھ کی دکان کے لیے یہاں لایا ہے۔ لیکن میری نگاہ گلی کے چان تلے ایک شے پر پڑی اور جگر گئی۔ فیتانہ کے..... الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے اس نے کہا تھا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میلہ ایک خور بنگا سے کی نذر ہونے والا ہے" اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

چان کے میں نے مجھے چند بولے نظر آئے۔ وہ ایک چار پائی پر بیٹھے تھے اور در گرد کے بنگا سے سے قلعی بے پنا ہو کر ناش کھیل رہے تھے میں ان میں سے ایک بولے کو دیکھ کر چونکا۔ وہ دوسرے بولوں سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا رنگ سیاہ، آنکھیں زرد اور چہرے پر کڑی کٹنگ میں پہلی گانہ اسے پہچان گیا۔ وہ کسی سرکس یا تماشے کا بونا نہیں قادر زنا کا خوفناک باڈی گارڈ تھا۔ استھانی ملک اور سفاک "اس۔ چادر کی گلی بار کھی تھی۔ میں ممکن تھا کہ اس گلی میں کو آنکھیں ہتھیار بھی موجود ہو۔ اس باڈی گارڈ کی یہاں موجود ثابت کرتی تھی کہ قادر زنا بھی نہیں نہیں یہاں موجود ہوگا۔ وہی قادر زنا جسے مروت و احسان مندی چھو کر نہ مگر زنی علی اور جس نے اپنا مطلب تلنے ہی غزالہ کو شکر کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں تھا کہ وہ اس مہمان دان کو ایک درندے کے حوالے کر ہے جس نے شب و روز ایک کر کے اس کی بیوی کی جان بچ رہے اور اسے ایک بچے کا باپ بنایا ہے۔

میں نے سوچا اگر قادر زنا اور شکر شکر جیسے لوگ یہاں موجود ہیں تو پھر اس میلے کی رو نہیں بہت جلد دم توڑ والی ہیں۔ میں شلوار قمیض میں تھا کندھے پر ایک بڑا سفید رومال تھا۔ اسے ہتھالی میں "صاف" کہتے ہیں۔ میں صاف سر کے اوپر سے گزار کے منہ پر لپیٹ رکھا تھا۔ اندر ایسا ہی تھا جیسے میلے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے۔ ڈھانچ رکھا ہو۔ قادر زنا کے کیا امور نہ بونے کو دیکھ میں نے صافے کو چہرے پر توڑا سا مزہ چڑھالیا۔ مجھے بو کا دیا کر کرانے کے بعد ذہن گلی دوبارہ چنڈو خانے میں آیا۔ یہاں تھما کو کا دھواں اب کچھ اور دیر ہو گیا تھا۔ چرا

انہی کی بوا تھی زیادہ تھی کہ سانس لینا دشوار تھا۔ ایک نئے رنگ میں اگر ٹھکا لگا رہا تھا۔ اس کے چند ساتھی گھاس و گلے وغیرہ بجا کر رقص کو ساز فراہم کر رہے تھے۔ نئے باز نے رقص کرتے کرتے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور ایک لمبی ن اٹھائی۔ اس تان کا اختتام "پاپو" کی لمبی جلی آوازوں پر۔ نئے باز غیبت بخالی میں بچے کے بول گانے لگا۔ اس نے میں ان سندر باروں کا ذکر تھا جو نڈل سے زیادہ نرم اور ستوری سے زیادہ خوشبودار ہیں جو بن سنور کر ملے میں آتی۔ بدھ مرے گزرتی ہیں دلوں پر پاؤں رکھتی جاتی ہیں اور خوش قسمت بھیڑ بھاڑ میں ان سے ٹکرا جاتا ہے اسے بغیر یہ خراج کیے رس ملائی اور بلیں کا سوا دیا جاتا ہے۔

چنڈو خانے کی دھواں دھواں فضا میں ٹھنک محسوس رہی تھی۔ میں نے سفیر احمد اور اسے ایس آئی فیتانہ سے اکہ کس اور چل کر بیٹھے ہیں۔ وہ شاید خود بھی یہی چاہتے تھے میرے کہنے پر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اسی ٹنگ سے تھے میں سے پہلے دار کے سامنے سے گزر کر ہم پانچوں رنگے ناچ گانا دیکھنے والے حمیرے گٹ بدستور خت ہو رہے تھے اب لاڈا انسپکٹر پر آواز لگانے والا لہ کن انداز میں چچ رہا تھا "مہمان، تدر دان! شو شروع نے والا ہے" آخری گٹ ہیں۔ جلدی آئیے جلدی پکے زندہ ناچ گانا دیکھیں، فلم کو بھول جائیں۔ جیسی گول گپے کر کٹی بجلیاں، سانپ کے ساتھ کوہا ڈانس۔

یہی مہمان شو شروع ہونے والا ہے۔

"کیا خیال ہے" حمیرے میں چل کر بیٹھیں۔ فیتانہ نے پیش کی۔

اس وقت ہمارا ہاں ہر گھومنا غھرے سے خالی نہیں تھا۔ مجھے کچھ سوچنے کیجئے کے لیے کس کو پیش کیا تھا۔ میں نے تجویز کی تھی کہ سفیر احمد کو بھلا کر اعتراض ہو سکتا تھا۔ نے آگے بڑھ کر چان پر بیٹھے شخص سے چار گٹ لے۔ ذہن گلی کو باہر چھوڑ کر ہم چاروں حمیرے میں بیٹے گئے۔ گول شامیانے تلے دائرے میں بہت بڑا ہنڈل تھا۔ بے دگ درویں پر بیٹھے تھے کچھ کریموں پر تھے ہنڈل کے حصے کو "دی آئی بی" بنایا گیا تھا۔ یہاں پہلے کچھ غلاموں نے صوفے رکھے تھے جبکہ جبکہ پڑشل فین لگے ہوئے تھے۔ ہمارا گٹ بھی انہی صوفوں کا تھا۔ ہمیں بیٹھے ہوئے کی منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسٹیج روشن ہو گیا اور سامنے

سے رقصیں پڑھ ہٹ گیا۔ دروی پر اتنی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تماشائیوں نے بیٹھیاں بجا کر اور لگا کرے مار کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ زندہ ناچ گانے کا پروگرام شروع ہو گیا۔ مجھے بچے قلمی گانوں پر فوجان لڑکیاں لڑکے بھونڈے انداز میں اچھل کود کرنے لگے۔ میں سفیر اور فیتانہ کے درمیان بیٹھا تھا۔ سفیر اور فیتانہ دونوں میری طرف دیکھتے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ فیتانہ کو مکمل یقین تھا کہ جو کئی سرخ تہنہ قمیض اور شہری واکٹ والا شخص میلے میں داخل ہوا غدر چچ جائے گا۔ وہ کہنے لگا۔ "مجھے تو لگتا ہے بادشاہ کو اس کے آٹھ دس کلکے ہو جائیں گے اور ہر پائل اپنا اپنا کلکالے کر بھاگ جائے گی۔"

میں نے کہا "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ میلے میں آئے ہی نہیں۔"

"ہوئے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے جی" فیتانہ نے جواب دیا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پٹر (خط) ہی جھوٹے ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ کسی نے مذاق شداق کر دیا ہو۔ پولیس والوں کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال اگر یہ جھوٹ بھی ہے تو بڑا سیلے والا جھوٹ ہے۔ ایک ہفتے سے اس جھوٹ نے تو کھلی چار کھی ہے۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "فیتانہ صاحب! اگر واقعی اس میلے میں سو کے قریب سچ بندے صرف "لال کپڑوں والے" کا انتظار کر رہے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے پہلے تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے ظاہر ہے کھات لگانے والے دو رنگ پہلے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے پہلے کو آنے والے رستوں کی ناک بندی کر رکھی ہو۔"

فیتانہ نے کہا۔ "جن جی! بات تو تم نے ٹھیک کی ہے۔ میرا اپنا چار بھی یہی ہے کہ پہلے کو آنے والے رستوں پر ہتھیار بند لوگ کھڑے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس بندے کو پہلے سے باہر ہی چھاپ لیا جائے۔"

سفیر احمد نے کہا "یہ معاملہ بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ سارا کام چھوٹے اور بڑے تھانے دار کی لڑائی نے خراب کیا ہے۔ ایک دوسرے کی ضد میں انہوں نے بد معاشوں کی پوری فوج یہاں اکٹھی کر لی ہے۔"

اسٹیج پر ایک بونا اور بونی مزاحیہ گانے پر اینٹنگ کر رہے تھے تماشائی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ اس بات سے قلعی بے خبر تھے کہ اس میلے کی فضا میں کتنا ڈانڈ ہے

اور کیسے کیسے خطرناک لوگ یہاں کیسے وحشت ناک ارادوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مزاحیہ گانے کے بعد ایک نوجوان نے دھرمیندر کا خطاب دیا کیا۔ دھرمیندر نے اسٹیج پر آیا اور ڈانس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی بالا ہنسنا کا روپ دھار کر اسٹیج پر آئی اور اچھل کود میں شریک ہوئی۔ دونوں گانا گانے لگے اور وہی حرکات کرنے لگے جو اس سے پہلے پنڈال سے باہر بچان پر کر رہے تھے۔ دھرمیندر نے ان حرکات میں شدت آتی گئی۔ تماشاخیوں کی بیٹیوں اور لٹکاروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ حیرت ہوئی کہ ایک دیکھی نے اس میں ایسی ماہر پیر اور آزادی کے مظاہرے کیے جا رہے ہیں۔ اچانک پنڈال کے باہر سے بلند ہونے والی چند آوازوں نے رنگ میں بھگ ڈال دی۔ یہ فائزنگ کی آوازیں تھیں۔ پنڈال کے بالکل پاس ہی خود کار رانا نقل کی ”تر تر“ گونجی تھی۔ ابھی اس آواز کی بازگشت باقی تھی کہ تھری ناٹ تھری گمن کے مسلسل دھماکے سنائی دیے۔ اس کے ساتھ ہی بھگدڑ اور چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔

دھرمیندر اور بالا ہنسنا اپنے چونچلے چھوڑ کر بھاگے اور چلا نکلیں۔ لٹکار اسٹیج کے عقب میں دوپوش ہو گئے۔ ان کی پھرتی دیکھ کر تماشاخیوں کو بھی جوش آیا۔ انہوں نے دھرمیندر کی مظلومہ کیا اور دونوں کی طرف لپکے (حالا لک) فائزنگ باہر ہو رہی تھی اور پنڈال میں وہ خامے محفوظ تھے) ایک دم بھگدڑ مچی تو ہر طرف گرد و غبار اچھیل گیا۔ سنیہ احمد نے سرسراتے لہجے میں کہا ”شاید کام شروع ہو گیا ہے“

ہم دروازے کے پاس ہی تھے لہذا باہر نکلے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ باہر نکلے ہی میری نگاہ سب سے پہلے دو غیموں پر پڑی۔ وہ دھڑا دھڑا جھل رہے تھے۔ یہ مٹائی کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف مٹائی بھری ہوئی تھی۔ ایک جلتی ہوئی بجلی الٹ گئی تھی جس کی وجہ سے آگ بجڑی تھی۔ میں نے سیاہ دھوئیں کے مرغولے میں سے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ اپنا زخمی بازو تھامے بھاگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رانا نقل تھی۔ اور بھاگتے والا وہ شخص اکیلا نہیں تھا۔ پہلے میں موجود ہرزی نفس بھاگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ سرکس کے پاس بندھا ہوا ہاتھیوں کا جوڑا بھی سخت مضطرب تھا۔ لوگ اتنی افزائش میں دوڑے تھے کہ ان کی مختلف اشیا ”جوتے“ سائیکلیں اور چادریں وغیرہ موقع پر بھری رہ گئی تھیں۔ فائزنگ کی آواز مزار کی طرف سے آ رہی تھی۔ پھر ایک ہمارے میں سامنے آسمانی جموں کے پاس بھی فائزنگ ہونے لگی۔ ہم نے بھاگ کر ایک چبوترے کی اوٹ لی۔ فائزنگ سے

ساف اندازہ ہوتا تھا کہ ایک سے زائد گروہ آپس میں ٹک رہے ہیں۔ آسمانی جموں پر بیٹھے ہوئے مرد و زن اور بچے دلدوز انداز میں سچ رہے تھے۔ ان میں سے جو کم بلندی پر رہے وہ نوکود کر بھاگ گئے تھے۔ باقی اداکار رہے تھے۔ چند گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں کے اوپر سے گزریں۔ میں۔ ایک رانا نقل بردار کو بھاگ کر دو غیموں کے درمیان۔ گزرتے دیکھا۔ پھر ایک تیز رفتار شخص میں ہمارے سا۔ گولی کھا کر گر اور ترختے گا۔

”وہ دیکھو“ اچانک ہونا نکھ ایک طرف اشارہ کر چینا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ رسا کشی میدان کے قریب گھرے سیاہ دھوئیں کے اندر سے میری ایک شخص پر پڑی۔ وہ سرخ تیز اور قیص میں تھا۔ اس کی سنہری واٹک، کچی پن رکی تھی۔ گولی اس کے سر پر تھی شاید گر چکی تھی۔ وہ اندر سے منہ گرا پڑا تھا۔ دوسرا ہونوں نے اس کے دونوں بازو پکڑ رکھے تھے اور پورا زور غیموں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ سرخ تیز قیص والا زور کھینچا جا رہا تھا۔ اچانک ایک ہونے کے بازو پر گولی لگی۔ کے ہاتھ سے چھوٹا سا چیکلا پھسل گر گیا۔ اس نے جگا پھسل اٹھا اور تڑپ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چلا دو سرا ہونے بھی کسی نامعلوم جگہ پر پوزیشن لے چکا تھا۔ تیز قیص والا بے سمدھ پڑا تھا، ہرنگے اور خوف۔ نیاز گولیاں اور چترے سنسناتے ہوئے اس کے اوپر۔ رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ بھاگ۔ طرف سے نکلی اور چلتی چلتی سنسناتے والے پر گھر۔ جو اس سال تھی۔ اس نے جگہ دار سرخ پڑے پس تھے لگتا تھا بن غصن کے پیلے میں آئی ہے۔ وہ بے سمدھ شخص کو مجبور نے لگی اور ڈھائی دینے لگی ”بیچا بچاؤ۔ خدا کے لیے بچاؤ۔ ہائے ظالمو! یہ کیا کیا تم۔ ہائے رب! میں کیا کروں۔ ہائے میرے بڑے سا۔ ہو گیا۔“

اندھی گولیاں جو پرواز تھیں۔ پہلے کے بچوں اس نام کٹان عورت کو کسی بھی وقت گولی لگ گئی کے لیے ہتر تھا کہ لٹ جاتی یا موقع سے ہٹ جاتی۔ چاہا کہ اسے بچانے کی کوشش کروں۔ لیکن ابھی میں جگہ سے حرکت ہی کی تھی کہ اسے گولی لگ گئی۔ و رست کی پوری کی طرح ایک طرف ڈھے گئی اور حرکت ہو گئی جیسے بھی حرکت ہی نہ کی ہو۔ مٹائی کی دکانوں میں لگی ہوئی آگ بڑی سر دوسرے غیموں تک پھیل گئی تھی۔ لوگ دور دور

رہے تھے لیکن قریب کوئی نہیں آ رہا تھا۔ آگ بڑی تیزی سے اس مقام کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں آسمانی جموں پر لوگ لکے رہ گئے تھے۔ انہیں آگ سے کوئی ایسا ذخروہ نہیں تھا مگر دہشت کے سبب وہ بڑی طرح روپیٹ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بنگالہ صرف پہلے کے اسی حصے تک محدود نہیں کم از کم تین مقامات سے فائزنگ کی آوازیں آ رہی تھیں مگر دھواں اتنا پھیل گیا تھا کہ قرب و جوار کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو شخص رانا نقل بدست دو غیموں کے بیچ سے گزرا تھا وہ ایک بار پھر نظر آیا۔ وہ کروغ کے انداز میں جگہ کر بھاگتا ہوا ہمارے بالکل سامنے سے گزرا۔ اب میں نے اسے زیادہ وضاحت سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم تھی۔ کندھے سے گولیوں والی بٹ لٹک رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا۔ وہ قادر زمان کے خاص کاندوں میں سے تھا۔ جیل کی گاڑی سے اغوا ہونے کے بعد میں نے قادر زمان کی میت ناک حویلی میں جو چند ہفتے گزرا رہے تھے وہ مجھے بھولے نہیں تھے۔ وہاں کا ایک ایک منظر میرے ذہن پر نقش تھا۔ یہ صورت بھی کسی ایسے ہی منظر کا حصہ تھی۔ گولیوں کی ریش سے نکل کر وہ شخص ایک کچی دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ پہلے کھانٹا رہا پھر پشت دیوار کے ساتھ ٹیک کر سانس درست کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے اپنی رانا نقل کا سیگنل بھی تبدیل کر لیا۔

قادر زمان کے خاص کاندے کو دیکھ کر میرے لیے چپے بیٹھے رہتا ممکن نہیں تھا۔ میں پوری طرح چوس ہو گیا۔ اس شخص نے شاید ہمیں دیکھا نہیں تھا۔ یاد کیا تھا تو غیر متعلق جان کر اور یہ سمجھ کر کہ ہم فائزنگ کے ڈر سے سسے بیٹھے ہیں، نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر دیوار کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کے پاس ایمویشن ختم ہو گیا ہے یا وہ یو پی لڑائی سے پیچھے ہٹ آیا ہے۔ چند لمبے بعد میں نے دیکھا کہ وہ جگہ کر بھاگتا ہوا ایک طرف جا رہا ہے۔ میں نے سنیہ احمد سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس شخص کے پیچھے ہوں گا۔ میرا چہرہ صاف میں چٹپٹا ہوا تھا۔ صرف انہیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ شخص پہلے سے باہر نکلا اور ایک پکڑ کاٹ کر مزار کی طرف آ گیا۔ یہاں لٹکر کے لیے دو لکھیں پک رہی تھیں، تاہم پکانے والے دیگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہاں دیگوں کے پاس ہی ایک کھلی جیب کھڑی تھی۔ رانا نقل دیوار شخص جیب کے پاس پہنچ کر گر گیا۔ میری نگاہ جیب میں گئی اور ہم کر دھمکی۔ اس جیب کے اسٹیجنگ پر تین زماں بنش نہیں نود تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سرحد سے

مشہور ٹی وی سیریل  
منزلیں کی مصنفہ  
سیم غزل کا ایک  
ناقابل فراموش ناول

گولی بھگت

قیمت:

جلد اول: ۱۵۰

جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہا کر قریبی ہسپتال سے طلب فرمائیں

بڑا راست منگوانے کا پتہ :-

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۲۲۴۲۱۳

اسٹاکس، علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

فون: ۲۲۲۸۵۳

کیوں ملے دور بیکتر میں واقع جوک خاص کی عظیم الشان حویلی میں بیٹھ کر حکم چلانے والا جاگیردار قادر زباں میاں موجود تھا اور گولیوں کی چھاؤں میں گرد و گدازوں چٹاک رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو انگریزوں کو بجلی اور بجلی کا خطاب دیتا رہا تھا اور کتا رہا تھا کہ وہ نیچے کی تلاش میں اپنا پتہ اور وقت برباد کر رہا ہے۔ آج وہ معترف ہو گیا تھا کہ ”دو گنی کی بات“ دہانے کا خواب نہیں۔ جو خیالات کل تک افسانوی نظر آتے تھے، آج ٹھوس حقیقت بن چکے تھے، پچیس عدد صندوق کی صورت میں انہیں دیکھا اور پھر جاسکتا تھا۔ آج انہی پیش بہ صندوق کی خاطر قادر زباں میاں موجود تھا اور اپنی جان کے لیے شدید ترین خطرات مول لے رہا تھا۔ قادر زباں شلوار گھیس میں تھا۔ اس کا سرخ و سپید رنگ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہوا جاتا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا چہرہ یا جاگیردار قسم کی شے ہے۔ جب میں ایک بونے سمیت قادر زباں کے تین ساتھی موجود تھے۔ ملے سے یہاں پہنچنے والے راکھ بھڑانے قادر زباں سے کچھ کہا پھر خود بھی گود کر جب میں سوار ہو گیا۔ جب کا انجن چاگا اور وہ ایک جھنگ سے ٹھیکوں کی جانب روانہ ہوئی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ مجھے اس جیب کے پیچھے جانا چاہئے۔ لیکن کیسے؟ میرے ارد گرد کوئی سواری موجود نہیں تھی۔ میں دل مسوس کر رہا جاتا لیکن اچانک ہوتا سنگہ فرشہ رحمت بن کر آیا۔ وہ ایک اسکوڑر سواری تھا۔ معلوم نہیں یہ اسکوڑر اسے کہاں سے ملا اور کیسے چلا چلا اسے کہ مجھے سواری کی ضرورت ہے۔ بہر طور مجھے آسموں سے سروکار تھا بیڑ گئے سے نہیں۔ میں ہوتا سنگہ کے عقب میں بیٹھ گیا اور اسے کہا کہ جیب کے پیچھے چلو۔ اس نے فوراً عمل کیا۔ ہوتا سنگہ کی بھول صورت دیکھ کر گولی سونچا کہ شاید اسے سائیکل چلانا بھی نہ آتی ہو مگر وہ بڑی صہارت سے اسکوڑر چلا رہا تھا۔ اس نے اپنی مکلی بجلی دھوتی کے دونوں پلوں سے پلٹتے سے راتوں تلے دیا رکھے تھے تاکہ ہوا کی وجہ سے پھر پھڑانہ نہ لگیں۔ جب کچے راستے پر چل رہی تھی اور دھول کے سبب ہماری نگاہ سے دھول تھی۔ ایک طرح سے ہم جیب کا نہیں دھول کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس دھول میں دم تو گھٹ رہا تھا لیکن یہ ہمارے قن میں مفید تھی۔ درختوں کے نیچے اور کھیتوں میں لوگ لہوں کی صورت میں کھڑے، ہر اسان نظروں سے ہلنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے گاہے گاہے فائزنگ کی وائز آ رہی تھیں اور دھوپ کے مخروطی اٹھ رہے تھے۔ کچھ بال بچے دار بہت افزا تفریح میں ماحول اور یہ حوٹ بیٹھ کر اپنی راہ لے رہے تھے۔

قریب دو فرلانگ جانے کے بعد جیب نے اپنا سرخ تبدیل کیا اور ایک بہت بڑی پختہ چار دیواری کا کھاد کات کر درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئی۔ جھنڈ سے ساتھ سر گز رہا ہم نے اسکوڑر چھوڑ دیا اور پیدل ہی جھنڈ کی طرف بڑھے۔ جب جھنڈ کے اندر ہی رکی تھی کہ اب انجن کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ درختوں میں پہنچ کر ہم مزید محتاط ہو گئے اور پھر کوئی آہٹ پیدا کیے آگے بڑھنے لگے۔ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز کس پاس ہی سے ابھری تھی اور صاف سنائی دی تھی۔ میں اس آواز کو ٹیکوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ جاگیردار قادر زباں کی آواز تھی۔ وہی آواز جو جاگیر کی بلند و بالا حویلی میں گونجتی تھی اور قرب و جوار میں موجود ہر بڑی شخص کو سہانے رکھتی تھی۔ یہ جاگیردار کا خاص انداز تھا۔ وہ جس قدر طیش میں ہوتا اس کا لہجہ اتنی ہی ملائم اور شائستہ ہوتا جاتا تھا۔ اس نے بہت مہربان لہجے میں کسی سے کہا ”بیٹھ جاؤ جان بی، بیٹھ جاؤ میرے بادشاہو میں آپ کے صدمے اب دور نہ ستاؤ ہم کو“

جو اب کوئی غیث پنجابی میں گرجا ”اوتے نہیں بیٹھوں گا میں“ میں تمہارا چور نہیں ہوں۔ تم ہونے کو نہ۔“

ابھی فقہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ”پنٹاخ“ سے ایک تھپڑ بولنے والے کے کال پر پڑا، پھر کئی افراد بولنے والے پہل بڑے۔ میں اور ہوتا سنگہ احتیاط سے چند قدم مزید آگے گئے اور تب گئے درختوں کے درمیان کا مظہر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ تہند اور قیس والا ایک صحت مند شخص قادر زباں اور اس کے کارندوں کے نرمے میں تھا۔ بونے سمیت یہ کل پانچ کارندے تھے۔ وہ اسے جیب پر چڑھا رہے تھے جب کہ وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ اس مزاحمت کے نتیجے میں اس کی سرخ بڑی کل بجلی تھی۔ قیس نامہ تار تھی اور دھوتی اس نے بشکل سنبھال رکھی تھی۔ قادر زباں کے ایک پهلوان نما کارندے نے اس کی راتوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور بے دردی سے جیب میں پھنسا دیا۔ وہ گالیاں بٹکا ہوا پھرتی سے اٹھا لیکن عقب سے ایک اور شخص نے اس کی گردن پر راکھ کا پٹ مارا، وہ لڑکھارہ اگلی نشستوں پر گرا۔ بونے سمیت چاروں افراد نے اسے بڑی طرح روک لیا۔

یہ گورکھ چند اچھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سرخ دھوتی قیس والا ایک شخص ہلنے کے بچوں سے بے ہوش یا غمزدہ پڑا تھا۔ یہ دو سرا شخص جھنڈ میں تھا اور قادر زباں کے کارندے اس سے کچھ بات کر رہے تھے۔ تاہم وہ شخص جو ہلنے میں مارا گیا یا زخمی ہوا اصل شخص نہیں تھا۔ وہ بد قسمتی سے کسی دھوکے کا شکار ہوا تھا۔ اصل شخص ہی تھا جسے قادر زباں کے

کارندوں نے پہلے تک پہنچنے سے پہلے ہی دھریا تھا اور اب جیب میں ڈال کر لے جا رہے تھے۔ میں نے سوائے نظروں سے ہوتا سنگہ کی طرف دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے ہوتا سنگہ کے بڑوں بھرے زور چرے پر جوش کی ہنگامہ۔ اس کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں مجھے ایک بار پھر وہی بجلی نظر آئی جو اسے غیر معمولی شخص ظاہر کرتی تھی۔ وہ میرے شانے سے شانہ ملا کر لڑنے اور سرد حریکی بازی لگانے کے لیے پوری طرح آمادہ نظر آتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ قادر زباں کے کارندے سرخ لباس والے کو اندھا مگر اس کی ٹھیکیں کسے میں مصروف ہیں۔ وہ چلا رہا تھا اور انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اس موقع پر قادر زباں اور اس کے کارندوں پر ہماری یلغار ٹھیک نہیں تھی۔ ہم قادر زباں کے کارندوں سے اٹھ جاتے تو سرخ لباس والے کو بھانسنے کا موقع مل جاتا۔ ہر تھاکہ پہلے لوگ اسے ہاندھ لیں اس کے بعد ہم ہٹا دیں۔ جو خنی اس کی ٹھیکیں کسے ٹھیکیں۔ ہوتا سنگہ نے میرے کان میں سرگوشی کی ”جہانی صاحب! میں چکر کات کر دو سری طرف جا تا ہوں۔ دو طرف سے فر ہو گا تو ان کی مت ماری جائے گی۔“

میں نے سر کے اشارے سے اسے ایسا کرنے کی اجازت دی۔ اس نے اپنا ریو اور چپک کیا اور کسی سانپ کے مانند گئے درختوں میں رینگ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی چستی عود کر آتی تھی۔ بشکل نصف منٹ گزرا ہوا کہ میرے مین سامنے سے فائز کی آواز آئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ہوتا سنگہ کا ریو اور چل رہا تھا۔ گولی اسی پهلوان نما شخص کو لگی جس نے سرخ لباس والے کو جیب میں پھنسا تھا۔ اس شخص نے اپنا دھاتا بازو تھا اور کھاتا ہوا ایک پھلو پر جھک گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے شات گن گرتے اور لمبی ٹھاس میں او بھل ہوتے دیکھی۔ دو سرا فائز جیب کی باڑی میں کہیں لگا۔ قادر زباں اور اس کے ساتھیوں نے فوراً جیب کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ اب ان سب کی پشت میری طرف تھی اور میں انہیں با آسانی شانہ بنا سکتا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے تیزی سے آگے بڑھوں اور کسی درخت کی اوٹ لے کر انہیں پنڈز آپ کرادوں۔ لیکن اس صورت میں یہ خطرہ بھی تھا کہ پنڈز آپ ہونے کے بجائے وہ لوگ پلٹ کر حملہ کریں۔ اگر ایسا ہوتا تو بہر حال ان کا پلڑا ہماری تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہاتل تھا۔ جب کہ وہ دو ہاتل اور دو گھون سے مسل تھا۔ ان میں سے ایک گھن گھاس میں گر چکی تھی لیکن باقی تینوں ہتھیار ان کے قبضے میں تھے۔ دو سرا طریقہ یہ تھا کہ ان پر بے دردی گولیاں چلا دوں اور اس

سے پہلے کہ وہ اپنی پوزیشن بدل سکیں انہیں زندگی کے جھیلوں سے آزاد کرادوں۔

میں نے تیزی سے سوچا اور فیصلہ کیا کہ درمیانی راست اختیار کیا جائے۔ قادر زباں اور اس کے دو ساتھیوں کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میری دھمکی کا احترام کریں گے اور اندھی گولی سے پہنچنے کے لیے ہاتھ اور انھادوں کے خطرہ ان کے ساتھی ہونے اور پهلوان نما شخص سے تھا۔ خاص طور پر بونے کو کوئی صحت مند خوراک آزمائش میں ڈالتا تھا۔ اپنے سابق تجربات کی روشنی میں میں جانتا تھا کہ یہ انتہائی بڈرا اور جنگ جو قسم کی مخلوق ہے۔ وہ آٹھیں بند کر کے آواز پر نشانہ لگاتے تھے اور حیرت انگیز تیزی سے حرکت کرتے تھے۔ چنے پل والی حویلی میں میں ان دوندہ نما انسانوں سے دوہو لڑ چکا تھا اور دیکھ چکا تھا کہ یہ بونے فولاد سے ڈھلی ہوئی ایسی لڑاکا مشینیں ہیں جو اپنے شکار کو گھوٹوں میں بار بار دھکے دیتی ہیں۔

میں نے سب سے پہلے بونے کے سر کے عقبی حصے کا نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ درمیانی فاصلہ بند کر کے زائد نہیں تھا۔ طاقتور کولٹ ہٹل کی گولی مین نشانے پر لگی۔ ہوتا پھر کمر کر رہا اور ساکت ہو گیا۔ دوسری گولی پهلوان نما شخص کی پشت پر لگی۔ اس کا بھاری بھر کم جسم پہلے جیب سے نکرایا پھر گھاس پر لڑھک گیا۔ قادر زباں اور اس کے باقی ماندہ تینوں ساتھی بیک وقت مڑے۔ ”پنڈز آپ“ میں نے گرج کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیسرا فائز گزرا۔ یہ ہوائی فائز تھا اور قادر زباں کے سر کو چھوٹا ہوا گزرا تھا۔ دو لوگ میرے نشانے پر تھے اور میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ قادر زباں نے ٹھنڈی کا مظاہرہ کیا اور فوراً ریو اور چپک دیا۔ اس کے کارندوں نے بھی تھلکی۔ لیکن ہاتھ کسی نے اور نہیں اٹھائے۔

”ہاتھ اور انھاد“ میں نے چلا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی پھر ہوائی فائز کیا۔ ایک ہوائی فائز عقبی درختوں سے ہوتا سنگہ نے بھی گزرا۔ قادر زباں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھ میں نظر آیا پھر اس نے ہاتھ اور انھاد دیے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک دوسرے خاں جاگیردار کو یوں بے بسی کے عالم میں ہاتھ اٹھانے دیکھنا ایک دلچپ تجربہ تھا۔ وہ شخص جس کا تعاقب کر کے میں ملے سے قادر زباں کی جیب تک پہنچا تھا ایک شخص کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ شاید ایک ساعت کے لیے میری نگاہ اس کی جانب سے ہی ہو گئی۔ اس نے پھرتی دکھائی اور جھک کر وہ شات گن اٹھا چاہی جو پهلوان کے ہاتھوں سے لمبی گھاس میں گر چکی تھی۔ جو خنی دھکا ہوتا سنگہ بجلی کی طرح عقبی درختوں سے بے درد ہوا۔ اس نے ہنگے ہوئے شخص کی پیٹ پر اپنے زور سے ٹانگ بٹائی کہ وہ لڑھکا ہوا کئی

گز کا فاصلہ طے کر لیا اور میرے سینے میں گرا۔ کوئی اور  
 ہوتا تو جہاں گرا تھا وہیں پڑا رہ جاتا۔ لیکن وہ قادر زماں کا  
 کارندہ تھا۔ غیب، تربیت یافتہ اور پختہ کار، خدا جانے اب  
 تک کتنے قتل کر چکا تھا۔ آوندھے منہ زمین پر گرتے ہی اس  
 نے اپنا ہاتھ اپنی ذب کی طرف پڑھایا اور ایک چھتا آنخبر  
 نکال لیا۔ آنخبر کی اولین جھٹک دیکھتے ہی میں نے اپنی جگہ سے  
 حرکت نہ کی اور آگے بڑھ کر ایک بھور ہو کر اس کے ہاتھ پر  
 لٹائی۔ میرے پاؤں میں بھاری بھر کم کئی جوتی تھی۔ یوں بھی  
 ابھی آنخبر اس شخص کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ آنخبر  
 اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں بلند ہو گیا۔ میری دوسری  
 ٹھوکر نے اس کے کئی دانت توڑ دیے۔ وہ ڈر کر اتار ہوا اپنے وول  
 نعت جاگیر اور قادر زماں کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔  
 جاگیر اور قادر زماں کا چوبیسٹھ کی طرح تھمنا رہا تھا۔ جیسے  
 ایک سو پانچ ڈگری بخار میں تپ رہا ہو۔ اس نے بڑے غور  
 سے مجھے دیکھا اور پچان کر حیران رہ گیا۔ ”شاہ جہاں تم؟“  
 اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔  
 ”کیوں۔ میں یہاں نہیں ہو سکتا؟“ میں نے پوچھا۔  
 اس نے خون خاں نظروں سے اپنے مرہہ ہونے کی لاش  
 دیکھی اور جسم کا سارا لہو جیسے اس کے سر کو چڑھ گیا۔ وہ  
 خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی میں آتش فشاں گرج رہے  
 تھے۔  
 ”ہوئے تھے بگڑ کر کہا۔“ دھڑکا کھڑے ہو کھجے کی طرح  
 وہاں چلو جتنے کے نیچے۔“ اس نے قادر زماں کو باقاعدہ دھکیل کر  
 جیب سے دور بٹاروا۔ قادر زماں کا غضب اتنا کہ چھو گیا۔  
 بات تھی بھی غضب ناک نہ دے والی۔ ایک مدوق لاغر شخص  
 جو صورت سے ہی بھک مکا نظر آتا تھا اتنے با اثر جاگیر دار کو  
 دھکیل کر پیچھے بٹا رہا تھا۔ وقت و وقت کی بات ہوتی ہے اور  
 ”وقت“ چاہے کتنا ہی مختصر تھا لیکن قادر زماں کے خلاف  
 تھا۔ جاگیر دار غالی ہاتھ تھا اور ہیکٹے کے ہاتھ میں موت  
 اٹکنے والا آکر تھا۔ جاگیر دار کے سارے اثر و رسوخ، رعب و  
 داب اور اختیار کو ایک دھماکے کی آواز میں غرق کر سکتا تھا۔  
 ہوتا تھکے کے ہاتھوں قادر زماں کو دھکا کھاتے دیکھ کر اس کے  
 کارندے بھی لال پیلے ہو گئے تھے لیکن قادر زماں کی طرح  
 انہیں بھی خاموش رہنا پڑا۔ وہ سب کے سب مجھے اچھی طرح  
 جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ میں کسی سے کوئی رعایت  
 نہیں برتنوں گا۔  
 ہوتا تھکے کی ہدایت پر قادر زماں اور اس کے تینوں  
 کارندے جیب کے پاس سے ہٹ گئے تو ہوتا تھکے نے ان کے  
 پیچھے ہوتے بھیاں نیچے اور جیب میں رکھ دیے۔ پھر اس نے

پھرتی سے جیب کی ذرا نیچے سیٹ سنبھال لی۔ گزرے دانے لے  
 برہنے کے ساتھ ہوتا تھکے کی کوئی نئی صلاحیت سامنے آ جاتی  
 تھی۔ اس کی صورت و بد حالی دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا  
 کہ یہ شخص اسکو نیا گاڑی ذرا نیچے کر سکتا ہے۔ ہونے نے  
 جیب کو پھرنے دیا اور میرے قریب آن کر رک گیا۔ ”میں نہیں  
 جانی صاحب“ اس نے اپنی باریک آوازیں کہا۔  
 لیکن وہ ایک چڑ بھول رہا تھا۔ اپنی دانت میں اس نے  
 سارا اسلحہ جمع کر لیا لیکن وہ دوسری شاٹ گن ابھی تک نہیں  
 تھی جو سب سے پہلے پھلانگنا شخص کے ہاتھ سے نکلی تھی  
 اور گھاس میں گری تھی۔ میں نے موقع پر پہنچ کر وہ گن لی  
 گھاس میں سے دھوڑی اور جیب میں آ بیٹھا۔ جاگیر دار قادر  
 زماں کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ اس کے پس میں ہوتا تو  
 وہ ہمیں دیر خوں سے باندھ کر زندہ جلاتا۔ یا پھر اپنے علاقے  
 کی قدیم رسم کے مطابق تیز ہمدار گھڑ سوار ہمارے پیچھے  
 لگا رہتا اور وہ اس کھنے جنگل میں دوڑا دوڑا کر ہمیں لڑکا  
 کر دیتے۔ میں نے ہٹل جیب میں رکھ کر اب سیون ایم ایم  
 اٹھائی تھی اور چاروں افراد کو اس کے نشانے پر لے رکھا  
 تھا۔ ٹریک پر رہی ہوئی میری انگلی کا پکا سا داؤ جاگیر دار قادر  
 زماں کے جسم کو چھلنی کر سکتا تھا۔ اس دار غیر میں درختوں  
 کے اس نیم تاریک جھنڈ کے اندر جاگیر دار کی لاش کو جو قبر  
 نصیب ہوئی، نہ کوئی اس پر فائدہ دھتا اور نہ یہ راز کھلتا کہ وہ  
 کیوں اور کس کے ہاتھوں چھلنی ہوا۔ لیکن میں نے ایک بار  
 پھر اس کی جان بخشی کی۔ کبھی کبھی قادر زماں جیسے دشمنوں کو  
 پانا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں انہیں اپنی عداوت کا سوم رس  
 پینے کی کھلی چھٹی دیتا ہوں۔ وہ اپنی پانی کر اتنے صحت مند  
 ہو جاتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں۔ یا پھر خوب پھولے ہوئے  
 غبارے کی طرح سوئی کی بلی کی چمیز بھی انہیں نابود کر دیتی  
 ہے۔ ایک دفعہ چٹنے والی حولی میں میں نے قادر زماں کی  
 نیند کو ابھی نیند میں تھیں بدلا تھا۔ دوسری دفعہ آج پھر میں نے  
 درختوں کے جھنڈ میں اسے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے دیا۔ ہوتا  
 تھکے نے جیب ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ قادر زماں اور  
 اس کے ساتھی اپنی جگہ جھمنوں کی طرح ساکت و جامد رہ  
 گئے۔  
 سرخ لباس والے کی مٹکیں تو کسی تھیں لیکن منہ کھلا  
 تھا۔ اس کھلے منہ سے وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔ میں نے جیب  
 کے فرش پر پڑا ایک پرانا کپڑا اٹھایا اور اس کے منہ میں  
 ٹھونس کر اڑے سے اپنا مافہ باندھ دیا۔ مٹھنے سے چار پانچ  
 فولانک آگے آنے کے بعد میں نے ہوتا تھکے سے پوچھا۔  
 ”اب کہاں چلنا ہے جی؟“

وہ بولا ”ڈیرے پر ہی چلے ہیں جی۔ اب واپس فرید کوٹ  
 جانا ہے کھتے (خڑے) والی بات ہے۔“  
 ”ڈیرا کتنی دور ہے؟“ میں نے بلند آوازیں پوچھا۔  
 ”یہاں سے تو آٹھ دس میل ہی ہوگا۔“ اس نے کہا اور  
 بڑی مشتاقی سے اسٹیرنگ کھما کر جب کو کھیتوں سے ایک نیم  
 پختہ راستے پر لے آیا۔ وہ بالکل ڈرائیو تھا، یہاں کے چور  
 راستوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ایسی صورت حال  
 میں مجھے اس سے اچھا ساتھی نہیں مل سکتا تھا۔  
 جیب اونچے نیچے راستوں پر اڑتی چلی جاری تھی اور  
 میری نگاہ دور عقب میں دیکھ رہی تھی۔ عقاب کے امکان کو  
 رو نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خود کار و نقل میرے ہاتھ میں تھی  
 اور اس کے میٹرز میں دس بارہ گیلیاں موجود تھیں۔ اس  
 کے علاوہ ”مال قیمت“ میں حاصل ہونے والے دو عدد پستول  
 اور ایک شاٹ گن بھی جیب میں موجود تھی۔ دوسرے  
 لفظوں میں اسلحے کے حوالے سے ہمیں کوئی ”فکر فائدہ“ نہیں  
 تھا۔  
 اگلے میں تیس منٹ بے حد خیریت سے گزرے۔ نہ  
 کوئی ہمارے عقاب میں آیا اور نہ جیب نے کسی طرح کا  
 دھوکا دیا۔ ہوتا تھکے جیب کو حتی الامکان رفتار سے بھگا رہا تھا۔  
 گاہے گاہے وہ ”شارٹ کٹ“ بھی استعمال کر لیتا تھا۔ لیکن  
 جب حمل کے آثار قریب نظر آ رہے تھے تو ہوتا تھکے نے جیب  
 اچانک روک لی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔  
 ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔  
 وہ اپنی پائیں ران دباتے ہوئے بولا۔ ”پتلا چڑھ گیا ہے  
 حراجہ، کبھی بھی ایسا ہو جاتا ہے۔“ اس کے منہ سے پٹا  
 چڑھنے والی بات بالکل قابل یقین لگتی تھی۔ اس کی صحت ہی  
 ایسی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”جیب چلا سکو گے؟“  
 ”شاید نہیں“ وہ ران ملتے ہوئے بولا۔  
 وہ ساتھ والی نشست پر چلا گیا۔ میں نے ڈرائیو رنگ  
 سیٹ سنبھال لی۔ وہ مجھے راستہ بتا گیا میں اس کی ہدایت کے  
 مطابق چلا رہا۔ گاہے گاہے ہوتا تھکے کن انکھوں سے پچھل  
 نشست پر بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہاں سرخ پوش بندھا پڑا تھا۔  
 اسے دیکھ کر ہوتا تھکے کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہو جاتی  
 تھی۔ راستے میں قادر زماں اور اس کے ہونوں کا ذکر بھی  
 ہوا۔ ہوتا تھکے نے کہا۔ ”جانی صاحب! مجھ کو اندازا ہوتا ہے  
 کہ اس سڑک کے پتھر کو آپ پہلے بھی جانتے ہو جیتے ہیں“ سڑک  
 کے پتھر کا اشارہ قادر زماں کی طرف تھا۔  
 میں نے اس بات کا جواب گول مول انداز میں دیا اور  
 بڑے کوتاہیا کر ایک دفعہ جھٹک میں اس شخص سے ٹھہر بیٹھ

ہوئی تھی۔  
 دس پندرہ منٹ بعد ہم اس ٹھنڈے ”اک بنگلے تک پہنچ  
 گئے جس کی پختہ رہے تھا شاگھاس کی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں  
 دروازے بند تھے اور کوئی جگہ عمارت کے بجائے صرف  
 لمبے کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ جیب کی آوازیں کر ایک  
 تاریک گوشے میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک سایہ سا  
 لہا گیا۔  
 ”راما پتہ! اور رام پتہ!“ ہوتا تھکے نے اپنی باریک  
 آوازیں گروہ کے کسی شخص کو پکارا۔  
 ایک لخت ایک سایہ سامنے آ گیا۔ وہ پچیس چھپیس سالہ  
 کبرو تھکے تھا۔ کندھے سے کہاں لٹک رہی تھی اور ہاتھ میں  
 ران نقل تھی۔ اس کی شکل جالی پچانی لگ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا  
 کہ جب بیٹھنے نو شاہ کے ڈیرے سے واپس آتے ہوئے ہوتا  
 تھکے اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گھرا تھا تو یہ شخص بھی  
 جتنے میں شامل تھا۔ ہوتا تھکے کے ساتھ مجھے اور بندھے ہوئے  
 شخص کو دیکھ کر ران نقل بردار حیران ہوا۔ اتنے میں تین چار  
 اور افراد بھی ڈاک بنگلے کے کونوں کھدروں سے نکل آئے۔  
 ان میں بابو لیاقت کو دیکھ کر میرے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ  
 گئی۔ بابو لیاقت نے بھی مجھے پچان لیا۔ مجھے پچانتے ہی اس  
 کی پائیں کل گئیں اور وہ بھاگ کر مجھ سے ٹکریا۔ اس  
 کالس ایک بڑے دوست کا کالس تھا ”ایسا دوست جو اتنے وقت  
 سے زیادہ بڑے وقت کا ساتھی ہوتا ہے۔ میں ابھی ایک کھٹنا  
 پہلے ایک خونی بنگالے سے گزر کر آیا تھا۔ خود میرے ہٹل  
 سے میرے ہاتھوں دو افراد موت کے منہ میں گئے تھے۔ ان  
 واقعات کا خوشگوار اثر میرے ذہن و اعصاب پر تھا۔ لیکن  
 بابو لیاقت سے مل کر یوں لگا جیسے نصف بوجھ ذہن سے ہٹ گیا  
 ہے۔  
 ”شاہ جہاں صاحب! آپ نے تو حد کر دی“ وہ لڑا لڑا  
 آواز میں بولا۔ ”ایسے غائب ہوئے کہ بس سبحان اللہ۔ بندہ  
 خدا سے تو سوچا ہو تاکہ ہم پر کیا گزرتے گی۔ خدا گواہ ہے ایک  
 ایک مل کن کر کا ہے۔“ اس نے مجھے کندھوں سے تمام کر  
 پیچھے ہٹایا اور غور سے صورت دیکھی۔ پھر وہ بارہ گلے لگا لیا۔  
 خانے میں جانے کے لیے لمبے کے ایک ڈھیر میں سے گزرتا  
 پڑتا تھا۔ اس ڈھیر میں ایک غلام تھا۔ سڑسٹ کر بڑی مشکل  
 سے ہم اس سوراخ میں سے گزرے۔ سامنے ایک بڑا ہال  
 نظر آیا۔ یہاں دن کے وقت بھی لا لائیں روشن تھیں۔ فرش  
 پر پرانی (چاول کی چال) پھی ہوئی تھی۔ پرانی چادر پس ڈال  
 کر آرام وہ بستر بنائے گئے تھے۔ اس بڑے ہال کی پارٹیشن کی  
 مٹی تھی۔ لیکن یہ پارٹیشن لکڑی یا بارڈ بورڈ وغیرہ کی نہیں

پڑنے کی تھی۔ رسیاں باندھ کر چادریں لٹکادی گئی تھیں۔  
رجنہ بھی یہاں موجود تھی لیکن وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔  
چہرے سے کئی ہفتے کی تیار لگتی تھی۔ بابولیاقت نے بتایا کہ  
ایک کے لئے اور دوبارہ کھوجانے کا اس کے دماغ پر بے حد  
ثر ہوا ہے۔ وہ مسلسل بے خوابی کا شکار ہے اور کسی وقت  
جائزے بار بار کر دینے لگتی ہے۔ اس نے بتایا کہ فی الحال وہ  
ذرا اب اور دو اے کے ذریعہ اثر و رسوخ ہے۔ ہمیں یہ ایک کوئے  
ہیں مجھے وہ گونگی لڑکی۔ جیسو بھی نظر آئی جواب تک کی تفتیش  
کے مطابق عشرت فارم پر ہونے والی واردات کی انکوائری کو وہ  
تھی۔ اس کے ساتھ پکڑے جانے والے دونوں ملازم =  
خانے کے مراد جسے میں بیٹھے تھے۔

یوٹا سنگھ دیگر افراد کے ساتھ مل کر سرخ لباس والے کو  
اندر لے آیا تھا۔ اس کی سرخ قمیص گردن میں دو جیبوں کی  
صورت لگ رہی تھی۔ واسٹ کا بھی کسی پتا نہیں تھا۔  
پکڑی بھی گر چکی تھی۔ وہ بندھن تھا یا مونا سنگھ۔ کیونکہ اس کے  
سر جوڑا نہیں تھا۔ رسی کلمات کے بعد میں نے بابو سے کہا  
کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہم جتنی جلدی اس  
مضام کی زبان کھلا سکیں اتنی ہی بہتر ہوگا۔

بابولیاقت نے ایک نفلی دروازہ کھولا اور ہمیں لے کر  
ایک حجرہ نامقام پر آگیا۔ مغلیہ دور کی اکثر تاریخی عمارتوں کی  
چار دیواری کے ساتھ ایسے ہی حجرے تھے۔ اندر تھار نظر  
آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے حجروں میں شاہی خادموں میں قائم  
کرتے تھے۔ آج کل ان حجروں میں جوا ہوتا ہے، نشے کے  
سکرٹ بنے جاتے ہیں، محبت ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ہوتا  
ہے جو تقریبی و تاریخی مقامات پر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ حجرہ بھی  
ان حجروں سے ملتا جلتا تھا۔ بے حد موٹی دیواریں، نہ ٹھنڈی نہ  
روزن، بس ایک ساڑھے پانچ فٹ کا دروازہ تھا جس میں سے  
ہم سب جبکہ کر (سوائے یوٹا سنگھ کے) داخل ہوئے تھے۔ بابو  
لیاقت نے باجس جلائی اور تانک میں رکھا ہوا مٹی کا گولا روشن  
کر دیا۔

اس بند کمری میں بابولیاقت، یوٹا سنگھ اور میں نے  
سرخ لباس والے سے پوچھ کچھ شروع کی۔ اس کے ہاتھ  
پاؤں بندھے رہنے دیے گئے تھے، صرف منہ سے کپڑا نکالا گیا  
تھا۔ وہ ہم سے خاصا مرموب نظر آ رہا تھا۔ وجہ صاف ظاہر  
تھی۔ ہم نے اس کے سامنے قادر زان کے دو کارندوں کو  
جسم واصل کیا تھا۔ اور بقیہ تین کو "میڈ زاپ" کرا کے صاف  
نکل آئے تھے۔ تاہم مرموب ہونے کے باوجود اس کے لیے  
میں اکثر مرموب موجود تھا۔ وہ ہم سے استفسار کرتے لگا کہ ہم کون

تمہاری چوڑی پر ہمارا حق اور بھی زیادہ بنتا ہے۔ پولیس والے  
بڑے پسند ہیں ہمیں۔ جب تک کھانے کے ساتھ دو تین  
پولیس والے نہ کھائیں گے کہ کچھ کھایا ہی نہیں۔ ویسے  
بائی دی دے، پولیس میں کیا کرتے تھے تمہارا مطلب ہے  
بھونکنے اور حرام کھانے کے علاوہ۔

وہ بولا "میرا چار ہے کہ رام پانچوے کا نام تم نے نہیں  
سنا ہوا؟"

"بالکل نہیں" میں نے پورے یقین سے نفی میں جواب  
دیا۔

وہ بولا۔ "تو نہیں کہ میں باندھ۔ یہ نام اب ہمیں زندگی  
بھر نہیں بھولے گا۔"

"ظاہر ہے" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم  
جس طرح تڑپ تڑپ کر مگو کہ وہ نکالنا ناقابل فراموش  
ہوگا۔"

میرے پوسٹن اور باا احوال نے اسے ٹھکانا۔ غالباً  
وہ اب تک خود کو کئی قلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم عام  
قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں جو اسے کوئی امیر کبیر ہستی سمجھ  
کر اٹھالائے ہیں اور اب اس کی رہائی کے بدلے مالی فوائد  
حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اس کے خیال میں کوئی باغی کی  
دشمنی اس اعلیٰ اکاؤنٹ پر تھی۔ عموماً تدریج پولیس والوں  
کے ساتھ اس قسم کے "ہاتھ" ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب  
میرے احتمالی ممکنہ لیے نے اسے اندر سے ہلا شیعہ کر دیا  
تھا۔ وہ بڑے غور سے مجھے اور یوٹا سنگھ کو دیکھ رہا۔ پھر نسبتاً  
وجھے لیے میں بولا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ میرے بارے میں  
تمہیں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہاری غلط فہمی دور  
کر سکتا ہوں لیکن پہلے تمہیں میرے یہ بکڑ بندھ کوئے ہوں  
گے۔"

یوٹا سنگھ بولا۔ "جی جی ایہ بکڑ بندھ تو اب تمہاری چٹا میں  
جل کر رہی کھلیں گے اور اگر چاہتے ہو کہ چٹا سے پہلے مکمل  
جائیں تو جو ہم پوچھ رہے ہیں، فر فرماتے جاؤ بالکل جیسے دونی کا  
پارازا سنا ہے۔"

سرخ پوش کو اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ اپنے  
بی بی سے مرموبہ لوگوں سے نہ کیا ہے۔ اس = خانے میں  
موجود اس کے متدار اور افراد کی تعداد بھی متاثر کن تھی۔  
ہمارے دم بدم بگڑنے تو یہ دیکھ کر اس نے ایک دم اپنا لب و  
لہجہ بدل لیا اور دوستانہ انداز میں بولا "ایک سکرٹ مل سکے  
گا؟"

یوٹا سنگھ نے اسے سارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھایا  
اور ایک سکرٹ لٹکا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ یوٹا سنگھ

کے غلط ہونٹوں سے لٹکا ہوا سکرٹ اپنے ہونٹوں میں دبا ہے  
ہوئے سرخ پوش کو کراہت محسوس ہوئی مگر مت سی دوسری  
باندھیدہ اور اشتعال انگیز باتوں کی طرح "اس نے یہ کراہت  
بھی برداشت کر لے۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہاں۔۔۔  
کیا پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

"رام پانچوے" سرخ پوش نے جواب دیا۔  
"کھانے کے رہنے والے ہو؟"

"قاسٹنگ کا۔ لیکن جب سے نوکری چھوڑی ہے فیروز پور  
میں ہوں۔"

"فیروز پور شہر میں؟"

"نہیں۔ نواحی گاؤں رت پور میں۔"

"رت پور میں تمہارا اکون ہے؟"

"وہاں میرا گھر ہے گھروالی ہے اور ماتا ہے۔ تمہوڑی سی  
زمن ہے اس سے گزر رہی ہو جاتی ہے۔"

"نوکری کیوں چھوڑی تم نے؟"

"بس مجھے میں ایک بڑے افسر سے خار بازی ہو گئی  
تھی۔ اس نے لائن حاضر کر دیا۔ ابھی انکوائری چل رہی تھی  
کہ میں نے استعفیٰ دے دیا۔"

میں نے پولیس والوں کے انداز میں اچانک پوچھا۔  
"نہروار عشرت کو گوب سے جانتے ہو؟"

"لگ۔ کون نہروار؟" رام پانچوے نے گڑبڑا گیا۔  
"وہی جس کے قادم پر 22 مارچ کی رات ڈاکا چڑا اور  
ایک قتل ہوا تھا۔"

میں نے صاف محسوس کیا کہ رام پانچوے کے چہرے پر  
رنگ سا لہرا گیا ہے۔ وہ بولا۔ "میں کسی نہروار کو نہیں  
جانتا۔"

میں نے کہا۔ "میری وہ موز ہے، جس پر ہمارے تمہارے  
راستے چڑا ہوا جائیں گے۔ ہمیں قصائی بننا پڑے گا اور تمہیں  
کبھی۔ ہم تمہاری کھال کھینچیں گے اور تمہیں بعد میں پھرن  
گے۔ اور تمہیں بھی ایک ہی بار نہیں پھرن دیں گے اس کی  
چار پانچ قطعی کریں گے اور ہر قط کے درمیان ایک ڈیڑھ  
گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔"

اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ منہ سے "تھو" کی آواز  
نکل کر اس نے سکرٹ ایک طرف پھینک دیا اور ہلکے  
ہوئے لیے میں بولا۔ "مجھے باندھ کر گھنٹے کی طرح بھونک رہے  
ہو، کھول کر دیکھو، ابھی پتا چل جاتا ہے کہ کون قصائی ہے اور  
کون بکری۔ میں تمہارا حوالہ دیتی نہیں ہوں کہ ہر سوال کا  
جواب دیتا جاؤں۔ میں نے پکا دیا ہے تمہارا۔ کیا کیا ہے

میں نے۔۔۔“  
میں نے انتہائی عجیبہ لمبے میں کہا۔ ”تم نے دی کیا ہے جو ایک پوئیس والے رات کے اندر میرے میں کرتے ہیں۔ تم نے ڈاکا ڈالا ہے عسرت فارم میں۔ وہاں ایک چوکیدار کو قتل کیا ہے۔ ایک بے زبان لڑکی کی عزت خراب کی ہے اور ایک بزرگ سمیت تین افراد کو آغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہو۔“

رام پانڈے کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”مجھے وشواس ہو گیا ہے کہ میں یہاں سے جیون چکار نہیں نکلوں گا۔ کیوں کہ میں ہانگوں کے نرسے میں ہوں اور باہر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“  
ہوتا نکھ بولا۔ ”کھوتے کے پڑا بیات تو ہم نے حمیس پلے تادی ہے کہ ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بار بار ایک ہی بات کرنے سے کیا فائدہ؟“

میں نے ہوتا نکھ کی کمرے پر کمان کھینچی لی اور سفاک لمبے میں کہا۔ ”ہوتا نکھ! میرا خیال ہے اس پر بھی ایک پکڑو بار نکھ والی ترکیب استعمال کرنا پڑے گی۔ پوئیس والا ہے نا اسی کی طرح نیزھا ہے۔ لانا اس حرای کو اٹانا۔“  
ہوتا نکھ نے فوراً عمل کیا۔ بندھے ہوئے رام پانڈے کو اونڈھا کرنے میں اسے خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ رام پانڈے کے ہاتھ پتھ پتھ بندھے تھے خون دیکھنے کے سبب اس کی انگلیاں نیلی ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک گھٹنا اس کی پشت پر رکھا اور دائیں ہاتھ کی ایک انگلی اپنی گرفت میں لے لی۔ ہوتا نکھ نے کسی جبر کا نرس کی طرح پانڈے کا بالائی دھڑ اپنی گرفت میں لے لیا تاکہ وہ زیادہ تر پتھ پتھ نہیں۔

رام پانڈے بہت سخت جان تھا لیکن دوبارہ نکھ سے زیادہ سنا نکھ۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کتنی بھی قوت برداشت کا مظاہرہ کرے آخر اسے کتنے ٹیکے ہی ہیں۔ تو کیوں نہ شدید جسمانی نقصان اٹھانے سے پہلے ہار مان لی جائے ابھی میں نے اس کی صرف دو انگلیوں پر ہی کپکان کی دھار آزمائی تھی کہ وہ چلا اٹھا ”بس بس بس“ جھگوان کے لیے بس کرو۔ میں بتا ہوں۔ سب کچھ بتا ہوں۔ آؤ جاؤ میرے اوپر سے۔“

اس نے پھل کی طرح تپ کر مجھے اپنے اوپر سے جھٹکا۔ اس کو فرش کے نتیجے میں اس کی گردن ہوتا نکھ کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے مڑ کر اپنی کئی ہوئی انگلیوں پر نظر ڈالنا چاہی لیکن میں نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنا لوبانان ہاتھ نہ دیکھ سکے بلکہ اس لیے کہ اس کا خوف ہراس برقرار رہے۔ اصل میں نے اس کی انگلیاں کاٹی نہیں تھیں صرف زخمی کی تھیں لیکن اس پر یہی ظاہر

کہا گیا تھا کہ انگلیاں علیحدہ کر دی گئی ہیں۔ شوع میں میں نے دوبارہ نکھ کی انگلیاں بھی نہیں کاٹی تھیں صرف ظاہر کیا تھا کہ انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ متعدد یہ تھا کہ ہاتھ سلامت رہے اور وہ زبان بھی کھول دے مگر وہ وحیت نکھ تھا اور انگلیاں کٹا کر ہی راہ راست پر آتا تھا۔ دوسرے نفلوں میں اس نے نفسانی اثر قبول کرنے کے بجائے خالص جسمانی اثر قبول کرنے کو ترجیح دی تھی۔

میں نے تڑپے پڑتے رام پانڈے کو اپنی راتوں میں دبائے رکھا اور اسی حالت میں اس سے پوچھ پچھ شروع کی۔ رام پانڈے میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہمیں گالیاں دے لٹکا وہ خنز کو گالیاں دے رہا تھا اور ہائے دائے کر رہا تھا۔ اسی حالت میں اس نے رک رک کر جو کچھ بتایا اور میں نے اپنے سوالات کے ذریعے جو کچھ معلوم کیا اس کا پتہ لبا بہ ہے۔

رام پانڈے نے تسلیم کیا کہ چند پتھ پتھ وہ عسرت فارم میں ہونے والی واردات میں لوٹ رہا ہے اور 22 مارچ کی رات جو پانچ افراد عسرت فارم میں گئے تھے وہ ان میں شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ گنڈا را پور گاؤں سے جو سات میل شمال کی طرف پڑی شکر کے کنارے خانہ بدوشوں کی ایک بستی ہے۔ یہاں گھڑے رہتے ہیں سانی خانہ بدوشوں کی طرح وہ بھی ہے۔ حد جھگڑا لوگ ہیں چوپایاں ڈکیتیاں کرتے ہیں اور ہر طرح کا شکار بھی گھیر ڈھونڈو وغیرہ مار کر کھا جاتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ سانپ بھی پالتے ہیں اور ان کا تماشا دیکھا کر روزی کھاتے ہیں۔ اس بستی کے چند گھر نے چوری ڈکیتی میں مانی گرائی ہیں۔ وہ اکثر ہتھیار بند ہو کر واردات کرتے ہیں اور خطرے کے وقت بھاگنے کے بجائے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ ان لوگوں نے سانپ کے زہر کو ایک خطرناک ذریعہ دیا وہاں ملکر ایک تیز قسم کا زہر تیار کر رکھا ہے۔ اس زہر کو چاکلی کہتے ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ گھڑے اپنی کھانڈوں اور برہمچینوں وغیرہ کے پھل اس زہر میں بھالیتے ہیں اور ان ہتھیاروں کا کھانا کھا لیا ہوا چند منٹ میں مورگ باشی ہو جاتا ہے۔ اس بستی کا شیرا سنگی نامی ایک شخص بہت تیز و طرار مشہور ہے۔ عسرت فارم کی واردات اسی شیرے نے اپنے چار ساتھیوں سے مل کر کی تھی۔

میں نے کہا۔ ”لیکن تم ان بچے ہو کہ اس واردات میں تم بھی شریک تھے۔“  
”میں انکار کماں کر رہا ہوں۔“ رام پانڈے نے کہا۔ ”جو جرم میں نے کیا ہے وہ حمیس ضرور بتاؤں گا لیکن جو

نہیں کیا۔ وہ نہیں کیا۔ دو انگلیاں چھوڑ میرا سر بھی نہ کاٹو گے تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”نکھ! اس کے بعد کیا ہوا؟“  
رام پانڈے نے کہا۔ ”شیرا سنگی پرانے وقت سے میرا شایا تھا۔ ایک دو دفعہ میرا اس سے ٹاکرا بھی ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے پر گولی بھی چلائی لیکن پھر وہ میرا دیکھ ہی گیا۔ اس نے مجھے وہ چن رہا تھا کہ جس تھانے میں میری ڈیول ہوئی وہ وہاں واردات نہیں کرنے گا۔ جب تک میں پولیس میں رہا اس نے اپنا دھن بھالیا۔ پچھلے مہینے ۲۰ تاریخ کو وہ رات کے وقت مجھ سے ملے میرے گاؤں آیا۔ اس نے کہا کہ گنڈا را پور گاؤں کے نبھوار عسرت پر اس کی بہت عرصے سے نظر ہے لیکن عسرت فارم جو کہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ اس لیے وہ نبھوار کو بخش رہا ہے۔ اب میں اس تھانے میں نہیں رہا بلکہ پولیس ہی میں نہیں رہا اس لیے وہ نبھوار سے دو ہاتھ کرنا چاہتا ہے میں نے کہا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں بیٹھے واؤ (شراب) پیتے رہے اور نبھوار عسرت کی باتیں کرتے رہے۔ شیرے کا خیال تھا کہ نبھوار بہت مولی مرغی ہے اور اس کے ”سیف“ میں سے چار پانچ لاکھ کا دھن نکل آتا معمولی بات ہوگی۔ پھر اس کے پاس چار پانچ ہتھے گھوڑے بھی تھے۔ ان میں سے دو گھوڑوں کی قیمت ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ شیرے نے مجھ سے کہا کہ میں بھی اس واردات میں شریک ہو جاؤں۔ میں تریگ میں تھا اس لیے باہی بھری۔

بعد میں میں نے سوچا بھی کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا لیکن باہی بھری تھی اس لیے پیچھے ہٹنا مشکل تھا۔ ۱۲ مارچ کی رات شیرا اور اس کے چار ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر میرے گاؤں آئے وہاں سے انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور گنڈا را پور پہنچ گئے میرے پاس ریو اور تھا جب کہ شیرا اور اس کے ساتھی اپنے دسکی ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ دو کے پاس کھانڈیاں تھیں اور دو کے پاس برہمچیاں۔ خود شیرے کے پاس کھانڈی کے علاوہ ایک بڑی تخت قسم کی کمان تھی۔ اس کمان میں چلنے والے بہت سے تیراں سے پلاسٹک کے ایک پائپ میں ڈال کر کندھے سے لٹکا رکھے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان سب تیروں پر چاکلی لگی ہوئی ہے۔ جو نشانہ بنے گا پھڑک کر مرجائے گا۔ نہ شعلہ نہ دھماکا نہ ہندوق جام ہونے کا ڈر۔ بس وہ کھینچا اور بندھ پار۔

ہم رات پورے آٹھ بج چلے تھے رات دس بجے کے لگ بھگ عسرت فارم پہنچ گئے۔ عسرت فارم سے کچھ فاصلے پر

ہم نے گھوڑیاں چھوڑ دیں۔ شیرے کا ایک ساتھی بھی گھوڑیوں کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ ہم سب نے واؤ لٹی رکھی تھی۔ شے کی وجہ سے ہر طرح کا خوف ڈر میں سے نکلا ہوا تھا۔ پہلے ہم نے فارم کا ایک چکر لگایا پھر باہر کی دیوار پھانڈ کر ڈیرے۔ یہیں ٹھہر گئے۔ یہاں بس ایک دو گھوڑوں میں دو شنی ہو رہی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹے کے پاس نبھوار عسرت کے چوکیدار نے ہمارا راستہ روک دیا۔ وہ ابھی ہندوق ہی سدھی کر رہا تھا کہ شیرے کے ایک ساتھی نے کھانڈی کا زور دار ہاتھ مارا۔ پھل چوکیدار کے منہ پر لگا اور وہ الٹ کر میزبوں کے پاس جا کر اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی دو سرا دار اس کے سر پر لگا اور سر دھک ہو گیا۔ چوکیدار کو گرانے کے بعد ہم اندر گھس گئے۔ ایک کمرے میں ایک اونچا لمبا جوان سویا پڑا تھا۔ بعد میں اس کا نام وجن سنگھ (مغدر) معلوم ہوا۔ اس کا پھتول دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ ہم نے وہ پھتول قبضے میں لیا اور دردانے کو باہر سے لٹکی چڑھا دی۔ اس کے بعد ہم نے اوپر کی منزل پر جا کر نبھوار عسرت کو قابو کیا۔ وہ روشنی میں تھا اور اپنی عمرانی میں کھانا پکوا رہا تھا۔ اس نے قابو آنے سے پہلے کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن آخر پکڑا گیا۔ بعد میں اسے بھی وجن سنگھ کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا۔ اس کمرے میں دردانے کے سوا کوئی رست نہیں تھا اور ہمیں وشواس تھا کہ وہ دونوں وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اس دردان شیرے کے بندوں نے ایک چوتھے شخص کو بھی پکڑ لیا۔ وہ احاطے میں کھڑے ٹرک پر سویا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام دلپیت بتایا۔ وہ بھی کوئی خانہ بدوش لگتا تھا۔ اس کی ران پر گھرا کھانڈ تھا اور ہلنا جھٹنا بھی اس کے لیے کٹھن ہوا تھا۔ شیرے نے اس کی تلاش میں لے کر پھل منزل کے اسٹور میں بند کر دیا۔ اس کے بعد ذرا ہمارے قبضے میں تھا اور صبح تک کوئی فکر فائدہ نہیں تھا۔ ہم نے سب سے پہلے نبھوار عسرت کا آہنی سیف کھولا اور اس میں سے نقدی اور زیور نکالے۔ یہ کل ستر ستر ہزار کال تھا اور شیرے کے اندازوں سے بہت کم تھا۔ شیرے نے نبھوار عسرت کو مارا پینا اور پوچھا کہ باقی مال اس نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں نہیں چھپایا۔ چند روز پہلے اس نے فنی گاڑی لی ہے۔ جو باہر ڈھونڈ میں میں کھڑی ہے۔ دوسری ڈر گھٹنا یہ ہوئی کہ نبھوار کے گھوڑے بھی طویلے میں نہ ملے انہیں صرف ایک دن پہلے شہر پہنچا دیا گیا تھا۔

شیرے اور اس کے ساتھیوں نے ڈیرے کی تلاش لی۔ پھر اوپر کی منزل پر چلے گئے۔ یہاں انہوں نے ایک الماری توڑ



کر دلائی دامد کی بوتلیں نکالیں اور پیئے پلانے میں لگ گئے۔

میں تک تا کر رام پانڈے کچھ انک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ موگوئی لڑکی جیسو والے واقعے سے کئی کترا رہا ہے۔ میں نے خود جیسو کا ذکر جھوڑا اور رام پانڈے سے پوچھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے پہلے تو پانڈے نے اودھڑا دھر کی باکی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اسے یہ گناہ بھی قبول کرنا پڑا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی جوان تھی اور وہ نئے میں تھا۔ پھر وہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا۔ لڑکی رو رہی تھی۔ اور ان سب کی منت سناہت کر رہی تھی۔ وہ اسے بچلے کمرے میں لے آیا اور اسے اشاروں سے سمجھایا کہ یہ خانہ بدوش بہت خطرناک قسم کے لوگ ہیں اسے کچا کھا جانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ ہنر ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور اس کی بات ماننے لڑکی نے دونا چلانا شروع کر دیا اور باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ مجھ کو اسے رہی سے باندھنا پڑا۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ہم بستی میں ہوتا تھا۔ اور بابو لیاقت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے جس طرح بالائی منزل پر ایک خوبصورت دسترخوان آجڑا لگایا تھا اسی طرح ایک لڑکی کو بھی آجڑا لگایا تھا۔

رام پانڈے نے بتایا۔ ”وہ مستی کی رات تھی۔ دلائی دامد نے ہم سب کے میز چھارے کئے تھے۔ شریے کا خیال تھا کہ ذریعے پر ایک بندہ مار کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا اس لیے وہ کا نام ثابت ہوا ہے میں نے پوچھا ”کاسب کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ چوہدری کرم چند کو لے آئیں“ پتے پھیلنے کے لیے میں اس کی بات سمجھ گیا۔ چوہدری کرم چند بہت مالدار آسانی ہے۔ وہ اکثر چڑا بھی کھاتا ہے۔ جوئے کی یہ محفلیں عشرت فارم پر ہی منع ہیں۔ جب بھی نہوارا عشرت پھیلنے کے موڈ میں ہوتا تھا، وہ اپنی گاڑی بھجوا کر چوہدری کرم چند کو بلوا لیتا تھا۔ نہوارا عشرت اناڑی تھا اس لیے کرم چند بھاگ بھاگ آتا تھا اور ایک ہی پھیرے میں اکثر چالیس بیچاس ہزار دیت کر چلا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ نئے باز کی سمجھ میں نئے باز کی بات فوراً آجاتی ہے۔ میں نے اسی وقت نہوارا عشرت کی بے غور گاڑی نکالی اور کرم چند کو لینے فرید کوٹ روانہ ہو گیا۔ اس وقت ذریعے سے نکلے ہوئے میری نظر ٹک پر بھی پڑی تھی۔ اس پر مجھے لگے تھے اور اگلے صبح کو ایک تہال سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکا تھا کہ اس ٹرک پر کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات اور زیور لادے ہیں۔ میں نے گاڑی کا کسٹ پلیئر

اونچی آواز میں لگا دیا اور اسے فرید کوٹ کی طرف بگاتا چلا گیا۔ اس وقت میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ذریعے پر ایک بندے کی لاش پڑی ہے اور میں بندے ہم نے کرموں میں بند کر رکھے ہیں۔ نہ ہی یہ سوچا کہ کرم چند بیٹھے بیٹھے میرے ساتھ بوجھنے کے لیے کیسے چل پڑے گا اور اگر ابھی تک تو کیا ضروری ہے کہ ڈیڑھ دو لاکھ روپے جب میں ڈال کر ہی نکلے۔ بس میں ذہن میں تھا کہ کرم چند کو نہوارا عشرت کے ذریعے پر لے جانا ہے اور اس سے رقم جیتی ہے یا پھر جین لینی ہے۔ بعد میں کیا ہوا یہ بعد میں دیکھا جاتا۔

ابھی میں گنڈارا پور سے بمشکل چار پانچ میل دور ہی گیا تھا کہ اندھیرے اور دھوٹی کے کارن کار پر قابو نہ رکھ سکا۔ بجائے اس کے کہ میں ٹیل پر سے نہوارا کرتا میں نے ایسی جگہ سے نہوارا کرنے کی کوشش کی جہاں ٹیل نہیں تھا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ میں کار سمیت چودھ فٹ گہری نہیں گرا۔ ابھی جیون بائی تھا کہ سخت چوٹیں لگنے کے باوجود میں بے ہوش نہیں ہوا اور ڈوبی ہوئی کار میں سے نکل کر باہر آ گیا۔ سر کا ہڈا بہت تیز تھا۔ کنارہ پکڑنے میں مجھے ایٹھریو آگیا۔ ایک فٹنڈا بڑی طرح گھاس ل ہو گیا۔ ہاتھ اور سر پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب یہ چوٹیں ٹھنڈی ہو گئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ عشرت فارم واپس جانا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں وہیں ایک کھیت میں چھپ چھا کر بیٹھ گیا۔ صبح ایک کسان کی مدد سے کرمیں تحصیل اسپتال پہنچا اور وہاں سے مرہم پٹی کروا کے اپنے گاؤں رت پور واپس چلا گیا۔ دو روز تک میں گھر سے باہر نکلا نہ مجھے یہ پتا چلا کہ گنڈارا پور میں کیا ہوا ہے۔ تیسرے روز دوپہر کو ایک شخص نے بتایا کہ نہوارا عشرت اپنے کچھ کارندوں سمیت ذریعے سے غائب ہے۔ اس کے چوکیدار کو قتل کر دیا گیا ہے۔ گنڈارا والا گیا ہے اور اس کی نئی گاڑی بھی ذریعے پر موجود نہیں۔ اس شخص نے جو سب سے اہم جانکاری مجھے دی وہ یہ تھی کہ نہوارا کے ذریعے سے کنوں سے لدا ہوا ایک ٹرک غائب ہو گیا ہے اور یہی وہ ٹرک ہے جس کا چرچا کئی دنوں سے سنا جا رہا ہے۔

اپنی روداد کو اختتام تک پہنچا کر رام پانڈے خاموش ہو گیا۔ میرے اشارے پر ہوا تھکے میں اس کی گردن چھوڑ دی۔ میں نے اس کی کمر اپنی ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دی۔ وہ زور لگا کر ہلو کے بل ہو گیا۔ اس کی زور پشانی پر پینے کے قطرے تھے سب سے پہلے اس نے گردن موڑ کر اپنی آنکھیں دیکھیں انہیں ہاتھوں سے خشک پا کر اس کے

چہرے سے حیرت آمیز اطمینان جھلکے لگا۔ میں نے کہا۔ ”مکن لو۔ آنکھیاں ابھی پوری ہیں اور اس طرح تعاون کرتے رہو گے تو پوری ہی رہیں گی۔“

اس کے چہرے پہنچ گئے۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس فراڈ پر ہمیں کو سے یا ہمارا شکر یہ ادا کرے۔ وہ کچھ دیر پڑی گہری نظروں سے ہمیں دیکھا رہا پھر بولا ”بڑی غلط قسم کی چیزیں ہو موندوں۔“

میں نے کہا ”اسی لیے تمہاری آنکھیاں سلامت ہیں۔“ اس نے کمنوں پر زور دیا اور دیوار کا سارا لے کر بیٹھ گیا۔ ہوا تھکے باہر گیا اور ایک کھلی سی پٹی لے آیا۔ ساتھ میں چلنے کی راہ بھی تھی۔ راگھ سے اس نے رام پانڈے کی انگلیوں سے رستے والا خون بند کیا اور پٹی باندھ دی۔ یوں تو وہ رام پانڈے کی تیار داری کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں پانڈے کے لیے بدستور نفرت کی چنگاریاں تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ پانڈے سے کچھ زیادہ ہی غار کھا رہا ہے۔ آنکھیاں کٹ جانے کا نفسیاتی اثر تھا کہ رام پانڈے کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے کہنے لگا ”تم نے جو چاہا مجھ سے پوچھا۔ کیا میں بھی کچھ پوچھ سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”فی الوقت پوچھنے کا حق صرف ہمیں ہے۔ ہر حال کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا ”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں تو لوگ تمہیں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے ہو۔ مجھے دھواں ہے تمہارا ناٹا پولیس سے نہیں۔ پھر تجھ سے یہ کیہ پچھنا آتی اور پوچھ کچھ کیوں ہو رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس بارے میں تمہارا اپنا کیا دھار ہے؟“

وہ بولا ”مجھے پتا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔“ ”میرا خیال ہے تم بھولے بن رہے ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ اس علاقے میں چنے چنے پر گمشدہ ٹرک کی تلاش ہو رہی ہے۔ ٹرک ۲۲ مارچ کی واردات میں غائب ہوا اور تم اس واردات میں شریک تھے۔ اس حوالے سے ٹرک کے ساتھ تمہارا گمراہ سمبندہ ہے۔ نبت کی بات یہ نہیں کہ تم پکڑے گئے ہو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تم اب تک آزاد پھر رہے تھے۔“

وہ کہنے لگا۔ ”واردات سے میرا سمبندہ ضرور ہے لیکن اب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

میں نے کہا۔ ”جس طرح تم نے واردات کے بارے میں بتایا ہے اسی طرح ٹرک کے بارے میں بھی بتاؤ گے اور نہ

صرف بتاؤ گے بلکہ ٹرک پر آمد بھی کرواؤ گے۔“ وہ ہنسی سی ہنسی ہنس کر بولا ”مجھے تو لگتا ہے کہ اب تم اپنا وقت اور میری آنکھیاں ضائع کر دو گے۔“

اس کی ہنسی میں ایسی قطعیت تھی کہ میری آنکھوں میں امید کی کرنیں بجھنے لگیں۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ ”اب یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم اس سے اور کچھ نہیں اگلا سکو گے۔“

اگلے آدھ پون گھنٹے میں میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہو گیا۔ رام پانڈے سے اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کا کتا تھا کہ وہ مزید کچھ جانتا ہی نہیں۔ بقول اس کے وہ خود حیرت میں فرق تھا کہ واردات کی رات اس کے جانے کے بعد عشرت فارم پر کیا صورت حال پیش آئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس ”جھوپڑا بستی“ لے جاؤں جہاں سے شیر اور اس کے ساتھی گھوڑیوں پر سوار ہو کر آئے تھے، لیکن وہاں سے بھی تمہیں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ واردات کے بعد ان خانہ بدوشوں میں سے کوئی بھی اپنے جھوپڑے میں واپس نہیں لوٹا۔ سوائے اسی شخص کے جو گھوڑیاں لے کر فارم سے باہر کھڑا تھا اور اگلی صبح دیر تک انتظار کرنے کے بعد بستی واپس پہنچا۔“

اچانک ہماری گفتگو کا سلسلہ متقطع ہو گیا۔ باہر سے کچھ ملی جلی آوازیں آئی تھیں۔ میں نے ٹنگ و تارک کو غری سے باہر نکل کر دیکھا۔ میری نگاہ سب سے پہلے غزال پر پڑی۔ وہ راجستھانی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چوہ چادر کے پلو نے ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ خوبصورت شریقی آنکھیں جو دیکھنے والے کے تصور سے چپک کر رہ جاتی تھیں۔ غزال کے ساتھ بٹا تھی۔ بٹا کے عقب میں سامیں عالی تھا اور ان تینوں کو یہاں لانے والا زریں گل تھا۔ زریں نے خود بھی ایک چادر کی بگل مار پٹی تھی۔ اس چادر کے شب و فراز سے اندازہ ہوتا تھا کہ بگل میں رانقل بھی چھپی ہوئی ہے۔ ان سب کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ ٹھگے ماندے ہیں اور طویل سفر کر کے آئے ہیں۔

سلام دعا کے بعد زریں گل نے یہ انکشاف کیا کہ انیسٹر وریار تھکے بھاگ نکلا ہے اور اس کے بھاگنے کے بعد وہ سب فرید کوٹ والی کو بھی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ وریار تھکے اسی کو بھی میں میٹم تھا جہاں ہمارے میزبان سفیر احمد نے ہمیں ٹھہرا رکھا تھا۔ یہ کو بھی سفیر کے ایک قری عزیز کی تھی۔ ہم نے وریار تھکے پر سختی کر کے اس کی زبان کھلوائی تھی اور اس

نے ہمیں گناہ خطوں کے ساتھ ساتھ لشکر والے کے لیے اور سرخ لباس والے فوجی کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم نے اسے فوجی حلقہ کے ایک اندرونی کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اس کمرے میں ملحقہ ہاتھ موجود تھا۔ دربار سنگھ کی دیگر ضروریات بھی اسی کمرے کے اندر پوری کر دی جاتی تھیں لیکن اب وہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگا تھا۔ اس واقعے کے بعد زیریں گلے اور سفیر احمد نے فکریاتی کا ثبوت دیا تھا۔ زیریں گلے نے سائنس خانی اور دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا تھا اور اس کو بھی سے نکل آیا تھا۔ اسے اس ٹھکانے کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ بذریعہ بس فرید کوٹ روانہ ہوا تھا اور تین چار میل پیدل چلنے کے بعد اس ٹھکانے تک پہنچ گیا تھا۔

میں نے زیریں گلے سے پوچھا۔ ”جب دربار فرار ہوا“ تم کہاں تھے؟“

وہ قدرے مذمت سے بولا۔ ”مگر میری میں تھا۔ میرے سفیر صاحب اور اے نے دو ڈھائی گھنٹہ آپ کا انتظار کیا۔ آپ نہیں آیا تو ام فرید کوٹ کی طرف چل پڑا۔ شاید آپ کو ابھی پتا نہیں ہے کہ سیلے میں چار بندے قتل ہوئے اور زخمی ہوئے والا تو دو درجن سے کم نہیں ہو گا۔ چند روز میں دکانیں بھی جل گیا ہے۔ پولیس نے سیلے کی جگہ کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ امارا وہاں زیادہ دیر رکتا نہیں تھا۔ اس لیے آپ کو خدا کے شکر کہ ام برادر سفیر صاحب کے ساتھ فرید کوٹ واپس آ گیا۔ ابھی ام کو آئے ہوئے دس چندہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ جیم صاحب (غزالہ) نے شور مچا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ابھی ایک بندہ دیوار پر چڑھ کر ہار کوا ہے۔ ام نے وائیں بائیں دیکھا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اتنے میں برادر سفیر صاحب نے بتایا کہ وہ حزامی اسپرنگ نکل بھاگا ہے۔ اس خانہ خراب نے ایک روشندان کا جالی گات کر وہاں سے چند اینٹیں اکھاڑا تھا اور نکل گیا تھا۔ بس ام سمجھ گیا کہ اب امارا یہاں رہنا سخت یقینی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”سفیر صاحب کہاں ہیں؟“

نشا بولی ”انہوں نے ہمیں دو فون نمبر دیے ہیں اور کہا ہے کہ ہم جب مناسب سمجھیں ان نمبروں پر ان سے رابطہ کر لیں۔“

دربار سنگھ کے بھاگنے کا مجھے افسوس تو ہوا تھا لیکن اتنا زیادہ نہیں۔ ہم اس سے جو فائدہ حاصل کر سکتے تھے وہ کر چکے تھے۔ باقی رہی اس کی انتقامی کارروائی تو اس کا ”خلع“ بھی میرے پاس موجود تھا۔ میں نے اس سے کئی سادہ اور تحریر

شدہ کاغذات پر دستخط کرائے تھے۔ ان کاغذات کی موجودگی میں وہ بے طرح بندھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بابو لیاقت کی والدہ یا قریبی احباب کو دوبارہ حراست میں لینے کی جرات نہیں کرے گا۔ اطلاعات کے مطابق اس نے مجھے پکڑوانے کا سودا فکھر شکر گروپ سے پچاس لاکھ میں طے کیا تھا لیکن اگر میں اس کے دستخط شدہ کاغذات بابو لیاقت جیسے کسی دیکل کے حوالے کر دیتا اور وہ انہیں دوبار سنگھ کے خلاف استعمال کرنے پر قائل جاتا تو دوبار سنگھ کو دن میں تارے نظر آسکتے تھے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ اس اٹھارہ مقام پر ایک تنہا کنڈر تلے جنگل میں مشکل کا ساں تھا۔ یہ خانہ قریباً بیس فٹ چوڑا اور چالیس فٹ لمبا تھا۔ اس مختصر جگہ پر کم و بیش درجن افراد موجود تھے۔ خانے کی حالت سے اندازہ ہوا تھا کہ سردار لالی اور اس کے ساتھی یہاں کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی ضروریات کے مطابق اس خانے میں کئی تبدیلیاں کر رکھی تھیں۔ اندر ہی کھانا پکانے کے لیے دو پختہ چولے بنائے گئے تھے۔ چینی کی ضرورت ایک سوراخ سے پوری کی گئی تھی۔ یہ سوراخ ڈاک بیگ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کھلتا تھا۔ خانے میں اترنے کے لیے مٹی کے زینے بنائے گئے تھے۔ زینوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں بنے ہوئے پانچ چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ ہماری حیثیت یہاں سردار لالی کے مہمانوں کی تھی لیکن وہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بابو لیاقت نے بتایا کہ اب تک وہ صرف ایک بار اس خانے میں آیا ہے۔ اس نے منہ سرگرمی میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ میاں قہر کا محض ہے لیکن آواز بہت رعب دار ہے۔ چند منٹ رک کر اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے کر وہ واپس چلا گیا تھا۔

میں نے بابو لیاقت سے پوچھا۔ ”اس کے کتنے ساتھی ہیں یہاں؟“

وہ بولا۔ ”آٹھ ہیں۔ ان میں سے دو ہر وقت باہر میرے پر رہتے ہیں۔ چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹیاں باندھ رکھی ہیں انہوں نے۔“

”کھانا وغیرہ کہاں سے آتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بابو لیاقت نے کہا ”بڑا زبردست انتظام ہے۔ جس کمرے میں آپ نے رام پانڈے سے پوچھ چکے ہیں وہاں سے ایک کمرہ اس کے سامنے بھی ہے۔ وہاں کم از کم دو مہینے کا راشن موجود ہے۔ سردار لالی کے آدمی یہاں پکاتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں اور ہمیں بھی کھلاتے ہیں۔ بڑے آزاد منشی اور خوش

ہم کے لوگ ہیں۔ خالصتان کے قیام تک اسٹے جینے مرنے کی تسخیریں کھا رہی ہیں ان لوگوں نے وہ دیکھیں سامنے دیوار پر نعرے لکھے ہوئے ہیں۔ ہندی میں ہیں اس لیے آپ میں دیکھیں گے کہ وہ اور لکھا ہے ”پچ پچ پک جائے گا“ ہندوستان بٹ پائے گا۔“ نچے لکھا ہے ”چے خالے کی ایک بچان۔ لب پر اس کے خالصتان۔“ وہ سب سے نیچے اڑھین سرکار کے لیے لکھا گیا ہے۔

غزالہ اور نشا خانے کے ”زبانے حصے“ میں بیٹھ بیٹھ تھیں۔ یہاں زوردار احمد گمری نیند سو رہی تھی اور کوئی جھجھکی نہیں مٹا رہی تھی۔ فضا میں رائے باستی عادل کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ چاند دوپہے دیکھوں میں ڈال کر چوٹوں پر رکھے گئے تھے اور سردار لالی کے دو ساتھی بڑے خوشگوار موڈ میں ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ڈاکو اور جرائم پیشہ ہونے کے باوجود مجھے ان نوجوانوں کی آنکھوں میں حائل نظر آئی۔ نشا کی خوبصورتی ایسی تھی کہ راہ چلنے لوگ حیرت مکر رہتے تھے۔ اگر میں یہ کسوں تو غلط نہ ہو گا کہ ”چری ویکر“ اور گرد کی ہر نگاہ کو اپنی طرف مبذول دیتی تھی۔ مگر ان لوگوں نے ایک دوبار دیکھنے کے بعد خود کو نشا اور غزالہ کی موجودگی سے لاپرواہ کر لیا تھا۔

زیریں گلے جانے کے لیے سخت بے قرار نظر آ رہا تھا کہ میرے سے پکڑے جانے والے سرخ پوش نے ہمیں کیا بتایا ہے اور ٹرک کی تلاش کس مرحلے میں پہنچی ہے۔ میں مختصر لفاظ میں اسے اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کرنے لگا۔ اس دوران ایک دلدوز جی نے ہم سب کو بری طرح خنکا دیا۔ ہارل پکاتے ہوئے نوجوانوں نے سمجھ کر اپنی رانٹیں ختم کر دیں۔ میرا ہاتھ بھی سیدھا ہے بلبل پر گیا۔ ٹھوم کر دیکھا کہ ہمیں نظر آئی۔ وہ خانے کے تنگ راستے میں سے رینگ رینگنے کی کوشش کر رہی تھی اور بڑائی انداز میں چلا رہی تھی۔ زیریں گلے نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ مجھ کو اس کے سر پر دو تھامنے لگی اور ناخنوں سے چوڑے پٹے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم سب نے زیریں گلے کی بددی واری اور جھجھکیوں کا دیکھا۔ ایک دم لڑکی کی آنکھیں الٹ گئیں۔ دانت مضبوطی سے یک دوسرے پر جم گئے اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ ایسے دوسرے سے پہلے بھی بڑے چکے تھے لیکن یہ دورہ بے حد شدید تھا۔ اگرچہ اس کا وہ علاوہ دروازہ دیکھ کر اس دورے کی وجہ بھی علی گھ میں آگئی۔ ہماری گفتگو کے دوران مجھ کو کسی کام سے کوٹھڑی میں چلی گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہاں کی فوج ”یہ نہیں نہیں“ بند ہے جو چند پہلے اسے

درونگی کا نشانہ بنا چکا ہے اور جس کی خنڈاک جھٹک وہ کسی بھی چہرے میں دیکھ کر بدست سے چلا آگئی ہے۔ اس نے کوٹھڑی کے فرش پر رام پانڈے کو دیکھا تھا اور ہوش کو بھیجی تھی۔

○☆☆○

رام پانڈے کو گچی جھجھکیوں میں دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا۔ میں نے اسے یہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ جھجھکیوں اور دیگر دلازموں کو ہم ہی مشرت فارم سے لے کر آئے تھے اور اب وہ ہمارے ساتھ اس خانے میں موجود ہیں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہم نے رام پانڈے سے پوچھ چکے جہاں رہی لیکن کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ رام پانڈے کی سوتی اس جگہ پر اگر ایک گھنٹہ بھی کہ وہ نمودار مشرت کی نئی گاڑی لے کر ڈیرے سے نکل آیا تھا اور بعد میں کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں۔

میں نے پوچھا۔ ”تم کچھ اندازہ تو لگا سکتے ہو۔“

وہ بولا۔ ”اندازہ تو بہت لگائے ہیں لیکن کوئی اندازہ دل کو لگے تب ہے نا۔“

”کوئی ایک ایسا اندازہ بتاؤ جو ہمیں زیادہ قریب معلوم ہوتا ہو۔“

اس نے اپنے بندھے ہاتھوں سے ٹھوڑی سمجھائی (اب ہم نے اس کے ہاتھ سامنے کی طرف باندھ دیے تھے) جگہ دیر سوچ میں گم رہ کر بولا ”یوں لگتا ہے کہ کسی کا دن ڈیرے پر ایک دم افزا تقری بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اخبار میں ایک جگہ پڑھا ہے کہ بھاگنے والے کھانا اور عورت چھوڑ کر بھاگے ہیں اور ان کے دو جوتے بھی موٹے سے ملے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بھاگنے والوں نے ٹرک کو صرف سواری کے طور پر استعمال کیا ہو۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ ٹرک میں گھولنے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیرا اور اس کے ساتھی افزا تقری میں بھاگے تو پھر نمودار مشرت اور باقی دو افراد کو زبردستی اپنے ساتھ کیسے لے گئے۔ کل رات سوچتے سوچتے ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح نمودار مشرت اور وچنگ سنگھ (مصدر) کمرے کا دروازہ توڑ کر نکل گئے ہوں۔ ان کے فرار ہو جانے سے شیرے اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں اور انہوں نے نکل بھاگنے میں خیریت سمجھی ہو۔ ڈیرے پر سواری کے طور پر صرف ٹرک موجود تھا لہذا وہ اسے ہی لے آئے ہوں۔“

میں نے کہا ”تمہارا یہ اندازہ اس لیے قابل قبول نہیں کہ اگر نمودار مشرت وچنگ کے ساتھ علیحدہ فرار ہوا ہے اور

شیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ملکہ بھاگا ہے تو پھر وہ سارے ایک ساتھ لاپتہ کیوں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تو کوئی انسان واقعہ پیش آسکتا ہے لیکن دونوں کے ساتھ نہیں۔

رام پانڈے ایک دم غامض ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھنیں لہرائی تھیں۔ ہر رنگ اور ہنگ کی الجھنیں۔ ان الجھنوں کا تعلق ماضی کے علاوہ حال سے بھی تھا۔ حال کے حوالے سے اس کی سب سے بڑی الجھن شاید یہ تھی کہ اس کی جبری کرنے والا کون ہے اور کون ہے جس نے اسے اس دلدل میں پھنسا یا ہے؟ وہ کتنے غماض سے ج سنور کو لنگر وال کا میلہ دیکھنے لگا تھا اور اب فقیروں کے حال دیکھوں میں بجز اس سلیٹن زدہ فرش پر پڑا تھا۔

رام پانڈے کو اس کی الجھنوں میں چھوڑ کر میں باہر باہر لیاقت کے پاس آ بیٹھا۔ میں نے سکرٹ ملگائے ہوئے کہا۔ "لیاقت صاحب! سب سے پہلے تو ہمیں رام پانڈے کے بیانات کی صحت جانچنی ہوگی۔ اس حوالے سے ہمیں دو کام کرنے ہیں۔ نمبر ایک اس گاڑی کا کھنک لگانا ہے جو رام پانڈے کے بغیر نہیں مری گئی ہے اور اب تک وہیں ہے۔ نمبر دو خانہ بدوشوں کی ہستی میں جا کر حالات دیکھنے ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ واقعی شیر سنگھی نام کا کوئی بندہ ہستی سے غائب ہے۔ اگر شیر اور اس کے ساتھی ہستی سے غائب ہیں تو ان کے وارثوں نے ان کی تلاش میں کیا کیا ہے؟"

بابو لیاقت نے کہا "میاں ایک اور نکتہ بھی ہے، ممکن ہے واردات پر جانے والوں میں سے کوئی ایک آدھ والہیں بھی آگیا ہو لیکن پولیس یا کسی دشمن کے خوف سے چھپا ہوا ہو۔ جو لوگ اس طرح چھپ جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اپنے وارثوں کو اپنی خیر خیریت سے ضرورت آگاہ کر دیتے ہیں۔"

"بھاکا آپ نے" میں نے تائید کی۔ "مجھے امید ہے کہ اگر رام پانڈے نے خانہ بدوشوں کے بارے میں صحیح بیان دیا ہے تو اس ہستی سے ہمیں کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ہاتھ لگے گا۔"

بابو لیاقت نے کہا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے آڑی چنگی بجاتے ہیں یہ دونوں کام کریں گے۔" اس نے اسی وقت سعید نامی ایک شخص کو آواز دی۔

"جی بابو جی" وہ ہاتھ بانٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

بابو لیاقت نے جب سے ایک قلم نکالا اور سکرٹ بیکٹ چماڑ کر اس پر کسی کے نام لکھنے لگا۔

بابو لیاقت کے تمام ساتھی اس پر جان چڑھ گئے۔ تھے۔ ہر وقت اس کے پیچھے پر خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ بابو لیاقت نے جو کام ان کے ذمے لگائے تھے وہ انہوں نے بلا کی رفتار سے کئے صرف دس گھنٹے بعد ہمیں یہ پورا مل گئی کہ گنڈارا پور کے قریب بڑی نہیں پل کے مین ایک کار موجود ہے۔ وہ بارہنٹ کمرے پانی میں ڈوبی ہوئی اور جھاڑ جھکاڑ میں اس طرح الجھ چکی ہے کہ بھاڑ کے حرکت نہیں کر سکتی۔

اس کار کو میرے نکالنا پھنڈا یا کس کھولنے مترادف تھا۔ ہم نے کار کو جہاں کا تھاں رکھنے کا فیصلہ جس شخص کو گلڑوں کی ہستی میں بھیجا کیا تھا اس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اپنی رپورٹ ڈاک بٹلے تک دی۔ یاد رہے کہ یہ رپورٹ کم و بیش چالیس میل کا سفر کر کے آئی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق گلڑوں کی میں شیر سنگھی نامی شخص رہتا تھا۔ وہ پرانا اور دانا تھا۔ بچے تین بیٹے سے وہ غائب تھا۔ اس کے چند ساتھی بھی لاپتہ ہستی میں عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ لوگ کسی واردات پر میں دور نکل گئے ہیں۔ شاید للٹنٹ ملٹنٹ کی طرف گئے ہیں اور وہاں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ چھان کرنے والے نے یہ رپورٹ اپنے ایک ساتھی کے ذمے کے ایک شخص سے دوئی کاغذ لی ہے اور اس کے مجموعہ میں ہے۔ وہ ایک دو روز مزید ہستی میں رہے گا اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ رام پانڈے دونوں بیانات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں بار بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے "بابو لیاقت کا بیان کردہ درست ہو۔ شیر سنگھی یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی والہں آچکا ہو لیکن خوف کے سبب سامنے نہ آ رہا ہو۔ ایسی بات تھی تو بابو لیاقت کا رپورٹ راز لگے دو روز میں ہم اہم انکشاف کر سکتا تھا۔

اپنی اسی دور دراز پناہ گاہ میں ہم نے تین دن اطلاع کا شدت سے انتظار کیا لیکن اطلاع آئی نہ لانے والا۔ بابو لیاقت بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا جانتا تھا کہ اس کے ساتھی کو نامی یا سستی کرنے د نہیں۔ جب چہ قانون بھی گزر گیا تو بابو لیاقت کی بے کمرے اندیشے میں ڈھل گئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "شاہ

بھائی! مجھے لگ رہا ہے کہ گلڑوں کی ہستی میں کوئی کڑی نہیں ہے جو بندہ وہاں گیا ہے وہ آتی ہو کر لگنے والا نہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔ وہ سکرٹ ملگا کر بولا۔ "میرا قول چاہتا ہے، میں ایک نو روہاں کا لگا آؤں۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو ہم دونوں جا میں گئے بلکہ ی ہم دونوں کو چاہئے۔ بہت اہم معاملہ ہے ممکن ہے ہستی سے ہمیں کوئی کھنک مرال جائے۔"

کچھ بحث و تمحیص کے بعد دونوں میں طے پا گیا کہ ہم آج گلڑوں کی ہستی کے لئے روانہ ہوں گے۔ جس جیب پر ال پیچھے تھے وہ ابھی تک میںیں تھک پڑا تھا۔ اپنے اوپن سے مٹورے کے بعد اسے ڈاک بٹلے کے عقب پر قلم لکھنے درختوں کے اندر چھپا دیا تھا۔ لیکن اس جیب پر سکرٹ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ فیصلہ ہوا کہ ہم ال پر جائیں گے۔ گھوڑوں پر سفر کی طرح سے مفید تھا۔ ل "وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر ہم عام راستوں ٹ کر کیتوں کھلانوں میں سفر کر سکتے تھے۔ یوں کی جگہ کٹ لگائے جاسکتے تھے اور پولیس ٹاکوں سے بھی بچا تھا۔ پوتا سکرٹ نے ہمارے گئے تین گھوڑے منتخب نہ دو گھوڑوں پر بیٹھنے کے لئے تھیں وغیرہ ڈال دیئے برا گھوڑا بھگای ضرورت کے لئے تھا۔ ہم نے اس پر ال کے گھنے لاد لئے اور سرشار جانے کے لئے تیار ہمارے پٹلے خالص دیانتوں والے تھے۔ اس پٹلے سے بڑی سولت یہ تھی کہ چنگی کو ڈھانے کے طور ل کر کے چو چھپایا جاسکتا تھا۔ پوتا سکرٹ نے دو جسم کی لائیں اور ایک لائیں بھی ہمیں مہیا میں نے اس علاقے میں دیکھا تھا کہ رات کے وقت پر سفر کرنے والے عموماً تاریخ لائیں ساتھ رکھتے تھے پوتا سکرٹ اور زیریں کی ضرورت دیالیا دیں کے لئے تیار ہو گئے۔ غزالہ کی آنکھیں عیش کی کھاں تھیں۔ وہ ہر گز میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں۔ ہم روانہ ہوئے نہ کوئی بات کہنے کے لئے میرے قریب چلی آئی غالباً جی تھی کہ اسے اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے۔ میں کی کوشش کروں۔ اپنا خیال رکھوں وغیرہ وغیرہ۔ وہ میرے پاس آئی، ایک کہنے میں غامض بیٹھا کی چٹل کے مانند چھٹا اور ہم دونوں کے درمیان ہٹ جاسے۔ پیچھے ہٹ جاؤ تو ف میں کتا ہوں

دور ہو جا۔" وہ غزالہ کو دھکیلا ہوا چلایا۔ "تیرا اس سے کوئی واسطہ نہیں" اس کا واسطہ کسی اور سے ہے۔ دور کیہ وہ بھی ہے۔ وہ دیکھ "اس نے انگلی سے ہاتھ ار حنہ بانو کی طرف اشارہ کیا جو خواب آور دوا کے زیر اثر مری خند سو رہی تھی۔ غزالہ کے چہرے پر بوکھا ہٹ تھی۔ وہ بے بسی سے بھی بچھے اور بھی ماس میں مانی کو دیکھتی تھی "ماس میں عالی نے اسے ایک اور دھکا دیا اور گرجا بھیا لگتا ہے یہ تیرا؟ کچھ نہیں" بچھے نہ نہیں لگتا ہے اور تو اس کے پیچھے مری ماری پھرتی ہے کیا چاہتی ہے تو اس سے تیرے اور اس کے راستے علیحدہ ہیں۔ جا چھوڑو۔ پیچھا اس کا۔ ورنہ بہت ذلیل ہوگی۔ میں کچھ کہوں نہ ذلیل ہوگی۔"

غزالہ بچھے اور شرم سے زمین میں گڑی جاری تھی۔ شاید زندگی میں کسی اسے ایسی شرمندگی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "ماس جی! میری بات سنیں۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔" میں نے ماس میں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دم مجھ پر چڑھ دوا "بچھے بد ہنر مارنے لگا اور میری راستے کی طرف دھکیلنے لگا۔

"چل تو نکل میاں سے۔ خواہ خواہ مٹائیاں پیش کر رہا ہے۔ میں کتا ہوں چل میاں سے۔"

غزالہ کا چو سرخ ہو رہا تھا۔ بد خواہی کی جگہ اب جھنجھلاہٹ نے لی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر تیزی سے زبانی صے کی طرف مڑ گئی۔ میں کچھ دیر شش و پنج میں کھڑا رہا پھر دل میں ماس میں عالی کو کستا ہوا یہ خانے سے باہر نکل آیا۔ باہر بابو لیاقت گھوڑوں کے پاس میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چاندنی رات تھی۔ خطرے کے احساس نے دل میں ہلکا بھگوش پیدا کر دیا تھا۔ غلطی کی طرح کا تھا۔ تاریک جنگل کا پولیس کا فکڑ فکڑا اور گرمی انجانے دشمن کا۔ جب تک ہم اپنا کام انجام دے کر واپس ڈاک بٹلے نہ پہنچے خود کو محفوظ تصور نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں لائیں تھیں۔ لائیں پر پولیس کی بینیں اور ہیکل کی شاہیں تھیں۔ ان بینوں اور شاہوں کی وجہ سے لائیں چاندنی میں چمک رہی تھیں لیکن ہمارے اصل ہتھیار ہمارے لباس میں پوشیدہ تھے۔ میرے پاس کولٹ ہٹل تھا جب کہ بابو لیاقت دس گولی والے مائز سے مسل تھا۔ دونوں ہتھیاروں کے کم از کم سو داؤد ہمارے پاس موجود تھے۔

بابو لیاقت کی ساری عمر اسی علاقے میں گزری تھی۔ وہ راستوں اور مقامات سے بخوبی واقف تھا۔ کچھ معلومات اس نے پوتا سکرٹ سے بھی حاصل کر لی تھیں۔ ہم نے کیتوں اور

گنڈے بڑوں پر اپنا سفر جاری رکھا اور اس ایک کھتے میں نصف سے ڈاکہ فاصلہ طے کر لیا۔ اب ہم فرید کوٹ کے فوجی علاقے سے گزر رہے تھے لہذا مزید محتاط ہو گئے ہم فرید کوٹ کے بالکل قریب سے ہو کر نکلے تھے جس جگہ چند روز پہلے ایک بارونق سیلہ تھا وہاں دریائے ڈیرے ڈال رکھے تھے جلی ہوئی دکانوں اور جھوپڑیوں کا بے کار ملہا ابھی تک وہیں رہا تھا۔ کوڑے کرکٹ پر آوارہ کتوں کے غول گرد کر رہے تھے۔ اچانک مجھے اس شخص کا خیال آیا جس نے رام پانڈے کی طرح سرخ لباس پہن رکھا تھا اور اتفاقاً قادر زماں کے خطرناک پولوں کے بہتے چڑھ گیا تھا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں اس کا بے حس و حرکت جسم پڑا تھا اور ایک جوان عورت اس پر ٹین کر رہی تھی۔ پھر وہ بد قسمت خود بھی گولی کھا کر سرخ لباس والے کے اوپر گر گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ دونوں زندہ رہتے تھے یا اس خونی ہنگامے کا قہر بن گئے تھے۔ مجھے زیریں گل سے اس بارے میں پوچھا یا وہی نہیں رہا تھا۔ اب میں نے باولیات سے اس واقعے کا ذکر کیا تو وہ بولا۔ ”ہاں۔۔۔ پر سوں زیریں گل نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سرخ لباس والے کا نام بخت احمد تھا۔ وہ لشکر والی کا رہنے والا تھا۔ صرف پانچ چھ ماہ پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ میں غریب ٹاٹ غریب کی گولی لگی تھی۔ وہیں موقع پر پڑے پڑے اس نے دم توڑ دیا تھا۔ اس سے لپٹ کر رونے والی اس کی بیوی تھی۔ وہ بھی زخمی ہوئی تھی لیکن اسے بچا لیا گیا۔“

میں سوچنے لگا جب وہ فوجی بخت احمد گھر سے نکلے کے لئے سرخ کپڑے اور سنہری واٹک پہن رہا ہوگا اسے کیا خبر ہوگی کہ وہ خود کو ایک نامانی موت کے لئے تیار کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کا روپ دے رہا ہے خود کو جو عظیم ترین حادثوں کی زد میں ہے۔ اگر وہ اپنے لباس میں کچھ تبدیلی کر لیتا، کسی اور رنگ کی واٹک پہن لیتا، کسی اور طرح کی بگڑی پانڈہ لیتا تو شاید بچ جاتا۔ لیکن سب بخت کی بات ہے اور وہ بخت احمد ہونے کے باوجود اپنے بخت سے ہار گیا تھا۔

ہمارا باقی کا سفر بھی خیریت سے طے ہوا اور نوبے کے لگ بھگ ہم فیروز پور کی اس بہت بڑی بستی کے نواح میں پہنچ گئے جو ایک پشیل میدان میں شمالاً جنوباً دو رنگ بھیل ہوئی تھی۔ بستی کی منشا تین دو شہنشاہیں ہیں دور سے ہی نظر آنے لگیں۔ کبھی کبھی ہوا کے دوڑ پر خانہ بدوشوں کے بولے کتوں کی غرائیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ ابھی ہم بستی سے دو

دھائی فرلانگ دور ہی تھے کہ ایک گھڑ سوار تیزی کے ساتھ ہمارے پاس سے گزرا۔ وہ اسی طرف جا رہا تھا جس طرف سے ہم آ رہے تھے ہمیں کراس کرنے کے فوراً بعد وہ ڈر گیا اور گھوڑا موڑ کر ہمارے پیچھے آیا۔ ہم نے بھی گھوڑے آہستہ کر لئے۔ نوادر کے ہاتھ میں ایک ماسج تھی۔ اگر دسائی گھڑ سواروں کی طرح اس نے بھی چوہ بگڑی۔ صاحب رکھا تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے تاریخ روشنی ہمارے چہروں پر بھیگی اور اپنے چہرے سے بچا ہٹا دی۔

”السلام علیکم یا بوی۔“ اس نے ہاتھ ماتھے پر لے کر باولیات کو سلام کیا۔  
باولیات نے بھی بگڑی کا پلو چرے سے ہٹا دیا۔ ”سلیمان! ابھی بت پریشان کیا ہے تم نے؟“ بوی نے شکر لے لیا۔ ”ہمیں تو خدا شہیدا ہو گیا تھا کہ تم کسی میں پھنس گئے ہو۔“  
وہ بولا ”مشکل ہی سمجھنے جا بوی! یہاں بستی کے آواز آوارہ کتوں کا بہت زور ہے۔ پیچھے دونوں دو تین گئے ساتھ بولے ہو گئے۔ انہوں نے کئی بندوں کو کاٹ کھا۔ بھینر بکریاں بھی زخمی ہوئی ہیں۔ کل اور برسوں بستی میں کرفٹو لگا رہا ہے۔ دو گتے کل مرے تھے۔ ایک آج“ ہے اس کے بعد ہی سردار نے کسی کو گھر سے باہر ہے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے قریبی درختوں میں چا بیماں سے نہری بانی کا چھوٹا سا کھانا گزرا تھا۔ کھا۔ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ ہم نے گھوڑے ٹاہلی کے سے باندھ دیئے اور کنارے کی سبز گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ دھو کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ دیکھنے میں وہ بھی کوئی خانہ بدوش ہی نظر دسائی تھے۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ بھیلوں قبیلوں میں رہتا ہے اور اس نے پگڈوڑے دیرہ بھی بنا رکھے ہیں۔ بستی میں ایک شخص اس کا پرانا یا ربلی تھا۔ وہ بچہ دن سے اسی کے جھوپڑے میں قیام پزیر تھا۔ سلیہ کو ششوں کا نتیجہ ابھی تک مفر تھا۔ وہ اتنا ہی مٹا کہ شیر اٹھتی اور اس کے تین ساتھی پر اسرار طو اور بستی میں ان کے درمیان بخت پریشان ہیں۔ سلیہ ”مجھے کل پتا چلا تھا کہ رت پور کے پاس بھی کتا ایک جھوپڑیاں ہیں۔ آج بعد دوپہر میں رت پور وہاں سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔“

رت پور کا نام سن کر میں چونکا۔ پانچ روز پہلے رام پانڈے نے یہ بتایا تھا کہ وہ رت پور گاؤں کا رہنے والا ہے۔ ہاں اس کا آبائی گھر ہے اور وہ اپنی جتنی اور والدہ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس سارے گھر کو وہ دھندے میں رام پانڈے کی جتنی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھے تو نے فیصلہ یقین تھا کہ ام پانڈے کے بارے میں گناہ خطوط لکھنے والی اس کی جتنی ہے میں نے سوچا جب ہم یہاں آئے ہی ہوئے ہیں تو یہاں نہ اس عورت سے بھی ملاقات کر جائیں جس نے اپنے ہم جتنی کے خلاف گواہی دی تھی اور اسے عدالت کے مرے میں لانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سلیمان نامی شخص سے پوچھا کہ رت پور یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔ وہ بولا ”زیادہ دور نہیں جتنا اب! اس کھالے سے ساتھ تھ چلے جائیں تو پہلا گاؤں رت پور ہی آئے گا۔ مشکل زیادہ دو میل کا فاصلہ ہوگا۔“

میں نے باولیات سے کہا۔ ”ہیات صاحب! میرا ل ہے کہ ہمیں گناہ خطوں والی کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔“

باولیات میری بات سمجھ گیا۔ اسے اس تجویز پر کوئی راض نہیں تھا۔ ہم نے سلیمان سے کچھ مزید معلومات مل گئیں اور اسے ساتھ لے کر رت پور کی طرف چل پڑے۔

فوج ایک کھتے بعد میں رت پور گاؤں کی ایک تاریک میں گھڑا تھا اور ایک نیم پختہ مکان کے دروازے پر دستک رہا تھا۔ باولیات مجھ سے چند قدم پیچھے دیوار کے ساتھ تھا۔ سلیمان کو ہم گھوڑوں سمیت گاؤں سے باہر ایک یں پر چھوڑ آئے تھے۔ میری تیسری چوٹی دستک پر زبے کی دو سری جانب آہستہ سنائی دی اور کسی ڈری ہوئی کی آواز آنے لگا۔ ”کون ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے رام پانڈے کی جتنی سے ملنا ہے۔“ نسوانی آواز نے پوچھا۔ ”لیکن تم ہو کون؟“

میں نے کہا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم رام پانڈے کی بہن ہو؟“ لیکن کون ہو تم اور کیا کہنا ہو مجھ سے؟“ آواز میں شکوک اور بے رخی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ مٹ لگایا اور مجھے لے لیا۔ ”میں انیسٹر دبار سنگھ ہوں۔ رام پانڈے کے بارے سے بت اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔“

میرے بااٹھو لے لے اثر و لکھا اور چند سیکنڈ بعد

دروازہ کھل گیا۔ ایک اونچی لمبی خوبصورت لڑکی کا آنکھ کوٹھک کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لائیں اس کے قدموں میں رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹھک پر اور دوسرا دروازے کے پت پر تھا۔ کاتے کوٹھک کی طرح اس نے دروازہ بھی ”کھانا“ ہی کھول رکھا تھا اور لگتا تھا کہ میرے من سے ایک بھی غلط بات نکلی تو وہ ”کھانے“ کو اندھا کر دے گی۔

میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ میرا سب انیسٹر دبار نواز ہے۔ ہم تمہارا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ بس دس پندرہ منٹ کی بات ہے۔“ لڑکی شش و پنج میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا ”ہم یہیں کھڑے کھڑے بھی بات کر سکتے ہیں لیکن کلی میں کسی آتے جاتے نہ دیکھ لیا تو پریشانی ہوگی۔“

میرے اس آخری جملے نے فوری اثر کیا اور لڑکی نے سامنے سے ہٹ کر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی۔ قریباً ایک کینال پر یہ اچھا خاصا مکان تھا۔ احاطے میں ہی ایک طرف چند گائے بھیس بندھی تھیں۔ ایک سائبان تلے ٹوٹا پھوٹا فریشر پڑا تھا اور کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والی چند دیگر اشیاء نظر آ رہی تھیں۔ رام پانڈے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ گاؤں میں اس کی زمین ہے اور وہ پولیس سے استعفیٰ دینے کے بعد کھیتی باڑی کر رہا ہے۔ مکان میں دو عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ایک تو شش و پنج کی پڑوسی والی دی خوبصورت لڑکی تھی جس نے دروازہ کھولا تھا، دوسری ایک لمبی چوڑی قوی پہل عورت تھی جو ایک کمرے میں بیٹھ کر سینے کی طرح بھیل کر سوتی ہوئی تھی اور گن دار خراٹے لے رہی تھی۔ یہ لڑکی کی ساس اور رام پانڈے کی ماں تھی۔ اس کا بڑا اور کرخت صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لڑائی بھڑائی میں وہ تنہا ہی ایک دو مردوں پر بھاری ہوتی ہوگی۔

لڑکی اپنی ساس کے پاس سے بہت دے پاؤں مگڑی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ہماری طرف دیکھا، جیسے ہمیں بھی محتاط رہنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ بغیر کوئی آہستہ پیدائے ہم لڑکی کے پیچھے ہی پیچھے ایک بیٹھک نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں رام پانڈے کی ایک دو تصویریں بھی موجود تھیں، ان تصویروں میں وہ باوردی نظر آ رہا تھا۔

لڑکی مجھے گہری نظروں سے دیکھتی رہی پھر جیسے اس نے یقین کر لیا کہ میں ہی انیسٹر دبار سنگھ ہوں۔ وہ بولی۔ ”کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے؟“

میں نے کہا۔ ”ان بچوں کے بارے میں پوچھنا ہے جو رام پانڈے کے متعلق ہمیں ملے ہیں۔“

لڑکی نے بے چینی سے پھلو بدلا۔ ہمیں اندر بلا کر وہ یہ

بات قریباً قریب حلیم کر چکی تھی کہ خطوط لکھنے والی وہ خودی ہے اب صرف رکھی اقرار باقی تھا۔ وہ سنسنائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "مکون سے پڑھ؟"

میں نے بالحد کچھ میں کہا۔ "لی بی! میں چاہتا ہوں کہ ہم تمام ضائع نہ کریں۔ یہ بات تم جانتی ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ خبر تم نے لکھے ہیں۔ اب اس بات پر بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں اور اسی لئے یہاں آیا ہوں۔ یہ مدد اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

گھوم گھٹ کی اوٹ میں چند لمبے بوجھل خاموشی طاری رہی، پھر لڑکی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے لکھا بھی تھا کہ میں اس معاملے سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے آشا تھی کہ آپ مجھ تک پہنچیں اور مجھے اس پکڑ میں کھینچنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن آپ نے مجھے زراش کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں لی بی! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بہت رازداری سے کر رہے ہیں اور ہمیں وجہ دیتے ہیں کہ تمہاری مرضی کے بغیر اس کیس میں تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

وہ گھبرائی آواز میں بولی۔ "اگر ایسا ہو گیا تو میرے لئے آتما ہتیا کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔"

"تم بالکل بے فکر رہو۔" بابو لیاقت نے کہا۔ "سمجھو کہ تم نے ابھی کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر لرزے گھوم گھٹ کی اوٹ سے دلی دلی آواز ابھری۔ "وہ اب کہاں ہے؟" اس کا اشارہ اپنے بچہ کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "وہ بڑی محفوظ جگہ پر ہے۔ آنے والے دنوں میں ہمیں اس سے کوئی خطرو نہیں ہوگا۔ ہم نے اسے تمہارے میں جمع کر رکھا ہے" اور وہاں سے اس کی جان جلد ہی چھوڑنے والی نہیں ہے۔"

یہ جان کر کہ اس کا بچہ گرفتار ہو چکا ہے لڑکی کی بے چینی اچانک ماند پڑ گئی۔ اس نے گھوم گھٹ تھوڑا سا دور سر کیا اور اپنی بڑی بڑی شفاف آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ شکل و صورت سے شری لگتی تھی۔ عمر مشکل بائیس برس رہی ہوگی۔ وہ ایک سابق پولیس انسپکٹر کی بیوی تھی اور نچانے اس پر کیا افاد پڑی تھی کہ وہ ایک حاضر رسوس انسپکٹر (یعنی دربار سنگھ) سے مدد لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اس حوالے سے کریدنا چاہا۔ میرے

سوالات نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہنے لگی۔ "بس جی۔ میرے داغ پر بوجھ تھا۔ میں نے اپنے بچہ کی شریے خانہ بدوش سے ہاتھیں کرتے سن لیا تھا۔ میں باقی کئی کہ نمبر وار فحشٹ کے ذریعے پر ہونے والی واردات میرے بچہ کی ہے۔ بس میں نے پولیس کو بتانا اپنا فرض جانا۔"

میں نے کہا۔ "لی بی! یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن آخر ہم کچھ پولیس والے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب تک کسی عورت کو گھر تک نہ لے جائیں تو وہ اپنے بچہ کے خلاف اس حد تک نہیں جاسکتی۔ تم بتاؤ یا نہ بتاؤ تمہاری صورت بتاتی ہے کہ اس گھر میں تم بہت کچھ بیت چکا ہے۔"

کافی کوشش کر کے چند لمبے منٹ بعد ہم اس عورت اپنے ڈھب پر لانگے کچھ دیر تک سکھیں بھرے اور وہ سے آنسو پونچنے کے بعد اس نے جو درد و آسانی وہ مختصر الفاظ میں یوں کہ

"میرا نام راجا ساہنی ہے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میرے پاس ایک سرکاری گھر کے میں ملازم ہیں۔ فریڈ کوٹ میرے پاس کا ذاتی مکان ہے۔ میرے پاس جس گھر میں کرتے ہیں اس میں ایک لڑکا فریڈر کار بھی ملازم تھا۔ وہ جی کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی کسی کام کے سلسلے میں ہمارے بھی آجاتا تھا۔ ادنیٰ سا شکل صورت والا نوجوان تھا۔"

چپ رہتا تھا لیکن جب بھی بات کرتا تھا بہت بے چارگی میں ان دنوں کالج میں پڑھ رہی تھی اور وہ مجھ میں دیکھی لگا۔ دھیرے دھیرے میں بھی اس سے پریم کرنے لگی۔ کوہارے میل جول کا پتا چل گیا لیکن وہ جانتے تھے کہ نہ اچھا لڑکا ہے اور آئندہ ترقی بھی کرے گا۔ انہوں نے سو اچھا ہوا لڑکی نے انہیں رشتہ و عروہ کی مشکل سے

ہے۔ یہ فریڈر کار پانڈے میرے موجود ہی سب ا رام پانڈے کا چھوٹا بھائی تھا۔ رام پانڈے نے اگر جیوا کسی سے پریم کیا ہے تو وہ یہی اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ بھائیوں کے چچا بچپن میں ہی سوگڑا ہوا ہو گئے تھے۔ اس سو اور کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔ اس نے پانڈے کا سارا پریم اور توجہ فریڈر کے لئے تھی۔ جب

ہے کہ رام پانڈے ایک بہت کثرت مزاج اور بد لگانا ہے لیکن اپنے بھائی کے لئے وہ اتنی ہی نرم اور نرم دل اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے اسے اچھے دلائی تھی اور اپنا رسوخ استعمال کر کے اچھے گھرے کر لیا تھا۔ اسے وشواس تھا کہ وہ ترقی کرے گا اور بنے گا۔

رام پانڈے سے میری ملاقات فریڈر کار سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ جب رام پانڈے بھائی کو نوکر کرانے کے لئے بھاگ دوڑ کر پتا تھا وہ اکثر میرے پاس جی کے لئے ہمارے گھر آتا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے مل کر خوش ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر کڑکھلی کی جگہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ لیکن میرے وہ ہمہ گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے۔ بعد میں جب فریڈر کار کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تو سب انسپکٹر رام پانڈے خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔

ایک طرح سے اس نے اپنے بھائی کے لئے اپنے پریم کا لبدان دیا تھا۔ لیکن یہ لبدان اسے ہمیشہ نہیں ہوا۔ سب انسپکٹر رام پانڈے قدم بڑھا کر پیچھے ہٹنے والے لوگوں میں سے نہیں۔ ایسے لوگ جس چیز کو پسند کر لیتے ہیں اسے اپنانا ان کے لئے زندگی موت کا سوال بن جاتا ہے۔ اپنے جیتنے لادنے بھائی کی خاطر رام پانڈے پیچھے تو ہٹ گیا تھا لیکن اس کے اندر ہر وقت انکارے سکتے رہتے تھے۔ آخر وہ موقع آیا

جب میرے اور فریڈر کے بیاہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ دونوں گھروں کے مصلح مشورے سے پہلے کتنی ہوئی اور پھر بیاہ کے دن مقرر کر دیے گئے۔ میں وہ دن جون مہر نہیں بھول سکتی۔ وہ دسمبر کی چودہ تاریخ تھی۔ میں دلنسی بی بی تھی تھی اور میرے گھر والے میری برات کا انتظار کر رہے تھے۔

رام اور فریڈر یوں تو فریڈ کوٹ ہی میں رہتے تھے لیکن برات گاؤں سے تیار ہو کر آتی تھی۔ یہاں اسی گھر سے فریڈر نے سارا باندھ کر میری ڈولی لینے کے لئے جانا تھا۔ برات تین پر روانہ ہوئی۔ لیکن ایک گھنٹے کا یہ سفر کئی جنم سے بھی لمبا ہو گیا۔ فریڈر چلتی تین کے دروازے میں کھڑا ہو کر باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ اچانک وہ نیچے گر گیا۔ پہلے اس کا سر ایک کھمبے سے ٹکرا ہوا پھر وہ لائن پر گر کر اور درجوں پہنچے اس کے جسم پر سے گزر گئے۔

شما بیوں کی گونج نام کی چیزوں میں بدل گئی۔ فریڈر کے جسم پر شادی کے لباس کی جگہ چٹا کی کڑیاں جھکیں۔ کئی ماہ تک میں سوگ میں ڈوبی آنسو بھائی رہی۔ مجھے لگتا تھا کہ جون اب ایک بے کار شے ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا عزم ہے۔ میرے ذہن میں دھیرے دھیرے کے سے عزم سے بھرنے لگے۔ قریب دو برس بعد میرے لئے سب انسپکٹر رام پانڈے کا رشتہ آیا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اقرار کروں یا انکار۔ لگتا تھا جیسے یہ بیاہ نہیں میرے

جیون کی کتاب میں مجبوراً ایک خانہ بڑی کی جاری ہے۔ ماما پتا کے کئے کئے پر میں نے "ہاں" کہہ دی اور سب انسپکٹر رام پانڈے کی جی بی بن کر اس کے گھر آ گئی۔ میرا مطلب فریڈ کوٹ والے گھر ہے۔

سب انسپکٹر رام پانڈے نے شروع شروع میں مجھ سے بے حد پریم کیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ شراب، عورت، کالم گلوچ، اس نے میری خاطر بہت سی چیزیں چھوڑ دیں۔ ان دنوں وہ کتا تھا۔ رتا! تمہیں باکر میں سے سنسار میں سب کچھ پایا ہے۔ اب کوئی حسرت نہیں ہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ اپنی اصل جون میں آنے لگا۔ بات بے بات بگڑنا شروع ہو گیا۔ تھانے دادوں کی طرح میری حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھنے لگا۔ اگر میں کہیں جاتی تو تھنوں قہقہے کرتا رہتا۔ کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے لئے جو سب سے اذیت ناک بات تھی وہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے فریڈر کار کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ مثلاً میں سب سے پہلے اسے کہاں ملی تھی؟ ہم ایکے میں کتنی بار ملے؟ وہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے یا نہیں؟

میں ان سوالوں سے زچ ہو جاتی تھی اور وہ جان بوجھ کر مجھے زچ کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس کے داغ کا کوئی چچا دھلا ہے۔ میرا اور فریڈر کا پریم باضی کا قصہ بن چکا تھا کہ وہ اب بھی اس کے داغ پر سوار تھا۔ پھر ایک روز میرے بدترین اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔ مجھے پہلی ہی شک پڑنے لگا تھا کہ فریڈر کی موت میں رام پانڈے کا ہاتھ ہے۔ اس رات رام پانڈے نے اپنے منہ سے سب کچھ بک دیا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر سویا تھا۔ آدھی رات کو جھپٹنے چلائے لگا۔ میں نے اسے جھجھوڑ کر بگاڑا۔ سخت سردی میں اس کا چھوٹے سے تر ہو رہا تھا اور آنکھیں چھریاں ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ میں قائل نہیں ہوں۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ کچھ دیر اول فول بک کر وہ پھر بستر پر گر گیا۔ میرا شک و شواس میں بدل چکا تھا کہ فریڈر مرا نہیں اس کی ہتھ کی تھی ہے۔ میں نے اپنے طور پر رام پانڈے کے لئے جیلے والوں سے نو لگائی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت فریڈر چلتی تین سے گرا اس کے قریب صرف رام پانڈے تھا۔ دروازہ بیت الخلا کی اوٹ میں تھا اس لئے ڈبے میں موجود کوئی شخص نہیں دیکھ سکا کہ دروازے پر کیا ہوا ہے۔ فریڈر کے قریب کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کسی شک کی مٹھائش نکل گئی تھی لیکن رام پانڈے کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کا لانا بھائی تھا۔ اس کے

جیون کی کتاب میں مجبوراً ایک خانہ بڑی کی جاری ہے۔ ماما پتا کے کئے کئے پر میں نے "ہاں" کہہ دی اور سب انسپکٹر رام پانڈے کی جی بی بن کر اس کے گھر آ گئی۔ میرا مطلب فریڈ کوٹ والے گھر ہے۔

سب انسپکٹر رام پانڈے نے شروع شروع میں مجھ سے بے حد پریم کیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ شراب، عورت، کالم گلوچ، اس نے میری خاطر بہت سی چیزیں چھوڑ دیں۔ ان دنوں وہ کتا تھا۔ رتا! تمہیں باکر میں سے سنسار میں سب کچھ پایا ہے۔ اب کوئی حسرت نہیں ہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ اپنی اصل جون میں آنے لگا۔ بات بے بات بگڑنا شروع ہو گیا۔ تھانے دادوں کی طرح میری حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھنے لگا۔ اگر میں کہیں جاتی تو تھنوں قہقہے کرتا رہتا۔ کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے لئے جو سب سے اذیت ناک بات تھی وہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے فریڈر کار کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ مثلاً میں سب سے پہلے اسے کہاں ملی تھی؟ ہم ایکے میں کتنی بار ملے؟ وہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے یا نہیں؟

میں ان سوالوں سے زچ ہو جاتی تھی اور وہ جان بوجھ کر مجھے زچ کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس کے داغ کا کوئی چچا دھلا ہے۔ میرا اور فریڈر کا پریم باضی کا قصہ بن چکا تھا کہ وہ اب بھی اس کے داغ پر سوار تھا۔ پھر ایک روز میرے بدترین اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔ مجھے پہلی ہی شک پڑنے لگا تھا کہ فریڈر کی موت میں رام پانڈے کا ہاتھ ہے۔ اس رات رام پانڈے نے اپنے منہ سے سب کچھ بک دیا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر سویا تھا۔ آدھی رات کو جھپٹنے چلائے لگا۔ میں نے اسے جھجھوڑ کر بگاڑا۔ سخت سردی میں اس کا چھوٹے سے تر ہو رہا تھا اور آنکھیں چھریاں ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ میں قائل نہیں ہوں۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ کچھ دیر اول فول بک کر وہ پھر بستر پر گر گیا۔ میرا شک و شواس میں بدل چکا تھا کہ فریڈر مرا نہیں اس کی ہتھ کی تھی ہے۔ میں نے اپنے طور پر رام پانڈے کے لئے جیلے والوں سے نو لگائی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت فریڈر چلتی تین سے گرا اس کے قریب صرف رام پانڈے تھا۔ دروازہ بیت الخلا کی اوٹ میں تھا اس لئے ڈبے میں موجود کوئی شخص نہیں دیکھ سکا کہ دروازے پر کیا ہوا ہے۔ فریڈر کے قریب کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کسی شک کی مٹھائش نکل گئی تھی لیکن رام پانڈے کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کا لانا بھائی تھا۔ اس کے

جیون کی کتاب میں مجبوراً ایک خانہ بڑی کی جاری ہے۔ ماما پتا کے کئے کئے پر میں نے "ہاں" کہہ دی اور سب انسپکٹر رام پانڈے کی جی بی بن کر اس کے گھر آ گئی۔ میرا مطلب فریڈ کوٹ والے گھر ہے۔

سب انسپکٹر رام پانڈے نے شروع شروع میں مجھ سے بے حد پریم کیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ شراب، عورت، کالم گلوچ، اس نے میری خاطر بہت سی چیزیں چھوڑ دیں۔ ان دنوں وہ کتا تھا۔ رتا! تمہیں باکر میں سے سنسار میں سب کچھ پایا ہے۔ اب کوئی حسرت نہیں ہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ اپنی اصل جون میں آنے لگا۔ بات بے بات بگڑنا شروع ہو گیا۔ تھانے دادوں کی طرح میری حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھنے لگا۔ اگر میں کہیں جاتی تو تھنوں قہقہے کرتا رہتا۔ کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے لئے جو سب سے اذیت ناک بات تھی وہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے فریڈر کار کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ مثلاً میں سب سے پہلے اسے کہاں ملی تھی؟ ہم ایکے میں کتنی بار ملے؟ وہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے یا نہیں؟

میں ان سوالوں سے زچ ہو جاتی تھی اور وہ جان بوجھ کر مجھے زچ کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس کے داغ کا کوئی چچا دھلا ہے۔ میرا اور فریڈر کا پریم باضی کا قصہ بن چکا تھا کہ وہ اب بھی اس کے داغ پر سوار تھا۔ پھر ایک روز میرے بدترین اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔ مجھے پہلی ہی شک پڑنے لگا تھا کہ فریڈر کی موت میں رام پانڈے کا ہاتھ ہے۔ اس رات رام پانڈے نے اپنے منہ سے سب کچھ بک دیا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر سویا تھا۔ آدھی رات کو جھپٹنے چلائے لگا۔ میں نے اسے جھجھوڑ کر بگاڑا۔ سخت سردی میں اس کا چھوٹے سے تر ہو رہا تھا اور آنکھیں چھریاں ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ میں قائل نہیں ہوں۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ کچھ دیر اول فول بک کر وہ پھر بستر پر گر گیا۔ میرا شک و شواس میں بدل چکا تھا کہ فریڈر مرا نہیں اس کی ہتھ کی تھی ہے۔ میں نے اپنے طور پر رام پانڈے کے لئے جیلے والوں سے نو لگائی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت فریڈر چلتی تین سے گرا اس کے قریب صرف رام پانڈے تھا۔ دروازہ بیت الخلا کی اوٹ میں تھا اس لئے ڈبے میں موجود کوئی شخص نہیں دیکھ سکا کہ دروازے پر کیا ہوا ہے۔ فریڈر کے قریب کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کسی شک کی مٹھائش نکل گئی تھی لیکن رام پانڈے کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کا لانا بھائی تھا۔ اس کے

جیون کی کتاب میں مجبوراً ایک خانہ بڑی کی جاری ہے۔ ماما پتا کے کئے کئے پر میں نے "ہاں" کہہ دی اور سب انسپکٹر رام پانڈے کی جی بی بن کر اس کے گھر آ گئی۔ میرا مطلب فریڈ کوٹ والے گھر ہے۔

سب انسپکٹر رام پانڈے نے شروع شروع میں مجھ سے بے حد پریم کیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ شراب، عورت، کالم گلوچ، اس نے میری خاطر بہت سی چیزیں چھوڑ دیں۔ ان دنوں وہ کتا تھا۔ رتا! تمہیں باکر میں سے سنسار میں سب کچھ پایا ہے۔ اب کوئی حسرت نہیں ہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ اپنی اصل جون میں آنے لگا۔ بات بے بات بگڑنا شروع ہو گیا۔ تھانے دادوں کی طرح میری حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھنے لگا۔ اگر میں کہیں جاتی تو تھنوں قہقہے کرتا رہتا۔ کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے لئے جو سب سے اذیت ناک بات تھی وہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے فریڈر کار کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ مثلاً میں سب سے پہلے اسے کہاں ملی تھی؟ ہم ایکے میں کتنی بار ملے؟ وہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے یا نہیں؟

میں ان سوالوں سے زچ ہو جاتی تھی اور وہ جان بوجھ کر مجھے زچ کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس کے داغ کا کوئی چچا دھلا ہے۔ میرا اور فریڈر کا پریم باضی کا قصہ بن چکا تھا کہ وہ اب بھی اس کے داغ پر سوار تھا۔ پھر ایک روز میرے بدترین اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔ مجھے پہلی ہی شک پڑنے لگا تھا کہ فریڈر کی موت میں رام پانڈے کا ہاتھ ہے۔ اس رات رام پانڈے نے اپنے منہ سے سب کچھ بک دیا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر سویا تھا۔ آدھی رات کو جھپٹنے چلائے لگا۔ میں نے اسے جھجھوڑ کر بگاڑا۔ سخت سردی میں اس کا چھوٹے سے تر ہو رہا تھا اور آنکھیں چھریاں ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ میں قائل نہیں ہوں۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ میں نے فریڈر کی ہتھ نہیں کی۔ کچھ دیر اول فول بک کر وہ پھر بستر پر گر گیا۔ میرا شک و شواس میں بدل چکا تھا کہ فریڈر مرا نہیں اس کی ہتھ کی تھی ہے۔ میں نے اپنے طور پر رام پانڈے کے لئے جیلے والوں سے نو لگائی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت فریڈر چلتی تین سے گرا اس کے قریب صرف رام پانڈے تھا۔ دروازہ بیت الخلا کی اوٹ میں تھا اس لئے ڈبے میں موجود کوئی شخص نہیں دیکھ سکا کہ دروازے پر کیا ہوا ہے۔ فریڈر کے قریب کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کسی شک کی مٹھائش نکل گئی تھی لیکن رام پانڈے کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کا لانا بھائی تھا۔ اس کے

مرسرے کے بھول دیکھنے کے لئے وہ کئی مہینوں سے بے قرار تھا۔ اپنے دلہا بے بھائی کو وہ کیوں کر موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ پولیس نے اس واقعے کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔

رات نے روشنی دوپٹے کے نیچے سے اپنی ہستی آنکھیں صاف کیں اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی "انٹیکسٹر صاحب! جو کچھ میرے سن میں تھا وہ ان میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ پچھلے پانچ چھ مہینوں میں مجھے پورا دشواں ہو چکا ہے کہ زبردگر انہیں تھا" اسے چلتی نہیں سے دھکا دیا گیا تھا۔ اور دھکا دینے والا بھی رام پانڈے تھا۔ جیسے جیسے یہ دشواں کا ہوا ہے، میرے اندر رام پانڈے کے خلاف نفرت بھی بڑھتی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم جتنی جتنی کے تعلقات جو پہلے ہی خراب تھے، اب اور خراب ہو گئے ہیں۔ پہلے تو رام پانڈے گالی گلوچ پر بس کر دیتا تھا، اب مارنے پہنچنے بھی لگا ہے۔ نوکری چھوٹ جانے کے بعد وہ مجھے میاں گاؤں میں لے آیا ہے۔ ادھر تو اسے دو گئے نوکسے والا بھی کوئی نہیں۔ ایک ساں ہے، وہ بیٹے سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس گھر میں میری چوکیداری کرے اور بیٹی مجھ پر حکم چلاتی رہے۔ میرے نام پتا اور بھائی بہنوں کا اس گھر میں آنا جانا میرے بچے نے چار پانچ ماہ پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ مجھے بھی ان کے پاس جانے کی کیا نہیں ہے۔ یوں یہ گھر میرے لئے نہیں بن کر رہ گیا ہے۔ سوچتی ہوں کسی دن ایسے ہی گھٹ کر مر جاؤں گی اور نہ مری تو رام پانڈے کسی بھانے مار دے گا۔ اس کی آنکھوں کی نفرت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ لگتا ہے، وہ کسی ایسے جانور کی آنکھیں ہیں جو مجھے مارنے کے لئے موقع ڈھونڈ رہا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے رتنا کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ چنگیوں سے رونے لگی۔ روشنی کپڑوں میں لپٹا ہوا کوئلہ بدن جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ مت، ہن! اپنے جتنی کے خلاف اطلاع دے کہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ اب وہ قانون کے شکنجے سے بچ سکیں گے گا۔ اس نے عشرت فارم میں جو کچھ کیا ہے وہ اسے پانچ چھ برس کی جیل کرانے کے لئے کافی ہے، اور مجھے آشا ہے کہ اسی دور اور بھی بہت کچھ ہو گا۔ اس کے علاوہ اگر اس پر بھائی کے قتل کا الزام بھی ثابت ہو گیا تو جہاں اس کا عقدر ہے۔"

وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں آپ سے پھر براہِ تنہا کرتی ہوں کہ اس سارے معاملے میں میرا نام نہ

آئے۔ ورنہ میں آقا بھتیجا پر مجبور ہو جاؤں گی۔ آپ جانتے نہیں یہ رام پانڈے کتنا کینہ پرور ہے۔ وہ جیل میں رہ کر بھی مجھے انتقام کا نشانہ بنانے سے باز نہیں آئے گا۔ اور وہ کچھ نہ کرے تو اس کی نامی میرے جیون کو موت سے بدتر بنانے کے لئے کافی ہے۔ بڑی سخت دل عورت ہے وہ۔ مردوں سے مردوں کی طرح لڑائی جھگڑے کرتی ہے۔ رات کو اپنے سرہانے کے نیچے کپاں رکھ کر سوتی ہے۔"

بابو لیاقت اور میں نے ایک بار پھر رتنا سہانی کی دھار سے بندھائی۔ کچھ دیر اس سے رام پانڈے کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ پھر اسے تسلی بخشی دے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے گھوڑے ایک بار پھر چاندنی کے سنہری سمندر میں بہتے واپس فرید کوٹ کی طرف جا رہے تھے۔ گرد آلود راستے پر گھوڑوں کے پاؤں بڑتے تھے تو ایک سنہری غبار سا اطراف میں پھیل جاتا تھا۔ چاند چھیلے دانیوں کی جانب تھا اب واپسی پر ہمیں ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ اس کی کرنیں اونچے نیچے کھینچ کر جگمگاتی ہوئی دور کسی گاؤں کے درو دیوار کو پھوڑی تھیں گاؤں جہاں زندگی کے حد خاموشی سے سوری تھی اس راز کی طرح جو عشرت فارم کی چار دیواری میں دھن تھکی اڑ رہے تھے۔ جو خواب تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کشمکش جہاں سے بھی شروع ہوتی تھی ایک مقام پر آکر ٹک جاتی تھی۔ کھوج کا ہر راستہ ایک سیاہ دیوار تک پہنچ کر مسدود ہو جاتا تھا۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ رات گیارہ بجے تک ٹک عشرت فارم پر موجود تھا۔ اس کے علاوہ مصدر دولت، منہوار عشرت اور پچھو بھی فارم پر تھے (چوکیدار کا کھانگہ بھی موجود تھا۔ لیکن لاش کی صورت میں) رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس کے بعد صرف پچھو وہاں رہ گئی تھی باقی تینوں افراد کو سمیت غائب ہو گئے تھے یا کوئی گئے تھے۔

پروگرام کے مطابق بابو لیاقت کا سماجی سلیان توفیر کوٹ چلا گیا تاہم ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ہم قربا گیارہ بجے رت پور سے روانہ ہوئے تھے۔ کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی رکھوں کے اندر سفر کرتے ہوئے ہم نے رات پچھلے پھر تین بجے واپس ڈاک بچلے تک پہنچ گئے۔ ڈاک بچلے کا بیابان ٹھنڈر چاندنی میں بڑا سراں نظر آ رہا تھا۔ باہر سے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ میاں بندہ میں افراد رہائش رکھے ہوئے ہیں۔ جو بھی ہم ایک مخصوص مقام پر پہنچے پھرے پر موجود دونوں افراد سامنے آ گئے۔ ان کے چہرے حسب معمول

پچھو میں چپے تھے۔ ہمارے چہروں پر ہنس کی روشنی ڈالنے کے بعد انہوں نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم نے گھوڑے ان کے حوالے کر دیے۔

خانے میں داخل ہوتے ہی ہمارا استقبال ہوا سنگھ نے کیا۔ باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ ہوا سنگھ کے علاوہ زریں گل جاگ رہا تھا۔ ہوا کوئی ٹوکی پچھو۔ وہ دونوں راغن والی کو غری میں آنے کی بوریاں اور دال چاول والے کسٹروں کے درمیان بیٹھے تھے۔ زریں گل نے ایک بوریا سے ٹیک لگا رکھی تھی اور بڑی بے تکلفی سے اشادوں کنایوں میں پچھو سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر اپنا منہ صاف کر رہی تھی۔ کوشش کرتا تھا۔ پچھو کبھی کبھار جوابی اشارے سے کسی بات کا جواب دے دیتی تھی۔ آج پہلی دفعہ میں نے پچھو کو نارمل محسوس کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی عزت کا ہتھیار اسیوں میں جکڑا کال کو غری میں پڑا تھا اور اسے دیکھ کر پچھو کو یقین آیا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھوں اپنے کئے کی سزا پائے گا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے ایک پھونکی شکل بنا کر زریں گل کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنی شہادت کی دونوں انگلیوں سے دو دائرے بنا کر آنکھوں سے لگاتی اور دائیں بائیں حرکت دینے لگتی جیسے پتلی چلا رہی ہو۔ زریں گل بھی زور زور سے اقرار میں سرہلانے لگا۔ کبھی اس کے چہرے سے الجھن کے آثار ہو رہے ہوا جاتے۔

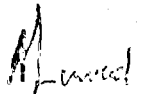
ہم بھی ان دونوں کے پاس جا بیٹھے۔ زریں گل نے کہا۔ "جہانی صاحب! ام نے اس کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ اس کا ہاتھ کچھ کچھ امدادی سمجھ میں آئے لگا ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ یہ ام کو فارم کی واردات کے بارے میں کچھ بتاتا چاہتا ہے۔ یہ بار بار کسی بہت موٹے ٹھنڈے ہاتھ پر کرتا ہے جس نے ٹیک ٹیک بھی لگا رکھا تھا۔ یا پھر یہ کہ۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی اور اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو مونڈے دے کر کچھ سوچنے لگا۔

ہوا سنگھ نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "یار جریں گل! تم کھٹے ہو گئے ہیں تجھے ختم ہمارے ہوئے" اب صبح ہونے والی ہے۔ کچھ دیر سو جا، باقی سویرے دیکھا جائے گا۔"

زریں گل ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔ ہوا سنگھ کچھ اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت دیر تک ہمارے کان کھائے گا اور جانا چاہے گا کہ ہمارا دورہ کیسا رہا ہے۔ لیکن اس نے تو یہ موضوع پچھو تک نہیں تھا۔ نجائے کیوں مجھے میاں کچھ بلا بلا نظر آ رہا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی

میں جو پہلے نہیں تھی۔ میں نے زریں گل سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ پچھو کے ساتھ اشاراتی رابطہ استوار کرنے میں اتنا شرمک تھا کہ میں اسے ڈسٹ نہ کر سکا۔ میں اٹھ کر اس مقام پر چلا آیا جہاں روز سو رہا تھا۔ بابو لیاقت بھی بہت تھکا مائدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ مزید کوئی بات کے بغیر ہم گہری نیند سو گئے۔

میری آنکھ دوبارہ صبح سات بجے کے قریب کھلی۔ ہوا سنگھ کے سوا ابھی کوئی نہیں جاگا تھا۔ مجھے تو لگا کہ وہ رات سو رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہونٹ سرخ و نونی سے سیاہی مائل نظر آتے تھے۔ وہ میرے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ مجھے خشک مگر راکہ شاید اسی نے مجھے فوکا دے کر بچا دیا ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سے ایک سگریٹ لے کر لٹکا دیا اور اپنے ذہن سے غموں کی ایک دھند صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ زریں گل میرے پاؤں کے قریب جوتے پرا خزانے لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بابو لیاقت بھی جوتے خواب تھا۔ ہوا سنگھ نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور غموں کے میں بولا۔ "جہانی صاحب! چار پانچ راتوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت اپنی ماما کا چہرہ گھومتا رہتا ہے۔ بس ایک ہی بات داغ میں رہتی ہے۔ بی بی ایس ایف کے کورس کے سپاہی نے جب میری ماما کے سینے میں سنگھن کھونٹی ہوئی تو ان کے منہ سے کیا نکلا ہو گا۔ وہ کس طرح کڑی ہوں گی اور کیسے اپنے ہی لمبوں میں ڈوب کر دم دیا ہو گا انہوں نے پتا نہیں اپنے آنکھری وقت میں وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔ مجھے دشواں ہے مجھے جوروں یاد کیا ہو گا انہوں نے۔ میرا نام پکارا ہو گا۔ مجھے آواز دی ہو گی۔ ان کو بڑا کھیاں رہتا تھا میرا۔ سب سے چھوٹا بچہ تھا ان کا۔ اور چھوٹے بہت لاڈلے ہوتے ہیں۔ اور۔۔۔ وہ میری بھابھو۔ جو میرے لئے ماما سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس پر کیا قیامت ٹوٹی ہو گی۔ اس کے بہت میں تین باہ کا بچہ تھا۔ وہ باہم تھے دار وہ حرام کا بچہ! اس پر بھوکے گتے کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ کتنا روٹی چلائی ہو گی، کتنے ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے اس نے۔ ذرا وہ نقش اپنے داغ میں لاؤ جہانی صاحب! اس کمرے میں ایک طرف میری ماما کی ٹھون میں ڈوبی ہوئی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف وہ جناور میری بھابھو کی بخت برباد کر رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے جہانی صاحب! آج بھی میری بھابھو کی آواز میرے کانوں میں بچ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے، بڑے تو کہاں ہے۔ بڑے تو کہاں ہے۔"



ہوتا تھک کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے ترجمی نگاہ سے دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ چہرے کی گندی کھال یوں تھی ہوتی تھی جیسے ہلکی سی پمپڑے پھٹ جائے گی۔ مجھے اس کا دودھ کل رات سے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ ”ہوتا تھک! کیا ہے۔ تم میرا مطلب ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آج یہ باتیں کیوں پیمز دی ہیں تم نے؟“

اس نے اپنی آواز کچھ اور دھبی کر دی۔ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جہانی صاحب! تقدیر میرے دشمن کو میرے سامنے لے آئی ہے۔ میں چاہتا ہوں آج اس کا حساب چمکا کر دوں۔“ میں نے دیکھا کہ ان کا ہاتھ میں چمک رہی تھی۔ وہ بے دھیانی میں اس کی دھاری انگلیاں پھیر رہا تھا اور اس کی نگاہیں عین سامنے ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کون ہے تمہارا دشمن۔ کس کی بات کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”جہانی صاحب! آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”وہی سب انسپکٹر تنک رام؟“ میں نے پوچھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”ہاں، وہی انسپکٹر تنک رام۔“

اس کا پورا نام تنک رام پانڈے ہے۔ اور ہم نے اسے اس سامنے والی کوٹھری میں بند کر رکھا ہے۔“

یہ انکشاف سن کر میں سمجھتا ہوں کہ میری نگاہیں بھی ہوتا تھک کی طرح کوٹھری کے دروازے پر جم گئیں۔ چند لمبے ہم دونوں کے درمیان سنسنی خیز خاموشی طاری رہی، پھر میں نے ہونے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم رام پانڈے کی بات کر رہے ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے دیکھا کہ اس کی داہنی آنکھ سے ایک آنسو لڑکھ کر اس کی بوسیدہ داڑھی میں کس گم ہو گیا ہے۔

”تم۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ میں وہ شخص ہے۔“ میں نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

”اب جو بتا رہا ہوں۔“ وہ خوفناک آواز میں بولا۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی اور یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ رام پانڈے کو دیکھ کر ہوتا تھک کی آنکھوں میں نفرت کا آتش فشاں کیوں بھڑک اٹھا تھا۔ میں نے کئی بار یہ بات نوٹ کی تھی کہ رام پانڈے کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ہونے کے چہرے پر ایک خاص تاثر ابھر آتا تھا۔ اس وقت

میں نے کن انکھیں سے دیکھا۔ اس وقت یہ خانے میں ہم دونوں کے علاوہ صرف وہی چار افراد بیدار تھے۔ خود کار رانگھلیں ان کے کندھوں پر تھیں۔ وہ چولے پر شاید چائے رنجو بنا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ اس خانے میں پہلے موجود نہیں تھے۔ ان میں سے دو دھاریاں لہجے میں تھے اور انہوں نے صاف تھری چٹکیاں باندھ رکھی تھیں۔

”لیکن۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا؟“

”آپ کی سامی ٹوکی کی وجہ سے۔ شاید غمال نام ہے اس کا۔“

”غزالہ؟ کیا کیا تھا غزالہ نے؟“

”اس بے چاری نے تو کچھ نہیں کیا۔ مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد ہم بھتیار بچھنے پر مجبور ہو گئے۔“

”کیا مطلب؟“ میرے ذہن میں یکایک اندیشوں کے دیو چمکناڑے لگے۔

وہ بدستور سرگوشی میں بولا۔ ”کل رات آپ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بونی رہی پھر کھاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل گئی۔ کسی ایک کو بھی نہیں بتایا اس نے۔ باہر کھڑے پہرے والوں کو بھی چمکا دئی۔ لیکن یہاں سے ایک فراٹنگ آگے جا کر پکڑی گئی۔ اسے بندے پکڑ لیتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن پکڑنے والے غیر تھے۔ یہ کوئی بڑے کھڑاک قسم کے لوگ ہیں۔ ان کے پاس دو تین جھپٹیں ہیں۔ وائلیس سیٹ ہیں اور ایسا جردت اسٹو ہے جو بڑے امیر کبیر لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ انہوں نے غمال بی بی کو رات سے یہ غمال بنا رکھا ہے۔ بڑے جالم لوگ ہیں، اس کی ٹانگ سے ہم باندھ دیا ہے۔ یہ کنٹرول سے چلنے والا ہم ہے۔ ہمیں کھد دکھایا ہے ایک بندے نے۔ یہ بہ سگریٹ کی ڈبی بتاتا ہے۔ کسے سے بندھا ہوا ہے بی بی کی داہنی ہڈی سے۔ یہاں آتے ہی ان لوگوں نے ہمیں دھکایا کہ اگر بھتیار نہ چھینے تو سب سے پہلے اس ٹوکی کی جان جائے گی۔ جہانی صاحب! سردار لالی کے شیرا تھی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں لیکن مسئلہ غمال بی بی کا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ غمال بی بی کی زندگی آپ کے لئے کتنی قیمتی ہے۔ میں نے سوچا اگر زندگی نہ بھاسکا تو کچھ نہ بچایا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی رانگھلی نیچے جھکی۔ اس کے بعد میرے ساتھیوں نے بھی بھتیار پیچیک دینے۔“

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اتنا اہم واقعہ اتنی خاموشی اور رازداری سے ہو گیا تھا۔ مجھے ایک دم

محسوس ہوا کہ میں ایک اجنبی مقام پر بیٹھا ہوں اور پہلی بار گردن اٹھا کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہوں۔ درحقیقت رات یہاں آتے ہی مجھے کچھ عجیب اور نیا محسوس ہوا تھا۔ یہ خانے سے باہر سے والوں کا اندازہ۔ یہ خانے کے اندر کی خاموشی۔ ہوتا تھک کا بدلا دلا دینہ۔ شاید میں رات کو اس حوالے سے مزید کچھ سوچتا لیکن سخت مکان کے سبب میں بھی بولیافت کی طرح ہنسنے مگر کرتے ہی سو گیا تھا۔ اب صبح بیدار ہوا تھا تو ہوتا تھک نے اپنی باتوں میں اٹھایا تھا۔ میں نے پہلی بار غور سے یہ خانے میں کچھ خواب افراد کو دیکھا۔ سامنے عالی اور زرس گل سمیت وہ سب گمری نیند میں تھے اور دن چڑھ آئے کے باوجود بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے ہوتا تھک سے پوچھا۔ ”انہیں کچھ کھلا دیا گیا ہے؟“

”ہاں۔“ ہوتا تھک کا جواب اثبات میں تھا۔ ”چائے میں کوئی نشہ آور دوا پلا دی گئی ہے۔ وہ چولے کے پاس بیٹھا موٹا سٹور کہہ رہا تھا کہ دوسرے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے۔“

”لیکن زرس گل تو رات بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔“

اسے خبر نہیں کہ یہاں کیا ہوا ہے؟

”نہیں۔ وہ آپ کے جاتے ہی گوجی جھمکے کے ساتھ اٹھ وانی کوٹھری میں چلا گیا تھا اور آپ کے آنے تک اس سے باتیں میں لگا رہا تھا۔ اسے اب بھی کچھ پتا نہیں۔“

”اور اس کا رویہ اور؟“

”وہ بھی دو بے ہتھیاروں کی طرح ان لوگوں نے قبضے میں لے لیا ہے۔ جیسے کل نے اسے اپنے تکیے کے خلاف میں چھپا رکھا تھا۔ میرا چارہ ہے کہ رات سونے تک جیسے کو پتا نہیں چلا تھا کہ وہی اور غائب ہے۔“

”کیا اس نے چائے نہیں پئی تھی؟“

”نہیں۔ منہ میں نسوار رکھی ہوئی تھی اس نے۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہوئی تھی۔ گوجی جھمکو میری طرح ویسے ہی چائے کو منہ نہیں لگائی۔“

”ارحند بانو اور بشاد فیرہ کو بتا ہے کہ کیا ہوا ہے؟“

”نہیں۔“ ہوتا تھک نے جواب دیا۔ ”جیسے کل اور جھمکو کی طرح وہ بھی بے کسم ہیں۔“

میں سخت الجھن میں تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو یہ شک بھی گزرا کہ شاید ہوتا تھک کوئی ڈرامہ لگا رہا ہے، لیکن پھر یہ خیال ذہن سے جھٹکتا پڑا۔ ہوتا تھک اب تک ہر طرح بااقتدار ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”غزالہ کہاں ہے؟“

ہونے نے بتایا۔ ”وہ زنائے حصے میں ارحند اور بشاد کے ساتھ سو رہی ہے۔ سوئی بھی کیا ہوگی، چپ چاپ پڑی۔ آٹو بنا



ری ہوگی۔

بے قراری کی ایک لہری میرے اندر اٹھی۔ میں نے پوچھا۔ "اس سے کوئی نئی تو نہیں کی گئی۔"

بوہا تکہ بولا۔ "میرے سامنے تو اسے کسی نے انگلی تک نہیں لگائی۔ جنگل میں شاید کچھ کچھ بچا بچا ہوئی ہو اس سے اس کے ماتھے پر جوت کا معمولی سا نشان ہے۔"

میں نے کمری سانس لے کر دواڑے تک لگا دی۔ ذہن میں ایک ساتھ کئی نام گونج رہے تھے۔ قادر زماں، شکر شرکا، شیخ عاصم بن ارشد، معلوم نہیں ہمارے دشمنان جرار میں سے کس دشمن نے یہ شب خون مارا تھا اور کس ارادے سے مارا تھا۔ اگر بوہا تکہ نے کہا تھا کہ میرے سونے کے بعد میرا ہنسل خالی کروا گیا ہے تو یقیناً ٹھیک کہا ہوگا اور یقینی بات تھی کہ بابو لیاقت کے دائرہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہوگا۔

ایک ایک میرا ذہن پھر بوہا تکہ کے ہاتھ میں پکڑی کہان اور تکہ رام پانڈے کی طرف چلا گیا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ بوہا تکہ نے یہ کیوں کہا ہے کہ نہ اب ہم تکہ رام سے کچھ پوچھ سکیں گے اور نہ وہ بتائے گا۔ واقعی سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ سب کچھ وہ بولا ہو گیا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والی گزروں میں یہاں کیا ہونے والا ہے۔ امن رہے گا یا لڑائی ہوگی، کون غالب رہے گا اور کون مغلوب، کون مارا جائے گا اور کون مار دے گا؟ بوہا تکہ نے ہنر سمجھا تھا کہ کسی نے ہنگامے کا ڈول بڑے سے پہلے "وہ اپنے دل کی حسرت نکال لے۔ حالات نے اس کے دیرینہ دشمن کو باندھ کر اس کے سامنے ڈال رکھا تھا۔ وہ دشمن اس حالت میں رہنے کے بعد بھی زندہ بچ کر نکل جاتا تو یہ بوہا تکہ کی بہت بڑی بد قسمتی تھی۔ بوہا تکہ نے تیز کر لیا تھا کہ وہ اپنی بد قسمتی کا راستہ مسدود کر دے گا۔ اس کی آنکھوں میں جتنی پنک تھی اور کہان کے دستے پر گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ معلوم نہیں اس نے یہ کہان نہ خانے کی سخت تلاش میں کیوں کر بچائی تھی۔ مجھے لگتا رہا تھا جیسے مجھ سے ہتھکڑی کرتے ہوئے بھی بوہا تکہ کی تمام تر توجہ اس بند دواڑے کی طرف رہی ہے جس کے پیچھے تکہ رام بندھا رہا تھا۔

میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لئے کہا "تمہارے خیال میں کتنے بندے ہیں یہاں؟"

"پانچ" وہ خانے میں ہیں۔ کم از کم پچیس باہر ہوں گے۔ سب کے پاس بڑی جبر دست رانٹلیں ہیں۔ انہوں نے چاروں طرف سے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ ان کے پاس تین

چھبیس چھبیس۔ یہ بہت بڑی بڑی چھبیس ہیں۔ دو چھبیس تو بیچے جنہر کی مہاڑیوں میں کھڑی کھڑی ہیں گئی ہیں۔ ایک دھاتی بیچے کے قریب دواڑے کی چابی تھی۔

"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی بوہا تکہ۔ اگر وہ لوگ ہمیں پوری طرح بے بس کر چکے ہیں تو اب کس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ باہر گھات لگائے کیوں بیٹھے ہیں؟"

بوہا بولا۔ "میرا دھار ہے جی کہ یہ لوگ آپ کو اور غمالہ لی لی کی گھاس کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح آپ کو اور غمالہ لی لی کو پچھانتا نہیں" اور نہ یہ جاننا ہی رکھتا ہے کہ آپ کو پکڑنے کے بعد آپ سے کیا سلوک کرنا ہے۔ اب وہ لوگ اپنے کسی جتنے دار یا سردار کو لینے گئے ہیں تاکہ وہ اگر کوئی فیصلہ کر سکے۔" میں نے ایک بار پھر دھیان سے ان افراد کو دیکھا جو چلے کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے وہ شکر شرکا کے ساتھی نہیں لگے۔ نہ ہی ان میں سے کسی کو میں نے قادر زماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ویسے بھی شکر اور قادر زماں کے قریب تمام باتوں کے مجھے پچھانتے تھے۔ اپنا کچھ ذہن میں آیا۔ کہیں یہ لوگ شیخ عاصم بن ارشد کے ہرکارے نہ ہوں۔ ان کی جدید و ترقی رانٹلیں "گواہ" تھیں کہ ان کا تعلق کسی معمولی شخص سے نہیں۔ اور پھر وہ زبردست چھبیس جن کا ذکر بوہا تکہ کر رہا تھا۔ میرا دھیان آپوں آپ شیخ عاصم بن ارشد کی طرف جانے لگا۔

بوہا تکہ کی آواز نے مجھے خیال سے جھٹکایا۔ اس نے اپنا دھاتا ہاتھ میری طرف پھیلا رکھا تھا۔ بڑے لمبیر اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "جہانی صاحب! کوٹھری کی چابی مجھے دے دیں۔"

"نہ اسے قتل کرنا چاہیے ہو؟"

"ہاں"

"اگر میں انکار کروں؟"

مجھے دھڑاس ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کس کی ہتھیار کرتے جا رہا ہوں اور کیوں۔" بوہا تکہ نے یہ بات غیر معمولی لہجے میں غیر معمولی اعتماد سے کہی تھی۔ اور اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے ایڑیا میں داخل ہونے کے بعد اب تک رام پانڈے کے بارے میں جو کچھ جانتا اور محسوس کیا تھا اسے ایک قہرے میں سموا جاتا تو میں تھا۔ وہ ایک ایسا زندہ تاجس نے قانون کی روڈی پن رکھی تھی اور جس کے منہ کو بے بس لوگوں کی عزت و

تہذیب کا خون لگا ہوا تھا۔" بوہا تکہ اور اس کے گھرانے کی رودادی کچھ کم کر رہے تھے۔ جی اب وہ اور داستانیں بھی تکہ رام کے نامہ اعمال میں خوف سیاہ چمکنے لگی تھیں۔ ایک داستان مختصر تھی اور دوسری طویل۔ مختصر داستان کو کئی چھبیس کی جتنی تھی تکہ رام پانڈے نے محنت قائم کی چار دیواری میں بے آہد کیا۔ طویل داستان رتنا ساتھی کی جتنی بنے حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے جیتے بھائی کی جان تک سے کھیل گیا تھا۔ اس نے اپنے لاڈلے بھائی کو اس وقت قتل کیا جب وہ دھما دھما اپنی محبوبہ کو گایا جے جا رہا تھا۔ بھائی کو قتل کر کے تکہ رام نے رتنا ساتھی سے شادی کی۔ لیکن پھر نفرت کا زہر پھیلنا کر اس "آزادی جی رشتے" کو بھی قتل کر ڈالا۔ اور اب رتنا ساتھی اس کی چار دیواری میں ایک زر خرید لوٹری کی زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ تو داستانیں تھیں۔ نجانے ایسی کتنی طویل اور مختصر داستانیں تکہ رام کے نامہ اعمال میں درج تھیں۔ اگر بوہا تکہ اسے قتل کرنا چاہتا تھا تو یہ بھی "مکافات عمل" تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ ان حالات میں اور اس جگہ تکہ رام کو جنم واصل کیا جانا مناسب ہے یا نہیں۔ بوہا تکہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کی یہ مہم جوئی نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ میں بوہا تکہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر ایک دم مجھے خاموش ہونا پڑا۔ وہ خانے سے باہر کچھ فاصلے پر جب کی آواز سنائی دی تھی۔ میرے ساتھ ہی بوہا تکہ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑے غور سے یہ ذوقی ابھرنی آواز سننے لگا۔ اپنا کچھ اس کے چہرے کی بیانی کیفیت عروج پر پہنچ گئی۔ وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ "جہانی صاحب! میرا دھار ہے۔ وہ لوگ آگئے ہیں۔ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو شاید بہت عرصے تک پچھتانا پڑے۔ آپ مجھے کوٹھری کی چابی دے دیں۔"

نجانے کیا بات نظر آئی تھی بوہا تکہ کی نمناک آنکھوں میں کہ میرا ہاتھ خود بخود گھیس کی اندرونی جپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے چابی نکالی اور بوہا تکہ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں جانتا تھا یہ چابی نہیں ہے۔ سب انجینئر تکہ رام کی موت کا پروانہ ہے جو میں بونے کے ہاتھ میں تھا رہا ہوں۔ پروانہ جاری ہوتے ہی تکہ رام اور اس کی موت کے درمیان آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی تھی۔

بوہا تکہ نے کن انجینئروں سے ان بھانوں کی طرف دیکھا جو چلے کے قریب بیٹھے خانے کی چکیاں لے رہے تھے۔ پھر چمکدار کہان تبند میں آڑی اور مجھ کو ٹھوکر لگی اور دواڑے کی طرف بڑھ گیا۔ بڑی احتیاط لیکن تیزی سے اس

نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اندر ٹھس گیا۔ اندر مچھتی سی اس نے دروازے کو کھڑی لگائی۔ چند لمحے بعد اندر سے دھچکا دھچکی کی آوازیں آئیں۔ پھر تکہ رام پانڈے کی دلدوز چیخوں سے کوٹھری گونج اٹھی۔ وہ یوں ڈکرا رہا تھا جیسے اپنا کچھ بے شمار زہر لے لے سانپ اس سے بٹ گئے ہیں اور جسم کے ہر حصے پر ڈنک رسید کر رہے ہیں۔ کوٹھری میں کراما پو تو چڑھوں کے پاس بیٹھے شلوا قیاس والے دو افراد رانٹلیں تمام کر لکے۔ "کون ہے۔ کون ہے یہاں۔" مونا سنا رہا تھا۔

میں اپنی جگہ لا تھقل بیٹھا تھا۔ مونے نے کوٹھری کے چوٹی دروازے پر ٹانگ چلائی۔ مختصر لیکن بھاری بھر کم دروازہ اس سے مٹ نہیں ہوا۔ اندر تکہ رام سخت مصیبت میں تھا۔ مونے نے چوٹ کے ساتھ کھانکا لگا کر ۳۳۲ رانٹل کا ترچھا برست دروازے کے بالائی حصے پر مارا۔ زبردست دھماکوں سے وہ خانہ گونج اٹھا۔ دھوئیں کے ساتھ ہی بارود کی ملک بوجھاؤں طرف پھیل گئی۔ دروازے کا ایک بالائی تختہ ٹوٹ کر ٹھس گیا تھا۔ فریہ اندام شخص نے غلامی ہاتھ ڈال کر کھڑی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک خوفناک منظر نظر آیا۔ کوٹھری کے پیچھے فرش پر تکہ رام کا خونچکان جسم پڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں کرناک انداز میں مڑے ہوئے تھے۔ بوہا تکہ کے ہاتھ میں کہان تھی اور وہ کہان کا خون آلود پھل اپنی دھوئی کے پلو سے پوچھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی دھوئی اور قیاس پر خون کے بے شمار جھینے ہیں۔ فریہ اندام شخص رانٹل آتے ہوئے آگے بڑھا اور ٹال بوہا تکہ کی کپٹی سے لگا دی۔ بوہا تکہ کا سکون و اطمینان دینی تھا۔ اس نے بڑے عاصم سے انداز میں کہان فرش پر پھینک دی۔ مجھے دوسرے رانٹل سے بردار نے جھک کر اٹھالیا۔ بوہا تکہ نے منہ پھیر کر دواڑوں سے "پرچ" کی آواز نکالی اور تکہ رام پر ٹھوک دیا۔ بے حد باغیانہ انداز تھا اس کچھ میں یوں لگا جیسے وہ صرف تکہ رام پانڈے پر نہیں خالصتاً اس کے ہر مخالف کی لاش پر ٹھوک رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہر اس نا انصافی پر ٹھوک رہا ہے جو آزادی کے متوالے سکھوں سے روا رکھی جا رہی ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر تکہ رام کو دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ اس کے جسم پر زخم کے کم و بیش پچیس زخم تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا "بوہا" نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اندھا دھند وار کئے ہیں۔ اس کی ناف سے نیچے تا غلوں کے درمیان بھی زخم تھے اور یہاں سے اٹنے والے خون نے اس کے سرخ رنگی تبند کو سرخ تر کر رکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے تکہ رام

کے نومند جسم نے چند شہید جھلکے کھائے اور بالکل ساکت ہو گیا۔

اتنا ہنگامہ ہونے کے باوجود خانے میں موجود اکثر افراد سوئے رہے تھے۔ صرف ذہیں گل اور بوٹا سنگھ کا ایک ساکھی بیدار ہوئے تھے اور ہفتوں کی طرح نہ چماڑے کو غمری میں تلاش کا منظر دیکھ رہے تھے۔ تلک رام کے جسم پر وہ بندھنیں ابھی موجود تھیں جن میں اسے پانچ سو روز پہلے جکڑا گیا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ جب وہ کھلے سے اغوا ہوا اس کے ہاتھ پشت پر بندھے گئے تھے اور منہ میں کپڑا غوثنا گیا تھا۔ اب اس کے ہاتھ ذرا اچھے سامنے کی طرف بندھے تھے اور منہ میں کپڑا بھی نہیں تھا۔ بوٹا سنگھ نے ایک بندھے ہوئے شخص کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، لیکن ایسا اس نے بزدلی کے سبب نہیں مجبوری کے تحت کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ تلک رام کو آزاد کر کے اس سے دو بدو مقابلہ کرتا۔ اور وہ اس قابل تھا کہ پھر بھی اس کو جہنم داخل کر سکتا۔ میں اب اسے کچھ کچھ جانتے لگتا تھا۔ وہ بہت گمراہ شخص تھا اور بے حد غیر معمولی بھی۔

بوٹا سنگھ سے بلک کر میری نگاہ ایک بار پھر تلک رام پانڈے کی خونچکاں لاش پر جم گئی۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوا کہ میرا کیا ہوا ایک وعدہ، اتنے میری کوشش کے کتنی جلدی ایفا ہوا ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے میں نے رت پور کے ایک مکان میں رہتا سامنی سے اس کی غمناک کمائی سنی تھی اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے شیطان صفت "چی" کو قتل کر دوں گا۔ دلو اس کا وعدہ کرتے وقت میرے ذہن میں اس "سزا" کے لئے کوئی واضح پلان نہیں تھا۔ صرف ایک وعدہ تھا جو فوری ضرورت کے تحت کرنا پڑا تھا۔ اب یہ وعدہ پورا ہو چکا تھا۔ وہ دیکھتی ہوئی ذخیرہ اعلیٰ ہوا سنگھ کے ہاتھوں ٹوٹ چکی تھی جس نے اس کو مل بدن کو سر تاپا بکڑ رکھا تھا۔ رہتا سامنی تلک رام پانڈے کے خوف سے پیشے کے لئے آزاد ہو چکی تھی۔

جب کی گھون گھون اب خانے سے بالکل نزدیک پہنچ کر ختم ہوتی تھی۔ چند لمحوں بعد ہم نے ڈاک بنگلے کے فرش پر ہماری قدموں کی آوازیں سنیں۔ خانے میں موجود تمام مسلح افراد پوری طرح جکڑن ہو گئے تھے۔ کم از کم چار راتھوں کے چیل ہماری طرف اٹھے ہوئے تھے۔ فریہ اندام شخص نے کڑک کر ہمیں "بڑا زاپ" کا حکم دیا۔ ہم نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ پانچوں مسلح افراد بوٹا سنگھ کو بڑی جرات سے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوٹے جیسا خفیہ و زار چہرہ بھی کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ یقین

کرنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے بھی کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

میں ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔ دو مسلح افراد باہر چلے گئے اور تین ہمارے عقب میں رہے۔ ہمیں ایک ایک کر کے باہر نکالا گیا۔ خانے سے باہر دھن کی روشنی چمک چکی تھی۔ نئے دن کا سورج ابھی اُبھی اُبھی نمودار ہوا تھا اور اس کی روشنی کرنیں درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی تھیں۔ میری نگاہ اس جگہ پر پڑی جو ابھی ابھی یہاں ٹکڑی تھی۔ جیسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ اس میں کون سیساں بچھا ہو گا۔ یہ شیخ عاصم بن ارشد کی جگہ تھی اور وہ بڑے اہمیتان سے جگہ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر شخص تھا اور عقب میں کم و بیش دس مسلح افراد۔

میں اپنی جگہ گم گم کھڑا ہو گیا۔ گھوڑے کے فوامی پڑاؤ میں شخص کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد نے ابھی میرا چہرہ نہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ دعویٰ واپس کیا ہے۔ یہ بات ذہن میں آئی نہیں سکتی تھی کہ جو شخص پچھلے چار پانچ برس سے میری تلاش میں ہے اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود اپنی کوشش سے باز نہیں آیا وہ کامیابی سے اس قدر نزدیک پہنچ کر باز آجائے گا۔ تاہم ایٹھ چھوڑنے کے بعد مجھے ہر دم محسوس ہوتا رہا تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد کسی بجلی ہوئی روح کی طرح میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے اور اب یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا تھا۔

میرے ارد گرد بہت سے دشمن چکرارہے تھے لیکن شیخ عاصم اس لحاظ سے خطرناک ترین تھا کہ اسے صرف میری "جان" درکار تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے بمون سکتا تھا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ میں مر گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ اس کے برعکس باقی تمام خائنیں میری فوری موت کا رنگ نہیں لے سکتے تھے۔ انہیں یہ یقین تھی کہ میں گمشدہ ترک کے ٹھکانے سے آگاہ ہوں اور انہیں وہاں تک پہنچا سکتا ہوں اور اگر پہنچا نہیں سکتا تو ایسی معلومات ضرور دے سکتا ہوں جو مقدمہ کے حصول میں مددگار ثابت ہوں۔

شیخ عاصم بن ارشد نے اپنا وزن ایک ہانگ پر منتقل کیا اور بڑے تعینک آہستہ انداز میں مجھے گھورا پھر اعترافی میں بولا۔ "انسان اپنی موت سے کمال تک بھاگ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "پانچ سال پہلے یہی بات میں نے خیرے بد کردار بھائی سے کہی تھی، لیکن اس نے نہیں مانی تھی۔ اپنے گرو شخص جیسے گزرتن کو بت کر لیا تھا اور ایلٹ پروف گاڑی میں بیٹھ کر سوچتا تھا کہ موت اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔"

شیخ عاصم فرمایا۔ "تیری زبان بہت چلتی ہے۔ میں سب سے پہلے تیری اس زبان کو چب کر اڑاؤں گا۔" اس نے زمین پر ٹھوکر مارنا شروع کر دیا۔ لڑنے کی کوشش کی۔ پھر شخص سے غائب ہو کر نکلا۔ "اس کی گولی آگے نہ بڑھے۔"

شخص نے یہی سوال اردو میں فریہ اندام شخص سے پوچھا "اس نے بتایا کہ اندر چار لڑکیاں موجود ہیں۔ آپ خود نیچے جا کر ملاحظہ کریں۔"

شخص نے فریہ اندام شخص کے ساتھ خانے میں چلا گیا۔ اس دوران کم و بیش دس مزید افراد درختوں کی اوٹ سے نکل کر موٹے پر چڑھ گئے۔ وہ سب کے سب مجھے بوئے بدعاش اور قاتل نظر آتے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ بے خولی کی مرضی تھی۔ یہ لوگ رات بھر اس ڈاک بنگلے کی چوکیداری کرتے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد شخص نے فرال کو بالوں سے کھینچا ہوا پار لے آیا۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر خود کو شخص کی آہنی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پر چوٹ کا نشان غاصا واضح تھا۔ فرال کے بے چارے کو دیکھ کر اچانک میرا خون کھول اٹھا۔ میری آنکھوں کی پوروں میں وہی سنسنی بھاگ اُٹھی جو مجھے ہر خطبے سے بے نیاز کرتی تھی، اور میرے جسم میں ایک ایسی آگ بھڑکائی تھی جس سے میرا دواں دواں دھبہ اُٹھتا تھا۔ ڈاک بنگلے کی غلٹلے میزبوں پر فرال کھڑکی۔ شخص اسے قریب کھینچا ہوا باجپ تک لایا۔ اس بد بخت کو کچھ معلوم نہیں تھا، وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ فرال کو ہاں تکلیف پہنچا کر اپنی موت پر فخر تصدیق کر رہا تھا۔ فرال میرے لئے کیا ہے؟ یہ صرف مجھے معلوم تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ فرال ابھی نہیں جانتی تھی۔ میری ساری بے لونی و سرور مری اپنی جگہ کین میزے والے کے نمایاں خانوں میں اس کے لئے جو محبت و حرارت تھی وہ کسی کے تصور میں بھی نہ آسکتی تھی۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ میری لڑکھنچے جانے کے عوض فرال کو ایک کانٹا چھیننے کی تکلیف ہو گئی کہ اسے بالوں سے کھینچا جائے اور زمین پر لٹا دیا جائے۔

شیخ عاصم نے فرال کو خونخوار نظروں سے گھورا پھر اس کی نگاہ بوٹا سنگھ کے خون آلود کپڑوں پر پڑی۔ اس نے شخص سے اس بارے میں پوچھا۔ شخص نے بتایا کہ یہ خانے میں ایک لاش پڑی ہے اور پتا چلا ہے کہ یہ قتل اسی شخص نے کیا ہے۔

شیخ عاصم نے بھی بوٹا سنگھ کو حیران نظروں سے دیکھا۔ مجھے یقین نہ کر پاتا ہوں کہ بوٹا سنگھ جیسا شخص قتل کر سکتا ہے۔ شخص نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مرنے والا کوئی مقامی شخص ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا کوئی ذاتی مسئلہ ہے۔"

اس یو صوبہ پر کچھ در شیخ عاصم اردو شخص میں کھڑے پھر ہوئی پھر شخص نے بوٹا سنگھ کو ایک جانب لے گیا اور پوچھا کچھ والے انداز میں اس سے باتیں کر رہا۔ اسی دوران وہ خانے میں موجود باقی افراد کو بھی باہر نکال لیا گیا۔ ان میں بوٹا سنگھ کے ساتھیوں کے علاوہ "سائیں عالی" بابو لیاقت، ارجمند بانو، رشا، جھمکو اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ وہ سب ابھی ابھی بیدار ہوئے تھے اور حواس بانت نظروں سے ارد گرد کا جہیز سے لائق اور بے خبر نظر آ رہا تھا۔ وہ گریبان میں ہاتھ ڈال کر بار بار اپنا سینہ کھینچا تھا اور جہانیاں لینے لگتا تھا۔ ابھی وہ کسی رات نقل بردار کو دیکھ کر ناقابل فہم اشارے کرتے لگتا۔ ارجمند بانو کا چہرہ زرد تھا اور وہ خواب آور دوا کے زیر اثر یوں جھوم رہی تھی جیسے ابھی گڑبڑے کی۔ بابو لیاقت نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

شیخ عاصم بن ارشد سے کھڑے پھر کرنے کے بعد شخص نے با آواز بلند درشت لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں سے ہمیں کچھ لینا رہا نہیں ہے۔ تم واپس کھنڈر میں جا سکتے ہو۔ لیکن اگر کسی نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی یا ہمارے جانے کے بعد پولیس کو اطلاع دی تو اس کا انجام بہت دردناک ہوگا۔"

شخص کا فقرہ ختم ہوتے ہوئے دو رات نقل بردار میری طرف بڑھے اور مجھے رات نقل کی نال سے دھکیلے ہوئے فرال کے پاس لے آئے۔ شخص گرجا۔ "پانی سب لوگ واپس جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے رات نقل کا رخ موڑا اور گولی چلا دی۔ "ریٹ ٹیٹ" کی سماعت شکن آواز کے ساتھ یہ بوٹا سنگھ کا ایک ساکھی اچھل کر ڈاک بنگلے کی بیرونی دیوار کے پاس گر اور ساکت ہو گیا۔ اس کے جسم میں گولیوں کے کئی سوراخ ہو چکے تھے۔ رشا اور فرال یہ منظر یہ کر چلا تھیں۔

شخص کی فائرنگ کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید ہانک ہونے والے شخص نے کوئی "چالاکی" دکھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن چالاک کی تعریف "کیا تھی؟" مقتول نہ تھا اور اس کے آس پاس کوئی ایسا ہتھیار بھی نہیں تھا جس پر وہ مجھے

کی کوشش کرتا ہوں متھن نے صرف دہشت بھانے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ انسانی جان ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی یہ قتل تھا۔  
 ”چلو۔۔۔ سب لوگ واپس“ متھن ملنے کے بل غزالیہ۔  
 سب پیچھے ہٹ گئے لیکن نشا اپنی جگہ کھڑی رہی۔ ”کیا بات ہے؟“ متھن کاٹ کمانے والے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ دوتے ہوئے بولی۔  
 ”کیوں نہیں جائے گی کیا؟“ متھن دباؤ اور راتقل اس کی طرف پھیرا۔  
 ”میں شاہ جہاں صاحب کے ساتھ جاؤں گی۔“  
 متھن کے تیرے جوتے یوں لگا جیسے وہ گولی چلا دے گا یا زنا پر بہت خوفناک قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرنا۔۔۔ شیخ عاصم بن ارشد نے انگریزی میں پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“  
 متھن نے بگڑی کھجوری انگریزی میں جواب دیا۔ ”یہ ساتھ جانا چاہتی ہے۔“

کتے ہیں جن اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ غالباً یہاں بھی کسی حوالے سے اس ”پُر زور سفارش“ نے کام کیا۔ شیخ عاصم ایک لمحے کے لئے متذبذب نظر آیا پھر اس نے کہا ”بھالو! اس کو بھی“  
 متھن مجھے راتقل پوائنٹ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”چلو

نیو جوب میں“  
 میں نے دیکھا جب کے دونوں دروازے کھولے جائے تھے ڈرائیونگ سیٹ پر شیخ عاصم کا چاق و چوبند ڈرائیور براجمان تھا۔ وہ انجمن اشارت کر چکا تھا اور اب ہمیں بٹھانے جانے کا منظر تھا۔ ایک راتقل بردار نے مجھے دھکیلا۔ دوسرے نے ۳۳ راتقل کی نالی غزالہ کی کمر سے لگادی۔ غزالہ نے اپنی جھکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو ”بتاؤ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“ میں نے گولی کھا کر سرخو ہو جاؤں یا گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس جنبش کا کوئی واضح مطلب تو نہیں تھا لیکن میرا خیال ہے کہ غزالہ میرا مالی العنصر سمجھ گئی اور اس نے مزاحمت ترک کر کے گاڑی میں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بٹھانے مجھ سے کوئی بات کرنا چاہی لیکن متھن نے اس کے سر پر بے دردی سے راتقل کی نالی رید کی اور پیچھے ہٹا دیا۔ میری نگاہ غزالہ کی کھالی شلوار پر جمی تھی۔ بٹھائی پر شلوار کے نیچے ایک اہم صاف نظر آ رہا تھا۔ پوتا کھم کی اطلاع سو فیصد درست

تھی۔ غزالہ کی ٹانگ سے منحنے کے نزدیک ہم باندھا گیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ ریکوٹ کنٹول سے چلنے والا اصلی ہم تھا یا صرف پوتا کھم وغیرہ کو دھکیلا گیا تھا۔ اس قسم کے ہم جم میں چھوٹے ہونے کے باوجود بی ایس بی سے بھر پور ہوتے ہیں اور عموماً کافی فاصلے سے بھی تیریت کئے جاسکتے ہیں۔ اگر یہ اصلی ہم تھا تو اس کا کنٹول متھن کے کسی ساتھی کے پاس موجود تھا تو ہنگامی کی بلکی سی جنبش اس جسم کے جیتنے سے آزاد کتنی تھی جو میرے لئے دنیا میں محبوب ترین تھا۔ اس ہم کی موجودگی میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جب میں سوار ہوتے وقت یا سوار ہونے کے بعد کسی طرح کی قسم جوئی کروں۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور غیر ارادی تھا کہ خود میں بھی حیران رہ گیا۔ جس وقت میں جب پر سوار ہوا زینٹا پچھلی نشست پر بیٹھ چکا تھی اور غزالہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے پائیدار پر پاؤں رکھ رہی تھی۔ پائیدار ان پر پاؤں رکھتے ہوئے غزالہ۔ اپنا ہاتھ غیر محسوس طور پر اوپر کھینچا۔ مقصد یہ تھا کہ اس کی ٹانگ سے بندھا ہوا ہم دیکھ لوں ”اور کوئی ایسی حرکت نہ کروں جو سب کے لئے جان لیوا ثابت ہو۔ مجھے پکڑ۔“  
 والے اس بات سے بے خبر تھے کہ میری ٹانگ کے ساتھ ایک خنجر خاص تکنیک سے بندھا رہتا ہے اور میں چشم زونہ اس پر گرفت کر سکتا ہوں۔ شاید متھن کو یہ بات معلوم لیکن طاقت و خود سری کے نشے میں وہ بھی بھولا ہوا تھا۔ جو مجھے غزالہ کے ممر میں منحنے سے بندھا ہوا ہم نظر آیا۔ میں۔۔۔ جھکا۔ ایک ہی حرکت میں میں نے نہ صرف خنجر نکالا بلکہ تھم بھی کاٹ دیا جس نے روی ساخت کے ہم کو منحنے۔۔۔ خشک کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے ڈرائیور کو گزرو کا احاطہ ہوا۔ اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا اور میری طرف جھکا اس سے پچھتر کر اس کے ملنے سے آواز نکلی۔ میرا ہاتھ دروازے کے منڈل تک پہنچ چکا تھا جہاں سے ڈرائیور میں سوار ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور دائیں کندہ ایک طوفانی ضرب سے اسے باہر لٹکا دیا۔ اس کے ساتھ میرے بائیں ہاتھ نے حرکت کی اور ڈیڑھا غلام دور در جھانپوں میں جاگرا۔

پچھلی نشست پر ایک راتقل بردار زنا کے پلوٹ چکا تھا۔ ڈرائیور کو باہر نکلتے دیکھ کر اس نے پھرتی راتقل سیدھی سی گھر بٹھانے کمال کی پھرتی سے چل دی۔ میں نے پلٹ کر خنجر کا بھر پور وار کیا۔ نوکلیا خنجر در راتقل بردار کے دل میں ٹھس مکیا۔ بٹھانے اپنی دروازے سے لگائی دو دونوں ٹانگیں جو زکر راتقل

کے کندھے پر رسید کیں۔ اس نے ابھی دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ کھلے دروازے سے لٹھک کر وہ در جاگرا۔ تاہم اس سے پہلے ہم نے دو اشیا اس کے جسم سے علیحدہ کر لی تھیں۔ میں نے اپنا خنجر اور نشانے وہ راتقل جس کا جیل اس نے آخر وقت تک بے حد مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔ میں نے بٹھانے کے ہاتھ سے راتقل لے اسی وقت خوفناک ترزاہٹ سے کچھ گولیاں جب کی باڑی اور شیشوں پر لگیں۔ اور یہ برٹ ہارنے والا متھن تھا۔ میں نے اسے دوسرے برٹ کا موقع نہیں دیا میرے ہاتھ میں پکڑی خود کار راتقل نے اہل اگلی اور متھن کینڈ کی طرح اچھل کر شیخ عاصم کے قریب گرا۔ میں نے پختہ ارادے کے ساتھ اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا لیکن گولیاں اس کی گردن اور کندھے پر لگیں۔ ۳۳ راتقل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری۔ غزالہ پھرتی سے اپنی جانب والا دروازہ بند کر چکی تھی۔ جب اشارت تھی۔ میں نے اپنی جانب والا دروازہ بند کیا اور راتقل غزالہ کی گود میں پیچھ کر ایشیئرنگ سنبھال لیا۔

یہ بڑے سنگین کمات تھے میں جانتا تھا اب ایک ساتھ کی برٹ گاڑی میں لگیں گے۔ اگر کوئی گولی کسی ٹانگ کا مزاج پوچھ لیتی تو دروازے سے پہلے ہی ہمارے بڑکت سکتے تھے۔ ہر جوب کے عقب میں پٹرول کا کین بھی تھا کوئی شعلہ اس میں جانتا تو پوری جب آگ کی لپٹ میں آسکتی تھی۔ جوئی میں نے پہلے علیحدہ گٹر کچھ چھوڑا جب کی پوری باڑی سمجھنا اگلی۔ توقع کے عین مطابق کی برٹ گاڑی میں لگے تھے۔ غزالہ اور بٹھانے چلائی ہوئی نیچے جھک گئیں۔ انیس ابھی پتا نہیں چلا تھا کہ یہ شاندار جب بلیٹ بروف ہے اور دروازے نہ ہوجانے کے بعد ہم فائرنگ سے محفوظ ہو چکے ہیں۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا جب کے پیچھے بھلہ ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھے شیخ عاصم کا ایک محافظ نظر آیا ”وہ ایک کھٹنا زمین پر یک کر بیٹھ چکا تھا اور بڑی احتیاط سے جب کا نشانہ لے رہا تھا اس کی راتقل کا رخ بتا رہا تھا کہ وہ پچھلے ٹانگوں کو نشانہ دے رہا ہے اور یہ وہ کارروائی تھی جو ہمارے نقطہ نظر سے فیکل ترین تھی۔ میں نے اپنی سی کوشش کرتے ہوئے جب لوہا میں سے بائیں ٹھیرا لیکن اس سے پہلے کہ محافظ کی راتقل ہلک اٹھی دھماکا ہوا اور عقب میں غبار سا پھیل لیا۔ ایک دو سینڈ کے لئے تو مجھ سمجھ میں نہیں آیا ”پھر ڈانڈھو گے یہ اسی ڈیڑھا غلام کا دھماکا ہے جو تھوڑی دیر پہلے غزالہ کے منحنے سے بندھا ہوا تھا۔ ہمیں فرار ہوتے دیکھ کر ”چارہ گر“ نے آخری حربہ آزمایا تھا اور ریکوٹ

کنٹول کا بٹن دبا دیا تھا۔ وہ اس امر سے بے خبر تھا کہ ہم کہاں پڑا ہے اور کسی کی جان لے گا۔ دھماکا میں اس جگہ ہوا تھا جہاں میں نے کین میں کو کھٹنا زمین پر چپکے ہوئے دیکھا تھا۔ بہت کم امکان تھا کہ وہ اس بلاسٹ سے بچ نکلا ہوگا۔ بعد میں اس بات کی تصدیق ہوئی کہ جب کا ٹانگ برٹ کرنے کی کوشش میں کین میں کا اپنا پینٹ برٹ ہو گیا تھا اور وہ موقع پر ہی دانی اچھل کر لپک کر گیا تھا۔ اس کا نام کرشنا تھا اور وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔

جب کمان سے نکلے تھری طرح کے راستے پر آگے بڑھی۔ میں اس راستے سے دو دفعہ گزر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب ہم سڑگ بائیں ٹھک رام باغیچے کو گٹر وال کے کھلے سے پاندھ کر مائل لائے تھے۔ دوسری بار اس وقت جب میں اور بابو لیاقت پانڈی رات میں گھوڑوں پر سوار ہو کر گٹر والوں کی ہستی کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں جب کو پہلے سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ پھر اسے راستے سے اتار کر دوختوں میں موڑ دیا۔

ہم مشکل دو تین فلاک گئے ہوں گے کہ عقب میں باقی دونوں جیپیں نمودار ہو گئیں۔ وہ خاصی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ کسی نے شکاری کتے سے پوچھا تھا ”مالک تجھے اتنا کھانا پاتا ہے تیری کتنی شل سیدھا کرتا ہے“ پھر بھی مجھ کو سارے خرگوش تجھ سے جان بچا کر بھاگ جاتا ہے۔ شکاری کتے نے کہا تھا ”میں اپنے مالک کے لئے بھانٹا ہوں لیکن خرگوش اپنے لئے بھانٹتا ہے“ اس لئے نکل جاتا ہے ہم بھی اپنے لئے بھاگ رہے تھے فزا ہماری رفتار شیخ عاصم کے خنجر و وارنٹوں سے جبر تھا۔ میں چھوٹی موٹی کھانسی اور گڑھوں کو بھلا لیتا چلا جا رہا تھا۔ کئی جگہ جب دو درختوں کے درمیان سے یوں گزری جیسے کوئی کرت دھار رہی ہو۔ ایسے موقعوں پر غزالہ اور بٹھانے اختیار چنچا اٹھتی تھیں۔

زینٹا مسلسل عقب میں گارے کئے ہوئے تھی اور مجھے بتاتی جا رہی تھی کہ آنے والے نئے فاصلے پر ہیں اور کس رخ سے آرہے ہیں۔ اس کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ جب شیخ عاصم کے کارندوں نے ہمیں سے غائب تھا اور جب میں بٹھانا چاہا تھا تو بٹھانے نے امر کیا کہ غزالہ وہ بھی جب میں بیٹھنے کی اس وقت مجھے اس کی خدمت کا محسوس ہوئی تھی اور اس پر غصہ بھی آیا تھا۔ بات تھی بچی غصے والی۔ وہ کیوں خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈال رہی تھی اور میری مغیبت میں بھی اشتباہ کر رہی تھی۔ لیکن اب اس کی دلیری اور ذہانت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مشکل وقت میں ایک اچھا ساتھی ثابت

ہو سکتی ہے۔ غالباً رنگ رنگ کے لوگوں کے ساتھ بطور داشتہ رہ کر اس نے تھوڑے عرصے میں زمانے کا بہت خبیث و فزاز دیکھ لیا تھا۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی چٹکی اور بے غنی تھی۔ جس طرح اس نے جب کے اندر گھسنے کے کارندے سے را نقل چینی تھی اور اسے تا گھنیں رسید کر کے جب سے باہر نکالا تھا وہ ایک قابل دید منظر تھا۔

میں نے جب ڈرائیو کرتے کرتے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ بڑے عزم نظر آتی تھی۔ دور تک۔ اور دیر تک ہمارا ساتھ بھانے پر آمادہ تھی۔ دوسری طرف غزال نے بھی ابتدائی خوف کو ذہن سے جھٹک دیا تھا اور اب کسی چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم نظر آتی تھی۔ میں نے غزالہ میں یہ بہت خاص بات نوٹ کی تھی۔ کسی بھی مشکل یا اُفتاد کے آغاز میں وہ گھبرا جاتی تھی لیکن پھر بہت جلد تسخیل جاتی تھی اور سرانجام حالات کا مقابلہ کرتی تھی۔ ہم نے قریباً پندرہ منٹ تک شیخ عام کے کارندوں کو ان خبیث و فزاز میں خوب بھگایا، اور ایک موقع پر تو یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید ہم ان کی زد سے نکل آئے ہیں۔ لیکن دو تین منٹ بعد ایک پہلو سے سرخ رنگ کی لینڈ کروزر دوبارہ نمودار ہو گئی۔ وہ لوگوں کا ڈکا فائر بھی کر رہے تھے مگر درختوں کی کثرت اور زمین کی تابواری کے سبب یہ فائر کارگر نہیں تھے۔ بٹانے بتایا کہ سرخ لینڈ کروزر بہت تیزی سے قریب آ رہی ہے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ ڈرائیو کرنے واقعی سردھڑکی بازی لگا رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا دوسری جیب جس میں شیخ عام بن اور شہ بھی سوار تھا ایک درخت سے ٹکرا کر پہلو کے ملے الٹ گئی تھی اور اس میں کئی افراد کے سر پھٹ گئے تھے اور انھیں ٹوٹ گئی تھیں۔ اسی جیب کو حادثہ پیش آتے دیکھ کر سرخ جیب والوں کے غضب نے جوش مارا تھا اور انہوں نے ہم تک پہنچنے کے لئے سردھڑکی بازی لگائی تھی۔ اس جیب نے پندرہ جیس گز کی دوری سے ہم پر جو تین فائر کئے ان میں سے ایک جیب کے اگلے حصے میں لگا۔ جیب اپنے راستے پر چلے چلے پلے پلے ٹھوکی جیسے اچانک کسی طرح دار چنگ کا کاغذ پھٹ جائے اور وہ ہوا میں ایک طرف کو جھٹکی چلی جائے میرے بہت سنبھالنے کے باوجود جیب بے قابو ہوئی اور چند تحیف و زحار درختوں کو توڑنے کے بعد چالیس کے زاویے سے ایک گڑھے میں جا گئی۔

گڑھے میں ہر طرف گردوغبار پھیل گیا۔ اس گردوغبار میں غزال اور نشا کی دم گھٹیں ایک ساتھ گونجیں۔ جیب کے غیر محرک ہونے سے پہلے پہلے میں اپنی جانب والا دروازہ

کھول چکا تھا۔ میں نے غزال کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر نیچے اتار لیا۔ بٹا بھی پھیلا دو انا کھول چکی تھی۔ جو کئی دو تینے آڑی ہم کھینچے درختوں کی طرف لپکے۔ لیکن وہ درخت انھار بٹا ایک جھٹکے سے ٹک گئی۔ اس کا دھنچا چپ کے دروازے میں کسک پھنس گیا تھا۔ بہتر ہو گا کہ وہ دھنچا گٹے سے اتار بیجھتی لیکن غیر ارادی طور پر وہ دھنچا جھڑانے کے لئے واپس مڑی۔ یہ ہے کہ حد جیتی تھے "بٹا" میں نے ٹوک کر اسے نکارا۔

ابھی میری آواز کی بازگشت فضا میں تھی کہ سیون ایم کا ایک برست آیا۔ میں اور غزالہ زمین پر گر گئے۔ بٹا برا راست برست کی زد میں تھی۔ میں نے اسے لڑکھڑا کر کر دیکھا۔ یہی لگا کہ وہ برست کے سبب ڈگمگاتی ہے۔ میں نے غزالہ کو زمین پر رول کیا اور گڑھے میں غرا۔ میں نشا کو گڑھے سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر ساکت رہ گیا کہ بٹا کے ایک حصہ صاف اڑ چکا ہے اس کے منفر کا کچھ حصہ جیہ کے سیاہ ٹائر سے دھکا ہوا تھا۔ اس کا حسین پیکر یوں ساکت تھا جیسے اس میں بھی زندگی کی لہر دوڑی ہی نہیں تھی۔ میں اس کے چہرے کی طرف ایک جھٹک دیکھی۔ خوبصورتی عروج پر صورت کی انتہا میں داخل چکا تھا۔ اس منظر چہرے نظر پھر کر دیکھنا میرے جیسے شخص کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ بارود ایسا ہی بے رحم ہوتا ہے۔ اسے جب بھی موقع جاتا ہے وہ انسان سے اپنے ایجاد کے جانے کا دستور انتقام لیتا ہے۔ بٹا کی ہانسی موت نے ایک لمحے کے لئے مبسوٹ کر دیا۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا اور جھٹک گڑھے سے باہر آیا۔ میں نے دیکھا "سرخ جیب پندرہ گز کے فاصلے پر ٹوک گئی ہے اور اس میں سے شیخ ایم اور غزالہ نکلتے دیکھ کر دوڑنا ہوا۔ میں نے درختوں میں گھس گیا۔ "بٹا کو کیوں چھوڑ دیا؟" غزالہ بھاگتے بھاگتے چلی۔ "وہ زخمی ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" وہ دوبارہ آواز بولی۔

اس کے پہلے کہ میں کچھ کہتا "عقب سے ایک برست آیا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے شاخیں گزر گئیں۔ سیون ایم ایم میرے دائیں ہاتھ میں تھی۔ نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر چند سنگل فائر کئے مگر راونڈ میرے پاس نہیں تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اب گز ہیشکل پانچ چھ گولیاں ہوں گی۔ ویران جھاڑیوں اور در

اس وقت میرے ذہن میں وہ تصویر آئی جو میں نے ڈال گری کے رست ڈاکس میں دیکھی تھی۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت نعل گائے پر گرسے ہاونڈ گتے جھپٹ رہے تھے میں یہ سوچ کر لرز گیا تھا کہ کب کبیں غزالہ کے ساتھ اس نعل گائے جیسا سلوک نہ ہو بعد میں اپنے اس تصور پر میں نے خود کو ملامت بھی کی تھی۔ لیکن آج ان درختوں میں اندھا موند بھاگتے ہوئے معلوم نہیں کیوں وہ تصویر پھر میرے تصور میں ٹھس آئی۔

اچانک میری نگاہ ایک گڑھے میں پڑی۔ یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ جمع تھا۔ اس جھاڑ جھنکاڑ میں سے خاکستری رنگ کا ایک جنگلی ہلاک کر ہاگا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی سوراخ یا کھوکھ میں سے نکلا ہے۔ سوراخ بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ گڑھا ہیشکل چار فٹ گہرا تھا۔ میں نے اس میں چلائی لگائی۔ جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان مجھے ایک بہت رانے پائے کا دہانہ نظر آیا۔ سینٹ کا یہ پائپ قریباً ڈھائی فٹ قطر کا تھا۔ غالباً برسوں پہلے یہاں پرانی پانی کے نکاس کے لئے یہ راستہ بنایا گیا تھا۔ ممکن ہے کوئی طویل منصوبہ ہو لیکن آٹاڑی میں ٹھپ ہو گیا ہو۔ اب یہ پائپ کسی اور حوری خواہش کی طرح زمین کے سینے میں دبا رہ گیا تھا۔ ان سنگین ترین لمحات میں یہ تنگ و تاریک پائپ مجھے "چائے پناہ" نظر آیا۔ سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ لاکڑی آوازیں دم بدم قریب آ رہی تھیں۔ میں نے پائپ کے دہانے سے جھاڑ جھنکاڑ ہٹایا، پھر غزالہ کو پائپ میں گھسنے کا اشارہ کیا۔ شاید عام حالات میں وہ اس تنگ و تاریک اور انجانے خلا میں جھانکنا بھی گوارا نہ کرتی مگر وقت کا تقاضا بھانے ہوئے وہ فورا زمین پر بیٹھی اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر پائپ میں داخل کیوں اور اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ پائپ ہم دونوں کے لئے کافی تھا (لیکن بس اتنا کہ ہم سانس لے سکتے تھے) پائپ میں گھسنے میں سے ہنتر اور لکڑی کی خشک سنہنیاں کھینچ کر دہانہ ڈھانپ دیا۔

یہ سب کچھ چار پانچ کیلنڈ کے اندر ہوا اور میں وقت پر ہوا کیونکہ اگلے ہی لمحے تعاقب کرنے والے گڑھے تک پہنچ گئے۔ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گالیاں بکنے کے ساتھ ساتھ تلاش کے حوالے سے ایک دوسرے کو مشورے بھی دیتے جارہے تھے۔ "اے ہاتو خان! اوٹکاب سٹک کے ساتھ نہ۔" بھگت رام! تم ذرا اور پیچھے ہٹ جاؤ۔" اوئے ٹیلے! اپنے بندے لے کر آگے نکل جا۔" ہانپتی ہوئی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ تعاقب کرنے

کا وہ سلسلہ ایک آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم مسلسل بھاگتے چلے جا رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ کہاں جاتا ہے۔ عقب میں لاکڑی ہوئی آوازیں تھیں اور خود کار یا ٹھنوں کی ترزا ہٹ تھی۔ میرا ہاتھ مضبوطی سے غزالہ کے ہاتھ میں پوسٹ تھا اور میرے ہاتھ کے سارے وہ تھکے رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اس کا ایک میٹل جیب سے اترتے ہوئے گر گیا تھا۔ دوسرا اس نے بھاگتے بھاگتے اتار دیا تھا۔ اب وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس کا میٹلا ڈھالا جوڑا کھل گیا تھا اور بال درختوں سے جھمن کر آنے والی سڑی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ عام حالات میں یہ ایک دلکش منظر ہوتا لیکن فی الوقت اس منظر کی تمام دلکشی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ کسی بھی وقت کوئی کوئی اس منظر کو چاٹ نہ سکتی تھی اور کسی بھی لمحے رست اچل اس دلکشی کو لوٹمان کر سکتا تھا۔ بٹانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ لمحات ہم دونوں پر بہت بھاری ہیں۔ ہماری یہ ساری بھاگ دوڑ بے کار جانے والی ہے، ہم دونوں کے ساتھ یا ہم میں سے کسی ایک کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں یہ جھنپنی حس کی پکار تھی یا نشا کی لاش کا جاناؤہ غور ایک وہم کی پرورش کر رہا تھا۔ جس حتی الامکان کو خشش کر رہا تھا کہ غزالہ ڈگمگا کر گرنے نہ پائے اور نہ ہی اس کی رفتار آتی سخت پڑے کہ ہم را نقل برداروں کے کھیرے میں آجائیں۔ وہ میرے ساتھ کبھی چلی آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا وہ ننگے پاؤں ہے اور اس کے نازک کھوے زخمی ہو رہے ہیں۔ ان یہ زخم ان درختوں کی نسبت بہت معمولی تھے جو پھٹلا ہوا بیس امارے جسموں کو دے سکتے تھے۔

اگلے تین چار منٹ میں میں نے اپنی را نقل کے آخری ٹکڑاؤں بھی فائر کر دیے شاید ان میں سے ایک آدھ گولی نے کسی تعاقب کرنے والے کو زخمی بھی کیا ہو لیکن مجموعی طور پر یہ فائرنگ بے اثر ہی رہی۔ اب را نقل میرے ہاتھ کا ایک لاشی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میرا واحد یار وہ خنجر تھا جو میں نے جیب میں استعمال کرنے کے بعد ادھ اپنی ہڈی سے لگا لیا تھا۔ لیکن یہ خنجر بھی اس سطح جوم سامنے گیا کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کم دیش پندرہ اور ہمیں کھیرنے کی کو خشش کر رہے ہیں۔ اور مگر کوئی جانے نظر نہیں آ رہی تھی۔ کہ کب کوئی مکان نہ آبادی نہ چرند نہ انسان۔ بس چاروں طرف درخت تھے اور ہمارے لوہا کی آوازیں۔ ہم بڑی طرح ہانپ رہے تھے اور پیٹنے خراپور تھے۔ ان معیبت زدہ جانوروں کی طرح جو شکاری ماکے نرسے میں ہوں اور دوڑ رہے ہوں۔ بٹانے کیوں



”کوئی کو تھکا رہا اور حوٹھی لیس گے“ میں نے کہا۔  
”کیوں اور جانا ہے تو پھر۔“ وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔  
”جپ جانا تھا، وہ کیا کہنے جا رہی تھی اور کیوں چپ ہوئی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ اگر کوئی اور جگہ ڈھونڈتی ہے تو پھر یہیں کیوں نہیں چھپے رہے لیکن چپ اس لیے ہو گئی تھی کہ اس ”پناہ گاہ“ کے بیچ پناہ بھی اس کے ذہن میں آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی اور میری بے انتہا قربت کے تصور نے اس کی زبان کو نالاگ کر دیا تھا۔  
میں اس کی سی این سی کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ میرے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ میں بظاہر غزالہ سے ہم کلام تھا لیکن ذہن کیوں اور تھا۔ دل دماغ میں اچھل سی پچی ہوئی تھی۔ سیراجہ کی خوشگام لاش کا تصور نگاہوں میں ٹھہر سکا تھا۔ معلوم نہیں وہ کن حالات میں قتل ہوا اور کیسے یہاں پہنچا تھا۔ میں غزالہ کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنے کے بعد دوبارہ یہاں آنا چاہتا تھا تاکہ اطمینان سے لاش کا معائنہ کر سکوں لیکن محفوظ جگہ یہاں کون سی ہو سکتی تھی۔ ارد گرد کوئی بستی تھی نہ کیمت کھلیان نظر آتا تھا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ ملنے کے بعد درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ یہاں بکثرت جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں نے غزالہ کو اس جھنڈ میں چھپا دیا اور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہاں گڑھے کی طرف چل دیا جہاں ایک تنگ و تاریک پائپ میں سیراجہ کا جسدِ خاکی ایک لائٹل سوال کی صورت پر تھا۔

ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ میں نے حتی الامکان تیزی اور احتیاط سے طے کیا اور دوبارہ گڑھے میں پہنچا گیا۔ جھاڑ جھکاڑ کے اندر غلت پائپ کا دانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ پائپ میں ٹھس کر میں نے سیراجہ کی لاش باہر کھینچی لیکن اسے مکمل طور پر پائپ سے باہر نہیں نکالا۔ سیراجہ کے جسم پر سائے کی طرف تھی تیز و ہار آلے کے دو گہرے زخم موجود تھے ایک زخم پیٹ پر تھا اور دوسرا میں دل کے مقام پر۔ سیراجہ کی سلیٹی شلوار قمیص اس کے اپنے ہی لوم میں دھکیں ہو چکی تھی۔ اس کے پاؤں نکلے تھے۔ میں نے بریف کیس دیکھا۔ اس کی دونوں جانب گہرے نشانات نظر آ رہے تھے۔ یہ نشانات واضح طور پر کھلاڑی کے تھے غالباً سیراجہ کو قتل کرنے والوں نے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ناکام ہو کر انہوں نے اسے توڑنا چاہا تھا لیکن وہ اس کام پر زیادہ دقت صرف نہیں کر سکتے تھے اور لاش یہاں پھینک کر رفو چکر ہو گئے تھے۔ بریف کیس ایک چھوٹی سی ڈیجیٹر اور

بھٹوری نمالاک کے ذریعے سیراجہ کی کھائی سے منسلک تھا۔ اسے سیراجہ کی کھائی سے منسلک کیا کر نکھانے کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ سیراجہ قتل کا تعلق ”نرک“ والے معاملے سے نہیں۔ دھیان خود بخود اس درپے دشمنی کی طرف جا رہا تھا جس کا ذکر سیراجہ نے مجھ سے کیا تھا اور جس دشمنی کی اگر سے بچنے کے لیے وہ کافی عرصے سے راجستھان میں قیام پزیر تھا۔ یہ بات بالکل سائے کی تھی۔ اگر سیراجہ کی جان سے کھینک والا کوئی ایسا شخص ہوتا جسے نرک کی تلاش تھی تو وہ سیراجہ کی کھائی سے منسلک بریف کیس کو یونسی چھوڑ کر جاتا۔ کچھ اور بن نہ پڑتا تو وہ اس کی کھائی کاٹ کر ہی بڑھ کر کیس اپنے ساتھ لے جاتا۔ بریف کیس کو دیکھنے سے سناڑ انداز ہوتا تھا کہ اسے بے دلی سے توڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور بعد ازاں سیراجہ کے ساتھ ہی اس پائپ کی تیار

میں پھینک دیا گیا ہے۔  
”ریف کیس“ ”نرک کی نیشن“ سے گھٹا تھا۔ ”نرک کی نیشن“ مجھے معلوم نہیں تھا اور میں ممکن تھا کہ سیراجہ کو بھی ابھی تک پتا نہ چلا ہو۔ اگر میرے پاس ہسپتال ہو سیدن ایم ایم رائل میں ہی ایک آدھ گولی پچی ہوئی تو بریف کیس کالاک توڑنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن اب میں ان چیزوں سے محروم تھا۔ میں ابھن میں ادھر ادھر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ پاؤں کے قریب ایک شے پر پڑا۔ یہ گارے اور مٹی میں لتھڑا ہوا ایک ریو اور تھا۔ میں جبکہ کر یہ ریو اور اٹھایا اور پہلی نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ سیراجہ کا ریو اور تھا۔ جب میں نے سیراجہ کی لاش پائپ میں کھینچی تو یہ اس کے ساتھ ہی لڑھک کر گڑھے میں گر گیا۔ میں نے قمیص کے دامن سے ریو اور کی کچھ صفائی کی اور دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ جیب میں تین سہری گولیاں رہی ہیں۔ یہ ریو اور سیراجہ کے لباس میں کیس موجود ہو سکتا ہے۔ سیراجہ کو قتل کرنے والوں نے ویسے ہی میں پھینک دیا ہو، بہر حال یہ ریو اور اس وقت میرے بے حد اہمیت رہتا تھا۔

میں نے ریو اور کا سیٹھی کیچ بنا کر اس کی ٹال بریف کے تالے پر رکھ دی۔ فائر کرنا خطرے سے خالی تو نہیں اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اوپر سے ایک بریف کیس کا سائے والا حصہ درمیان سے نوٹ کیا۔ میں نے ڈھکنا اٹھایا تو وہ پہلی کوشش میں اٹھنا پڑا۔ بریف کیس میں ایک فائل موجود تھی۔ اس کے علاوہ کاندات اور ترائے بے ترتیب پڑے تھے۔ میں۔

میں چرمی تو پھر اسی گڑھے کے ارد گرد کیس ہوگی۔  
”تم نے فائر کیوں کیا تھا؟“  
”میری کو متوجہ کرنے کے لیے۔ وہ اس ریو اور کی آواز پہنچاتی ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے بجائے تم یہاں پہنچ جاؤ گے۔“

موتے سڑکے اشارے پر ایک بندہ گڑھے میں اتر گیا اور اچھتی نظر سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسے جھاڑ جھکاڑ میں چھپا ہوا پائپ کا دانہ نظر نہیں آیا۔ خود وہ دونوں نے اس دہانے کو زبردست طریقے سے ”یکو فلاج“ کر رکھا تھا۔ سڑک نما چمپلی دار شخص نے اپنی خود کار رائل میری طرف یوں تان رکھی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ ذرا سا چوکا تو میں بھاپ بن کر اڑ جاؤں گا۔ اور صرف وہی نہیں، پانی دونوں رائل بردار بھی ایک جھپکے بغیر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیاں رائلوں کے ٹریگرز پر تھیں اور رگ پیٹے تھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ پر پوری طرح حاوی تھے پھر بھی ان کی آنکھوں سے تشویش جھانک رہی تھی۔ وہ میرے نام سے آگاہ ہو چکے تھے اور خود ہی دیر پہلے میرا طرز مزاحمت بھی ملاحظہ کر چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ میں نے کس طرح ”ان کا ٹھکانہ“ توڑا ہے اور بے دست دیا ہوتے ہوئے بھی کیسے ان کے جھپکے چھڑائے نہیں۔ ان کے بدوں نے انہیں میرے بارے میں محتاط اور ہوشیار رہنے کی جو ہدایات دے رکھی تھیں وہ ان کی ذہنی آکھوں میں صاف پڑی جا رہی تھیں۔  
”چلو گاڑی کی طرف“ سڑک نما شخص نے کمن کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیا۔ میرا تجربہ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا شخص جس نے مجھ پر رائل تان رکھی ہے اور جو مجھ سے بے حد خوفزدہ بھی ہے میری ذہنی غلط فہمی پر مجھے گولیوں سے بھون سکتا ہے لہذا وہ میرے لیے کسی بھی شخص سے بڑھ کر خطرناک ہے۔ میں بلا چوں چڑائیوں افراد کے ساتھ چل رہا تھا۔ ان میں سے دو میرے دامن بائیں چل رہے تھے جب کہ ایک عقب میں تھا۔ وہ اپنی شکل سے ماہر کھلاڑی نظر آتے تھے لیکن مجھے ”کٹور“ کرنے میں انہوں نے اٹاڑی پن کا ثبوت دیا تھا۔ شاید یہ بھی ان کی حد سے بڑھی ہوئی تشویش کا نتیجہ تھا۔ وہ ”کٹور“ کرنے کا بنیادی اصول فراموش کر رہے تھے کٹور کرنے والے ایسا زاویہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے فائر کی دوشیں نہ ہوں لیکن یہاں میرے دامن بائیں چلنے والے دونوں افراد مجھے مارنے

کاندات فائل میں رکھے اور فائل بڑی احتیاط سے اپنی شلوار کے نیچے میں اڑس لے۔ سیراجہ کی لاش کو دوبارہ پائپ میں دھکیل دیا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس لاش کے بارے میں مقامی پولیس کو اطلاع دی جائے اگر ایک دو گھنٹے میں لاش یہاں سے نہ ہٹائی جاتی تو جنگلی جانور اس کی چرچا شروع کر دیتے۔ میں خود تو تھا نے میں پیش ہو کر یہ اطلاع دے نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیے جانے کی ضرورت تھی جس میں مجھے سائے نہ آنا پڑا۔ ابھی میں اسی اوجھڑی میں کھڑا تھا کہ بالکل قریب سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے اپنا ریو اور سیدھا کیا لیکن اچھا ہوا کہ میں نے اسے استعمال نہیں کیا ورنہ جو برست میرے سر کے اوپر سے گزرا تھا وہ میرے جسم میں بھی ہوت ہوا تھا۔ میں نے دیکھا گڑھے سے باہر دو افراد خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے عقب میں بھی چند افراد نمودار ہو گئے۔

”ریو اور پیچھے پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھاؤ“ ایک آواز نے گرج کر کہا۔

یہ وہی موٹا سڑک تھا جس نے ڈاک بھنگے میں موجود افراد کو گرفتار چاہے لٹائی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے اندر فیصلہ کر لیا تھا۔ مزاحمت کرنا تھی یا نہیں کرنا تھی۔ میں ریو اور سے باز کر کے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کو ڈھیر کر دیتا لیکن میری طرف تین رائلوں اٹھی دلی تھیں اور وہ سب برست مارنے والی تھیں۔ ایک فائر کے جواب میں مجھ پر پچاس گولیاں چل سکتی تھیں۔ میں نے

ریو اور گڑھے سے باہر پھینک دیا۔ ایک شخص نے جیل کی لٹچ جھپٹ کر ریو اور دوہرا چا اور جست لگا کر گڑھے میں اٹھیا۔ اس کی رائل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ رائل ”شلوڈر ٹرپ“ سے منسلک تھی لہذا رائل بردار کو یہ حدش نہیں آ کہ میں جھپٹ کر اسے غیر مسلح کر دوں گا۔ پھر بھی وہ بے حد اظہار آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جہانی استاد کے نام کی شے ہے۔ رائل بردار نے ایک ہاتھ سے میری داہری سی ٹی لی اور پھر بڑے رعب سے باہر نکلے کا حکم دیا۔ میں سے نکل آیا۔

”میری کہاں ہے؟“ سڑک نما غرا کر پوچھا۔

”میری کو ڈھونڈنا پھر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”وہ تمہارے ساتھ تھی!“ سڑک کے ایک سامھی نے

”جھاگ دوڑ میں پھڑکنی ہے اور اگر تمہارے ہتھے

ان کو شش میں ایک دوڑے کو بھون سکتے تھے۔  
ان کی اس کو تابی کو بوجھ معاف کرتے ہوئے میں  
میدان چلا رہا۔ قرینہ ایک آگے گئے درختوں کے  
نذر ایک سرخ جب کھڑی تھی۔ یہ وہی لینڈ کوزر تھی جس  
کے اندر سے فائر کر کے ہٹا کر ابھی نیند ملائی تھا۔ جب مرد  
وغبار میں آئی ہوئی تھی اور اس کی ایک سائیز پر گولیوں کے  
نشان موجود تھے سڑنا شخص نے جب کے اندر سے ایک  
واکی ٹاکی پر آدہ کیا اور جیسے لمبے میں کسی سے بات کرنے لگا۔  
اس شخص کی شکل و صورت میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ  
اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ایک خرخراتے سڑ کا تصور ذہن میں  
آ جاتا تھا۔ واکی ٹاکی پر بات کرتے ہوئے بھی اس کی چھوٹی  
چھوٹی آنکھیں بدستور بچہ پر جی تھیں اور رائفل میری طرف  
اٹھی ہوئی تھی۔

میں نے دوسری بیب میں  
دو نوں کو  
سیکھ  
کی  
زبان  
پر  
تھیں  
مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص نے دوسری بیب میں  
وجود افراد سے رابطہ کیا ہے اور انہیں یہاں بلا رہا ہے  
گلے پانچ منٹ میں یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ دوسرے  
کسی گاڑی کی سربراہی سنائی دی۔ ایک شخص نے سرخ  
سینکڑے گاڑی کا ہارن بجایا کرتے والی گاڑی کو متوجہ کیا۔ چند  
سینکڑے بعد یہ گاڑی معمول آرائی موقع پر پہنچی۔ یہ بھی ایک  
شاندار امیٹل پروف جب بھی لیکن کسی درخت سے ٹکرانے  
اور زمین پر دو تین فلا بازیاں کھانے کے بعد اس کا سوا  
ستیا باس ہو چکا تھا۔ ایک دو اندازہ چپک کر اندر ٹھس گیا تھا۔  
ایک کوئی کاشیفہ اپنے فریم میں سے نکل چکا تھا۔ بوٹ ٹر  
میں تھا اور انٹیل کا ہیر ایک جانب زمین پر گھسٹا چلا آ رہا

تھا۔ اس جب میں پانچ دیگر افراد کے علاوہ شیخ عاصم بھی سوار تھا۔ شیخ عاصم کے ماتھے پر ایک پانی بندھی ہوئی تھی۔ پانی کسی چیز کی گھماؤ کرتا ہی نہ تھا۔ اس پانی پر دو تین جگہ خون کی آلائش نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص کے دانت ٹوٹ چکے تھے۔ اور وہ اپنے ہونٹوں سے بننے والے لہو کو مسلسل قیص کی آستین سے لوتھ رہا تھا۔ جب میں موجود قریباً ہر شخص کو جھولی میں چوٹ اُلٹی تھی۔ شیخ عاصم کی ہلکی کیفیت اس کی خون بار آنکھوں سے عیاں تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ پر فوٹ پڑے اور میں اس جنگلی گھاس پر گر کر امیری رنکا ہونی کر دے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنا ہے ورنہ میں کسی بھی وقت پاسا اپنے حق میں لٹ سکتا ہوں۔

پٹ سلا ہوں۔  
شیخ عاصم کے کارندوں میں سے صرف متعین اس کی  
زبان سمجھتا تھا اور متعین میری فائزنگ سے شدید زخمی ہو کر

ڈاک بچے کے سامنے کر گیا تھا۔ اب شیخ عامر اپنی بات  
 صرف اشاروں کنایوں میں سمجھا سکتا تھا اس نے فری  
 اندام غصے کو اشارہ کیا کہ مجھے اپنی بھنکری لگا دی جائے  
 فری اندام غصے نے سرخ جب کے اندر سے چنگدار ارمیل  
 کی بھنکری نکال لی۔ شیخ عامر نے اشارے سے فری اندام کو  
 اپنے پاس بلایا اور اس کی راتفل اپنے ہاتھ میں تھام لی۔  
 راتفل کا سنیٹی کچھ بنا ہوا تھا اور وہ بالکل تیار حالت میں  
 تھی۔ شیخ عامر نہایت سفاک لہجے میں بولا۔ "میں خدا کی قسم  
 کھاتا ہوں جانی! کوئی چلائے میں ایک لمبے کی ناخن نہیں  
 کروں گا۔ چاہے اس کی زو میں میرا اپنا آدمی ہی کیوں نہ  
 آجائے چپ چاپ بھنکری لگواؤ۔ ورنہ مرنے کے لیے  
 تیار ہو جاؤ۔"

تیار ہو جاؤ۔  
اس کا بوجھ تیار رہا تھا کہ وہ جو کم رہا ہے اس پر عمل بھی  
کے گا۔ اگر بھنگری لگوائے وقت میں نہ فریہ اندام مختص  
کو بخیر حال بنائے کی یا کوئی اور حربہ آزما یا تو وہ ہم  
دونوں کو چھینٹی کر دے گا۔ برسوں کے تجربے نے مجھے اتنا تو  
سمجھا ہی رہا تھا کہ کس دھمکی کے پیچھے ارادہ ہوتا ہے اور کون  
سی دھمکی صرف دھمکی ہوتی ہے۔ میں نے مزاحمت کا خیال  
ذہن سے نکال دیا۔ میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر بھنگری  
پہنا دی گئی۔ بھنگری کی چابی فریہ اندام مختص نے شیخ عاصم  
تعماری۔

میرے ہاتھ بندھ جانے کے بعد شیخ عاصم اور اس  
ساتھیوں کی گنجیوں میں گھری تفتیش کے سامنے قدرے سر  
مخفیہ رہا۔ نقل بردار درمیان فاصلہ کم کر کے میرے عین عقد  
میں آگئے اور شوکے دے کر مجھے جپ میں بٹھاوا دیا۔ کیا  
را نقل بردار چونک کر حالت میں میرے سر پہانے کھڑا رہا۔  
شیخ عاصم کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے اور شیخ عاصم اشارہ  
کرتے ہوئے میں اسیں ہدایات دینے لگے۔ صاف بتا چکے تھے  
ہدایات غزالہ کی تلاش کے بارے میں ہیں۔

شیخ عاصم کے کارندوں کو غزالہ ملی یا نہیں اس بارے میں مجھے شک ہے چنانچہ چل سکا۔ بہر حال بذریعہ جب قریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شاندار عمارت میں پہنچا اور کیا۔ بوقتِ رخصت میری آنکھوں پر پانی پڑا۔ مٹی تھی لہذا کچھ پانی چل سکا کہ میں کہاں سے گزرا اور کس جگہ پہنچا ہوں۔ میری اپنی عمارت کے اندر جا کر مٹی تھی۔ عمارت کے خدو وخال سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندو سیٹھ کی رہائش گاہ ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہندو سیٹھ

مذہبی قسم کا شخص ہو۔ عمارت کے احاطے میں بیرونی دروازے کے پاس ایک چھوٹا سا خوبصورت مندر تعمیر کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ چتروں اور طاق دانوں میں روڑ گاؤی، گلاباٹا اور رام کرشن کی مورتیاں نصب تھیں۔ مسلح راقش بدوار مجھے ایک طویل راہداری سے گزار کر کشادہ کمرے میں لے آئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اس عمارت کے مہمان خانے کا حصہ تھا۔ یہاں بھی ایک گوشے میں رام کرشن کی خیالی تصاویر آویزاں تھیں۔ کمرے کا ساز و سامان ایک پلنگ، دو کرسیوں اور ایک میز پر مشتمل تھا۔ مجھے وہاں بند کر کے باہر سے لالاکا دیا گیا۔ دو دروازوں کے علاوہ کمرے میں ایک کھڑکی اور دو روش و ان بھی تھے۔ آہم این تین راستوں پر باہر کی طرف آہنی گرل کی ہوئی تھی۔ مجھے قوی امید تھی کہ مسلح افراد اس کمرے سے باہر پوری طرح چوس ہوں گے اور اس بات کا یقین نہ رکھیں گے کہ چڑیا بھی اندر سے باہر اور باہر سے اندر نہ جا سکے۔ مجھے اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد مجھے قتل کرنے کا تیرہ کرپا ہے اور اب وہ اس سلسلے میں کوئی لاپرواہ مجھے اپنا بھی نہیں چاہتا۔ میں بیجا طور پر توقع کر سکتا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلے گا اور شیخ عاصم ایک لفظ کا تبادلہ کیے بغیر مجھ پر اپنی راقش خالی کر دے گا۔ میں سوچا کہ مرنے سے پہلے کم از کم ان کاغذات کا مطالعہ تو کر لیا جائے جو آدے بھوانی کے پریفیکس سے بنے ہیں۔ ایک نو سفر آخرت پر روانگی سے پہلے تموزا سا ناٹم میں ہاں ہو جائے گا ورنہ عالم بالا میں چیخ کر یہ حسرت نہ رہے گی کہ آدے بھوانی کے کاغذات بھی نہ دیکھے۔

میں نے دواؤں سے کاندھ سے گنڈی چڑھا دی۔ کھڑکی وغیرہ پیلے ہی اندر سے بند بھی۔۔۔ روشندان میں سے کس نے جھانکنا تھا۔ میں نے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دے کر قبض کے نیچے سے فائل نکالی اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ تلاشی لینے والے نے میری تلاشی بڑے ڈر سے سسے انداز میں لی تھی۔ نہ صرف فائل میرے پاس وہ مٹی جی بلکہ خنجر بھی ابھی تک بندلی سے لگا تھا۔ تاہم اُسٹی جھکری لگ جانے کے بعد ہی خنجر میرے لیے قریباً بے کار ہو گیا تھا۔ فائل نکالنے کے بعد میں نے اسے کھولا اور گردن پشت کی طرف موڑ کر درق گردانی کرنے لگا۔ محالے کا یہ انداز عجیب و غریب تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں امتحان کے کمرے میں ہوں اور سخت کن کن گناہ بچا کر نقل کر رہا ہوں۔ میں نے سوچ کر کھکا تھا کہ اگر دواؤں پر کھٹ بیٹ ہوئی تو فائل کو ایک صوفے کے

بچے چھپا دوں گا (فاکس کو دوبارہ نیچے میں اُڑنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا) لیکن اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کسی نے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا اور میں اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔ اس فاکس میں ایک اہم شے تو وہ تراشے تھے جو مجھے آر کے بحوالی نے مہاراج رتن کی موجودگی میں دکھائے تھے۔ ان میں سے ایک تراشہ برطانوی جریدے کا تھا اور اس میں ان گمشدہ ہتھیاروں کی تصاویر بھی تھیں جو دیگر ساز و سامان کے ساتھ یہاں ٹھیکوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اس کے علاوہ مقامی اخبارات کی کچھ خبریں اور مضامین تھے۔ ان تحریروں میں ہندو امر کے گمشدہ امانتوں کا تذکرہ تھا اور ان کا کشوں کا احوال تھا جو وہ لوگ ان امانتوں کی تلاش میں وقتاً فوقتاً کرتے رہے تھے۔ زرد جو امر اور انتہائی قیمتی سامان سے بھری ہوئی دو گاڑیاں ۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو رجمیر یا قارن سے براستہ بجنٹ نکایہ روانہ ہوئی تھیں لیکن وہ منزل تک نہیں پہنچی تھیں۔ ان دونوں گاڑیوں کے ساتھ جانے والے محافظوں کی لاشیں نیکانہ سر کے کنارے پائی گئی تھیں۔ ان لاشوں کے حوالے سے پولیس نے لمبی چوڑی تفتیش کی تھی۔ اس تفتیش کا احوال بھی ان کاغذات میں موجود تھا۔ ان کاغذات کے مطالعے سے مجھے گراں قدر معلومات ضرور حاصل ہوئیں مگر ان تمام معلومات کا تعلق ماضی سے تھا۔ یعنی اس دور سے جب یہ بیش قیمت ساز و سامان پہلی بار لاپتا ہوا تھا۔ اب اس ساز و سامان کے ساتھ دوسری مرتبہ یہ "معاذہ" پیش آچکا تھا فذاہرانی باتوں میں سر کھٹانا سانپ کی لکیر پینے کے مترادف تھا۔ میں نے فاکس کو بند کیا اور پروگرام کے مطابق اسے ایک صوفے کے نیچے مٹا دیا۔

رات نو بجے تک کسی نے میری خبر نہیں لی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے یہاں بند کر کے بھول چکے ہیں۔ عمارت میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ کھٹ پٹ کے ساتھ بھی کبھی کوئی انسانی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی بلکہ ایک دو بار تو بچوں کی چچکاریں بھی سنائی دیں۔ پھر عمارت کے اندر واقع مندر میں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ ان گھنٹیوں کی صدا اتنے ہم پڑی تو کسی پنڈت پجاری کی ہماری بھرمار آواز سنائی دینے لگی۔ کبھی یہ آواز دھیمی پڑ جاتی، کبھی بلند ہو جاتی۔ میں نے الغائب پر غور کیا تو چہ چلا کہ یہ مذہبی اشلوک ہیں یا بھاگو کی کتھا قسم کی کوئی چیز سنائی جا رہی ہے۔ بولنے والے کی آواز میں سوز تھا اور وہ کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے لیے کچھ ڈرامائی رنگ دیتا جاتا تھا۔ یہ کتھا رات دس بجے کے لگ بھگ ختم ہوئی۔ کچھ دیر بعد کرے کے دوڑانے پر کھٹ پٹ سنائی دی اور ایک اور چیز



معرض باہر میں کھانے کا قاتل لئے اندر داخل ہوا۔ چھوٹی چھوٹی پالیوں میں تین چار قسم کی ترکاری اور دال تھی۔ ساتھ میں چھوٹے چھوٹے ٹھیکے تھے کھانا لانے والے کے عقب میں ایک راتقل بردار پوری طرح چوکس کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے میری آٹنی بھڑکی ٹھونکنے کا فطوری مول نہیں لیا۔ ادھر عمر فطس میرے قریب آتی پانی مار کر بیٹھ گیا اور پتلا نوالہ بنا کر میرے منہ کی طرف بڑھایا۔ میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں بھوک کا نہ لگنا اچھے کی بات نہیں تھی۔ پھر کھانے والا بھی ایک غلیظ ٹاپاک سا شخص تھا۔ اگر تو زری بہت خواہش تھی۔ بھی تو مر گئی۔ ان لوگوں نے بھی زیادہ تکلف نہیں کیا اور قاتل اٹھا کر چل دیے۔ میں نے راتقل بردار سے پوچھا ”نڑکی کا کچھ پتا چلا؟“ میرا اشارہ غزالہ کی طرف تھا۔

راتقل بردار نے میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سنی ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔ تو زری ہی دیر بعد میں دوا زے کے تالے میں چابی کھونے کی آواز سن رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند کر گزشتہ دن کی مصوفیات کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ بہت بنگامہ خیر دن ثابت ہوا تھا۔ ذاک بیٹنگ میں صبح سویرے مدقوق بوٹا ٹکھنے نے جتنے تھے تنک رام کا ”ہولورام“ کر دیا تھا۔ تنک رام کی ذم زخم لاش ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ بوٹا ٹکھ کے ڈیلے پتلے بازو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ ہماری بھی ذبح نہیں کر سکتا گھراس نے انہی بازوؤں سے تنک رام کا تپا پانچا کر دیا تھا۔ خبر نہیں اتنی قوت اس کے منحنی جسم میں کمال پچھی ہوئی تھی۔

شاعر نے کہا تھا ”دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے“ مگر بوٹا ٹکھ نے یہ قتل بازو کے زور سے نہیں اپنے انعام کی طاقت سے کیا تھا۔ پھر میری نگاہ میں زشا کی خونچکان لاش آئی۔ وہ بموت گردنے والے حش کی مالک تھی۔ پتا نہیں کب سے دیکھنے والوں کو بموت کر رہی تھی۔ اس نے آخر وقت تک یہ فطش جادری رکھا اور جب ڈھنگ سے مر کر مجھے اور غزالہ کو بموت کر گئی۔ پھر سفیر احمد کا مزار خفا خنکایں جسم میرے تصور کو زخمی کرنے لگا۔ میں اس کی لاش کو محفوظ جاکھوں تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن بہت سی انتقام خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ میں مجبور ہو گیا تھا کہ سفیر احمد کے بے جان جسم کو اسی ویران گڑھے میں چھوڑ دوں اور اس کے ساتھ ساتھ غزالہ کو بھی غیر فطنی حالات کے شہرہ کر آؤں۔ میرے ارد گرد کے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ ان کا ساتھ دینے کی کوشش

میں دماغ لٹو کی طرح گھومنے لگا تھا۔ غزالہ کمزور لڑکی نہیں تھی۔ خاص طور پر جب مصیبت اس کے سر پر جاتی تھی تو اس کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں وہ ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خود کو شیخ عاصم کے کارندوں سے چھپانے میں کامیاب رہے گی اور موقع ملے ہی میاں سے نکل جائے گی۔ اچانک میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا کہ کہیں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ احساس پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کمرے میں بند ہونے قریب آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس دوران تین چار دفعہ لگا تھا کہ کوئی اس بند دوا زے کے آس پاس موجود ہے جو عمارت کے اندرونی حصے میں کھتا ہے۔ میں اٹھ کر دوا زے کے پاس گیا۔ چوٹی تختوں میں ایک دو باریک درزیں موجود تھیں۔ ممکن تھا کہ انہی میں سے کوئی مجھے ناؤ رہا ہو۔ میں نے درزیں آنکھ لگائی ”دوسری جانب عمل تار کی تھی۔ میں نے دانتوں سے پھینچ کر کھڑکی کا پردہ ہار لیا اور سر کی مدد سے لاش کا سوچ آف کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بھی میں نے اسی کمرے میں گزارے۔ فریہ اندام راتقل بردار اور ادھر جڑ ملازم کے سوا کسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ فریہ اندام فطس کا نام نامی دام تھا اور عام بندوں کی طرح وہ دھوٹی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے تمام قد و خال انسانی تھے۔ انسانوں جیسی ناک ”انسانوں جیسے ہونٹ“ کان، آنکھیں اور لب لیکن ان اعضا کو جب بحیثیت مجموعی دیکھا جاتا تھا تو تجانے کیوں ایک جنگی سڑکی شبیہ نگاہ میں ابر آتی تھی۔ اس کی زبانی مجھے پتا چلا کہ میری فائزنگ سے زخمی ہونے والا دشمن دہلی کے اسپتال میں ہے اور اس کی حالت نازک ہے۔ میں نے اس سے غزالہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے غزالہ کو فطش گالی دی اور بولا کہ وہ ابھی تک ان کے ہتھے نہیں چڑھی۔ اگر چہ گئی تو میرے سامنے اس کی ایسی کم تھیں کی جائے گی۔

میں نے یہ گالیاں مبرو سکون سے برداشت کیں۔ برداشت کرنے اور ہتھم کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں ان گالیوں کو ہتھم نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ یہ اس ہتھی کو دی گئی تھیں جو میرے دل کی آقاہ گمراہیوں میں مرمریں چھوڑے پر مقدس ہیولے کی طرح براجمان رہتی تھی۔ میں نے یہ گالیاں اپنے حافظے کی کتاب میں درج کر لیں اور دل ہی دل میں ”سوزنا“ سے وعدہ کیا کہ اسے اس بد زبانی کی سزا دوں گا۔ میں اب تک کی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ غزالہ عاصم کو غزالہ کے پلڑے کے پلڑے کا انتظار ہے۔ غالباً وہ چاہتا

تھا کہ میری اور غزالہ کی سزا پر ایک ساتھ عمل در آمد کیا جائے یا پھر وہ غزالہ کو میری سزا کا منظر دکھانے کا خواہش مند تھا۔ اپنی ”سزا“ کے بارے میں تو مجھے ذہن مبر شہ نہیں تھا۔ شیخ عاصم کے نزدیک میری کم از کم سزا موت تھی۔ ہاں غزالہ کے متعلق یقین سے کچھ نہیں لگتا تھا۔ غزالہ نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا۔ جو شیخ عاصم کو اس کے خلاف آگسا سکتا۔ وہ میرے ساتھ آندل سے فرار ضرور ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ شیخ عاصم کی نہیں مہاراج رتن کی تحویل میں تھی اور مہاراج رتن خود بھی شیخ عاصم سے بے وفائی کر چکا تھا۔

اگلی شب دس گیارہ بجے کے قریب ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ کمرے کے اس دوا زے پر دستک ہوئی جو عمارت کے اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا۔ پھر کسی نے بے حد آہستگی سے دوا زے کے قفل میں چابی کھائی۔ کمرے کی لائٹ آف تھی، قرب و جوار میں عمل سنا تھا۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ چند لمبے بعد دوا زہ بے آواز کھٹکا اور ننگیوں دو شہ کی ایک ٹھون سی اندر آگئی۔ میں نے اپنے سامنے ایک قبول صورت لڑکی دیکھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے میں ہزار داستان کا کوئی کردار ہوں اور ایک ریشمی رات کے غم کی گدا میں ڈوب اٹھ رہا ہوں۔ وہ لڑکی سر تا پا شباب تھی اور ہر طرح آراستہ حیرت انگیز نظر آتی تھی۔ ہونٹوں پر لالی، رخساروں پر چمک، آنکھوں میں کاجل، کانوں میں دل آویز بوندے، وہ صرف جنگلات کی ساری پہنے ہوئے تھی۔ میں نے دیکھا اس کی کلائیوں پر رنگین چوڑیوں کے اوپر مویسے کے

مجرے لپٹے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دلن ہے یا پھر ایک ایسی لڑکی ہے جو چند روز پہلے دلن ہی ہے اس کی شریقی آنکھوں میں ایک غمناک سی کیفیت تھی۔ وہ چند لمبے یک تنک میری طرف دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔ ”آئیے میرے ساتھ۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں آپ کو کسی سے ملانا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز میں ترنم کے ساتھ ایک طرح کی دعوت بھی تھی۔

میں نے دو تین لمبے سوچے میں مزے کیے پھر اس کی طرف بڑھ گیا۔ ننگیوں روشنی ایک چھوٹے بلب سے پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک مختصر کھاتا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ایٹور کی آنسوئی صورتی کھڑی تھی۔ پاس ہی ایک الماری میں بہت سی بوسیدہ کتابیں رکھی تھیں۔ ایک طرف مانتا جینے کی جگہ

بھی بنی ہوئی تھی۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ پوجا پاندہ کا کرا ہے۔ ایسی ننگیوں پر ننگے پاؤں آیا جاتا ہے لیکن میں نے دیکھ کر حیران ہوا کہ لڑکی جو تے سمیت تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے بھی پہل آدرا ضروری نہیں سمجھا۔ کمرے سے گزر کر ہم ایک طویل الماری میں آئے۔ راداری کی دونوں طرف پتھر کی جالیاں تھیں جن میں سے خوشگوار ہوا آ رہی تھی۔ ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچے۔ یہاں بہت گداز قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر ایک نہایت مونا بند سیٹھ بے خبر سو رہا تھا۔ بیکے خزانوں کی لے پر اس کی توند پھول چمک رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر قہقہہ تھا اور کانوں میں بڑے بڑے بالے لڑکی نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ میرے باپ ہیں۔ انہوں نے تین دن سے بڑت رکھا ہوا ہے۔“

میں نے سوچا ”تین دن کے برت کے بعد جس فطس کی توند اتنی توانا ہے وہ بیٹ بھر کر کھانے کا زبانت کہاں بیٹھے گی۔ ہم دونوں اس کمرے سے دبے پاؤں گزرے۔ اگلا کمرہ کسی زنانہ خواب گاہ سے مشابہ تھا۔ وہ دو دیوار میں خوشبو بھری بسی تھی۔ آدھ کھلے وارڈروپ میں زنانہ لباس دکھائی دے رہے تھے۔ بستر کے پاس ادنی ایزی کے سینڈل پڑے تھے۔ اس خواب گاہ میں پہنچ کر میرے اندیشے حقائق کے قالب میں ڈھلنے لگے۔ رات کے اس پہر ایک بنی سنوری لڑکی مجھے نہایت خاموشی کے ساتھ ”بندی خانے“ سے نکال کر اس رنگین خلوت میں لے آئی تھی۔ کمانیوں اور ناولوں میں یہ بہت پرانا ”دوستو“ ہے کہ قیدی حضرات کو حسین و جمیل لڑکیاں اپنا امتدان پیش کرتی ہیں۔ اس چوبیس میں قیدی عموماً نودان ہوتا ہے اور لڑکی کا فطش انہی لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے نوجوان کو پا بے زنجیر کر رکھا ہوتا ہے اس واقعے کے بعد اکثر ایک زبردست قسم کا ایڈو نجر شروع ہو جاتا ہے جس میں تموزا تموزا درواں بھی جھٹک دکھاتا رہتا ہے شاید میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا تھا۔ اگر نہیں ہونے والا تھا تو یہ فتنہ سامان غارت گردین و ایمان مجھے یہاں کیوں لے کر آئی تھی۔

”بیٹھ جائیے“ اس نے بڑی نرمی سے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس کی پیشکش قبول یا رد کرتا، اس نے اندر سے دوا زے کو مقفل کر دیا۔

مجھے اپنے کانوں میں شیطان لعین کے ہر دی کی پھر پھراہٹ سنائی دینے لگی لیکن بیٹھنا تو بہر حال تھا۔ میں ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔ لڑکی ایک اوٹے بے نیازی سے



”پھر یہ سب کیسے ہو گا؟“

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں جیج جیج تمہیں اس کمرے سے باہر لے جاؤں گی۔ تو مشرے ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ میں چاہوں بھی تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے جسے بتایا ہے تاکہ اس گھر کی دیواریں بست اور بجلی ہیں۔ میں گھر کی دہلیز پر قدم رکھوں تو نگران نگاہیں چوسک ہو جاتی ہیں۔ میں مستان خاندان کی عزت ہوں۔ مجھے سات پردوں میں چھپا کر باہر نکالا جاتا ہے اور جب تک باہر رہتی ہوں میرے سانس سر کی جان ٹھکنے میں آتی رہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تو وہ قلم۔ وہ ہوئی۔ اور رقص وغیرہ؟“

وہ مسکرائی۔ ”وہ سب انتظام اسی کمرے میں ہے۔ یہ دیکھو اس الماری میں یہ چھوٹا سا پردہ بیکٹر پڑا ہے اور اس ڈبے میں مکمل قلم ہے۔ کچن میں ہمارا جیج تیار پڑا ہے اور یہ دیکھو یہ ہے ”ادون“ میں گرم گرم کھانا بھی ابھی ہمارے سامنے سبز گولوں کی۔ میوزک رقص ہر شے سب کچھ یہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے نا۔ اگر اصل نہیں۔ تو اصل کی جھلک ہی سہی۔ ہم یہ سب کچھ اسی کمرے میں کریں گے اور تصویریں کریں گے کہ فرید کوٹ میں آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں۔“

مشری کی بات سے مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ میں ابھی تک فرید کوٹ میں ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرید کوٹ کا کون سا علاقہ ہے اور میں درحقیقت کس شخص کی تحویل میں ہوں۔

وہ بولی۔ ”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ جیج عمر ہے اور تم میرے مشرینہ رام داس جی کی کوٹھی میں ہو۔“

عجب گورکھ دھندلا سی لڑکی تھی۔ پہلے لگتا تھا کہ اس کا کوئی جیج جیلا ہے لیکن اب چاروں خانے دف نظر آتی تھی۔ اس نے بستر لینے لینے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور اس کی آنکھوں میں نمٹے کا دریا بہنے لگا۔ دلنشین انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”تو چلیں پھر سہما گھر؟“

میں نے کہا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مشر کا قیدی ہوں اور ہو کے رحم و کرم رہوں۔“

وہ اٹھا کر الماری کی طرف بڑھی اور پردہ بیکٹر نکال کر اسے ایک میز پر ایڈجسٹ کرنے لگی۔ اس کام میں وہ خاصی ماہر لگتی تھی۔ دو چار منٹ میں اس نے سب کچھ تیار کر لیا۔ پردہ بیکٹر آن کرنے کے بعد زیر و پا در کا لب بھی بچھا دیا گیا۔

سامنے سفید ساٹ دروازہ پر تین فٹ ضرب دو فٹ کی شاندار تصویر نمودار ہو چکی تھی۔ یہ امپورٹڈ پروڈیکٹر تھا۔ بے آواز چلا تھا اور تصویر بہت واضح تھی۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور قلم دیکھنے لگی۔ اس کے گداز بدن سے اٹھنے والی مک مویٹ کی خوشبو سے مل کر ایک جاوٹی اثر کی حامل ہو گئی تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور جو مشریتا نے مجھے اس خاندان کے بارے میں بتایا تھا اس کے مطابق یہ کٹر مشر کے مذہبی لوگ تھے۔ ہونیڈوں کو سات پردوں میں رکھتے تھے اور خود بھی سر تاپا کتہ عقائد کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے لیکن اس خاندان کی ایک دو دھوا نے تمام تربیاتیوں کے باوجود ایک آزاد چین تک رسائی حاصل کی تھی۔ مختلف ثبوت میرے سامنے تھے اس کا گھڑا بھری خور تھا لیکن اس نے اپنے لیے پکن کارن سوپ اور ڈرم اٹکس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک پردہ بیکٹر تھا جس پر رومان انگیز ہندی فلم چل رہی تھی اور وہ ایک ابھری شخص کے پلو سے چکی بیٹھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نچانے کون کون سی آزادیاں تھیں جو اس نے اپنے لیے ان سات پردوں کے اندر مٹا کر رکھی تھیں۔ جیج بے دریا کے آگے ریت کے بند نہیں بناوے جاسکتے اور نہ پونپھنے کے بعد سورج کو چھپنے سے روکا جاسکتا ہے۔



خواب گاہ کی تاریکی میں قلم رواں دواں رہی۔ مشریتا نے آزادی و جمہوریت کی گڑھی گڑھی تھی۔ جب کوئی گانا آتا یا بلند آہنگ میں مکا لے بولے جاتے تو وہ آواز کچھ اور دھیمی کویتی۔ یہ حال شب کے سناتے میں یہ مذہم آواز بھی ہمارے لیے کا تھی۔ اچانک کمرے میں گھپ اندر آکر چھپا گیا۔ لائٹ چلی آ تھی۔ پردہ بیکٹر کے ساتھ ساتھ چھپتا بھی بند ہو گیا۔

”اوہ گاڈ“ مشریتا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”لائٹ کو بھی اب ہی جانا تھا۔“ ہم نام کی میں غراب اپنی جگہ ساکت بیٹھ رہے۔ ایک دو منٹ کے اندر اندر کمرے میں جس محسوس ہونے لگا۔ موسم گرم تھا۔ بند کمرے کی چھلکے کے بغیر ساموں سے پسینہ چھوٹنا شروع ہو گیا۔ گھر دوسرے حصوں میں سوئے ہوئے افراد بھی نیم بند رہ رہے تھے۔ کسی قریبی کمرے سے مسلسل کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ جس وسیع کمرے سے گزر کر ہم اس بیڈا میں پہنچے تھے وہاں سے بھی آہنیں ابھر رہی تھیں۔ اس مطلب تھا کہ ہمید نماوند والا سیٹھ بھی جاگ گیا ہے۔

”ہائے رام“ مشریتا کے منہ سے ذری ذری آواز نکلی

”وہ بھگتو رام! کہاں مر گیا ہے تو؟“ ہاچس کہاں ہے؟“ سیٹھ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ پھر کوئی دھیرے دھیرے لکڑی کی کھڑاؤں پر چلا راہدار کی طرف بڑھا۔

مشریتا نے مجھے کمرے میں ہی مشریتا کا اشارہ کیا اور اپنے مشر کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کو شش میں اسے کیس ٹھوکر بھی لگی اور اس کے منہ سے ”گف“ کی آواز نکل گئی۔ اس کی واپسی پانچ دس سیکنڈ بعد ہوئی۔ اس نے اپنے رزٹے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھاما اور ہانپتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔ ”دھما کے کی آواز آئی تھی“ میرا خیال ہے کہ ٹرانز فامر آگیا ہے۔ ویسے بھی سب جاگ گئے ہیں۔ ہمیں اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔ آؤ... میں نہیں واپس چھوڑ آتی ہوں۔“

اس نے میرا بازو کندھے کے پاس سے تھام لیا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اگر کہیں ٹھوکر لگتی تو میں منہ کے بل گرنا۔ سیٹھ رام داس غالباً ہاچس ڈھونڈنے کمرے سے نکلا ہوا تھا۔ اس کی چوٹی کھڑاؤں کی آواز کچھ فاصلے سے آ رہی تھی۔ مشریتا نے مجھے ہال نما کمرے سے گزرا اور راہدار کی میں لے آئی۔ چترپتی چالیوں دلی۔ راہدار کی کسی وسیع لان کے درمیان سے گزرتی تھی۔ چند لمحوں بعد ہم پوچھا پانچ کے مختصر کمرے سے گزرے اور اس دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ جو میرے ”بندی خانے“ میں لگتا تھا۔ مجھے ”بندی خانے“ میں دو چھلک کر مشریتا نے زنان خانے کی طرف کھلنے والا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

وہ ساری رات میں نے مسمان خانے کے اس بند کمرے میں بیچ و تاب کھاتے گزار دی۔ مشریتا کے اندازے کے عین مطابق بجلی تمام رات نہیں آئی۔ پسینہ دھاروں کی صورت جسم سے بہتا رہا۔ صبح دس بجے کے قریب چلنے میں حرکت پیدا ہوئی۔ ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی حرارت اور تپش کی ایک بلند دھارا لہری آئی۔ یہ لہری شیخ عاصم بن ارشد کی صورت میں تھی۔ اس نے قریباً اڑتالیس گھنٹے بعد مجھے اپنی صورت دکھائی تھی۔ اس کی پیشانی اور ایک ہاتھ پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ چوٹیں اسی حادثے کی نشانی تھیں جو اسے ہمارے عقاب کے دوران میں پیش آیا تھا۔ شیخ عاصم کے بال منتشر چھوڑ کر آلود اور آنکھیں سرخ تھیں۔ یہ آثار بتا رہے تھے کہ وہ اب تک پوری تندی سے غزالہ کی تلاش میں رہا ہے۔ وہ جھنجھلا ہوا بھی تھا اور اس جھنجھلاہٹ سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا

کہ وہ اپنی تلاش میں ناکام رہا ہے۔ اس کی ناکامی کو محسوس کر کے میرے رگ و پے میں عجیب طرح کی طمانیت دوڑ گئی۔ شیخ عاصم شکاری لباس میں تھا۔ اس کے عقب میں ”ہٹا کتا“ نامی رام ذہیل ٹورا نقل تھا جسے چوسک لگتا تھا۔ اس کا زور دار دھماکا کھا کر میں اونٹھے منہ فرش پر گر گیا۔ اس کے بعد جیسے مجھ پر وزنی ٹھوکوں گولوں اور گلیوں کی بارش ہو گئی۔ شیخ بھی بڑی دھشت کے ساتھ اور بے دریغ مار رہا تھا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے مار مار کر جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ یعنی بھائی میں کہا جائے تو کہیں گے کہ ”تھان مار دنا“ چاہتا تھا۔ میں حتی الامکان اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مرنے سے انکار نہیں تھا لیکن بد ٹھکل ہو کر مرنے والا آہیڈیا کچھ دل کو نہیں لگ رہا تھا۔ شیخ عاصم کی انگریزی غرا نہیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ان غراہٹوں میں پچھلے سات برسوں کے اندر جمع ہونے والی تمام آگ، نفرت اور کدورت موجود تھی۔ میرے منہ میں خون کا ٹنگین ذائقہ مکمل چٹکا تھا۔ وائیں جانب کی پلیوں میں بھل کے نیچے جیسے انگارے سے بھرے گئے تھے میں سوچ رہا تھا شاید ایک دو پلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ یہ بات واضح تھی کہ اگر میں نے مزاحمت نہ کی تو شیخ عاصم کے غضب کا چڑھا ہوا دریا مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا جائے گا۔ فرش پر لوٹ پٹ ہوتے ہوتے میں نے اچانک اپنے جسم کو جھکا دیا اور میری ٹانگ بھر پر طریقے سے شیخ عاصم کی اڑیوں سے ٹکرائی۔ کراٹے کی اصطلاح میں اس ضرب کو ”سویپ“ کہا جاتا ہے۔ ٹانگ درست ہو اور ضرب نشانے پر لگے تو یہ مقابل کے پاؤں تلے سے جیج زمین نکل جاتی ہے۔ شیخ عاصم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ چپکے فرش پر کھڑا تھا۔ سوپ لگی تو اس کی ٹانگیں ہوا میں بلند ہو گئیں اور وہ پشت کے بل فرش پر گر کر گرے گا یہ انداز بڑا مضحکہ خیز تھا۔ شیخ کو سخت چوٹ بھی لگی تھی۔ ایک دو لمحوں کے لیے وہ کھٹے میں رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرنا یا دروازے پر کھڑا نامی رام اپنے مسل ہونے کا حق ادا کرنا میں زب کر شیخ عاصم کے اوپر گر کر۔ میری ٹانگیں اس کی کمرے لٹ چکی تھیں۔ نامی رام نے رات نقل سیدھی کی گردہ فائر کھولا تو میرے ساتھ شیخ عاصم بھی پار ہو جاتا۔ وہ جھونکا سا کھڑا تھا جب کوٹھی کے بیوی کیٹ کے پاس پولیس کارڈ کے تیز مارن سٹائی دیے سمجھ سمیت کمرے میں موجود ہر فرد ٹھک گیا۔ شیخ عاصم نے ایک جھٹکے سے خود کو میری ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کیا پھر اپنی خجالت کم کرنے کے لیے ایک زوردار ٹھوکر میری کمرہ رسید کی اور غرا نا ہو دروازے کی

طرف بڑھا۔ مامی رام اس سے پہلے ہی صورت حال جاننے کے لیے باہر نکل چکا تھا۔ اب کمرے میں صرف ایک شخص موجود تھا۔ مامی رام کے باہر نکلنے ہی اس نے جب سے ہسٹل نکال کر بیچے کوڑ کر لیا تھا۔ چند لمبے بعد شیخ عاظم دوبارہ کمرے کے دروازے پر نظر آیا۔ وہ کان کھیرایا ہوا تھا۔ اس نے مامی رام سے اشاروں میں کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لے اور مجھے اپنی گمن کے نشانے پر رکھ۔ مامی رام نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ وہ دروازہ اندر سے بند کر کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ نرپل ٹورا نقل کی ٹال میرے سینے کی جانب اٹھی تھی۔ مامی رام کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے شوٹ کرنے سے پہلے زیادہ سوچ بچار نہیں کرے گا۔ ”خبردار“ وہ نہایت گرفت آواز میں بولا ”کوئی آواز نکالی تو رام قسم ڈھیر کر دوں گا۔“

دروازے پر باہر بھاری بوٹوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ مختلف آوازیں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس کی بھاری جمیت کو بھی میں ٹھکنے لگی ہے۔ ان پولیس والوں کے ساتھ ایک اسٹنٹ کشنر بیٹن نہیں موجود تھا اور وہ اعلیٰ خانہ سے پوچھ بچھ کر رہا تھا۔ یہ بات جیت اس کمرے کے عین سامنے ہو رہی تھی جہاں مامی رام مجھے راتقل کے نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اسٹنٹ کشنر کے ساتھ بات کرنے والا وہی قریہ اندام سیٹھ تھا جسے میں نے کل رات پھیل کر کمرے میں سوئے دیکھا تھا اور جس کے بارے میں شرتیانے بتایا تھا کہ اس کا نام سیٹھ رام داس ہے اور وہ بد قسمتی سے اس کا سر ہے۔ اسٹنٹ کشنر نے باؤربے لیے میں کہا۔ ”رام داس

نی! ہماری لسٹ کے مطابق آپ کے پاس تین راتقلوں اور دو ریو لووروں کے لائنسن ہیں۔ دو لائنسن آپ کے نام ہیں جب کہ تین آپ کے بیٹوں کے نام کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟“

”درست کہہ رہے ہیں آپ“ سیٹھ نہایت برہم آواز میں بولا۔ ”لیکن میری سمجھ میں ہے نہیں آپ کا کہ یوں میرے گھر پہ چھاپا مارنے اور لائنسن یافتہ ہتھیاروں کی پڑا ل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے آپ کو؟“

اسٹنٹ کشنر نے خنگ لیے میں کہا۔ ”آپ کی پرہی بجا ہے لیکن ہم بھی مجبور ہیں۔ آپ سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہوگی کہ ہندو سکھ فساد فرید کوٹ میں اب تک تین درجن انسانی جاںیں لے چکا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اعلیٰ حکام کو شبہ ہے کہ سرکردہ افراد کا لائنسن یافتہ اسلحہ فسادوں کے استعمال میں آ رہا ہے ہمیں آؤر دڑ آئے ہیں کہ فرید کوٹ میں لائنسن یافتہ اسلحہ چیک کیا جائے

ہمارے ریکارڈ کے مطابق آپ کے پاس پانچ ہتھیار ہیں۔ آپ صرف اتنا کٹ کریں کہ ہمیں یہ ہتھیار ملاحظہ کرادیں۔“

سیٹھ رام داس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”بھلے مانس شریوں کو تنگ کرنے کے لیے یہ اچھا جوہنک رچایا ہے آپ لوگوں نے میں اس سلسلے میں چپ نہیں رہوں گا۔ میں اپنی شکایت گورنر صاحب تک پہنچاؤں گا۔“

اے سی نے اس دھمکی کا اثر قبول کیے بغیر کہا۔ ”آپ شکایت کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ بہر حال ہم اپنے فرض سے مجبور ہیں۔ آپ کو پکا کر کے اپنا اسلحہ چیک کرادیں۔“

سیٹھ نے بلند آواز میں کسی بدری پر شاد کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ صاحب بنوار کو لائنسن یافتہ اسلحہ چیک کرادے۔ بدری پر شاد گویا اور تھوڑی دیر بعد اسلحہ لے آیا۔ کھٹ پٹ کی آوازیں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اے سی صاحب اور پولیس انسپکٹران اسلحے کی پڑا ل کر رہے ہیں۔ ”ایک نرپل ٹورا نقل ان میں نہیں ہے؟“ اے سی کی بھاری بھر کم آواز آئی۔

”وہ وہ خراب تھی۔ مرمت کے لیے مہنی ہوئی ہے۔“ سیٹھ رام داس نے ہمان تراشا۔ میں جانتا تھا یہ ہمان ہے کیونکہ راتقل میری آنکھوں کے ساتھ مامی رام کے ہاتھ میں تھی۔

اے سی نے کہا۔ ”اگر مرمت کے لیے مہنی ہے تو یقیناً آپ کے پاس رسید ہوگی۔ رسید نہیں ہے تو اس درکشاپ کا پتا بتائیے جہاں مرمت ہو رہی ہے، ہم ابھی پتا کوائے لیتے ہیں۔“

سیٹھ نے مزید برہم ہو کر کہا۔ ”آپ ہال کی کھال اُتار رہے ہیں۔“

اے سی بولا۔ ”ہمیں کھال اُتارنا پڑتی ہے۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے یہاں سے دو فلاگ دور ہم نے چودری ست زائن سنگھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا ہے۔ ان کی دو راتقلیں بھی ”مرمت“ کے لیے لے گئی ہوئی تھیں۔ وہ مرمت طلب راتقلیں ہم کل رات دو سکھ فسادوں سے برآمد کر چکے ہیں۔ کیا سمجھے آپ؟ اگر آپ لوگ اسی طرح اسلحہ دے دے کر سر پرچمے غنڈوں کو آپس میں لڑاتے رہیں گے تو بات کہاں پہنچے گی۔“

سیٹھ نے کہا ”آپ لوگ ایک شریف شری پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ آپ کو اس کا تھانہ بھگتنا ہوگا۔“

اے سی بھی تڑکی پر تڑکی بولا۔ ”دیکھو سیٹھ جی۔ بحث سنا کوٹ کا کام ہے، میرا نہیں اور نہ ہی میرے پاس اذ وقت ہے آپ راتقل ملاحظہ کرادیں یا پھر آپ کے خلاف

آمریکاٹ کے تحت کیس درج ہوگا۔“

بحث نے طول پکڑا تو سیٹھ دھیملا پڑنے لگا۔ اس نے لازم بدری پر شاد سے پوچھا کہ چوکیدار پارے لال کہاں ہے وہ اے سی پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ راتقل کے بارے میں اصل معلومات چوکیدار کے پاس ہی ہیں اور عین ممکن ہے کہ راتقل مرمت ہو کر واپس آچکی ہو۔ بدری پر شاد اپنے سیٹھ کی ہدایت پر چوکیدار کو دھونڈنے لکل گیا۔ سیٹھ رام داس نے اے سی (اسٹنٹ کشنر) سے کہا، چلیں نشست گاہ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ سیٹھ کا ارادہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اے سی اور پولیس والے یہاں سے کل جائیں تو مامی رام راتقل لے کر باہر آجائے یہ راتقل نشست گاہ میں جا کر اے سی کو ملاحظہ کرادی جائے۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ میں اس موقع پر کوشش کرتا تو باہر کھڑی پولیس کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا لیکن پولیس کو متوجہ کر لیتا اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ شیخ عاظم میرا دشمن تھا تو انڈین پولیس بھی چچن نہیں تھی۔ وہ لوگ فرید کوٹ کے کئی کچوں میں باؤلے کتوں کی طرح استاد جانی کو دھونڈتے پھر رہے تھے جو زور جوہر سے بھرا ہوا ترک لے کر ہندوستانی علاقے میں داخل ہوا تھا اور فرید کوٹ میں خوزیر فساد کا سبب بن گیا تھا۔ ابھی میں اسی آؤجھڑی میں تھا کہ کمرے کے دروازے کے باہر ایک لڑوہ خیر نسواری چچ سنائی دی۔ یہ چچ اسی دروازے سے سنائی دی تھی جو غمراہ کے

اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا اور جس میں سے گزار کر کل رات شرتیا مجھے اپنی راتقلیں خلوت میں لے کر گئی تھی۔ چچ کی آواز اور خاص طور سے نسواری چچ کی آواز بہت تیز اور اڑیک ہوتی ہے۔ اس آواز کی شناخت اکثر مشکل ہوتی ہے۔ میں ممکن تھا کہ چیخنے والی شرتیا ہی ہو مگر میں پہچان نہیں سکا۔ چچ بلند ہوتے ہی مامی رام کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے ہراساں نظموں سے پہلے اندرونی دروازے کی طرف اور پھر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ یقیناً باہر کمرے پولیس والے بھی چوکتا ہو چکے تھے۔ اے سی نے باؤربے لیے میں کہا۔ ”یہاں کون بند ہے سیٹھ صاحب؟“

”گگ۔ کوئی نہیں۔ معلوم نہیں کون چنچا ہے۔“ سیٹھ نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

”شاید کوئی نوکرائی ہے“ بدری پر شاد کی ابھنن زدہ آواز آئی۔

”اس کمرے کا دروازہ کھلو اتیں سیٹھ صاحب“ کسی پولیس آفیسر نے ٹھکم سے کہا۔

”میرا خیال ہے“ آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں“ یہ شیخ عاظم کی آواز تھی۔ وہ بڑی طرح دار انگلش میں گویا ہوا تھا۔ اس کی آواز اور میرے مقتول راشد بن ارشد کی آواز میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔

”آپ چچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں؟“ اے سی نے انگلش میں شیخ عاظم سے دریافت کیا۔

”میں سیٹھ صاحب کا کسمان ہوں اور نہ ہی ہوتا تو تم لوگوں کا یہ توہن آمیز رویہ برداشت نہ کر سکتا۔“

بحث طول کھینچ رہی تھی اور تمام آوازیں کمرے میں سنائی دے رہی تھیں۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس کی بھاری جمیت کو بھی میں موجود ہے اور شیخ عاظم و سیٹھ رام داس بے حد برہم ہونے کے باوجود قحط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ آخر پولیس والوں نے کمرے پر چھائی کر دی۔ دروازے کو چند زوردار دھکے دیے گئے۔ دروازے کو صرف چھٹی چھائی مہنی تھی۔ وہ آؤجھڑی اور پولیس والے دندنا تے ہوئے اندر ٹھس آئے۔ ان میں انسپکٹروں کے علاوہ چند کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل بھی تھے۔ مامی رام کو راتقل بدست اور مجھے لولمان ویکر پولیس والوں نے بھی اپنی راتقلیں سیدھی کھیں۔ ایک انسپٹر نے آگے بڑھ کر اپنے ریو لوور کی ٹالی مامی رام کی تپتلی سے لگائی اور اس کے ہاتھوں سے نرپل ٹورا نقل چھین لیا۔ اسے میں اے سی صاحب بھی اندر آئے وہ درمیانے قد کے کورے پٹے صاحب تھے۔ عمر

علیہ الحق حقہ کے دو ناول

قیمت 15/-

پر پامتا ببول

قیمت 15/-

علی مہاں پبلی کیشنز عزیز ناریٹ اردو بازار لاہور

چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور پوچھنے لگے "تو کی کہاں ہے؟" ان کا اشارہ چیخنے والی لڑکی یا عورت کی طرف تھا۔

میں نے کہا "وہ شاید اس ساتھ والے کمرے میں ہے۔" اے سی صاحب اور پولیس انسپکٹر ان کے کمرے کے اندر دھکی دھکائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چند کھانسیاں بھی بازوؤں سے پکڑ کر باہر آئے۔ میرے ہاتھ بدستور جھکری میں جکڑے ہوئے تھے۔ کرتے کا گریبان پھٹ چکا تھا۔ ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور ایک جانب کی پٹیلیوں میں انگارے سے بھرے ہوئے تھے۔ شیخ عاصم کی پرانی چوٹیوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ اس نے پولیس کی آمد سے قبل مجھے اتنے جوش و خروش سے زدکوب کیا تھا کہ اپنے زخموں کے نیچے بھی آگیزہ لے رہے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ اسی طرح مجھے جان سے مار دیتے کا ارادہ رکھتا ہو۔

پولیس والوں کے درمیان کچھ دیر کھڑے پھڑپھڑ رہی۔ پھر مجھ پر یہ اعشاف ہوا کہ مجھے بطور استاد جانی لیا گیا ہے۔ ایک موٹا تازہ پولیس افسر جس کے کندھے پر انسپکٹر کے پھول لگے تھے، میرے قریب آیا اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "چلو استاد جانی صاحب، گاڑی میں بیٹھو۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اے سی سمیت پولیس کا تمام عملہ مجھے حیرت آمیز دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ باندھے تھے اس کے باوجود وہ کھانسیوں نے مجھے گرن پائنت پر رکھ لیا اور کونسی کے گیٹ کی طرف لے چلے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ ایک دم پانی ساری باتیں بھول گئے ہیں۔ گمشدہ راتقل "تو کی کی چیخ" سیٹھ رام داس کی دروغ گوئی، شیخ عاصم کی مداخلت ہے جا آئیں کچھ دیا نہیں رہا تھا۔ میرے اطراف میں راتقلوں کی کونکڑا ہٹ اور وزنی بوتلوں کی ٹھک ٹھک تھی۔ میں تیس قدم چل کر اس کونسی سے باہر نکل آیا جہاں دین دھرم اور شرافت کے سات پردوں کے اندر ایک گناہ گار لڑکی رہتی تھی۔ معلوم نہیں اسے کتنا گار کتنا درست بھی تھا یا نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں نے کل رات صرف ایک خواب ہی دیکھا ہو لیکن نہیں۔ وہ خواب نہیں تھا اور نہ ہی وہ جو خواب تھی جو تھوڑی دیر پہلے مجھے سنائی دی تھی۔ میں اس چیخ کے بارے میں کبھی نہ جان سکا کہ وہ کس کی تھی اور کیوں ابھری تھی لیکن ایک یقین سا ہے کہ وہ شرتی ہی کی چیخ تھی۔ وہ کسی کو نہ کھدے سے

سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ پولیس والے مستوب قیدی کو (یعنی مجھے) اس کے حال پر چھوڑ کر نشست گاہ کی طرف چلے جائیں گے تو اس نے عورت ہونے کے حوالے سے سچ مارنے کا "حق" استعمال کیا اور پولیس والوں کو سرخ جھنڈی دکھا دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک لڑکی کی نہیں "مفلطت" کی چیخ تھی۔ فطرت جو کسی حال میں پابند نہیں ہوتی اور ظلم و جبر کے خلاف ہر دور میں بغاوتوں کا پرورش کرتی ہے۔

مجھے پولیس کی ایک بند دین میں بٹھا دیا گیا۔ میرے ارگرد آنکلوں کا پھرا تھا۔ ایک جیب میں اے سی صاحب، دودھ اور انسپکٹر براجمان ہو گئے۔ دین کے عقب میں پولیس کی ایک اور گاڑی موجود تھی۔ اندھا میں داخل ہونے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں انڈین پولیس کے پتے چڑھا تو میں عرصہ پانچ سال سے کئی مقدمات میں ان لوگوں کو مظلوم تھا۔ یقیناً ان میں سے کئی مقدموں میں مجھے اشتہاری بھی آوا جا چکا ہوگا۔ پھر تازہ بہ تازہ مقدمے بھی موجود تھے جن اہم ترین اور حیرت ناک مقدمہ اس جادوئی ٹرک کا تھا اپنے پیٹ میں ہفت اقلیم کی دولت سیٹھے چالیس چودوں کسی بڑا اسرار غار میں دیو پوش تھا۔ ان لوگوں کی موج تھی۔ آپ ان میں سے بیشتر کی تعریفی اسناد اور ترقیاں و کفر تھیں۔

دین کی کھڑکیوں پر نیلگوں پر دے کھینچے تھے۔ کچھ پتا چل رہا تھا کہ ہم فرید کوٹ کے کس حصے کی طرف جا رہے ہیں۔ ٹریفک کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی ہم کے بارونق علاقے میں داخل نہیں ہوئے۔ اچانک وہ رفتار آہستہ ہوئی اور وہ سڑک کے کنارے روک گئی۔ اور گرد و پیش پولیس والے الرٹ نظر آنے لگے۔ میر گردن موڑ کر دیکھا۔ وڈا اسکریں کی دوسری جانب سڑک منظر نظر آ رہا تھا اور یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ دین کے جانے والی جیب کا راستہ ایک مریدیز کار نے روک رکھا۔ کار سے تین سٹو پولیس والے برآمد ہوئے۔ ان کے عقب ہاتھوں میں جدید خود کار رائفلیں تھیں۔ ان کے عقب سفید پوش نظر آتے تھے اور وہ بھی مسلح تھے۔ ایک با پولیس والا اسٹنٹ کشنری جیب کے پاس جا کھڑا، اس سے بات کرنے لگا۔ پولیس والے کے بچوں سے رہا تھا کہ وہ ایس پی ہے۔ کسی بات پر ایس پی اور انسپکٹر میں تلخ کھائی ہوئی۔ اسٹنٹ کشنری ایس پی کرنے کے لیے باہر نکلتا چاہ رہا تھا جب اچانک الیر

بولے۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو جانی صاحب، ہمارے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔"

میرے ذہن میں اچھل سی پچی ہوئی تھی۔ میں جنہیں اصلی پولیس والے سمجھ رہا تھا وہ جلی تھے اس کا مطلب تھا کہ جنہیں میں جلی سمجھ رہا تھا وہ اصلی تھے۔ میری نگاہ میں وہ منظر محسوس کیا جب ایس پی لب سڑک تڑپ رہا تھا اور اس کے سامنے دفاعی فائرنگ کرتے ہوئے مریدیز میں ٹھس رہے تھے۔ میں سڑک پر بیٹھ گیا۔ عجیب جھلکی سی پچی ہوئی تھی میرے ارد گرد جیسے میں آستار جانی نہ تھا، کسی کھیل میں استعمال ہونے والی گیند تھا جس پر برق رفتار کھلاڑی بھٹ رہے تھے، ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں "اب میں کس ٹیم کے ہاتھ میں تھا۔ اچانک میری یہ مشکل آسان ہو گئی۔ میں نے ایک ہونے کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ٹرسے لیے ایک جانب سے برآمد ہوا اور بڑی چستی سے چلتا "پولیس والوں" کے قریب پہنچ گیا۔ ٹرسے میں شراب کی بوتلیں اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ کینیا سے در آمد شدہ خوراک ہونے کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ مجھے کس پارٹی کی "سہانی" کا شرف حاصل ہوا ہے۔ لنگرو والے ٹیلے میں مجھے کھانے کے بعد قاور زباں نے میرا پیچھا جاری رکھا تھا اور ایک بار پھر میں اس کے آہنی جھوں میں تھا اور قاور زباں کے جھوں میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے خوراک ترین دشمن شکر شکر کے علاوہ افراتیم اور عیسی جان وغیرہ سے بھی میری ملاقات ہونے والی ہے۔ ان محسوس چوں کو یاد کر کے میرے جسم میں پھر ہی سی دھڑکنی۔ میں نے تقریباً تین گھنٹے اسی کمرے میں گزارے۔ ہر گھڑی میں توقع کرتا رہا کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور طلع جنگ کے سفاک ترین جاکھار دار قاور زباں کا بھار میں پتا ہو چھو میرے سامنے آجائے گا لیکن قاور زباں وہاں نہیں آیا۔ ہاں ایک بار راتقل بدوار کے زبر سایہ ایک سختی سا شخص ضرور اندر داخل ہوا۔ اس نے میری مرہم پٹی کی اور بڑی احتیاط کے ساتھ میری جامہ تلاشی لی۔ اس جامہ تلاشی میں وہ تجربہ بھی برآمد ہو گیا جو اب تک میری پندلی سے پوست تھا۔

شام سے تھوڑی دیر بعد مجھے کھانا دیا گیا۔ کھانے میں چاول، مہزی اور گوشت کے علاوہ دودھ بھی تھا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ غنودگی بے وقت اور غیر متوقع تھی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ کھانے میں خواب آور دوا دی گئی ہے۔ ذہن بڑی سرعت سے ایک دھندلک میں پھنسا جا رہا تھا۔ جب کسی شخص کو یہ پتا

وردی والے شخص نے ہولسٹرے ریوالور نکال لیا۔ یہ بڑا سنی خنجر منظر تھا۔ ایک سرکاری اہلکار دوسرے اہلکار پر اسلحہ تین رہا تھا لیکن ابھی میں یہ منظر پوری طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اسٹنٹ کشنری جیب سے خود کار راتقل کا فائر ہوا۔ ایس پی کی وردی والا لاکڑا کر سڑک پر گر گیا۔ اسی دوران میں مریدیز گاڑی کی ایک کھڑکی سے تباہ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ اسٹنٹ کشنر خود کو بمشکل اس فائرنگ سے بچا سکا۔ مریدیز سے نکلنے والے افراد نے حالات سنگین ہونے دیکھے تو پھرتی سے واپس گاڑی میں ٹھس گئے۔ مریدیز کے پتے چڑچڑائے اور وہ بڑی تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب یہ اندازہ لگنا دشوار نہیں تھا کہ مریدیز میں سوار افراد جلی پولیس والے تھے۔ پولیس پارٹی کی طاقت کا اندازہ لگانے بغیر انہوں نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی اور زبردست مزاحمت کا سامنا کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

ایس پی کی وردی والا سڑک پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ ہماری دین کے پیچھے آنے والی جیب دامن جانب مڑ گئی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ مریدیز کے پیچھے نکلی ہے۔ اے سی صاحب والی گاڑی اپنے سابق راستے پر متحرک ہو گئی۔ ہماری دین بھی اس کے پیچھے چل دی۔

دونوں گاڑیوں نے بڑی تیز رفتاری سے دھاتی تین میل کا فیصلے طے کیا اور "ہائی وے" کو طے کر کے ایک بارونق علاقے میں داخل ہو گئیں۔ میرا خیال تھا کہ ہماری منزل کوئی پولیس اسٹیشن ہوگی جہاں پہنچ کر مجھے لاک اپ میں بھیج دیا جائے گا اور مقامی پولیس کے سخت ترین گڑگڑے مجھے آڑے ہاتھوں لے لیں گے لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوئے۔ قانے کے بجائے مجھے ایک کونسی میں پھنسا گیا اور خوات کے بجائے ایک آرام دہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرے میں ایک وسیع و عریض کھڑکی موجود تھی۔ اس میں جالی اور لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ گرل میں سے میں برآمدے کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ اسٹنٹ کشنر اور انسپکٹروں سمیت وہاں تمام عملہ موجود تھا۔ وہ سب خوش نظر آ رہے تھے۔ مونے تازے انسپکٹر نے اپنی ٹوپی اتار کر ہوا میں اچھالی اور اسٹنٹ کشنری کمرہ پر دھول جھاتے ہوئے بولا۔ "راجا جانی! ایک سگریٹ کشنری کمرہ پر دھول جھاتے ہوئے بولا۔ "راجا جانی! اسٹنٹ کشنر نے کہا۔ "پیارے، سگریٹ تو کیا جان بھی حاضر ہے۔ آج تو تیری کارکردگی پر قریان ہونے کو دل چاہ رہا ہے۔"

مونے انسپکٹر نے گردن کھٹائی اور مجھے گھورتے ہوئے

چن ہے کہ اسے دھوکے سے کچھ کھلا پلا دیا گیا ہے تو ایک عجب سی دشت دل و دماغ کو گھیرنے لگتی ہے۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آتا ہے کہ اب ایک بار آنکھیں بند ہوئیں تو شاید پھر بھی نہ کھل سکیں۔ مجھ پر بھی ایک بار یہی اپروٹ پر یہ کیفیت گزر چکی تھی۔ یہ بت پرانا واقعہ ہے اور اس دوداد میں اس کا کوئی ذکر نہیں لیکن قادر زماں کے گماشتوں کے ہاتھوں خواب آور دوا کھانے کے بعد مجھے کسی طرح کی تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا اس خودگی کے نتیجے میں میں سو سکتا ہوں بے ہوش ہو سکتا ہوں لیکن مر نہیں سکتا۔ قادر زماں یا اس کے کارندے سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ مجھے کوئی ملک شے کھائیں گے میری زندگی ان سب کے نزدیک ان کی اپنی زندگیوں سے بھی زیادہ عزیز ہو چکی تھی۔ میں مرجاتا تو انہیں اس دولت کا کیا کون بتا جا جو تک کی حویلی سے نکلی تھی اور اپنے پیچھے ہنگاموں کا غبار چھوٹی کسی نامعلوم تاریکی میں گم ہو جاتی تھی۔ ان کے نزدیک میری حیثیت اس گہنی کی تھی جو ایک بہت بڑے خزانے کو لگتی تھی اور ان پر دنیا میں جنت کے دروازے کھلتی تھی۔ وہ اس گہنی سے محروم ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ میں کامل اطمینان سے بستر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور خود کو ہر دم جھیلتی اور گہری ہوتی تاریکی کے صحنہ کے سپرد کر دیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک جہازی ساز کی مسری پر پایا۔ بدن میں عجب سی فاقہ اتاری ہوئی تھی۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ میں کافی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں نے اپنے لباس پر نگاہ دوڑائی۔ یہ وہ لباس نہیں تھا جو میں نے پہنے پہن رکھا تھا۔ وہ لباس خون آلود ہو چکا تھا اور جیسے جیسے غصہ کی غیظ و غضب کی زد میں آکر جھٹ گئی تھی۔ اس لباس کی جگہ اب میں ایک آرام دہ کرتے پانچامے میں ملبوس تھا۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ سولہ تاریخ تھی اور گوری نو بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ پورے اڑتالیس گھنٹے بعد آنکھ کھل رہی تھی میری۔ مجھے یہ کچھ کہنا پڑا تھا محسوس ہوا۔ ایک مانوس خوشبو انڈر میں تھی درد دیوار کے اندر سے۔ میرے سینے سامنے ایک کڑی تھی۔ اس میں مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچا ہوا تھا۔ چانک میرے جسم کو جھکا سا لگا اور میں مسری پر انڈر کر چھ گیا۔ شدید جہت کے عالم میں میں اپنے ارد گرد دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ میں ایک جانی پچانی جگہ پر تھا۔ ایک جیل میں زخمی ہونے اور جاگیر دار

میں نے بستر لوٹ لگائی اور اندھ کر کھڑا ہو گیا۔ فراگ جب کے انداز میں اچھلتا ہوا میں کڑی تک پہنچا۔ کڑی کے قریب ہی سوچ بڑا تھا۔ میں نے کندھے کی مدد سے لائٹ کا سوچ آف کر دیا۔ کمرے میں جتا ہوا زیر دیاور کا نیکیوں بلب جھگھکیا اور تاریکی چھا گئی۔ میں نے کڑی کا پردہ اٹاؤں سے پکڑ کر یہ آنکھیں کھینچا۔ باہر کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس منظر کی چمک دیکھ کر آنکھیں خیر ہوئے لگیں۔ میری حالت اس گول آنکھوں والے شب بیدار پرندے کی سی تھی جسے پکڑ کر چانک دھوپ میں بٹھار دیا گیا ہو۔ کمرے سے باہر برآمدے کا ایک حصہ نظر آتا تھا اور اس سے آگے سمان خانے کے وسیع و عریض احاطے پر نگاہ پڑتی تھی۔ یہ احاطہ ایک سبز زار کی شکل میں تھا۔ اس وقت یہ سبز زار سیکڑوں ہزاروں چھوٹے چھوٹے نمکوں کی روشنی میں جھلکا رہا تھا۔ سبزے کے قطعی تختوں پر کرسیاں میز پر بھی تھیں۔ ان میزوں پر خود نوش کے لوازمات تھے اور در کرسیوں پر حسین و جمیل لوگ ذوق برق لباس پہنے پرانہاں تھے۔ ان باہمال و خوش لباس مہمانوں کے درمیان سفید بے داغ وردیوں والے بونے خدمت گار چکرارے پھر رہے تھے۔ سبز زار کا جو حصہ میری نگاہوں کے سامنے تھا اس پر کم و بیش ایک سو مہمان موجود تھے۔ یقیناً ابھی بہت سے لوگ میری نگاہوں سے اوچھل تھے۔ چانک میری نگاہ قادر زماں پر پڑی۔ وہ ایک شاندار سفید شیروانی میں ملبوس تھا۔ شیروانی کی جیب میں سرخ دیوال لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی پمپتی انگشتیاں اتنے قاسطے سے بھی اپنی لپک دھچک دکھا رہی تھیں۔ سکیم شای جو تا ایسا تھا کہ لگتا تھا پاؤں سے دو سوچ لپٹے ہوئے ہیں۔ اس ج دج نے اس کی ہار عجب شخصیت کو کچھ اور نکھار دیا تھا۔ پھر مجھے قادر زماں کے پہلو میں ایک لڑکی نظر آئی۔ وہ جیسے سر ہا چاندی میں لپٹی ہوئی تھی۔ بڑی زبردست ”چینگ“ تھی اس کے لباس اور بناؤ نکھار میں۔ اس نے ایک سفید ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس پر نفرتی ناموں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ سفید جوتی سفید دونا اور آپ داموتوں کا نفرتی زیور۔ اپنے سیاہ بالوں اور سرخ ہونٹوں کے سوا وہ سفید ہی سفید نظر آ رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ یہ چھوٹا سا بچہ چالنا چھٹنے کا اندھرو موجود سمان بڑی دلچسپی اور محبت سے بچے کو کھینچے لگے۔ کسی نے اس کے ہونٹ چھونے کسی نے گال چوما۔ کسی نے سخرہ پان کر کے اسے ہانے کی کوشش کی۔ ایک لمبے ترنگے چھدری نما شخص نے واسک کی جب سے سو سو کے بہت سے

نے نوٹ نکالے اور بچے کے برابر گھما کر ایک غریب صورت بڑھیا کے حوالے کر دیے۔

میرے ذہن میں گھما کا سا ہوا۔ اد آیا کہ غزال نے مجھے قادر زماں کے باپ بننے کی خبر سنائی تھی۔ قادر زماں کی سب سے چھوٹی بیوی زخم کا سنگین کیس غزال نے ڈیل کیا تھا اور اپنی شان و شوکت اور گلے سے زچہ دیکھ کر موت کے منہ سے چھینا تھا۔ اس احسان کا بدلہ قادر زماں نے یوں چھایا تھا کہ غزال کو فخر شکر کے حوالے کر دیا تھا۔ یقیناً یہ قادر زماں کے بچے کا جشن ولادت تھا۔ وہ خوشی سے بھولا نہیں سارا تھا۔ اس کے راج پات کو وارث مل گیا تھا۔ اس جاگیر کو ”جاگیر دار“ فلیب ہو گیا تھا۔ یہ مسرت کا موقع بنانے کتنے برسوں کے بعد آیا تھا۔ جاگیر دار قادر زماں مہمانوں کے پاؤں تلے ٹوٹوں کا فرش بچھاتا ان کو سونے کے نوالے کھاتا اور آپ حیات سے ان کی تواضع کرتا تو بھی تم تھا۔ پھر میری نگاہوں کے ”فریم“ میں چند خود لڑکیاں داخل ہوئیں۔ وہ ٹھٹھے سے رقاصا میں نظر آتی تھیں لیکن جب وہ بولیں تو پتا چلا کہ بیچڑے ہیں۔ انہوں نے اپنی پٹنی ہوئی آوازوں میں دماغیہ گیت گانا شروع کیا اور آگے بڑھ بڑھ کر نیچے کی بلا میں لینے لگیں۔ لمبے ترنگے چھدری نما شخص نے ایک بار پھر واسک میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے درجنوں نوٹ بیچڑوں پر بٹھا کر دیے۔

اتنے میں دواڑے پر کھٹ پٹ سنائی دی۔ میں قالین پر بے آواز اچھلتا ہوا واپس آیا اور بستر پر راز ہو گیا۔ کھٹ پٹ کچھ دیر بعد معدوم ہو گئی۔ میں وہیں بستر پر ڈا مو سیتی اور شور و غل کی ملی جلی آوازیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد وقفہ وقفے سے زور دار قہقہے بلند ہونے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کسی دوا کی شو کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ غالباً کوئی کامیڈین اپنا ”آکٹم“ پیش کر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر بستر سے اٹھا اور اچھلتا ہوا کڑی تک پہنچا۔ سبز زار کا آئینج میری نگاہوں سے اوچھل تھا لہذا میں وہاں کا منظر دیکھنے سے محروم رہا۔ کڑی کے بالکل قریب برآمدے میں بھی چند میز لگی ہوئی تھیں۔ ایک تھائی پسند جوڑا ایک ایسی ہی میز پر بیٹھا راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔ اس عایشان حویلی کے جاگیر دارانہ ماحول میں اس جوڑے کو بے جوڑ ہونے کے باوجود جوا کتنا ہی مناسب لگتا تھا۔ اس تقریب کے بیڑبان اعلیٰ کی طرح اس اوچھڑ عمر کی پارسر بھی ایک نوخیز لڑکی تھی۔ غالباً نئی شادی ہوئی تھی دونوں کی۔ اوچھڑ سمان دی لہذا ترنگا چھدری تھا جو کچھ دیر پہلے اپنی واسک میں سے سو سو کے کرارے نوٹ نکال رہا

تھا۔ دونوں سندھی بول رہے تھے اور شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں ان کی باتیں سمجھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے ازراہ تجسس کمزری سے کان لگا دیے۔ چوہدری جیسے ہوئے پولا "قسم سے" باب تو بالکل نہیں کیا۔ قادر زباں کی ناک ادھنی ہے اور رنگ بھی سرخ و سپید ہے۔ مجھے تو گڑبگڑ گئی ہے۔" لڑکی مصنوعی ناراضگی سے بولی۔ "بیٹھے بھی چوہدری جی! کس طرح کی بات کرتے ہیں۔ کسی نے سن لیا تو کیا سوچے گا؟"

"وہی سوچے گا جو ہم سوچ رہے ہیں" چوہدری نے ٹھٹھے سے کہا۔ "دیکھا میری سوہنی! یہ قادر زباں کی ناک چوڑی نہ اس کی بیگم کی، پھر یہ چوڑی ناک والا بچہ کہاں سے آیا؟" لڑکی بولی۔ "ہائے۔ ہائے خدا کا خوف کریں چوہدری جی۔ جاگیر دامنی سے ملی ہوں میں۔ اللہ نہ کرے وہ کوئی بد معاش تو نہیں ہے۔ اچھی بھلی، شرم و حیا والی لگتی ہے۔" "لگنے کی بات چوہدری میری سوہنی" چوہدری نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "ایسے خنجر مردوں کے ہلے بندھ جانے والی عورتوں کو جب آگے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا تو بڑا کچھ کرجاتی ہیں۔ وہ اندر سو لگی کی ہو گا پتا نہیں مجھ کو۔"

"توبہ ہے اللہ۔ آپ کے دماغ میں تو کندہ ہمارا ہے۔" لڑکی نے ازراہ عموں شرم برکی بات کاٹی اور اٹھ کر چمچم کرتی ایک طرف چلی گئی۔

چوہدری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کے طویل کش لینے لگا۔

یہ شخص یقیناً قادر زباں کا کوئی قریبی دوست تھا اسی لیے تو اتنی فراخ دلی سے ٹوٹ بھگدور کر رہا تھا۔ یقیناً ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ترم کو بھائی اور اس کے نو مولود بچے کو بھیجنے کے خطابات سے تو نوازنا ہو گا۔ اپنی بھالی اور سنجیدگی کے بارے میں اس نے جو رمارکس پاس کیے تھے وہ قادر زباں تک پہنچنے تو وہ "خوشی سے پھولا نہ سنا"۔ سیروں خون بڑھ جانا اس کا اپنے دوستوں کے "ٹیک" خیالات جان کر بد یا کار اور قریبی لوگوں کا حلقہ احباب بھی ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے ثبوت ہمیں انٹرویو شریتر ملتے رہتے ہیں۔

اچانک میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ جاگیر وار قادر زباں لپے لپے ڈگ بھرتا میرے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو سرا خوش پوش و بار مہمب شخص بھیجنی کنور تھا۔ وہی بھیجنی کنور جو برسر اقتدار پائی کا اہم رہنما تھا اور صوبے کا طاقتور ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کے چاہنے والے اور اس نے نفرت کرنے والے بے شمار تھے۔ وہ ایک

متنازع شخصیت تھا۔ یعنی اسے بہت اچھا سمجھتے تھے اور بُنے بہت بُرا۔ وہ ایک پیدا کنی جاگیر دار تھا اور سیاست میں قدم رکھنے کے بعد اسے جوانی میں ہی وہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا جس کی تمنائیں لوگ سال ہا سال اس خار زار میں بھیجتے ہیں۔ وہ بڑے شاندار انداز میں قادر زباں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ ان کے عقب میں ہونے باڑی گاڑتے اور کچھ سفید پوش محافظ بھی۔ میں جلدی سے واپس آیا اور مسری پر لپٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد دو اونے پر آہٹ ہوئی۔ قفل کھلا اور کچھ لوگ اندر آ گئے۔ میں نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا۔ جاگیر وار قادر زباں اور بھیجنی کنور میرے سر ہائے کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں ایک رافٹل بردار محافظ بالکل چوکس حالت میں تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرا شانہ چھوڑا۔ میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں بہت گہری نیند کی ادکاری کر رہا تھا لہذا سانس بھی بہت گہری لے رہا تھا۔ مجھے کچھ درد ہلانے جلانے کے بعد سمجھ لیا گیا کہ میں ابھی تک بے ہوش یا نیم بے ہوش ہوں۔

"بندہ تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے" بھیجنی کنور کی بھاری بھر کم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ تیسرا ایسے لمحہ جس میں کیا گیا تھا جیسے کسی انسان کی نیس پاتو جانور کی بات کی جا رہی ہے۔ جاگیر وار قادر زباں نے کہا۔ "بڑی لمبی چوڑی سسڑی ہے جی اس کی۔ کبھی آپ فرصت نکال کر تشریف لائیں تو بتاؤں گا بلکہ اس کی زبانی سنواؤں گا۔"

چوٹی کے ڈاکٹر کمرمان کی جانی بچائی آواز میرے کانوں میں آئی۔ "اگر آپ بات کرنا پسند فرمائیں تو میں اسے انجان میں دے دیتا ہوں۔ ابھی دو تین منٹ کے اندر ہوش میں آجائے گا۔"

"نہیں۔ فی الحال رہنے دیں۔" بھیجنی کنور نے جلدی سے کہا اور چند لمحوں کے کمرے میں پھرنے کے بعد جاگیر وار قادر زباں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ کمرے کی جی بھانے سے پہلے کسی ملازم نے میرا منہ کھول کر اس میں پھرید بوا کر کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے جی باندھ دی۔ شاید اس نے خیال کیا تھا کہ کپڑا خود بخود باہر نکل گیا ہے۔ دو اونے کے لاگ میں چالی تھکا کر کمر بند کر دیا گیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمزری کا پردہ برابر کیا جا چکا تھا اور کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ آثار سے نظر آ رہا تھا کہ اب تاہر کوئی میری مزاج پرسی کے لیے نہیں آئے گا۔ میں ایک بار پھر بستر سے اٹھ کر کمزری پر پہنچ گیا۔ دانتوں کی مدد سے پردہ کھسکایا تو قادر زباں اور بھیجنی کنور اسی میز کے گرد بیٹھے نظر

آئے جہاں تھوڑی دیر پہلے قادر زباں کا معتز مہمان اور اس کی بیٹی کی ہم عمر ملین بیٹھی تھی۔ غالباً یہ میزبانو نیاز کی باتیں کرنے کے لیے موزوں ترین تھیں اس لیے اسے بار بار دونوں بخشی جا رہی تھی۔ قادر زباں اور بھیجنی کنور کی خاص معاملے پر بات کر رہے تھے۔ قادر زباں کے ہونے باڑی گاڑ تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے تھے اور دوسرے محافظ بھی کافی فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ بھیجنی کنور نے اپنے سامنے رکھے انتہائی خوبصورت پتے میں سے شیری کا ایک ٹکڑا کھینچ لیا اور بس کر بولا۔ "خدا کا نام لو قادر زباں! کن چکوں میں پڑے ہوئے ہو۔ کوئی ٹھوس کام کہو جی جی۔ ایسے کاموں میں وقت اور پیسے کی برادری کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مندو قوں شندو قوں والی بات دیے ہی جھوٹ ہے اور اگر کچھ بھی ہے تو اس دولت تک پہنچنے پہنچنے تمہاری اپنی گرہ سے اپنی دولت خرچ ہو جائے گی کہ تم سب کچھ پا کر بھی کھائے میں رہو گے۔"

قادر زباں نے کہا۔ "کنور صاحب! آج سے دو ماہ پہلے میرے خیالات بھی بالکل وہی تھے جو آپ کے ہیں۔ میں نے اس حرای افزا ہم سے یہی الفاظ کہے تھے جو آج آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میں جاگیر داری شخص ہوں اور اس طرح کے پیکڑوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں جُڑا بھی اس لیے نہیں کیٹتا کہ اس میں بندہ بہت کے بجائے مقدر کے چکر میں پڑ جاتا ہے لیکن یہ ایک بالکل دھکا معاملہ ثابت ہوا ہے کنور صاحب۔ یقین کریں میں چکر کر رہ گیا ہوں۔"

بھیجنی کنور نے قہقہہ لگایا۔ "چکرائے تو تم ہر وقت رہتے ہو۔ اس میں کون سی نئی بات ہے۔"

قادر زباں بولا۔ "کنور صاحب! میں افزا ہم کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ ابھی اندھا میں ہی ہے لیکن وہ چار روز تک آجائے گا۔ میں آپ کو اس سے ملواؤں گا۔ وہ اس سارے جڑبے سے خود گزرا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھدائی کی ہے اور وہ دو درجن صندوق نکالے ہیں جو نیچے سے اوپر تک زیورات اور قیمتی پتھروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ تو مجھے پاتل بورا ہے اس دولت کے پیچھے۔ اور صرف افزا ہم ہی کی بات نہیں ہے ہمیں سے فرید کوٹ میں ایسے کھائے دیئے ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یوں لگ رہا تھا کہ پورے ہندوستان کے جرائد پیشہ کردہ فرید کوٹ میں اکٹھے ہو گئے ہیں اور نرگ کی بو سن گئے پھر رہے ہیں۔"

بھیجنی کنور نے بہت گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "مکانوں میں اور آنکھوں دیکھی بات میں بہت فرق ہوتا ہے قادر زباں اور پھر اس قسم کے معاملوں میں تو خواہ مخواہ بات کا پتھر بین جاتا ہے ابھی پچھلے دنوں ہمارے ایک ملازم نے سامنے سے ایک مچھلی پکڑی۔ کافی بڑی مچھلی تھی! بارہ چوہہ کھو وزن ہوگا۔ مگر چوہیں کھانے کے اندر اندر اس مچھلی کا وزن چوہہ کھو سے تیس گلو ہو گیا۔ وہ اس طرح کے کانوں کان وزن طوڈ بڑھ کھو بڑھتا رہا۔ تیسرے روز اخبار میں جو خبر چھپی وہ اس طرح تھی کہ کنور صاحب کے ملازمین نے ہفتے کے روز ایک بہت بڑی مچھلی پکڑی۔ اس کا وزن ڈیڑھ من کے قریب بتایا جاتا ہے۔ اس نسل کی مچھلی پہلے بھی اس علاقے میں نہیں دیکھی گئی۔ میرے کئے کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے صندوقوں والی بات میں سچائی ہو لیکن اس سچائی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا ہوگا۔ فرض کریں ان صندوقوں میں چند کروڑ کی مالیت کا سامان ہے بھی تو وہ سارے کا سارا تو ڈھونڈنے والے کو نہیں مل جائے گا۔ ان میں سے وہ اشیاء جو نوادرات کے زمرے میں آتی ہیں آثار قدیمہ والے اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ باقی سامان میں گورنمنٹ سمیت کئی حصے دار ہوں گے اور پھر تم ان لوگوں کو کیوں بھول رہے ہو جو اس سامان کے حقیقی وارث ہیں۔ درست ہے کہ اس حادثے کو گزرنے ایک عرصہ بیت چھیا ہے اور وہ لوگ ادھر ادھر بکھر چکے ہیں مگر ابھی ان میں سے کئی بقید حیات ہوں گے یا ان کی اولادیں اس بارے میں معلومات رکھتی ہوں گی۔ وہ سب لوگ چین سکون سے نہیں بیٹھے رہیں گے۔"

بھیجنی کنور اور قادر زباں کی گفتگو جاری رہی لیکن اسٹیج پر چونکہ تھمکے خیر قسم کا میوزک شروع ہو گیا تھا لہذا ان کی آوازیں دب کر رہ گئیں۔ میں کان کھڑی سے لگائے بٹھا رہا لیکن آٹھ دس منٹ تک کچھ سنائی نہیں دیا۔ میوزک ختم ہوا تو میری سماعت پھر آوازیں تک رسائی حاصل کرنے لگی۔ بھیجنی کنور کہہ رہا تھا۔ "لیکن جہانی کو پکڑ کر یہاں لانے کا مقصد؟"

قادر زباں نے کہا۔ "وہ ٹرک تو غائب ہو ہی چکا ہے اور اس کے جلد ملنے کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے۔ ٹرک کے بعد جو قیمتی شے ہمارے پاس پہنچی ہے وہ جہانی ہے کیونکہ ٹرک کے بارے میں وہ کسی بھی شخص سے زیادہ جانتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر جہانی کو وہاں رکھا جاتا تو وہ کسی بھی وقت کسی کے ہتھے چڑھ جاتا۔ حاشا کرنے والے جتنی منت



ٹوک کو کھینچ رہے ہیں" اب اسی محنت سے جانی اور باو لیاقت کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

"چھاپا راجھوڑوان باتوں کو" بھئی کنور نے کہا۔ "اس بیچر مل کا کیا باجو تم بھگت میں لگا رہے تھے۔"

قادر زمان نے بابل ناخواست بھئی کنور کو اپنی زیرِ قیصر بیچر مل کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور دونوں باتیں کرتے کرتے اٹھ کر سبزہ زار کے مرکزی حصے کی طرف چلے گئے۔

رات قریباً بارہ ایک بجے تک محفل زور پر رہی پھر یہ ہنگامہ ماند پڑنے لگا۔ قریبی علاقوں سے آئے ہوئے سہمان واپس جانا شروع ہو گئے۔ وسیع و عریض پورب کی طرف سے گاڑیوں کے اشارت اور روانہ ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ جن سہمانوں کو رات بیس گزارنا تھا وہ ابھی تک رقص و سرور اور کھانے پینے میں مگن تھے۔ گاہے گاہے قہقہے کو بجتے تھے اور نٹس میں ڈولی ڈولی آوازیں رات کی جھیل میں بڑے بڑے پتھر جھیک دیتی تھیں۔ میں اپنے بستر پر وارز بھوک اور بے خوابی سے نبرد آزما تھا۔ اپنے آپ سے لڑتے اور پشیمان آدھ ساعتوں کے بارے سوچتے سوچتے بھانے کس وقت اٹھ سکے گا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو دروازے کے بیسی قفل میں چابی کھوم رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور کوئی دے پاؤں چلتا ہوا اندر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی گول سی تریوز نما شے تھی۔ یہ شے اس نے دروازے کے قریب رکھی اور آہستگی سے میرے سر پر آن کر ڈالا۔ وہ ایک اوجیز عمر کا پتلا شخص تھا۔ اس نے شانہ جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ "جانی صاحب اٹھئے۔ اٹھئے جانی صاحب۔"

اس کا لہجہ رازدارانہ تھا اور انداز میں دوستی کی جھلک تھی۔ میں نے بے تکلیف کھل دیں۔ وہ اپنا منہ میرے کان سے قریب کر کے بولا۔ "میں آپ کو میاں سے نکالنے آیا ہوں۔"

"کون ہو تم؟" میں نے جانی سرگوشی کی۔

"میرا نام بشیر احمد ہے مجھے بی بی جی سے بھیجا ہے۔"

"کون بی بی جی؟"

"بی بی ترم صاحبہ نے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو حفاظت کے ساتھ میاں سے نکال دوں۔ یہ دیکھیں۔ یہ انہوں نے پیسے دیے ہیں آپ کے لیے اور یہ کپڑے ہیں۔ ذرا جلدی سے یہ کپڑے پہن لیں آپ۔" اس نے کپڑے اور پیسے پٹائی پر رکھ دیے۔

میں جراتی سے حاکم میں اوجیز عمر شخص کی باتیں سن رہا تھا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے ٹھیک

کہہ رہا ہے۔ ترم کے دھنچکے کے متعلق میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ ایک عرصے سے غزالہ کے زیرِ علاج تھی اور اس کی بے حد عزت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے ایک خط بھی لکھا تھا۔ اس خط میں اس نے مجھے اپنے شوہر کا انداز کے ارادوں سے خبردار کیا تھا اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں غزالہ اور انجی کو لے کر میاں سے کہیں دور نکل جاؤں۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس کے شوہر نے غزالہ پر یا مجھ پر کوئی زیادتی کی تو اس کا وبال اس کے پیچے پر پڑے گا اور خدا ناخواست اسے کچھ ہو جائے گا یا پھر کوئی اور ایسا نقصان ہو جائے گا جس کے لیے میاں بیوی کو تا عمر جیتنا پڑے گا۔

اوجیز عمر شخص نے کسی کو نہ کھدے سے ایک موم بتی ڈھونڈ نکالی تھی۔ موم بتی روشن کر کے اس نے میرے ہاتھوں کی بندش کو جلانا شروع کیا۔ نائیلون کی رسی تھی 'ذرا سی درمیں جل گئی۔ میرے ہاتھ آزاد ہوئے تو یوں لگا کہ جیسے اپنے جسم پر بلکہ اس سارے ماحول پر اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ میرا مددگار چاہتا تو رسی کو موم بتی سے جلانے کے بجائے اس کی گرہ بھی کھول سکتا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ میرے فرار کی کمانی میں سے اپنا کردار حذف کرنا چاہتا ہے۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے پاؤں کی رسیاں بھی کھول لیں۔ بشیر نامی اس شخص نے لباس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کسی ملازم کی شلوار قمیض تھی۔ بشیر نے موم بتی بجھا دی۔ میں نے اندھیرے میں لباس تبدیل کر لیا اور تپائی سے دوپے اٹھا کر جب میں رکھ لے کر میرے اندازے کے مطابق یہ ہزار پندرہ سو کی رقم تھی۔ بشیر نے ایک چابی میرے ہاتھ میں تھما دی اور بولا۔ "میں آپ کو زنان خانے کی طرف سے لے جاؤں گا۔"

حویلی کے عقبی دروازے کے باہر ایک مونڈ سا نیکی کھڑی ہے۔ یہ اسی کی چابی ہے۔ اور یہ کیچے ہیلرٹ۔" اس نے دروازے کے پاس سے تریوز نما چیز اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ "اسے پہن لیجئے اور چند قدم کا فاصلہ چھوڑ کر خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔"

میں نے ان ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کی اور ہیلرٹ پہن کر کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بشیر نے بے آنکشی دروازہ کھول کر باہر بھانکا پھر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں بعد ہم آگے پیچھے چلے حویلی کی اندرونی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ چاند کے رخ اور مقام سے اندازہ ہوا کہ رات کا آخری پہر ہے۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے کھائی اٹھائی۔ غزالہ کی دی ڈولی رست وارج چار بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ وہ صبا چنا شروع ہو گئی

تھی۔ حویلی کے وسیع سبزہ زار میں سرور ابری کی کیا کے بودے ہوئے ہوئے حرکت کر رہے تھے۔ بادری بوئے اور بیکر گھٹیلے ملازم ابھی تک مصروف تھے۔ وہ برتن اٹھا رہے تھے۔ میز پر سیٹیاں رہے تھے اور گھاس کے ٹکلی تختوں پر بکھری ہوئی بوتلیں سمیت رہے تھے۔

ہم ان لوگوں کے قریب سے گزر کر زنان خانے کی طرف چلے گئے۔ میں حویلی کے اکثر بیچ و خم سے آگاہ تھا لیکن زنان خانے کی طرف آنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ بڑی فی سنوری جگہ تھی۔ زنان خانے کا لان علیحدہ تھا۔ میاں بیک چھوٹا سا تالاب بھی موجود تھا۔ تالاب کی تہ میں چھوٹی چھوٹی نیلی روٹھیاں لگی ہوئی تھیں اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ لان سے آگے گول ستونوں والا برآمدہ تھا۔ پھر ایک کشادہ راباداری تھی جس میں مشینی قالین بچھا ہوا تھا۔ زنان خانے کے کسی کمرے سے بلند آوازیں بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ دو تین افراد نٹس میں داخلہ کر رہے ہیں۔ یہ آوازیں سن کر بشیر احمد کے قدم چاکا چاک پیچھے ہٹ آیا۔ وہ سخت الجھن میں نظر آ رہا تھا۔

میں نے قریب جا کر سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ بولا۔ "مگر بڑے جہاں سے گزر کر جانا ہے وہاں وہ دلزار ہے بیٹھے ہیں۔"

"کون ہیں؟"

"سہمان بی بی جاگیردار صاحب کے، فیلی کے ساتھ ہیں اس لیے جاگیردار صاحب نے انہیں میاں بھٹرا لیا ہے۔ اب وہ راباداری میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ بالکل مدہوش ہو رہے ہیں۔ بد بخت۔"

"پھر؟ کوئی اور راستہ نہیں؟"

"ہو نا تو مشکل کیا تھی" بشیر احمد نے ہونٹ کاٹے۔

میں نے دبے پاؤں آگے جا کر راباداری میں بھانکا۔ وہ درمختہ اور دو دھڑکیں۔ چاروں نے صرف زیر جاے پن رستے تھے اور راباداری کے براؤن قالین پر لٹے سیدھے زے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک جوڑے کو میں بھی طرح بچھتا تھا۔ یہ وہی نیم خیم چوہدری اور اس کی زوجہ ان بیوی تھی جو تقریب کے دوران سب سے الگ بائیں تھے اور اپنے بیڑیاں کی شان میں "تمسیدے" بڑھنے لگے تھے۔ وہاں جو کچھ انہوں نے قادر زماں کی مروا کی اور یکم قادر زماں کی شرافت کے بارے میں کہا تھا، ان دونوں کے کانوں میں پڑ جاتا تو اس وقت ان "نیم ٹیگوں" کو جوڑے مار

کر ہا ہر نکال دیتے۔

لوگوں کی یہ مدہوش پائی اس طرح راہ روکے بیٹھی تھی کہ جب تک رست صاف نہ ہوتا ہم وہاں سے گزر نہیں سکتے تھے۔ بشیر مجھے لے کر ایک اسٹور ٹاکرے میں ٹھکس کیا۔ کہنے لگا۔ "آپ میاں نہیں۔ میں دروازہ باہر سے بند کر دیتا ہوں۔ جیسے ہی یہ حرامی آگے پیچھے ہوتے ہیں" میں آپ کو میاں سے نکال دوں گا۔"

بشیر احمد مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ راباداری سے شور و غل کی آوازیں مسلسل بلند ہوتی رہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شور و غل کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا ہے۔ شاید ایک آدھ اور منٹ یا بھی اس پینڈال پائی میں شامل ہو گیا تھا۔ اسٹور ٹاکرے میں مجھے قریب دس منٹ گزرے ہوں گے جب اچانک کہیں پاس سے لرزہ خیز چیخیں سنائی دیں۔ یہ نسوانی چیخیں راباداری کے آخری سرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر ہدم دسک دی۔ بشیر احمد پاس ہی موجود تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ چیخوں کی آواز نے اسے بھی حواس باختہ کر رکھا تھا۔ ابھی ہم صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ راباداری کے مونڈ سے ایک عورت شبِ خوابی کے لباس میں برآمد ہوئی۔ اس کی گود میں بچہ تھا۔ وہ چیختی چلاتی باہر کی طرف بھاگی۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ بدحواسی کے عالم میں "چوکیدار" کو پکار رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا، وہ ترم تھی۔ ترم کے پیچھے ہی پیچھے وہی نیم خیم چوہدری اور راباداری کے مونڈ سے برآمد ہوا جو تھوڑی دیر پہلے راباداری میں بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ چوہدری کے جسم پر صرف اندر و رست اور غیاں تھا۔ اپنے بالوں بھرے جسم اور فریہ قوند کے ساتھ وہ اس ٹکٹے میں خوفناک لگ رہا تھا۔ "ترم خیم! ہماری بات سنو" اس نے ہیکار کر کر کہا اور قالین کے کنارے سے اٹھنے کے سبب گرتے گرتے بھاگا۔

میں غیر ارادی طور پر ترم کے پیچھے آیا۔ وہ راباداری سے نکل کر لان میں پہنچ چکی تھی۔ اچانک میں نے ایک وحشت خیز منظر دیکھا۔ بھانکے بھانکے ترم کے منڈر دیکھا، اسی اثنا میں وہ لڑکھائی اور بچہ اس کی گود سے اچھل کر تالاب میں جا کر۔ بدحواسی میں وہ پانچ لڑکھیز تھی۔ جیج حویلی کے در و درو میں گونگی اور شب کے نشاے کو چرتی چلی گئی۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ اپنے بچے کے پیچھے ہی تالاب میں چھانک لگے گی لیکن میں نارے پر پہنچ کر وہ ٹھک گئی۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔" وہ قلع کی پون توت سے بیٹھے

اور اپنی رانیں پیٹنے لگی۔

میں ہیلٹ اتار کر بے اختیار تالاب کی طرف بھاگا۔ یہ سوچنے اور تجزیہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جو چیز ترم کی پانوں سے اُچھل کر پانی میں گر گئی تھی یقیناً وہ بچہ ہی تھا اور اگر وہ بچہ تھا تو ایک ایک ساعت قیمتی تھی۔ میں نے رُکے بغیر پانی میں چھلانگ لگائی اور تہ میں اترتا چلا گیا۔ پانی کے سرد لمس نے مجھے ڈھانپ لیا اور کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ میں نے بچے کو گرتے دیکھا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس مقام پر گرا ہے۔ میں نے تاریک پانی میں دیوانہ وار ہاتھ چلائے لیکن پانی نے سوا کسی شے کا لمس محسوس نہیں ہوا۔ قریباً دس سینکڑ پانی میں رہ کر میں سطح پر ابھرا۔ کناروں پر کھرام بچا ہوا تھا۔ ترم ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی۔ کسی نے اس کو بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا۔ سبزہ زار میں کام کرنے والے بونے اور ملازم بھاگتے ہوئے موٹے پر پہنچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو نے تالاب میں چھلانگیں بھی لگادی تھیں اور تاریک سطح پر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ میں نے سانس اندر کی طرح کھینچ کر پھیپھڑوں میں پوری گنجائش کے مطابق ہوا بھری اور ایک بار پھر پانی میں غوطہ زن ہو گیا۔ یہ احساس جانکا تھا کہ میرے آس پاس ہی کسیں وہ معصوم بچہ موت سے ہلکنار ہو رہا ہے جو تھوڑی دیر پہلے ایک پُرسرت تقریب کا مولا تھا اور اپنی ماں کی پانوں میں بڑی شان سے ہمک رہا تھا۔ میں جانتا تھا میری یہ دوسری کوشش آخری کوشش ہے۔ اگر اب بھی بچہ نہیں ملتا تو پھر وہ ایک لاش کی شکل میں ملے گا۔ میرا دم سینے میں گھٹ رہا تھا لیکن میں سطح آب پر خالی ہاتھ ابھرتا نہیں چاہتا تھا۔ میں پانی کے اندر کچھ اور گرائی میں چلا گیا۔ تہ میں چپکنے والی نیلگوں روشنی اُداس نظر آرہی تھی جیسے وہ کسی قبر پر جتا ہوا رہا ہو۔ میں نے دیر تک ہاتھ پاؤں چلائے لیکن پھر دم ٹوٹنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ ہونٹ بے اختیار کھل جائیں گے اور کئی لیٹر پانی میرے پھیپھڑوں میں کھس جائے گا۔ میں ہاتھ چلا کر سطح آب پر اُٹھیا۔ ترم کی پچھلی ہونی سوا لہ لگا ہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ ان نگاہوں کی تاب کوئی گوشت و پوست کا انسان نہیں لاسکتا تھا۔ میں بھی نہیں لاسکا۔ مجھے یوں لگا کہ دل سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا ہے اور میں پانی پر اپنا توازن کھو کر تہ میں اتر جاؤں گا۔ یکایک میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے سانس روکی اور ترم پر کر ایک بار پھر پانی میں کھس گیا۔ میں نے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے۔ اس مرتبہ میرے ہاتھ میں بچے کی کھنٹی منی ٹانگ آئی۔ میں نے اسے کھینچا اور پانی سے باہر نکال لیا۔

بچہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ اس نومو لو د میں جان ہی کتنی تھی اور وہ قریباً دو منٹ تک پانی میں رہا تھا۔ میں نے اسے "کارڈن لائٹ" کی روشنی میں جنم آلود گھاس پر لٹا دیا اور ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ اس کام میں دو اور افراد بھی میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ معلوم نہیں وہ مسلمانوں میں سے تھے یا گھر کے افراد تھے۔ ہم نے بچے کو اوندھانا کر اس کے پیٹ سے پانی نکالا۔ میں نے اس کے منحنی سینے سے کان لگایا۔ دھڑکن خاموش تھی، سانس کا زبردست معدوم تھا۔ بظاہر وہ مر چکا تھا۔ میرے جسم میں شدید صدمے کی لہر دوڑ گئی۔ میرے کانوں میں ترم کی آواز دیکھا گونج رہی تھی۔ جنگ کے سب سے بڑے جاکیر وار کی بیوی کسی قیمتی کی طرح جھولی پھیل کر خدا سے اپنے بچے کی زندگی مانگ رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا "جاکیر وار صاحب کو بگاڑ، کوئی چلا رہا تھا گاڑی نکالو۔ کوئی حویلی کے ڈاکٹر رمضان کو آواز میں دے رہا تھا۔ میں نے بچے کے منہ سے منہ ملا کر اس کا تنفس بحال کرنے کی کوشش کی۔ بار بار اس کے سینے کو دبا دیا تاکہ دل میں جنبش پیدا ہو لیکن کوئی تریب کار گر نہیں ہوئی۔ وہ مر چکا تھا اور اگر مرا نہیں تھا تو نہ ہونے کے برابر زندہ تھا۔ اچانک میں نے ایک تجر خیز منظر دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ بھیڑ میں سے ایک شخص راستہ بناتے ہوئے آگے آیا۔ وہ سامنے عالی تھا۔ وہ سانس عالی بنے میں چار روز پہلے یہاں سے سیکڑوں میل دور فرید کوٹ کے نواح میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ ننگے سر اور ننگے اڈر تھا۔ جسم پر وہی میلا کپڑا لبادہ تھا جس میں "میں اسے اب تک دیکھتا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا تو اس کا سایہ بچے کے جسم پر پڑا۔ ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا۔ پھر وہ ایک دم جیسے ڈاکر پیچھے ہٹ گیا اور بچے کا جسم "کارڈن لائٹ" کی روشنی میں دوبارہ دکھائی دینے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بچے کے پیکھڑوں جیسے ہونٹوں میں معمولی جنبش پیدا ہوئی ہے۔ معلوم نہیں یہ میرا دم تھا یا واقعی جنبش ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر بچے کو "ماؤتھ ٹو ماؤتھ ٹریٹ منٹ" دینے لگا۔ ابر مرتبہ یہ کوشش کارگر رہی۔ بچے نے پچھلی لی اور بہت سا پانی پیٹ سے باہر نکال دیا۔ وہ تھوڑی دیر کے ساتھ بار بار اپنی باریک مبین آواز میں زور زور سے رونے لگا۔ یہ زندگی کا اعلان تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ موت پسپا ہو گئی ہے۔ مال دیوانہ وار بچے کی طرف بڑھی "اسے اٹھا کر جھاتی سے لگایا اور چوٹے چائے لگی۔

میں پانی میں شرابور اٹھ کھڑا ہوا۔ بچے کے رونے کی

آواز اس وقت دنیا کی حسین ترین آواز محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا، موقع پر جمع ہو جانے والے مسلمانوں میں بھٹی کنور بھی موجود ہے۔ وہ میری طرف تشریف لے کر نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی حیرت بھی تھی۔ اس حیرت کا سبب یقیناً یہ تھا کہ اس نے ابھی چند گھنٹے پہلے مجھے مسلمان خانے میں پایہ زنجیر اور مہر نیند سوئے ہوئے پایا تھا۔ اچانک میری نگاہ اس عظیم جہد پوری پر پڑی جس سے ڈر کر ترم بھی ہٹا گیا۔ وہ بھٹی کنور کے عقب میں کھڑا تھا اور نشے میں ڈول رہا تھا۔ میں لپک کر گیا اور اس کا بٹن کھینچ کر ایک زوردار ٹکڑا اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔ وہ لاش کی لاش تورا کر دو جاگرا۔ مجھ میں ایک دم سنسنی دوڑ گئی۔ ایک جانب سے دو افراد نکلے اور مجھ پر بجٹ پڑے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ کیم خیم جہد پوری کے باڑی گھارڈ تھے۔ اگر انہیں خبر ہوئی کہ جہانی استاد کے سامنے جا رہے ہیں تو ایسا کرنے سے پہلے سو بار سوچتے لیکن وہ بے خبری میں مار کھا گئے۔ ایک باڑی گھارڈ نے میرا گریبان پکڑنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ میری قمیص سے چھو، ایک زبردست ٹانگ اس کے سینے پر پڑی۔ یہ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ ہوا میں اڑتا ہوا بچا کے سے تلاب میں جا گرا۔ دوسرا باڑی گھارڈ قمیص کے نیچے سے روپو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک طوفانی ٹکڑا کھارڈ بھی دوڑ کر چھک گیا۔

قادر زماں کے کارندوں نے مجھے تین اطراف سے دبوچ لیا۔ وہ مجھے بچان چکے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے مار پیٹ شروع کر دیتے یا کوئی اور کارروائی ڈالتے، بھٹی کنور آگے بڑھا اور اس نے رُعب دار آواز میں انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ترم سے مخاطب ہو کر بولا، ”کیا ہوا تھا مسز قادر زماں؟“

ترم نے بچکیاں لیتے ہوئے کیم خیم جہد پوری کی طرف انگلی اٹھائی اور بے پناہ طیش سے بولی۔ ”یہ کیسے میرے بیٹے روم میں کھس آیا تھا۔ یہ۔ یہ۔“ وہ اس سے آگے کچھ کہہ نہ پائی اور روئے لگی۔

جاگیردار قادر زماں خود کبھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ نشے میں دھت سو یا پڑا تھا اور اسے جگانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد ہی ترم خیم جہد پوری کی طرف خواہاں ہو گیا تھا۔ بھٹی کنور نے کھانا نہ کھانے کے لیے میں حاضرین سے کہا کہ وہ اپنے اپنے ٹکڑے پر جائیں۔ مجمع کافی کی طرف ہٹنے لگا۔ بلا خیمیرے اور ترم کے علاوہ قادر زماں کے تین مشعل باڑی گھارڈ بھی موفتے پر رہ گئے یا پھر کیم خیم جہد پوری تھا

جو جہاں گرا تھا، وہیں گرا رہ گیا تھا اور اپنا کھانا تمام کر ہائے وائے کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار کھسے ہوئے جا رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ گرنے سے اس کی کوئی بڑی ہڈی پھٹی ہوئی تھی۔ مجھے ہونے بنان اور اندویش کے ساتھ کھاس پر پڑا وہ بعد میں کھنکھرتا رہا تھا۔ اس کے ذاتی باڑی گھارڈ نے اسے اٹھانا چاہا تو اس کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ بھٹی کنور نے بے حد نفرت سے اسے کھوڑا اور ہونے باڑی گھارڈ کو حکم دیا کہ وہ اس روٹی بھتی، لاش کا کوئی انتظام کریں۔

میری نگاہیں سائیں عالی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مجھے میں نظر آتا تھا۔ کبھی اس پاس۔ بس ایک جھٹک دکھاکر غائب ہو گیا تھا۔ کبھی مجھے وہم تو نہیں ہوا؟ میرے ذہن میں بے اختیار یہ سوال ابھرا۔ لیکن نہیں۔ میں نے اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

”کیا یاد رکھ رہے ہو؟“ بھٹی کنور نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے ٹھک کر کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ مجھے اور ترم کو لے کر زبان خانے کی طرف آیا۔ زبان خانے میں چچ کر ترم نے ساری بات تفصیل سے بتائی۔ اس نے کہا ”میں سو رہی تھی۔ اچانک آنکھ کھلی تو جہد پوری صرف بنان اور اندویش پنے سر پہ لکڑا تھا۔ بچے کی طرف اشارہ کر کے شرابی لہجے میں کہنے لگا۔ ”بچ بتا شہزادی۔ یہ کس کا بچہ ہے؟“

میں نے چلا کر کہا کہ وہ میاں سے دفع ہو جائے کہنے لگا۔ ”دفع ہو جاؤں گا لیکن یہ جان کر کہ بچہ کس کا ہے اور نہیں بتائے گی تو اس کا جرات دینا ہوگا“ ابھی اور اسی وقت۔ میں نے اپنے شوہر کو اٹھانا چاہا۔ وہ مہر نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ خبیث مجھ سے اپنا ہاتھ لگنے لگا، میں نے بچے کو اٹھایا اور بیٹے روم سے بھاگ نکلی۔

کنور کچھ دیر تک اس سے نصیحتات پوچھتا رہا۔ وہ بچکیاں لیتی رہی اور بتاتی رہی۔ گاہے گاہے وہ کھنکھیریں سے میری طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ بظاہر وہ میری طرف سے لائق نظر آ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آشنائی، محبت اور احسان مندی کے اشارے میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ روتے روتے مجھ سے کہنے لگی۔ ”بھائی صاحب، میں نہیں جانتی، آپ کون ہیں لیکن جو بھی ہیں میرے لیے فرشتہ رحمت بن کر آئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس لفظوں میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

میں نے کہا ”آپ شرمندہ کر رہی ہیں بس۔ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، بچے کو ڈوبے دیکھ کر کنوارے پر کھڑا نہ رہتا۔“

بچہ مسلسل چیخ کر رہا تھا۔ ترم اسے لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ بھٹی کنور بھی اس کے پیچھے باہر چلا گیا۔ میں کچھ دیر کے لیے کمرے میں اکیلا رہ گیا لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ اکیلا ہونے کے باوجود میں اکیلا نہیں ہوں۔ جاگیردار قادر زماں کے ہونے عافیت میری طرف سے پوری طرح چوکس تھے اور اگر میں کمرے سے کھنکے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً مجھے جھپا لیتے۔

بھٹی کنور کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ اس کمرے کا معائنہ کر کے آیا تھا جہاں مجھے پانڈ کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے سے حیرت جھلک رہی تھی۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا ”چلو“ یہ تو ہم مان گئے کہ تم نے موم بتی سے اپنے ہاتھوں کی رسیاں جلا لیں لیکن قفل کیسے کھولا تم نے؟“

میں نے کہا۔ ”تھوڑے بہت گڑ آتے ہیں قفل کھولنے کے وہیں کمرے سے لوہے کا ایک تار لٹکایا تھا۔ اسے سوراج میں کھانا تار پاب۔ آخر کامیاب رہا۔“

”اور یہ لباس، ہیلٹ وغیرہ؟“ اور وہ موٹر سائیکل جو حویلی کے ایک پچھلے دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موٹر سائیکل کی چابی بھی تمہارے پاس ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”یہ لباس اور ہیلٹ تو تیس ایک کمرے سے مل گئے تھے۔ موٹر سائیکل کی مجھے خبر نہیں۔ پتا نہیں آپ کس موٹر سائیکل کی بات کر رہے ہیں۔“

”جھاب کیا ارادے ہیں تمہارے؟“ اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آیا لیکن وہ خواہ مخواہ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔

میں نے کہا۔ ”قیدی بے چارے کا ارادہ بیش ہی ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح قید سے رہا ہو جائے۔“

اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی بار بار آنکھوں میں ایک غایاب قسم کی فلولادی سرد مہر تھی۔ مگر اسے لہجے میں بولا۔ ”تم تھوڑی دیر کے لیے مجھے بادشاہ سلامت تسلیم کر لو اور یہ سمجھو کہ میں نے تم سے تمہارا ایک سوال پورا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ بولو کیا سوال کرتے ہو تم؟“

میں نے کہا۔ ”میں سوال نہیں کرتا۔“

میرے فقرے کی بازگشت چند لمحوں تک کمرے میں گونجی۔ اس گونج میں بھٹی کنور کا چہرہ کئی رنگ بدل گیا۔ وہ اپنی خوبصورت آنکھوں سے یک نگ میری طرف دیکھتا رہا۔

”پھر بولا ”میرے ساتھ چلو گے؟“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے گھر“

میں نے کہا۔ ”میں قیدی ہوں، آپ جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں۔“



قریباً چوبیس گھنٹے بعد میں جنوبی لاہور کی ایک وسیع و عریض محل نما عمارت میں موجود تھا۔ یہ بھٹی کنور کی نجی رہائش گاہ تھی۔ میاں وہ اپنی بے حد خوبصورتی و زلف اور کوئی چار درجن ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک محل میں پائی جانے والی ہر آرائش اور آرائش اس عمارت میں موجود تھی۔ دبیر قالیں، بیش قیمت فرنیچر، جہازی ساز کے عالیجے، منقش در و دیوار اور بڑی بڑی الماریوں میں طلائی و نقرئی قلعوں، ریشہ نشین ٹھاٹ پات کے علاوہ جاگیردارانہ بود و باش کی علامتیں بھی اس محل میں بکثرت نظر آ رہی تھیں۔ نئے مائٹریک بے داغ گایاں، اعلیٰ سسل کے گتے اور وسیع نشست گاہ میں اسلئے کی نمائش اور چاندروں کے سروں کی بے شمار ٹرائفیں۔ یہ محل دلواؤں مناظر سے سجی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا تھا اور بھٹی کنور کی حیثیت میاں ایک مطلق العنان حکمران کی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا، بھٹی کنور نے مجھے قادر زماں کے چنگل سے کیسے نکالا ہے اور مشروط طور پر نکالا ہے یا غیر مشروط طور پر۔ نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ مجھے فراد میں مدد دینے والے پر کیا گزری ہے اور یہ راز کھلا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے علم میں نہیں تھی کہ صوبے کا یہ اہم ترین شخص مجھ پر کیوں مہمان ہو رہا ہے۔ میری حیثیت اس محل میں ایک معزز شاہی مہمان کی تھی اور شاہ کی خادما میں اور خادما میں میرے قدموں میں بیچے جا رہے تھے۔ اپنی آمد کے تھوڑی دیر بعد میں نہانے کے لیے ایک لٹ و دھن اور بچے سنو سے ہاتھ روم میں داخل ہوا اور اسی وقت میری قمیص کی جیب میں سے ایک شدہ کاغذ نکل کر مرمرین فرش پر گر گیا۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ ایک خط تھا اور ترم زماں کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ ترم زماں کا ایک خط مجھے غزال کی معرفت چند ماہ پہلے ملا تھا لہذا تحریر پہچاننے میں مجھے قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ میں جھوک شام کی خون

آشام حویلی میں صرف دو روز رہا تھا۔ یہ خط اس مختصر قیام کے دوران لکھا گیا تھا اور میری جب میں پہنچا گیا تھا۔

میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔ ”شاہ جہاں صاحب“ میں غزالہ سے اور آپ سے اتنی فرشتہ ہوں کہ اپنے آپ میں مری جا رہی ہوں۔ غزالہ نے جس طرح دن رات ایک کر کے میرا علاج کیا اور میری جان بچانے کے لیے اپنا تن من واد پر لگایا، میں زندگی بھر فرموش نہیں کر سکتی۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ میں جب تک زندہ رہوں گی میرے من سے اس کے حق میں دعائے خیر نکلتی رہے گی۔ کاش۔۔۔ کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ کے احسانوں کا حق ادا کر سکتی ہوں۔

میرے دل میں آپ کی عزت پہلے بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن کل رات آپ نے میرے بچے کی زندگی بچا کر مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ مجھے شکر ہی ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے۔ کاش میں آپ کو اور غزالہ کو اپنی دلی کیفیت سے آگاہ کر سکتی۔ کل رات جب میرے شوہر کے کارندوں نے آپ سے مینچا تائی کی توخیزا، مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرے پیچھے ہاتھ ڈال دیا ہے۔ یہ سوچ کر سرتاپا لرز جاتی ہوں کہ کل کھانا غزالہ یا آپ کے ساتھ کسی طرح کا ناوا سلوک ہوا تو کیسے برداشت کر پاؤں گی۔ میں دل کی گہرائی سے دعا کرتی ہوں کہ خدا ناک خواست کوئی ایسا وقت آیا تو مجھے موت آجائے۔

بھائی صاحب! میں نے آپ سے پہلے بھی درخواست کی تھی اور اب پھر دست بستہ عرض کرتی ہوں کہ جاگیر دار صاحب اور ان کے خواروں کی پہنچ سے بہت دور نکل جائیں۔ آج نہیں تو کل یہ لوگ آپ کو شدید نقصان پہنچا کر رہیں گے۔ میں جاگیر دار صاحب کی بیوی ہوں۔ انہیں مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے مشورے پر بہت سنجیدگی سے غور کریں۔ ایک بالکل ذاتی نوعیت کی بات بھی آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ یہ بات غزالہ کے حوالے سے ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتی ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ غزالہ آپ کی محبت میں ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ وہ اب خود کو ایک بادی ہوئی شکست خوردہ عورت تصور کر رہی ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنے پیار کو پانے کے لیے وہ سب کچھ کر چکی ہے جو کر سکتی تھی اور اب بے دم ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ اس کی یہ مایوسی دیکھ کر جہاں مجھے ترس آتا ہے وہاں مجھ پر طرح کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔ مجھے آپ دونوں کے درمیان فاصلے

پیدا ہوں۔ ایک ہمدردی بہن کی حیثیت سے آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب غزالہ کی پرطلوس چاہتوں کی اور آزمائش نہ کریں۔ وہ کبھی ری ہے اسے سیٹھ لیں اپنا تالیس کیونکہ یہ کیے بغیر نہ آپ سمجھ سکتے ہیں اور نہ وہ۔ خیر اندیش“ میں نے غور پڑھنے کے بعد خط پھاڑ دیا اور اس کے پڑے قلم میں مہادیے۔ طبیعت پر جب سکندری سی طاری ہوئی تھی۔ غزالہ کا تصور تو پہلے ہی ذہن سے محو نہیں تھا اب اور شدت سے در خیال پر دستک دینے لگا تھا۔ میں اسے سرحد پار نہایت غیر فنی حالات میں چھوڑ آیا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد میں نے ایک ہلکی پھلکی شلوار قمیض پہنی اور بالوں کو تولیے سے رگڑا ہوا برنگ نکل گیا۔ میری نگاہ جتنی کنور پر پڑی۔ وہ بڑی شان سے ٹانگ پر ٹانگ بچھا کر ایک صوفے پر براجمان تھا۔ اس نے کسی نہایت مہینے کپڑے کا ہلکا سا لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس سے اچھے والی بھیجی جینز خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو بھی بہت خاص قسم کی تھی۔

”آؤ بیٹھو شاہ جہاں“ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے بڑی شائستگی سے کہا۔

میں تو کیا کندھوں پر رکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے سگار تراش سے سگار کا ٹوٹا اشارہ اور ایک طلائی کانٹے سے سگار کش لینے لگا۔ جتنی کنور کے اعلیٰ ذوق اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی خوش لباسی کا اندازہ مجھے اس محل نعمات میں آتے ہی ہو گیا تھا۔ کنور اپنی غیر سرکاری حیثیت میں چند روز کے لیے لندن جا رہا تھا۔ اس کی خوبصورتی بھی ہمراہ تھی۔ جہاں وہ لوگ جا رہے تھے وہاں سردی تھی لہذا گرم بلبوسات بھی ساتھ جا رہے تھے۔ ان بلبوسات کو دھوپ دکھانے کے لیے ایک وسیع لان میں پھیلا دیا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے نہایت قیمتی اور نایاب بلبوسات کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ جتنی کنور کے درجنوں کوٹ، بیسیوں بیٹیکٹس اور ان گنت گرم سوٹ بڑی نفاست سے انگلیوں پر جمول رہے تھے۔ ان میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور سستے سے سستا لباس بھی دس بارہ ہزار سے کم قیمت کا نہیں تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال تھی اس طرز زندگی کی جو جتنی کنور اختیار کیے ہوئے تھا۔

جتنی کنور نے سگار کا سہرا دھواں فضا میں چھوڑے ہوئے بغیر کسی حمید کے کہا ”شاہ جہاں“ تم کوئی معمولی شخص نہیں ہو۔ اپنی صلاحیتوں کو معمولی اور بے کار ملاؤں۔ خدا مت کرے۔ یہ نوادرات اور ہمیرے جواہرات کا چکر چھوڑنا

ایسے کاموں میں آج تک کسی کو کچھ نہیں ملا۔ اگر بندے میں بہت ہو اور دیکھنے والی آنکھ بھی ہو تو تھیرے جواہرات کے ڈھیر ہر جگہ پڑے ہوئے ہیں۔ سرکاری دفتروں میں، فیکٹریوں میں، شام لاٹ زمینوں میں، بڑے بڑے ٹھیکوں میں۔ کوئی ٹھوس کام کر رہی تھی۔ زندگی اتنی لمبی نہیں ہے کہ اسے افزائیم جیسے خطیبوں کے پیچھے کھڑا رہا جائے۔ میں کل شام کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہوں۔ پانچ چھ روز تک وہاں ہی ہو جائے گی۔ اس دوران میں تم یہاں رہو، آرام کرو اور خود کو اس ”دفینے“ وغیرہ کے پکڑے کالنے کی کوشش کرو۔ میں نے تمہارے لیے ایک بہت اہم اور بڑا کام سوچا ہے۔ یہ کام ہو گیا تو شاید پھر کبھی تمہیں دولت کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کی باتیں بالکل بجا ہیں جناب اور ان پر نہایت سنجیدگی سے غور نہ کرنا یہ تو فنی ہے لیکن میں اتنا پریشان ہوں کہ ذہن کے کوئی بات سوچ ہی نہیں پا رہا۔ شکر شکر کا نام یقیناً آپ نے بھی سنا ہوگا۔ جاگیر دار قادر زان سے اس کی گاڑھی چھٹی ہے۔ میری ایک دوست ڈاکٹر غزالہ ہے۔ جھپٹے دنوں شکر شکرانے اسے جھوک خاصاں کی حویلی سے اغوا کیا اور انڈیا لے گیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اسے شکر کے چنگل سے نکال لیا لیکن ایک ہفتے پہلے وہ ایک بار پھر فریڈ کوٹ کے نواح میں مجھ سے ٹھکر گئی۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں جب تک اس کی خیریت سے آگاہ نہیں ہو جاؤں گا اور اسے واپس پاکستان نہیں لے آؤں گا“ مجھے اور کچھ نہیں سوچنے کا۔

کنور مسکرایا۔ ”بس اتنی بات ہے۔ جتنی اب تم کنور کے سمان ہو۔ ایسی معمولی باتوں پر فکر مند ہونا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمہاری گرل فرینڈ تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ اور یہ تو ایک معمولی بات ہے“ میں تمہیں دکھاؤں گا کہ مسئلے کیسے حل ہوتے ہیں۔ فاصلے کیسے گھٹتے ہیں اور انہوں نے ہونیاں کیسے بن جاتی ہیں۔ بے شک تم نے ایک دنیا دیکھی ہے شاہ جہاں لیکن ابھی کچھ نہیں دیکھا۔“

میں نے حیرانی سے جتنی کنور کی طرف دیکھا۔ وہ غزالہ کو واپس لانے کی بات اتنے اعتماد اور یقین سے کر رہا تھا جیسے وہ انڈیا میں نہ ہو۔ میں اندر دہنی لاہور کے کسی محلے میں ہو اور جتنی کنور ابھی ابھی اس سے مل کر آ رہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ شک بھی ہوا کہ کس غزالہ پھر سے قادر زان یا شکر شکر کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی لیکن پھر یہ خیال مجھے ذہن

سے نکالنا پڑا۔ ابھی تک مجھے کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا تھا جس سے اندازہ ہو سکے کہ غزالہ کے ساتھ کوئی ایسی بات ہوئی ہے۔ جتنی کنور نے مجھ سے پوچھا کہ غزالہ کہاں اور کس حالات میں مجھ سے جدا ہوئی۔ میں نے اسے ضروری تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ ”لو کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟“

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا ”خیر کوئی بات نہیں۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لاہور میں لڑکی کے بچے نکالنے سے آگاہ کرو۔“

میں نے کہا۔ ”جناب! میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی وجہ سے لڑکی پر کوئی حرف آئے یا اس کے اندیشہ جیتنے اور لاپتا ہونے کا احوال لوگوں کو معلوم ہو۔ میں نے۔۔۔“

”تم بے فکر رہو شاہ جہاں“ جتنی کنور نے میری بات کاٹی۔ اس کے لمبے میں حتم کے ساتھ ساتھ ایسا غیر حزرل اعتماد تھا کہ سننے والا لا جواب ہو جاتا تھا۔ سگار کا کش لے کر بولا۔ ”تم کچھ نہ بھی کو تو میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ تم اپنے ٹھیکے ہوئے ذہن کو تکلیف مت دو اور آرام کرو۔“ پھر اس نے اپنی پیش قیمت گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔ ”کل آٹھ بجے سے پہلے لڑکی تم تک پہنچ جائے گی۔“

میں نے کہا ”میرے دو قریبی ساتھی صفدر اور زبیر محل بھی ابھی تک انڈیا میں پھنسے ہوئے ہیں“ میں ان کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ جتنی کنور نے اس موضوع میں دلچسپی لی۔ ہم دس پندرہ منٹ اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

وہ اچھے کی باتیاں کر رہا تھا۔ میں نے کہا ”جناب! ایک اور سوال پریشان کر رہا ہے مجھے۔ کل رات جاگیر دار صاحب کی حویلی میں میں نے ایک ملنگ دیکھا تھا۔ اس کا نام سائمن عالی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک ہفتے پہلے انڈیا میں اس سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میں حیران ہوں کہ وہ یہاں پاکستان میں اور جاگیر دار قادر زان صاحب کی حویلی میں کیسے پہنچ گیا؟“

کنور نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں کل صبح اس بارے میں معلوم کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ اور کوئی مسئلہ؟“

”نہیں بہت شکر ہے“ میں نے کہا۔ کنور اٹھا اور بڑی شان سے چلا کرے سے باہر نکل گیا۔ اگلے روز گیارہ بجے دوپہر کے لگ بھگ مجھے غزالہ کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ اطلاع پہنچانے والا اچھے نقش والا ایک تیز و طرار شخص تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چار روز

چکا تھا۔ سہی صاحب سے میری آخری بات چیت میں مشتاکا ذکر بھی تحصیل سے ہوا تھا۔ یہ ملاقات لاہور کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہوئی تھی۔ سہی صاحب نے پہلے تو مجھ سے یہ کہا تھا کہ مجھے اس خوفناک چکر میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایک خوبصورت معصوم سی لڑکی میری بہن ہے اور میں دنیا میں اس کا واحد سارا ہوں لیکن جب میں نے اپنا معصوم اور حتمی ارادہ ظاہر کر دیا تھا تو انہوں نے مشتاکا حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور باطل ناخواست مجھے پہلے ہی کی حوصلی میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ لباس کے طور پر میں نے پتلون قمیص استعمال کی۔ خدا بخش نے فوراً ایک ٹیوٹا کا میرے لیے فراہم کر دی لیکن میں نے کار کے بجائے موٹر سائیکل کے استعمال کو ترجیح دی۔ موٹر سائیکل کے استعمال میں یہ حکمت تھی کہ ہیلٹ استعمال ہو سکتا تھا اور ٹل ہیلٹ اپنی شناخت چھپانے کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ لاہور کی جانی بچانی سڑکوں پر سڑک تار میں مرکز چوکی پہنچا اور وہاں سے راستہ جیل روڈ "سی ایچ" کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچ کر مطلبہ وارڈ ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ فریال خصوصی عہدہ اشت کے وارڈ میں تھی۔ وارڈ سے باہر کچھ دوسرے افراد کے علاوہ سہی صاحب اور یکم سہی صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے چہرے پریشانوں کی آئینہ تھے۔ سہی صاحب پہلے تو مجھے پہچان نہیں سکے۔ میں عینک اتار کر ان کے قریب پہنچا تو وہ مجھے بری طرح جوک بگڑ گئے۔ کچھ دیر حیران پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے رہے پھر گئے لگا لیا۔ ان کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

پوچھنے لگے "شاہ جہاں بیٹا! ماں تھے تم؟ ہم بہت پریشان تھے تمہاری طرف سے۔ اب کتناں سے آ رہے ہو؟ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟" انہوں نے ایک ساتھ بہت سے سوال جڑ دیے۔

میں نے کہا "جناب آپ کے سب سوالوں کے جواب دوں گا لیکن اس کے لیے تمہارا وقت چاہیے۔ اس وقت تو میں فریال کی طبیعت پوچھنے آیا ہوں۔"

فریال کے ذکر پر ان کا چہرہ ایک دم پیکا ہو گیا۔ گہری سانس لے کر بیٹھ بیٹھ گئے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگے "اب وہ پہلے سے بہتر ہے۔ کل صبح تو ہم ذریعہ گئے تھے ایک دم اس کے سر میں درد ہوا" اتنا شدید درد تھا کہ تڑپ تڑپ جاتی تھی۔ کسی انجکشن یا دوا سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ فوراً اسپتال لے آئے۔ آٹھ دس گھنٹے بعد اب

صاحب کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے میرے ذہن میں فریال کا ہنستا مسکراتا شرچہ محسوس رہا تھا۔ شام کے چھ بجے تھے۔ وہ شام کے وقت بڑی باقاعدگی سے ہائی گراؤنڈ میں ریٹیکس کرنے جاتی تھی۔ اس کی وابستگی سارے پانچ بجے تک بھگ بھگ کرتی تھی۔ میں نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا وہ ٹینس شوڈ اور پشٹ ٹیکر پہنے گہری دندنی پھر رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی موجودگی میں اپنے پڑے شام کے کھانے کے خطرناک اشاروں سے بے پروا تھا۔ پھر لی ہوئی کسی کسی صوفے پر گر کر تھی، کبھی کسی تالین پر لڑھکتی تھی۔ پھر دور کہیں گھسی۔ جی۔ دو بار۔ تین بار۔ چوتھی گھسی پر کسی نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو کون؟" کسی ملازم کی آواز آئی۔  
"سہی صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔  
"نہیں۔"  
"فریال ہیں؟"  
"آپ کون بول رہے ہیں؟"  
"میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتا" سربراہ اندوہنا چاہتا ہوں۔  
فریال ہیں؟"

چند لمبے بعد آواز آئی "وہ اسپتال میں ہیں۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بڑے صاحب اور یکم صاحب بھی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" میں نے ملازم کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا ہے فریال کو؟ کیوں لے گئے ہیں اسپتال؟" میرے لمبے نیں اُن محنت اندیشہ مٹ آئے تھے۔  
"بس جی ایک دم ہی بیمار ہو گئی تھیں۔ کوئی دودھ سا پڑا ہے۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔"

میں نے ریسیور کرینل پر رکھا اور پریشانی سے کمرے میں ملنے لگا۔ فریال بڑی باری بڑی ہودہ اور محنت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرا دل آپ ہی آپ اس کی طرف متھنے لگا۔ میں نے سوچا "مجھے اسپتال جانا چاہیے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟" لیکن اسپتال کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ ایک بار پھر رنگ کر کے اسپتال کا نام اور وارڈ کا پتا لٹکانا پوچھا۔ اس کے بعد لباس تبدیل کیا اور فریال سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پاکستان واپس پہنچے ہوئے اب قریباً آٹھ روز ہو چکے تھے لیکن سہی صاحب سمیت کسی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ میں واپس پاکستان پہنچ چکا ہوں اور نہ میں جانتا تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ پچھلے سات آٹھ روز میں "میں کئی بار مشتاکا کے بارے میں بھی سوچ

کرتی پابندی نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ میرے آنے تک تم میں قیام کرو۔ مجھے امید ہے کہ واپسی پر میں تمیں کچھ اچھی خبریں سناؤں گا۔" میںاں تمیں کسی بھی قسم کی ضرورت ہو یا کام ہو تو میں ایک الڈین کا جن تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کا نام خدا بخش ہے۔ تمہاری ایک گھسی پر یہ تمہارے پاس حاضر ہو جائے گا۔"  
کمرے میں ٹیلی فون "ٹیلی وژن" وی سی آر "ایر کنڈیشنر" اور فریج سمیت ہر بہترین سہولت موجود تھی۔ قد آدم فریج فرائز اور انگینڈ کی بہترین شرابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوم سروں کے لیے ایک خادمہ موجود تھی لیکن اسے خادمہ کہنا اور بطور خادمہ استعمال کرنا ایسے ہی تھا جیسے بہترین قسم کی شراب کو پانی کا جائے اور اس سے ہاتھ دھونے کا کام لیا جائے یا سات زبانی بولنے والی مینا کو صرف ایک پرندہ سمجھا جائے اور پکا کر کھالیا جائے۔ وہ سرتاپا ہنسکتی تھی اور یہ مسئلہ دن میں کئی بار میرے کمرے میں برپا ہوتا تھا اور یہ کوئی اکیلی لڑکی دعوت گناہ بن کر مایاں نہیں چکراتی تھی۔ اس سے ملتی جلتی کئی تھیں۔ میں جانتا تھا "وہ میری ایک جہش ایوی کھنر رہتی ہیں لہذا میں اپنی جہش ایوی کا بہت دھیان رکھتا تھا۔ اس چند روزہ قیام کے دوران میں میرا دسترخوان انواع و اقسام کی لذتوں سے بھرا رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جہش کونور جاتے جاتے اپنے ایک درجن باورچیوں میں مقابلہ حسن کارکردگی کا انعقاد کر کے مجھے اس مقابلے کا جج بنایا ہے۔ اب وہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بہترین کھانے پکارتے ہیں اور مجھ سے داد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مشن اور فٹس کے پتے پکوان میں نے ان پانچ دنوں میں کھائے، پچھلے آٹھ سال میں نہیں کھائے تھے۔ چائیز کھانے چکن، ویجی ٹیبل اور ٹیشنگ وغیرہ بھی مایاں باقاعدگی سے کھاتے تھے۔

یہ اپنے قیام کے پانچویں روز کی بات ہے، "میں نے سوچا کہ فریال کی خیریت معلوم کرنی چاہیے۔ اس کا ٹیلی فون نمبر مجھے معلوم نہیں تھا، "ہو یا بھی تو اسے فون کرنا میرے بہت مشکل تھا۔ جب بھی میں نے کبھی کسی ایسے اقدام سوچا تھا، میرے سامنے ایک دیوار سی کھڑی ہوتی تھی۔ یہ دیوار سہی صاحب کی شوخ و خشک سا جہاز ہی فریال کی طرف چلا گیا۔ اسے فریال کے بارے میں بل بل کی خبر نہ تھی۔ یقین بات تھی کہ اب بھی وہ فریال کی آمد اور اس مصروفیات سے پوری طرح باخبر ہوگی۔ میں نے اسے فون کرنے کی ٹھانی۔ فون نمبر میرے پاس موجود تھا۔ سات

پہلے فریال صاحبہ اپنے گھر واقع گہرگ تھری میں واپس پہنچ گئی ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہیں۔ صرف پیشانی پر ایک چھوٹی سی چوٹ کا نشان ہے۔  
اطلاع دینے والے نے یہ بھی کہا کہ فریال کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے کے لیے انہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ انہیں جانے سے پہلے ابھی وہ لوگ ابتدائی معلومات ہی حاصل کر رہے تھے کہ اس بات کا پتا چل گیا کہ ڈاکٹر فریال واپس آ چکی ہیں اور اپنے گھر میں ہیں۔ آخر میں اطلاع دینے والے نے کہا "مہم اس بات کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر فریال انڈیا سے کیوں گرواپس مایاں پہنچ سکی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے دونوں ساتھیوں کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔"

یہ اطلاعات میرے لیے جہاں نفسی خیر تھیں وہاں اطمینان بخش بھی تھیں۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ میں فریال کے بارے میں اپنی جلدی اور اتنی اچھی خبریں سکوں گا۔ فریال مایاں کیسے پہنچی یہ بعد میں بھی جانا چاہتا تھا۔ فی الوقت یہی بات اہم تھی کہ فریال بخیر عافیت لوٹ آئی تھی۔ مجھے اطلاع دینے والے تیز طرار شخص کا نام خدا بخش تھا۔ اس کی دلسالت سے بھٹی کونور نے مجھے میرے دوسرے سوال کا جواب بھی پوچھا۔ یہ سوال سائیں عالی کے بارے میں تھا۔ خدا بخش نے کہا کہ سائیں عالی نامی وہ شخص قادر زماں کی حوصلی میں موجود ہے۔ وہ کچھ دوسرے محتاجوں و فقیروں کے ساتھ جہش ولادت والی پارٹی میں مزدور تیار سینے کے لیے شامل ہوا تھا لیکن اس کی قلندرانہ باتوں سے متاثر ہو کر جاگیردار صاحب نے اسے حوصلی میں ممان ٹھہرایا ہے اور وہ ابھی تک وہیں ہے۔

سائیں عالی ایک آسیب کے مانند ہر جگہ پہنچ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے غیر ملکی ہاتھوں سے اس سارے معاملے کو اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ابھی سائیں عالی کی کچھ اور غیر معمولی صلاحیتیں سامنے آئیں گی۔



کنور لندن چلا گیا۔ میں اس کی محل نما رہائش گاہ میں "قائمہ اساتذہ خدمات" کی زود میں تھا۔ ایک دن میں نے انماری کی ایک دراز کھولی تو اس میں پانچ لاکھ روپے یوں پڑے تھے جیسے روٹی کاغذ پڑے ہوں۔ ساتھ یوں کنور کی جانب سے ایک چٹ تھی۔ "شاہ جہاں! یہ رقم تمہارے استعمال کے لیے ہے۔ اگر تم کہیں آنا جانا چاہو تو میری طرف سے تم پر

حالت سنبھلی ہے۔ انگریز ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر بوقت علاج نہ کیا جاتا تو داغ کی نس پھٹ سکتی تھی۔

”کیا میں ایک نظر اسے دیکھ سکتا ہوں؟“

”میں ڈاکٹر سے بات کرنا ہوں۔“ سہا صاحب نے

کہا۔ ”دیکھو اب وہ کافی بہتر محسوس کر رہی ہے۔ ابھی ایک

آدھ گھنٹے میں اسے کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے“ میں کچھ دیر انتظار کر لیتا

ہوں۔“

لیکن میرے منع کرنے کے باوجود سہا صاحب ڈاکٹر

سے پوچھنے چلے گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد آکر مجھے فریال کے

پاس لے گئے۔ فریال بیٹے تک چادر بٹھنے جت لٹی تھی۔ اس

کا ہر دم دھن چوہ سروسوں کی طرح زور نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر

بھی اس کے چہرے پر کوئی رونق نظر نہیں آئی۔ بس آنکھوں

میں ایک رنگ سالر گراؤ بھل ہو گیا اور اپنے پیچھے آنسوؤں

کی نئی چھوڑ گیا۔

”کیا حال ہے فریال؟“ میں نے اس کا نرم ملامت ہاتھ

اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہوں“ وہ برف جیسی سرد اور ٹھوس آواز میں

بولی۔

”کیا بات ہے۔ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟“

”ناراض ہونے کو اب وہی کیا گیا ہے“ وہ گہرے دھک

سے بولی۔ اور اس کے حشاش تھمتے بے تاب ہو کر پھر کتنے

لنگے

سہا صاحب مجھے فریال کے پاس چھوڑ کر باہر جا چکے

تھے۔ میں پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ فریال کے لب و لہجے

نے مجھے ایک دم پریشان کر دیا تھا۔ اچانک ہی مجھے یہ احساس

ہوا تھا کہ فریال کی بیماری اور پریشانی کا میرے ساتھ کوئی تعلق

ہے۔ کوئی ایسا خوالہ موجود ہے جس کے سبب وہ میرے ساتھ

یوں بے رحمی برت رہی ہے۔

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ“

رکھے تھے میں نے۔ آپ نے میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا۔“

”ہو کیا ہے؟“ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ غزالہ جی کی شادی

ہو رہی ہے۔ کل ان کی منگنی ہوئی ہے اور شاید اس ماہ نکاح

بھی ہو جائے“ اس نے بمثل یہ الفاظ ادا کیے اور پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے کان سامنے سانسیں گرج رہے تھیں۔ یوں لگ رہا تھا

جیسے میں ایک سنسنی خیز خوب دیکھ رہا ہوں اور ابھی جاگ

جاؤں گا۔ ایک عرصے سے میں توقع کر رہا تھا کہ کسی روز مجھے

اس طرح کی ہولناکی خیر خیر ملے گی اور میں خود کو ذہنی طور پر ایسی

خبر کے لیے تیار بھی کر رہا تھا لیکن آج اس خبر کو سن کر یوں

لگا تھا جیسے اچانک کسی نے پیچھے سے آکر میرے سر پر وزنی

تھوڑا سا مارا ہو۔ ذہن میں بڑی شدت سے یہ سوال ابھرا

کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دو ہفتے پہلے تک غزالہ

فرید کوٹ میں تھی۔ دو ہفتے میں وہ وہاں سے آچکی تھی اور اس

کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے لیے بے بیجان اور کرب کو حتی الامکان

چھپاتے ہوئے فریال سے پوچھا۔ ”تھیں اس بات کا کیسے پتا

چلا ہے؟“

وہ روتے روتے بولی۔ ”میں کئی دنوں سے اس طرح کی

باتیں سن رہی تھی۔ دو تین مرتبہ غزالہ جی کے گھر فون کیا

لیکن میری آواز سن کر فون بند کر دیا جاتا تھا۔ کل میں غزالہ

جی سے ملنے ان کے گھر چلی گئی۔ وہیں پر مجھے اس ٹھوس خبر کا

پتا چلا ہے۔ ان کے خاندان کا بی کوئی لڑکا ہے۔ کینیڈا سے آیا

ہے۔ شادی کے بعد فوراً واپس جانا چاہتا ہے۔“

میں حیران نظروں سے فریال کا زور چومک رہا تھا۔ میر

نے تصور میں دیکھا کہ اس خبر کو سننے کے بعد میرا اپنا چہرہ بھی

فریال کا ہم رنگ ہو گیا۔ اب فریال کی اچانک علالت کی وجہ

بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کی متوتر آنکھیں بتا رہی

تھیں کہ وہ کل ساری رات جاگتی اور روتی رہی ہے۔ اگر

رت بچنے کے نتیجے میں ہی وہ اسپتال پہنچی تھی۔

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے آکر نرمی سے میرے کندھے

ہاتھ رکھا اور بولا ”پلینز۔ ان کی حالت ابھی زیادہ اچھی

نہیں ہے۔ آپ انہیں آرام کرنے دیں۔“

میں اٹھا اور جیسے خواب میں چٹا ہوا انتہائی ہلکا

کے دروازے سے باہر آیا۔ سہا صاحب مجھ سے کچھ پوچھنا

رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فریال کو دیکھنے کے بعد میں

سے ان کے پاس بیٹھوں گا اور حالات سے آگاہ کروں گا لیکن

جو کچھ میں سن کر آیا تھا اس نے میرے اندر تسلسلہ سا چھایا

تھا۔ میں سہا صاحب سے معذرت کر کے اور دوبارہ ملنے کا

وعدہ کر کے اسپتال سے باہر آیا۔ جلد ہی میری موٹر سائیکل

نہر پہنچی اور اس کے کنارے کنارے شاہراہ کا انداز عظیم کی

طرف بڑھنے لگی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ دوشیزوں اور

رنگوں کا شہر لاہور جگمگا رہا تھا۔ سڑکیں بادوق تھیں۔ لوگ

اپنے حال میں مگن اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے کسی

کو خبر نہیں تھی کہ میرے دل میں کیا جہنم دھانچہ ہوئی ہے۔

ایک سویا ہوا آتش فشاں تھا جو پھٹ گیا تھا اور اس کی زہریلی

آگ میرے رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔ غزالہ کی شادی کی

خبر سن کر تجھ کا جو شدید حملہ ہوا تھا اس کا اثر ڈاکل ہو چکا تھا

اور اس تجھ کی جگہ اب ایک شدید قسم کی نفرت اور غصے نے

لے لی تھی۔ میں غزالہ کا حسین سراپا بار بار تصور میں لاتا

تھا۔ اس پر نفرت کی بجلی گرا رہا تھا اور جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔

ایک خودکھائی کی کیفیت مجھ پر چڑھ چکی تھی۔ میں اس کو کوہن

رہا تھا۔ لعنت ملاحت کر رہا تھا۔ ”تو کیا سمجھتی ہے خودک۔ تو

ہے کیا چیز؟ تیرا خیال ہے کہ میں تیری جدائی پر آنسو بہاؤں

گا؟ کسی تو خیز عاشق کی طرح کپڑے مجاز کر گلیں میں نکل

جاؤں گا؟ اپنے روتے پر پچھتاؤں گا اور گزرتے دنوں کا ماتم

کروں گا؟ نہیں کچھ نہیں ہو گا ایسا۔ میں۔۔۔ تو کتنا ہوں تجھ

پر اور لعنت بھیجتا ہوں تیرے غم پر۔ مجھے نہ کبھی تیری پروا تھی

اور نہ ہوگی۔“

میرا داغ باغی کی طرح کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ

غزالہ اور اس کی ٹھوس ماں میرے سامنے ہوں اور دونوں

کے چھوٹے بڑاؤں۔ نہجانے کیوں غیظ و غضب کے ان

لمحات میں غزالہ کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کا تصور بھی

میرے ذہن میں در آیا تھا۔ در حقیقت غزالہ سے میری نفرت

کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ جچی فخر کی بیٹی تھی۔ چھپتے آٹھ

دس برسوں میں غزالہ نے خود کو بت دلا تھا اور اس کی سیرت

ماں کی خصلت سے بالکل جدا ہو گئی تھی لیکن پھر بھی نہ

کبھی، کبھی نہ کہیں مجھے اس میں جچی فخر کی کوئی جھلک نظر

آتی تھی۔ اس انتہائی خزانہ اور بد باطن عورت کا تصور

میرے تن بدن میں آگ لگ دیتا تھا اور میں غزالہ کے لیے بے

حد انجمن اور بہت سے حس ہو جاتا تھا۔

میں یونی بے مقصد لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکل

بھاگتا ہوا اور اپنے اندر جچی کھلی سے نکلنے کی کوشش کرتا

رہا۔ قریباً ایک گھنٹے کی سڑک پیمائی کے بعد میری موٹر سائیکل

مر جتی ہوئی اس عظیم الشان کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوئی

جہاں میں قیام پزیر تھا۔ موٹر سائیکل سے اترتے ہی میں اپنے

کمرے میں پہنچا اور شاور لینے کے لیے ہاتھ میں گھس گیا۔

ٹھنڈے پانی کا غسل عموماً میرے اندرونی پیمانے کے لیے ٹھو

مند حاجت ہوتا ہے لیکن اس روز پانی کی پھوار بھی آگ کی

پھوار تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ششوں سے تھرا رہا ہوں۔

اس روز خواب آور گولیاں کھائے بغیر مجھے نیند نہیں

آئی۔ صبح دس گیارہ بجے تک سویا رہا۔ رات کے واقعات

ایک ڈراؤنے خواب کی طرف محسوس ہو رہے تھے کاش وہ

سب ایک خواب ہی ہوتا۔ رات فریال سے میری ملاقات

خواب میں ہی ہوئی ہوتی اور خواب میں ہی اس نے مجھے بتایا

ہوتا کہ غزالہ کی شادی ہو رہی ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ

خواب نہیں تھا۔ وہ واقعہ ظہور پزیر ہو گیا تھا جس کی توقع میں

بچھلے کئی ماہ سے کر رہا تھا۔ یقیناً اس واقعے کی داغ بیل اسی

دن پڑ گئی تھی جب ایک دھواں دھواں شام کو میں صفدر کے

ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا اور غزالہ بابو سی کی انتہا کو

چھونے کے بعد مری کے چوراہے میں خاموش کھڑی رہ گئی

تھی۔

یہ قراری قواب بھی تھی لیکن رات جیسی وحشت

نہیں تھی۔ میں بستر پر چٹ لیٹ گیا اور ڈرا ٹھنڈے دل سے

سوچنے لگا۔ ایک نہ ایک دن تو یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ اور

میں خود چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے۔ اب ہو گیا تھا تو

افسوس کس بات کا تھا۔ اس کی جان، میری گناہ گار بدنام

زندگی سے چھوٹ گئی تھی اور میری جان اس ماضی سے

چھوٹ گئی تھی جو غزالہ کے سامنے آتے ہی میرے دل پر

چھوٹے لگنے لگتا تھا۔ اب وہ اپنے ہونے والے شریک

حیات کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کرے گی اور میں اس

ندامت سے چھٹکارا پا جاؤں گا کہ کسی کی مسلسل چاہتوں کا

جواب میں مسلسل سرد مہری سے دے کر خود کو بے رحم ثابت

کر رہا ہوں۔

میں بہت دیر تک اس موضوع پر سوچتا رہا۔ دھیرے

دھیرے دل کو قرار سا آنے لگا۔ ہرگز نہ ان کی انتہا گمراہیوں میں

کہیں یہ خیال بھی موجود تھا کہ ابھی صرف منگنی ہی ہوئی ہے

شادی تو نہیں ہوئی۔ شادی تک حالات نہ جانے کیا رخ

اختیار کریں گے شادی ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ ایسا سوچتے

ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں دو حصوں میں بٹ گیا

ہوں۔ ایک حصہ چاہتا کہ غزالہ کی شادی کا کام پایہ تکمیل کو

پہنچ جائے۔ دوسرا حصہ چاہتا تھا کہ سیں کوئی ازچن پڑ جائے۔

ایسا کچھ ہو جائے کہ یہ شادی اتنی جلدی نہ ہو۔  
تیسرے روز چھٹی کنور لندن کے ٹوڑے واپس آیا۔  
شام کو اس نے مجھ سے ملاقات کی اور حال احوال پوچھا۔ وہ  
مجھے میری توقع سے بڑھ کر اہمیت دے رہا تھا۔ جی نری سے  
پوچھنے لگا۔ ”کیا بات ہے شاہ جہاں! کچھ کھوئے کھوئے نظر  
آتے ہو۔“

”نہیں جناب۔ میں یہاں بہت آرام سے رہ رہا ہوں  
بلکہ اتنا آرام ہے کہ بے آرامی ہو رہی ہے۔ فارغ بیٹھے بیٹھے  
بورت محسوس کرنے لگا ہوں۔“

وہ مسکرایا۔ ”بہت خشک مزاج ہو رہا ہو۔ بورت کی  
شکایت نہ کرتے۔ بہر حال ایک دو دن میں تمہاری یہ بورت  
دور ہو جائے گی اور ایسے ڈھنگ سے ہوگی کہ آتش  
کرو گے۔“

پھر وہ مجھ سے غزالہ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔  
میں نے اسے بتایا کہ خدا بخش نے اپنا کام خوش اسلوبی سے  
انجام دیا ہے اور غزالہ کا پتا چل گیا ہے۔ وہ بحفاظت اپنے گھر  
پہنچ چکی ہے۔

کنور نے پوچھا۔ ”لیکن بیٹی کیسے ہے؟“  
میں نے کہا۔ ”یہ تو ابھی پتا نہیں چلا۔“

وہ بولا۔ ”میرے خدا بخش نے خوش اسلوبی سے کیا کیا ہے۔  
اسے چاہیے تھا کہ مکمل معلومات فراہم کرتا۔ میں ابھی اس  
کے کان کھینچتا ہوں۔“

چھٹی کنور سے باتوں کے دوران ہی مجھے یہ خیال آیا کہ  
غزالہ کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے۔ کچھ خبر  
نہیں تھی کہ وہ اڑیا سے کن حالات میں واپس آئی ہے۔  
میں ممکن تھا کہ کچھ لوگ اب بھی اس کی تلاش میں ہوں۔  
شیخ عالم کو تو اس کی تلاش تھی ہی، ہو سکتا تھا کہ فرید کوٹ  
میں ٹرک کے سلسلے میں قسمت آزمائی کرنے والا کوئی گروہ بھی  
اس کے پیچھے لگ گیا ہو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سہی صاحب کو  
غزالہ کے بارے میں فون کروں۔

کنور کے جاتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور  
فون کی طرف بھاگ۔ غزالہ کے علاوہ میں سہی صاحب سے  
شفقت اور انجمن کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں  
سہی صاحب کی حفاظت میں تھے اور سہی صاحب نے  
اپنے پروگرام کے مطابق انہیں کسی خفیہ مقام پر رکھا ہوا  
تھا۔ اس مقام کی اطلاع سہی صاحب کے سوا اور کسی کو  
نہیں تھی اور انہوں نے عندیہ ظاہر کیا تھا کہ وہ مجھے بھی اس  
بارے میں بے خبر رکھیں گے۔ میں نے سہی صاحب کے نمبر  
ڈائل کیے۔ دوسری طرف ان کی بیارامیہ نے فون اٹھایا۔

وہ میری آواز میں پہچان سکیں۔ میں نے تعارف کرایا اور  
سلام دعا کے بعد سہی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ جواب  
میں سہی صاحب کی اہلیہ نے جو کچھ مکاوہ دہریلے تیلوں کے  
باندھنا تھا، وہاں میرے کانوں میں گھس گیا۔ انہوں نے بڑے  
عام سے لمبے میں کہا۔ ”یہ اُدھ کل چلیں احمد کی بیٹی کی شادی  
تھی نا، وہیں پر گھرے ہوئے تھے۔ رخصتی رات دیر سے ہوئی  
اس لیے وہیں رہ گئے۔ میرا خیال ہے ابھی ایک آدھ گھنٹے  
تک آجائیں گے۔“

چچا جلیں کی بیٹی کی شادی۔ یہ الفاظ تھے یا ہم تھے جنہوں  
نے میری سماعت کے پرچے اُڑا دیے۔ میں اپنی جگہ سکتے کی  
حالت میں کھڑا رہ گیا۔ ایک بل میں صدیوں کا کرب مجھ پر  
داروہوا اور مجھے روندنا ہوا کر گیا۔ سہی صاحب کی اہلیہ کی  
آواز مجھے کہیں دور بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔  
پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ شاید غزالہ کے دلہا کی بات  
کر رہی تھیں۔ ”اس کی والدہ بہت بیمار تھیں۔ کسی بھی وقت  
آسمانیں بند ہو سکتی تھیں۔ وہ بیٹے کے سر پر سر اڈھینا چاہتی  
تھیں اس لیے فوراً بیاہ ہوا۔“ وہ اس کے علاوہ بھی بہت  
کچھ کہہ رہی تھیں۔ میری غیر حاضری کے بارے میں پوچھ  
رہی تھیں۔ سہی صاحب کے بارے میں بتا رہی تھیں لیکن

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خبر نہیں میں نے ان سے  
الوداعی کلمات بھی کہے یا نہیں اور فون بند کر دیا۔ مٹی کے  
ایک ڈھیر کی طرح میں بستر پر گر آ۔ اس ڈھیر میں صرف میرا  
دماغ زندہ تھا اور تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ درد کرب میں  
ڈوبی ہوئی جو سچیں تھیں اور ان کا سرد دائرے کا سفر تھا۔ بیٹے  
ہوئے بل اور شب و روز ایک ترتیب کے ساتھ بار بار  
لگا ہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کتنا طویل سفر تھا  
یادوں کا، یہ کوئی دو تین ماہ یا برس کی بات نہیں تھی۔ قریب  
سولہ سال ہو چکے تھے اس نالے کو۔ یہ بچپن کی محبت تھی، مہار  
کے ایک خوشگوار سویرے میں یہ محبت کسی گونج کی طرح  
میرے دل میں پھونکی تھی۔ سادوں کی بے شمار بارشیں یہی  
تھیں اس محبت پر۔ ”ان گت چاندنی راتوں نے اسے چھو اٹھا۔  
صبحوں کے اُجائے اور شاموں کے رنگ اسے اپنے آسروں  
سے پیچھے رہے تھے اور مرمریں ہونٹوں سے چومتے رہے  
تھے۔ اب اس محبت کی جڑیں میری ہمتی میں بہت دور تک  
پھیل چکی تھیں اور وہ ایک تندر دخت کا روپ دھار چکی  
تھی لیکن اس دخت کی قسمت میں باقی رہنا نہیں تھا۔ اسے  
کننا تھا، آج نہیں توکل، آج یہ کٹ گیا تھا۔“

پتا نہیں میں کب تک یونہی سکتے کی حالت میں بستر  
بیٹھا رہا۔ اس خبر کے بے پناہ اندوہ کو اپنے اندر جذب کر

کی کوشش کرتا رہا۔ چھٹی کنور کا ملازم خاص خدا بخش دو تین  
بار آیا اور مجھے کم کم سمجھنے دیکھ کر چلا گیا۔ وہ سپر کے کھانے  
سے تھوڑی دیر قبل چھٹی کنور میرے پاس چلا آیا۔ کھنے لگا۔  
”کیا بات ہے شاہ جہاں بہت اُداس نظر آ رہے ہو؟“

”کوئی بات نہیں جناب، یونہی طبیعت مختل سی ہے۔“  
وہ بولا۔ ”نہیں اس لڑکی کا تو کوئی معاملہ نہیں جس کا کام تم  
نے غزالہ بتایا تھا۔“

”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں“ میں نے لمبے کو جتنی  
الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے سگار کا ایک گرامس لیا اور رعب دار لمبے میں  
بولا۔ ”تم چھپا رہے ہو شاہ جہاں! میں نے سب کچھ معلوم کر لیا  
ہے۔ کل اس لڑکی کی شادی ہو گئی ہے اور ختمیں ابھی تھوڑی  
دیر پہلے ایس پی رجاں سہی کے گھر سے اس بارے میں  
اطلاع ملی ہے۔“

میں چھٹی کنور کی باخبری اور ان ذرائع کی تیز رفتاری پر  
خیران رہ گیا جن سے اس نے یہ خبر حاصل کی تھی۔ اس نے  
خدا بخش کو الہ دین کے چراغ کا جنم کہا تھا اور یہ بات کچھ  
ایسی غلط نہیں تھی۔

میں نے بے روح لمبے میں کہا۔ ”نہیں جناب! میری  
پریشانی کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔“

وہ لب بچھنے مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا  
ہو کہ تم مجھے نہیں اپنے آپ کو یقین دہا رہے ہو۔ سگار کو  
الٹل ٹرے میں مسل کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ایک  
ایک کونڑی کے شیشے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک  
نوبصورت صوفے پر شاہانہ انداز میں بیٹھ کر اس نے ایک  
نئی ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ نمبر ڈائل کر کے  
”کی سی“ سے باتیں کرنے لگا۔ آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔  
صرف ہونٹوں کی حرکت دکھائی دے رہی تھی۔

منہمکو ختم کر کے اس نے نئے سگار کا کاٹا تراشا۔ قریب  
کوڑے خدا بخش نے جلدی سے جھک کر لائٹر روشن کیا اور  
گار کو ٹپ دکھائی۔ اتنے میں چار عدد بے گتے افراد جو  
ہر قوت سے ہی خطرناک جرائم پیشہ گتے تھے، اندر آئے اور  
خود باندھ کر چھٹی کنور کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کی  
فیس قالین چرتھیں اور ہاتھ نہایت مہذب انداز میں ناف پر  
ڈسے تھے۔ چھٹی کنور نے ان سے کچھ باتیں کیں۔ وہ اُٹنے  
دھن چنے باہر نکل گئے۔ چھٹی کنور سگار چھوکتا ہوا میرے  
س آ گیا۔

کہنے لگا۔ ”شاہ جہاں! تم چھٹی کنور کے مہمان ہو۔ شاید  
اُدھ نہیں ہو کہ اس وقت تمہارا کیا مرتبہ ہے، کہاں تک

رسائی ہے تمہاری، وہ کون سی چیز ہے جو اس وقت تمہاری  
دسترس میں نہیں۔ تم صرف اُشاہ کو سب کچھ تمہارے  
قدموں میں آئے گا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں جناب“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”یہ بالکل صاف سیدھی بات ہے تم اس لڑکی  
سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تم دونوں کو  
ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔ بس اس کے سوا  
جو کچھ ہے وہ جھوٹ ہے۔ قریب ہے یا بزدلی؟“ اس نے بڑے  
اشانگل سے اپنی رشتہ راج دیکھی اور بولا۔ ”آخری  
اطلاعات کے مطابق وہ لڑکی اپنے شہرانی رشتے والوں کے  
ہاں راولپنڈی میں ہے۔ اگر وہ راولپنڈی میں ہی ہے تو چچ  
سات گھنٹے کے اندر اندر یہاں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔  
تھیں میرے اس اقدام پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

میں حیرانی سے چھٹی کنور کا چہرہ نک رہا تھا۔ مجھے یقین  
نہیں آیا کہ یہ الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہیں۔ وہ ایک  
قد آور سیاسی لیڈر تھا۔ ایک عوامی شخصیت تھا، ایک با اختیار  
حکمران تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے ہونٹوں سے ایسی  
چھوٹی بات نکلے گی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں جناب! بہت معذرت  
کے ساتھ میں آپ سے اختلاف کرنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ ہو چکا  
وہ ہو چکا۔ میری ہرگز خواہش نہیں ہے کہ اس کو بدلنے کی  
کوشش کی جائے بلکہ مجھے ایک طرح سے خوشی ہوئی ہے۔  
میری بیک آؤ تھی کہ وہ لڑکی میرا پند چموز کر شرافت کی  
زندگی گزارے۔“

”واہ! پھر وہی روایت ازم“ چھٹی کنور نے میرا منہمکو  
اُڑایا۔ پتا نہیں کیوں کچھ لوگ پرچھائیوں کے پیچھے بھاگتا پند  
کرتے ہیں۔ بھائی میرے ”زندگی محسوس شے ہے“ کسی شاعری  
لفظ یا مصور کی تصویر نہیں ہے۔ اسے معائنہ بناؤ۔ جو کچھ مل  
رہا ہے، اسے حاصل کرو۔ اسے چھوڑو، اس سے لطف اٹھاؤ۔  
جو نہیں مل رہا اسے بھول جاؤ۔“

میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”جناب! میں بے حد  
شرمندہ ہوں آپ سے لیکن اس لڑکی کے بارے میں اس  
طرح کی کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔ پلیز۔ اگر آپ نے  
اس مقصد سے کسی کو بھیج دیا ہے تو اسے واپس بلا لیجئے۔“

کنور نے بہت گہری نظروں سے میرا چہرہ دیکھا۔ اس کی  
آنکھوں کا سرد فوٹو کسی برسے کی طرح متحرک ہوا اور میرے  
ذہن تک رسائی حاصل کر گیا۔ ایک بل سے بھی متغیر وقت  
میں وہ جان گیا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔

”اوکے۔ جو تم چاہ رہے ہو وہی ہو گا۔“ اس نے کہا  
اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔



○☆☆○

وقت مرہم ہوتا ہے لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وقت کا یہ مرہم مجھ پر بے اثر ہو گیا ہے گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میرا تم گرا اور وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ غزالہ کی موبی صورت ہر وقت نگاہوں میں رہتی تھی۔ سوتے جاتے، چلتے پھرتے۔ مجھے قوی یقین تھا کہ یہ کیفیت تادیر پر قرار نہیں رہے گی۔ جہاں اتنے بڑے بڑے غم اپنی شدت کھینچتے، اتنے المناک حادثے گزرتے اور فراموش ہو گئے وہاں اس دکھ کی دھار بھی گند ہونے لگے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ہونے لگا۔ میں کوئی جوشیلا تو جوان نہیں تھا نہ ہی کوئی دل بھینک عاشق تھا۔ ہر اونچ نیچ سمجھتا تھا اور جذباتی گھاٹوں سے پوری طرح آگاہ تھا، پھر بھی اپنے دل و دماغ پر میری گرفت گہوارہ پڑنے لگی۔ ایک دن غزالہ کی دی ہوئی گھڑی میں نے اتنے زور سے فرش پر پٹی کر دی کہ وہ درجنوں گھڑیوں میں تقسیم ہو گئی۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک طویل مدت طویل عرصے کے بعد میں نے شراب کو ہاتھ لگایا۔ اور پھر اتنی ہی کہ مدہوش ہو گیا۔ چھٹی کونور کا دھرے گزر ہوا۔ اس نے مجھے سرخ چہرے اور انگارے آنکھوں کے ساتھ ساغر و مینا سے کھیلنے دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ میرے ایک خدمتگار سے بولا۔ ”خان محمد! آج تمہارے صاحب موڈ میں ہیں۔ ان کے پاس رہو اور جو یہ مانگتے ہیں دو۔“

خان محمد نے بڑھ چڑھ کر ان ہدایات پر عمل کیا اور میرے بن مانگے ہی بہترین فریج و مینسکی کی ایک بوتل میرے سامنے سجادی۔ میں غزالہ کے غم کو آتشیں سیال میں ڈوبنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جتنا ڈوبا تھا وہ اتنا ہی عمر تار جا رہا تھا۔ میری خدمت پر مامور لڑکی کسی کام سے اندر آئی تو وہ مجھے معمول سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر لگی۔ میں جانتا تھا، میرے ذہن پر شراب کا اثر ہے۔ ایسے میں کوئی چھٹی گزری، بھی ہوتی تو موت لیزا لگتی۔ یہ تو پھر چلتا پھرتا شعلہ تھی اور اس چار دیواری میں یہ صرف ایک شعلہ رقصاں نہیں تھا۔ بہت سے شعلے میرے ارد گرد ناچ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی شعلہ میرے اچھے دامن میں آگ جگا سکتا تھا۔ مجھے اس ماحول سے خوف آنے لگا۔ میں نے سرب ہیلمیٹ پہنا۔ آٹھ ہارس پاور کی لی ایم ڈی بی موز سائیکل پکڑی اور نکل کھڑا ہوا۔ میں غمار کے عالم میں ہواؤں میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ نجانے میری موٹر سائیکل کب تک یوں ہی سڑکوں پر دندناتی رہی۔ شاید ایک دو جگہ میں نے معمولی قسم کے حادثات بھی دیکھے اور ہر جگہ میں سرخ اشارے پر میں گولی کی رفتار سے

شاہی محلے کے ایک مصوف چوک میں پایا۔ موٹر سائیکل کی گھن گھن سن کر بازارِ حُسن کے رنگین درہے چلنے لگے۔ میں نے ہیلمیٹ اتار کر نشست پر رکھا اور بھاری قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ میں انک جیل کا قیدی تھا اور بیروں پر رہا ہوا تھا۔ میرے بیروں کے کاغذات پر سائی صاحب کی سفارش تھی اور چند اعلیٰ افسران کی تائید تھی لیکن یہ کاغذات نہ بھی ہوتے تو چھٹی کونور کے ہوتے ہوئے مجھے کسی سے کوئی خوف خطرہ نہیں تھا۔ ایسے موقعوں کے لیے خیالی میں کما جاتا ہے ”ساری خدا کی راک پاسے“ میرا ڈھونڈنا ہی راک پاسے۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت بھی میں تنہا نہیں ہوں۔ میری حفاظت کی غرض سے چھٹی کونور کے کارندے مسلسل میرے ارد گرد موجود تھے۔ وہ کوئی بھی سے ہی میرے ساتھ آ رہے تھے۔ بظاہر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر کسی بھی مشکل میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ چار پانچ برس پہلے بازارِ حُسن میرے لیے ایک جانی پہچانی جگہ تھی۔ کئی لوگوں نے مجھے شناخت کر لیا۔ کئی آنکھوں میں نئے جرت، مسرت اور دلچسپی کے طے چلتے اثرات نظر آتے۔ بازار کے اس سرے سے اُس سرے تک سنسنی سی چھین محسوس ہوتی۔ کئی لوگوں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور انجان لوگوں کو سرگوشیوں میں بتایا کہ میں کون ہوں۔

چالیس پچاس قدم آگے دوڑھ فروشوں کا ایک ریڑھ سڑک کے عین درمیان کھڑا تھا۔ ایک توندنہ شخص ریڑھے پھیل کر بیٹھا تھا اور ایک کھڑکی سے جھانکنے والی مرل سی آئی کو فٹش اشارے کر رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی دوڑھ کے آگے آگے کر ٹیڑھ فروش کی ٹوکاں پر رکھ رہے تھے۔ نجانے طبعی میں کیسی کتنی بھری ہوئی تھی کہ میں خواہ مخواہ ریڑھا بان۔ الجھ گیا۔ میں نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا کہ اس نے خوشی میں یہ چرخہ سڑک کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے! کما کر ریڑھا بان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ دوا جت لگا کر ریڑھے سے اُترا جیسے پاؤں میں اسپرک۔ ہوں۔ اس کے ہاتھ میں موٹی ڈنڈی کا چابک تھا۔ چابک نے پوری طاقت سے میرے چہرے پر مارنے کی کوشش میں بالکل تیار تھا۔ وارو خالی دے کر میں نے ٹانگ کی ضرب اس کے سینے پر لگائی۔ لڑکھڑا کر کھڑے کے تہ میں گرا۔ کھڑا بڑک کرا چلا اور زیادہ وزن کے سبب ٹانگوں پر الف ہو گیا۔ ریڑھے پر لڑے دوڑھ کے برتن: آوازوں سے سڑک پر لڑکھنے اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر

کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس سے پہلے ہی اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ اس کے پیٹ میں گتے والی ایک چوٹ بے حد شدید تھی۔ وہ اوندھے منہ سڑک پر گرا اور ترپنے لگا۔ دوڑھ فروش کا ایک ساتھی پنجابی قلموں کے جانے بیچانے انداز میں بھٹک مار کھج پر حملہ آور ہوا۔ میں نے جھانکی دے کر بڑی آسانی سے اسے کندھے پر اٹھالیا پھر چند قدم بھاگ کر ایک دکان کے پختہ نمبر پر روے مارا۔ نمبرے کا کنارہ اس شخص کی پشت پر لگا اور اس کے حلق سے بلند چیخ نکل گئی۔ دوڑھ فروش کا تیسرا ساتھی یہ مناظر دیکھ کر سمجھ گیا کہ مزاحمت کرنا خطرناک ہے۔ باعزت پسپائی کا معروف طریقہ یہی تھا کہ وہ مجھے دھمکیاں دیتا ہوا بھاگ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ایک بار دوڑھ میں ترسڑک پر پھیلنے کے بعد بھاگ نکلے میں کامیاب ہوا۔ کشتی پولیس کی ایک بائی دندھاتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ پیٹ پر چوٹ کھانے والا توندنہ شخص بے ہوش ہو چکا تھا جب کہ اس کا ساتھی دکان کے نمبرے پر پڑا تھا اور ہاتھ کمر پر رکھے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک اے ایس آئی باز پرس کے لیے میری طرف بڑھا لیکن راستے ہی میں ایک شخص نے اسے روک لیا اور کان میں کچھ کہہ کر ایک طرف لے گیا۔ میں جانتا تھا، اے ایس آئی کو صوبے کی سب سے بااثر شخصیت کا حوالہ دیا جائے گا اور اس حوالے کو سن کر کئی گھنٹے تک بے چارے کی گھنگی بندھی رہے گی۔

میرے قریب ہی ایک کھوہ صورت دلال کھڑا تھا۔ میں نے دوڑھ فروش کا چابک اٹھا کر اسے تھمایا اور کہا کہ وہ ریڑھے کو میاں سے ہٹالے جائے۔ دلال نے کسی معمول کی طرح میری ہدایت پر عمل کیا اور چند افراد کے ساتھ مل کر ریڑھے کو ”پینٹس“ کمرے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا، اب دو تین منٹے تک کوئی اس سڑک پر اس انداز میں ریڑھا کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ چٹوں کی جب سے میں نے واٹ 69 کی کوارٹر بول نکالی اور چند گھنٹے لے کر ایک چوہارے کی بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میری آمد سے چوہارے میں گھلپٹی سی گچنی چٹی۔ جماندہ ٹانیاں آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ رقصائیں چشم براہ نظر آتے لگیں۔ اس چوہارے کے کین بازارِ حُسن کے شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ گورنمنٹ کے جاری کردہ لائسنس کے مطابق صرف ناچ گانے تک محدود تھے بلکہ اس لیے کہ وہ قانون کی خلاف ورزی بڑی احتیاط سے اور صرف خاص خاص لوگوں سے ہماری ”خزیناں“ لے کر کرتے تھے۔ میں اندر جا کر ایک آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔ لال گلابی چھوں اور

کاسیکس کی خوشبوؤں نے مجھے گھیر لیا۔ اس ٹانیکا سے میری جان پہچان اپنے دور پر آشوب میں ہوئی تھی۔ اسے جان بانی کما جاتا تھا۔ جان بانی کے اشارے پر چند سائندے اندر آتے اور اپنے سائوں سمیت صاف اعلیٰ چاندی پر چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹانیکا صاف ستھری اردو بولتی تھی۔ اس نے لجاہت سے کہا ”جہانی صاحب! بڑے لمبے عرصے بعد تشریف لائے ہیں آپ۔ ہندی کی تو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ زبے نصیب اس کو غمے کو آپ کے قدم نصیب ہوئے فرمائیے کیا خدمت کی جائے آپ کی؟“

”کچھ نہیں“ میں نے ہاتھ لڑا کر کہا ”میں تمہے سننے نہیں آیا اور نہ ہی خدمت کرانے آیا ہوں۔ بس تمہارے ہاتھ کا ایک پان کھانا سب وہی الاچی چٹاری سو فٹ اور قوام والا۔ اس پان کا کاغذ آج تک میرے منہ میں گھلا ہوا ہے۔“ تعریف نے جان بانی کو باغ باغ کر دیا۔ اس کے حکم پر لڑکیوں نے چاندی کا ایک بڑا پاندان لاکر قاتلین پر رکھ دیا۔ پان لگانے اور ہٹانے میں ٹانیکا جان بانی کو واقعی کمال حاصل تھا اور وہ اس سلسلے میں زبردست اہتمام بھی کرتی تھی۔ کتھا، چوٹا ٹیاری، خوشبو، پتا غرض ہر شے تازہ اور بہترین کوالٹی کی۔ وہ ایک خانہ ساز قوام استعمال کرتی تھی جو اپنی مثال آپ تھا۔ جان بانی کو پان کاتنے اور لگاتے دیکھنا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ آخر میں وہ پان کو چاندی کے ورق پر رکھ کر ایک نفرتی طشتری میں سجاتی تھی اور بڑے رکھ رکھاؤ سے پیش کرتی تھی۔

دو خرداغ دوڑھ فروشوں کی پھینٹی لگانے کے بعد میرا نمبر پچہترے نیچے آ گیا تھا، میں صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور جان بانی کے رس گلے جیسے پان کو منہ میں ڈالنے لگا۔ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر چوہارے کی رقصائیں اور گانے والیاں بھی قریب ہوئیں۔ وہ کچھ دیر تو جھجکتی رہیں پھر ادرادھر کی گانے لگیں۔ ایک بولی ”جہانی! بڑی زوردار خبریں مل رہی ہیں آپ کے بارے میں۔ سنا ہے جنگ کی کسی حویلی سے بہت سارے صندوق ملے ہیں آپ کو۔“

میں نے کہا ”مے نہیں شڑا دی! ملے تھے جیسے ملے تھے ویسے ہی کھو گئے۔ سمجھو بہا بن کر آؤ گئے۔“ عتب سے ایک بولی ”ہائے ہائے جہانی صاحب! ہم نے آپ سے کچھ مانگ تو نہیں لیا۔ اللہ آپ کو اور ترقی دے“ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”سنا ہے ان صندوقوں میں پرانے زیور اور ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ کروڑوں کی دولت ہے۔“

”ہوگی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے“ میں

نے گول مول جواب دیا۔

لڑکیاں اس سلسلے میں بڑے تجسس کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا پھر ایک دم مبرا دل اس ماحول سے بھی اچانک ہو گیا۔ جتنی کٹور کے دلے ہوئے نوٹوں کا کچھ حصہ میری جیب میں موجود تھا۔ میں نے پانچ سو کے آٹھ دس نوٹ نکال کر تانیا کی جھولی میں پیچھے اور ٹھکانا ہوا دو دانے کی طرف پڑھا۔ چار پانچ ہزار روپے میں ایک پان کھانے والے کے لیے پھرتی ہے دو دانہ کھولا گیا۔ میں بیڑیاں اتر کر سڑک پر پٹیا اور ایک بار پھر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سڑکوں پر دندناتے لگا۔ غم شدہ کی کھوپڑی کی طرح میرے عقاب میں تھا۔ کسی جگہ اس سے امان نہیں تھی کسی دھنک اس سے چمکنا نہیں تھا۔ رات دو بجے کے قریب میں واپس جتنی کٹور کی رہائش گاہ پر پٹیا۔ جتنی کٹور کی شاندار لیوڈین پورج میں تھیں۔ میں سیدھا اپنے بیڈ روم میں پٹیا۔ بدن میں انگارے سلک رہے تھے ہاتھ روم میں داخل ہو کر میں کپڑوں سمیت شاور کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ درود کرب کی بے پناہ شدت سے سولہ برس بعد پہلی بار میری آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے۔ پہلے میں ہاتھوں میں چوڑھپا کر سکیاں لیتا رہا پھر دھانیاں مار مار کر رونے لگا۔ دل سے آواز آئی ”جی بھر کر دلو شاہ جہاں میاں کون ہے جو تجھیں عورتوں کی طرح دوتے ہوئے دیکھے گا۔ نہ تمہاری آواز کسی کے کانوں تک پہنچے گی اور نہ کوئی تمہارا آنسوؤں سے تر چو دیکھے گا۔ آج کل کر اپنی برائیوں کا ماتم کرلو۔ اتنے آنسو بہاؤ“ اتنا کہ یہ کہہ کر دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ ”اتم کے ان لمحوں میں مجھے اپنی نگہاں بن شتیا یاد آئی۔ ہم ایک دوسرے کے راز داں تھے ایک دوسرے کا ہر دکھ سمجھتے تھے مجھے اپنے آنسوؤں کے لیے اس کے شانے کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس ہوتی کہ دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگیں۔

میں مسلسل رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کبھی یہ آنسو جھیں گے بھی یا نہیں۔ میں غزالہ سے محبت کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی جڈاں مجھے تکلیف دے گی لیکن یہ تکلیف اتنی ہولناک اور مسلسل ہوئی کہ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے آج تک اپنے اور غزالہ کے بارے میں جتنے اندازے لگائے تھے وہ سب غلط تھے۔ میں اس جذبے کی گہرائی اور وسعت سے قطعی بے خبر تھا جو برسوں سے میرے دگ دے میں بسا ہوا تھا۔ ”چپچپاتا“ اس کیفیت کے لیے ایک معمولی اور حقیرانہ تھا جو میرے دل و دماغ پر طاری تھی۔ ماضی کی غم کھڈوں کی صورت میرے پردہ

تصور پر چل رہی تھی۔ غزالہ کی جراثیم اور ہتیس یاد آ رہی تھیں۔ وہ کو ششیں یاد آ رہی تھیں جو اس نے ایک عورت ہونے کے باوجود مجھے متوجہ کرنے کے لیے کی تھیں۔ کتنے مواقع تھے جب وہ دلوانہ وار میرے پیچھے لگی تھی۔ بسبب اس نے میری منتیں سنا نہیں کی تھیں اور ٹھکرائے جانے کے باوجود بار بار میرے بازوؤں کی پتاہ طلب کی تھی۔ یہ داستان کئی برسوں تک چلی ہوئی تھی۔ آج اس داستان کا ہر ہر منظر میری نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔

”غزالہ! میری کچ دیوں کی یہ کہی سزا دے دی تم نے“ بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلا اور میں بے دم سا ہو کر کھٹکوں کے بل ہاتھ روم کے کچنے فرش پر گر گیا۔ نجانے کتنی دیر میں یو پی بیٹھا رہا۔ پھر کمرے سے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ مدت دیر بیٹھے کے بعد گھنٹی بند ہوئی لیکن ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد دوبارہ بجنے لگی۔ میں بالائی میں شرابور ہاتھ روم سے نکلا اور دنگا تاہو اس فون کی طرف بڑھا۔ زندگی میں پہلی بار دل میں یہ انسوئی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش دوسری طرف غزالہ ہو۔ شاید انسوئوں کی خواہش کرنا اور ”نارسا“ تک رسائی کی تمنا پانا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ میں نے ریسپوڈ اٹھایا۔ دوسری طرف جتنی کٹور تھا۔ وہ کسی کلب یا ایسی ہی باوقف جگہ سے بول رہا تھا۔ اس کی آواز کے ساتھ ساتھ میزک کا شور اور حواریہ و نسوانی قمیص بھی سنائی دے رہے تھے اس نے باؤرب آواز میں کہا۔ ”شاہ جہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں جی۔ آرام کر رہا ہوں۔“ میں نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ”تم سستی اور بے کاری کی شکایت کر رہے تھے۔ میں نے تمہاری یہ شکایت دور کوی اور یوں دور کی ہے کہ تم ایک مدت تک یاد رکھو گے تمہارے کمرے کی وارڈ روپ میں دائیں طرف جو سب سے پہلا لباس جھول رہا ہے وہ بہن لو۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد خدا بخش تمہارے پاس پہنچے گا۔ اس کے ساتھ چلے آؤ۔ اوکے؟“

”اوکے“ میں نے سناٹ لہجے میں کہا۔

فون بند ہو گیا تو میں وارڈ روپ کی طرف بڑھا۔ عایشان وارڈ روپ کھول کر میں نے بہترین امپورٹڈ لباسوں پر ایک نگاہ دوڑائی۔ دائیں جانب کا پہلا لباس دیکھ کر میرے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔

یہ ایک بے حد قیمتی قمیص تھی جسے ٹوٹ تھا۔ نفیس ترین کپڑا بہترین تراش۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ ٹوٹ مجھے

بالکل فٹ آئے گا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹوٹ کے ساتھ ہی ایک بلٹ پروف جیکٹ بھی وارڈ روپ میں جھول رہی تھی۔ یہ بے حد مضبوط فیکر کی بنی ہوئی جدید ترین جیکٹ تھی۔ اس جیکٹ میں سینے کے زیادہ نازک حصوں کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظام تھا۔ عام بلٹ پروف جیکٹوں کی نسبت بہت بھلی پہنائی گئی تھی۔ یہ دونوں ایشیا پینی جیکٹ اور ٹوٹ میری غیر موجودگی میں میاں رکھی گئی تھیں۔ کٹور صاحب کے حکم کے مطابق میں نے یہ دونوں ایشیا زیب تن کر لیں۔ ایک شاندار امریکن ریو الو ”ہلر مائل“ میرے پاس پہلے سے موجود تھا۔ یہ ریو الو میں نے گوٹ کی اندوولی جیب میں رکھ لیا۔

میں اسی وقت جتنی کٹور کا فون دوبارہ آگیا۔ اس نے کہا کہ اسے ایک ضروری کام کے سلسلے میں گورنر ہاؤس جانا پڑا ہے۔ لہذا اب میں آرام کروں، صبح ملاقات ہوگی۔ حکم حاکم مگر مناجات۔ میں نے کپڑے پھر تبدیل کیے اور بستر پر گر گیا۔

سونے سے پہلے میں نے نیند کی گولیاں کھائی تھیں لہذا دیر تک برا سوچا رہا۔ ناشا اور بیچ دونوں ہی نیند کی نذر ہوئے۔ ایک بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ ملازمہ نے بتایا کہ خدا بخش کمرے کے کئی چکر لگا چکا ہے۔ میں نے نہاد ہو کر لباس تبدیل کیا۔ کھانے کے نام پر چند لمبے تھڑا کیے۔ اخبار دیکھ رہا تھا کہ خدا بخش پھر آدھمکا۔ اس نے کہا کہ جتنی صاحب نی کو کسی میں مجھے یاد کر رہے ہیں۔ میں لباس تبدیل کر لوں اور اس کے ساتھ چلوں۔ لباس سے اس کی ٹراوڈی تھری جیس ٹوٹ اور بلٹ پروف جیکٹ تھی۔

میں لباس تبدیل کر کے باہر نکلا تو خدا بخش بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میری سرخ اور سوئی ہوئی آنکھوں کا سبب کیا ہے۔ غالباً اس نے اس شرعی و شوجن کو شراب نوشی پر محمول کیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ کل رات شاہ جہاں عرف جہانی استاد جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فلادی اعصاب کا مالک ہے، ہاتھ روم کی تھالی میں چپوں کی طرح ہلک ہلک کر رہا تھا ہے۔ کبھی کبھی ہمارے ظاہر و باطن میں کس قدر تضاد ہوتا ہے۔

”چلے صاحب“ خدا بخش نے مجھے تیار دیکھ کر کہا۔

میں خاموشی سے خدا بخش کے ساتھ چل رہا تھا۔ باہر جتنی کٹور کی شاندار مرسیڈز موجود تھی۔ باورڈی ڈرائیور بالکل تیار کھڑا تھا۔ میں خدا بخش کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا اور گاڑی ہموار راستے پر چلتی ہوئی بڑی سڑک پر آگئی۔ قریباً

آدھ گھنٹے بعد ہم ایک شاندار عمارت میں پہنچے۔ عمارت کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ابھی حال ہی میں کیرلاکٹ سے تعمیر کی گئی ہے۔ درختوں سے ڈھکی ہوئی نہر بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔ عمارت کے اندر اور باہر میرے لیے شمار ہونے والے درخت لہلہا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کی آمد کی تیاریاں ہیں۔ خاکروب بھاگے بھر رہے تھے۔ درودیاور کی جھانڈ پونچھ ہو رہی تھی۔ قریباً ایک دو جنرل مائی گھاس اور پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھے۔ پورج میں کم و بیش دو درجن شاندار گاڑیاں موجود تھیں۔ خدا بخش مجھے لے کر ایک جے جہانے ڈرائیور میں بیٹھا۔ میاں ہم سے پہلے ہی بت سے افراد جمع تھے۔ ان میں چار پانچ اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ کچھ سیٹھ کم کے اور زیادہ تر سیاستداں ٹائپ حضرات تھے۔ دو خوش لباس اور خوشنما خواتین بھی میاں موجود تھیں۔ جتنی کٹور حالکانہ انداز میں ایک صوفے پر براجمان تھا اور حاضرین کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ جو بھی میری آنکھیں اس سے چار ہوئیں میں نے سلام کیا۔ وہ گفتگو منقطع کر کے بولا ”آؤ شاہ جہاں میاں بیٹھ جاؤ۔“

میں نے پچھلی صف میں ایک طویل صوفے پر جگہ سنبھال لی۔ جتنی کٹور سفاری ٹوٹ میں لمبوس تھا۔ نصف آستین میں سے اس کے بالوں بھرے بازو بہت نمایاں نظر آ رہے تھے۔ گفتگو کے دوران میں وہ بڑے اسٹائل انداز میں سگار کے کش بھی لیتا جا رہا تھا۔ وہاں کمرے میں ہونے والی گفتگو سے بے جا لگ کر آج رات دس بجے کی فلاٹ سے کوئی بہت اہم غیر ملکی شخصیت نندیا پارک سے لاہور پہنچ رہی ہے۔ جتنی کٹور کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس شخصیت کو میاں اس عمارت میں قیام کرتا ہے۔ یہ سب تیاریاں اسی سلسلے کی گڑی تھیں۔

میں نے دیکھا جتنی بڑی روانی اور تفصیل سے فرما فرما کر ہر شخص کو اس کی ڈیوٹی سونپ رہا تھا۔ ”جی سی صاحب! آپ انٹرویو کے انتظام کی گہرائی کریں۔ روٹ میں نے ایس بی ٹی ٹیٹک کو دے دیا ہے۔ وہ رش ٹائم ہو گا لہذا خاص احتیاط رکھیں کہ راستے میں کمپس ٹریفک جام نہ ہو۔ مسٹر ڈیر طعام اور قیام کا سارا بندوبست آپ نے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو جس طرح کی مدد چاہیے خدا بخش سے لے لیں لیکن معزز مہمانوں کو کوئی شکایت نہ ہو“ پھر وہ ایک فریڈ انعام دیستانی سے مخاطب ہو کر بولا ”چوہدری شفقت! ہو سکا ہے کہ مہمان لوکل کھانوں کی فرمائش کریں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ لوازمات ہمیں فراہم کرنا ہوں گے۔ میرا مطلب ہے ساگ“

مکی کی روٹی، چھاپچ اور جو بھی الم غلم ہوتا ہے۔  
چوہدری نے زور زور سے انہات میں سرھلایا۔ جتنی نے  
قریب تیشی خود لڑکی کو مخاطب کیا۔ ”مس نائلہ“  
”میں سر“ وہ فرط احترام میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔  
”جب تک سمان یہاں ہیں، تمہیں چوہدری سے نہیں  
رہنا ہوگا۔ مس سمان تمہارا ساتھ دے گی۔ مس سمان کی  
ڈیوٹی فون پر ہوگی۔ تم سمان کو سرو کر دو گی۔“  
”میں سر“ نائلہ نے جھک کر کہا۔

حاضرین کو چند مزید ہدایات دینے کے بعد جتنی کنور نے  
میری طرف دیکھا۔ ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ رست  
واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”سسر  
شاہ جہاں، تم میرے ساتھ آؤ۔ اس نے مجھے اور خدا بخش کو  
ایک ساتھ اشارہ کیا تھا۔

ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے چلتے نشست گاہ سے باہر  
نکل گئے۔ سرسبز لان پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چوکور  
کیاریوں میں نیلے پیلے پھول دم دم ہوا میں ہلکورے لے رہے  
تھے۔ جتنی نے ایک نظر لان کا جائزہ لیا۔ وہ ہر شے کو بہت  
باریک بینی سے دیکھنے کا عادی محسوس ہوتا تھا۔ ایک گلاب  
کے پودے کے ساتھ چند خشک شبنیاں پوسٹ رہ گئی تھیں۔  
جتنی نے بیڈ مالی کو اشارے سے قریب بلایا اور ان مٹیوں کی  
طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔  
”شاہ جہاں، میرا خیال ہے کہ تمہیں پتہ چل گیا ہوگا، آج  
رات دس بجے کی فلائٹ سے جی کلارک نامی ایک صاحب  
نیواک سے میاں تشریف لارہے ہیں۔ وہ بہت مشہور و  
معروف تاجر ہیں۔ امریکا کے گئے پنے آراء میں ان کا شمار ہوتا  
ہے۔ ان کا یہ دورہ بالکل نجی نوعیت کا ہے۔ نشست گاہ میں  
موجود افراد کے سوا کسی کو اس بارے میں علم نہیں۔ وہ میاں  
قریباً دو ہفتے قیام کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے قیام  
کے دوران میں تم ان کی حفاظت کے فرائض انجام دو۔  
تمہیں اس ”ڈسے داری“ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“

جتنی کنور ہر بات فیصلہ کن انداز میں کرتا تھا۔ حالانکہ  
وہ میری رائے کو پوچھ رہا تھا لیکن مجھے میں قطعی تھی اور اس  
قطعی سے فرار خاصا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”جناب! اگر آپ نے مجھے اس اہم ڈسے  
داری کے لیے موزوں سمجھا ہے تو یقیناً ٹھیک ہی سمجھا ہوگا۔  
مجھے یہ ڈیوٹی انجام دے کر خوشی ہوگی لیکن۔“

”لیکن کچھ نہیں“ جتنی نے میری بات آپکی ”میں جانتا  
ہوں، تم پریشان ہو مگر اس وقت میری نظر میں ایسا کوئی شخص

نہیں جو اس اہم ترین ڈسے داری کے لیے تم سے بہتر ہو۔“  
اس دوران میں برآمدے میں رکھے ٹیلی فون کی کھنٹی بج  
اٹھی۔ خدا بخش نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ ”جی  
میزم۔ جی میڈم“ اس نے بے حد مذہب لہجے میں کہا۔ پھر  
جتنی کنور سے بولا۔ ”بیک صاحبہ کا فون ہے۔ آپ کو پوچھ رہی  
ہیں۔“

جتنی کنور نے فون ریسیو کیا۔ ”ہاں کیا بات ہے؟“ اس  
نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں۔۔۔ نہیں اس کی ضرورت  
نہیں۔ تم پانچ بجے تک تیار رہنا۔ ہاں میں خود آؤں گا۔“  
وہ ہماری موجودگی کی یاد آگے بغیر اپنی مسز سے حاکمانہ  
لہجے میں بات کر رہا تھا اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا میں نے  
تین چار دفعہ یہ بات نوٹ کی تھی۔ ”نیک“ جتنی کی بیوی تھی۔  
بڑھی لمبی، خوبصورت اور طرہ دار لیکن جتنی کے سامنے وہ  
کسی نو عمر عورت کی طرح ڈوری سہی رہتی تھی۔ ہر کام جتنی سے  
پوچھ کر کرتا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ نیک کی عادت ٹائیہ  
بن چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ ٹیلی فون پر جتنی سے دریافت  
کر رہی تھی کہ وہ سمانوں کو ریسیو کرنے کے لیے کون سا  
لباس پہنے اور جتنی بڑے مابہراندہ انداز میں اسے ہدایات  
دے رہا تھا۔ وہ ہر فن مولا شخص تھا اور اس کے ساتھ ساتھ  
بے حد باخبر بھی۔ اپنے اندر گرد کی ہر شے پر گہری نظر رکھتا تھا۔  
تمام جزئیات و تفصیلات اس کے علم میں رہتی تھیں۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد وہ پھر میرے پاس لان میں  
آ گیا۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے انگلی سے اپنا ہاتھ  
ٹھوک کر پوچھا۔ ”۔۔۔ ہاں یاد آیا۔ شاہ جہاں! تم مسز جی  
کلارک کی حفاظت کے لیے ان کے ساتھ رہو گے۔ ان کو  
میاں پاکستان میں کچھ اہم امور نشانے ہیں۔ وہ جہاں جائیں  
گے تمہیں ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ تمہاری معاونت کے لیے  
کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں خدا  
بخش تمہیں ان سے ملو اورے گا۔“

میں کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد جتنی کنور واپس  
نشست گاہ میں چلا گیا۔ خدا بخش نے مجھے جتنی کے چند ذاتی  
حفاظتوں سے ملوایا۔ یہ تین بڑے کئے افراد تھے۔ صورتوں سے  
ہی مجھے ہوئے بد معاش اور لڑائی بھڑائی کے مابہر نظر آتے  
تھے۔ چوتھا شخص ان میں قد سے مختلف تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی  
واڈھی والا دور سیاہی قد کا فرد تھا۔ اسے مارشل آرٹس کا مابہر  
سمجھا جاتا تھا۔ وہ کراچی میں مارشل آرٹ کی ایک بڑی تربیت  
گاہ چلا رہا تھا۔ اخبار و رسائل میں اکثر اس شخص کا ذکر آتا  
رہتا تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس شخص کو یہ بات

پاسی، باگوار، گزری تھی کہ جتنی صاحبہ مجھے اس فیم کا سربراہ  
پانچے ہیں جسے معزز سمان کی سیکورٹی کی ڈسے داری سونی  
مٹی ہے۔ اس شخص کا نام جلیل احمد کمانڈر تھا۔ وہ کچھ کہہ  
نہیں سکتا تھا لیکن اس کے تاثرات دل میں چھپی ہوئی  
حاصلت کی جھلک دکھا رہے تھے۔

پرداز کی آمد سے دو گھنٹے قبل ہی ہم ایئر پورٹ روانہ  
ہو گئے۔ خدا بخش ہمارے ساتھ تھا۔ وہ خود بھی ایک مہمل  
سے مسلح تھا۔ معزز سمان کی سیکورٹی کے سلسلے میں کیا جانے  
والا اہتمام دیکھ کر شک گزرتا تھا کہ کسی لمبی چوڑی گز بڑ کا  
اندیشہ ہے لیکن جب دیگر انتظامات پر نظر ڈالی جاتی تو وہاں  
بھی کچھ خصوصی اہتمام نظر آ رہا تھا۔ سمان کو ایئر پورٹ سے  
نام گاہ تک لانے کے لیے ایک شاندار لیمنوز، دی آئی لی  
ٹیک کے مین سامنے کھڑی کی گئی تھی۔ یہ ”لائٹ اسٹرینج  
لیمنوز“ قریباً ۲۰ فٹ لمبی تھی۔ اس لکڑی کار کے چھ  
دروازے تھے۔ دو گاڑز سمیت ایک باوردی ڈرائیور بڑے  
چوکس انداز میں اس لیمنوز کے قریب موجود تھا۔ لیمنوز  
کے علاوہ ایک ایروپلینس، پولیس کی دو گاڑیاں اور ایک  
واٹرپیس سے لمبی جہز بھی موقع پر موجود تھی۔ دی آئی لی  
لائونج میں بوکسنگ گلوں کی مدد سے تلاشی لی جارہی تھی۔ سادہ  
لباس میں پولیس کے ارکان ہوائی اڈے میں پہلے ہوئے  
تھے۔ میں جو ایک مفور قد کی تھا، جتنی کنور کے ساتھ عاطفت  
میں آنے کے بعد قانون کی گرفت سے سیکڑوں میل دور چلا گیا  
تھا۔ میں ناچاز رویا اور سے مسلح کچھ بندوں پھر رہا تھا لیکن  
کسی مالی کے لال میں جرات نہیں تھی کہ میری طرف آنکھ  
بھی اٹھا کر دیکھا۔ سادہ پوش پولیس والوں میں چند شاسا  
جرے بھی تھے اور ان میں ایک چوہو تو خاص طور پر جانا پہچانا  
تھا۔ یہ ایس بی برکت کا چوہو تھا۔ وہی برکت صاحب جن میں  
ایک دسمائی پولیس افسر کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود  
تھیں اور ”جمہوری دا“ جن کا جانا پہچانا نیکے کلام تھا۔ وہ بھی  
مجھے پہچان چکے تھے لیکن نہ تو انہوں نے مجھ سے بات کرنے کی  
لوشن کی اور نہ قریب آئے۔ شاید اس گریڈ کا سبب یہ تھا کہ  
میں جتنی کنور کے خصوصی آدمی کی حیثیت سے ان کے سامنے  
آ رہا تھا۔ وہ مجھے دور دور سے یوں دیکھتے رہے جیسے کسی عجوبے کو  
دیکھ رہے ہوں۔

میرے علاوہ وہ چاروں افراد بھی میاں موجود تھے جن  
سے خدا بخش نے میرا تعارف کرایا تھا۔ میں نے ان میں سے  
لاک ڈیوٹی لیمنوز پر نگاہ کی تھی۔ مارشل آرٹ کا مابہر جلیل

کمانڈر اور اس کا چوہا سمانی میرے ساتھ تھے۔ میری طرح  
ان تمام افراد کو بھی ہلٹ پروف، ہیکس مٹیا کی گئی تھی۔  
فلائٹ ٹائم سے ایک گھنٹہ پہلے ان لوگوں کی آمد شروع ہوئی  
جنہوں نے معزز سمان کا استقبال کرتا تھا۔ ان لوگوں کو شرکی  
محکمہ لکھا جاسکتا تھا۔ چند چوٹی کے صنعت کار اور ان کی  
بیگمات کچھ اعلیٰ افراد اور ان کی ”فریباں“ کچھ سیاستدان اور  
ان کی خود ”سیاستدانیاں“ یہ سب لوگ بڑی بڑی کاروں  
میں طعراتی سے پہنچ رہے تھے اور انتظار گاہ میں داخل ہوتے  
جا رہے تھے۔ پھر مجھے جتنی کنور کی حسین و جمیل بیوی دیکھا نظر  
آئی۔ چند ماہ کا خوبصورت بچہ مجھے آگے اس کے ساتھ تھا۔ جتنی  
کنور ٹھیک ساڑھے نو بجے پہنچا۔ وہ ایک شاندار فحری ہیں  
سٹوٹ میں تھا۔ سرخ ٹائی، سرخ رومال، پاؤں میں شارک  
پنس جوڑے۔ وہ اپنے اندر گرد کی ہر شے کو جھانکنا غور سے  
دیکھتا ہوا انتظار گاہ میں چلا گیا۔

جہاز میں وقت پر پہنچ گیا۔ اٹاؤنس منٹ ہوتے ہی وہی  
آئی لی لائونج میں سنسنی سی جھلک گئی۔ سادہ پوش اُدھر سے  
اُدھر بھاگتے گئے۔ جتنی کنور اپنے ساتھیوں کے ساتھ  
استقبالہ دروازے کے مین سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں اس  
وقت جتنی کنور کے بالکل قریب موجود تھا۔ سب نگاہیں جہاز  
کی سمت لگی تھیں لیکن پھر ایک غیر متوقع خبر آئی اور ساری  
سنسنی خیزی جھاک کی طرح بجھ گئی۔ معلوم ہوا کہ معزز سمان  
اس فلائٹ سے تشریف نہیں لائے۔ بالکل مین وقت پر ان  
کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور ڈاکٹروں نے انہیں سفر سے  
منع کر دیا تھا۔

دی آئی لی لائونج میں موجود اکثر افراد کے چہرے لنگ  
ہمے مایوس ہوئے والوں میں جتنی کنور پیش پیش تھا۔ اس  
کے سرخ روشن پر جھنجھلاہٹ صاف دہم کی جاتی تھی۔  
جھنجھلاہٹ یقیناً اس بات کی تھی کہ پروگرام کی تبدیلی سے  
اسے اگاہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ معزز سمان کے ساتھ چار  
افراد اور آ رہے تھے۔ ان میں دو خاتون اور دو مرد تھے۔ یہ  
لوگ حسب پروگرام پہنچے تھے۔ جتنی کنور اور اس کے  
ساتھیوں نے چوٹی پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر ان کا استقبال  
کیا۔ رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ پھر سب لوگ گاڑیوں کی  
طرف بڑھ گئے۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ میں نے سرگوشی کے لہجے میں خدا  
بخش سے پوچھا۔  
وہ بولا ”بڑے لوگوں کے ڈھنگ نرا ہے ہوتے ہیں۔  
جتنی صاحب کو پہلے ہی اندیشہ تھا کہ کہیں مین وقت پر

بروگرام بدل نہ جائے۔ بندہ جتنا دولت مند ہوتا ہے اتنا ہی فخرے میں رہتا ہے۔ ہر قدم اسے پھوک کر اٹھاتا پڑتا ہے۔ جی کھارک صاحب بھی اپنی سکونتی کے سلسلے میں بے حد غماز رہتے ہیں۔ ممکن ہے پروگرام کی یہ تبدیلی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہو۔

مسلمانوں کو ان کی قیام گاہ پر چھوڑ کر جتنی کنوڑ اور اس کی بیگم رات بڑھ بچے جتنی جیلں واپس آگئے۔ ہم بھی ان کے ساتھ تھے۔ استقبال کے لیے آنے والوں میں کچھ تو باہمی کے عالم میں ازبوت سے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ کچھ سر والی بارش گاہ تک گئے لیکن جلد ہی پنڈ چھڑا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جتنی کنوڑ گھر گھر تھا اور جب وہ گھر مہم ہوتا تھا تو ارد گرد کی ہر شے سم جاتی تھی۔ تاریک رات کے بطن میں جتنی پیلے خاموش تھا اور جتنی پیلے کے بطن میں ہر شے خاموش تھی۔ میں تھا کاندہ بند پر آکر گر گیا۔ جو کئی ذرا فرمت ملی، غزالہ کا تصور اپنی تمام تر کرب نگی کے ساتھ ذہن میں آوارہ ہوا۔ جی چاہا ایک بار پھر بارہا کر جاؤں اور

بے سمت چلتا شروع کروں۔ چلتا رہوں، چلتا رہوں، یہاں تک کہ نہ حال ہو کر گر جاؤں۔ اور ایسا کروں کہ پھر کبھی افسانہ نہ ہو۔ پورے بدن میں ایک آگ سی بھڑک رہی تھی اور تشویشک بات یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس آگ کی شدت کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ خود بخود اس الماری کی طرف چلا گیا جہاں خدا بخش نے امپورٹڈ مسک کی کئی بوتلیں چھڑا رکھی تھیں۔

ابھی میں الماری کو کھول ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ یہ کون جی رہتی آواز جتنی کنوڑ کی تھی اور عمارت کے رہائشی جس کی طرف سے آئی تھی۔ وہ کسی برس رہا تھا۔ میں نے آواز بہتر طور پر سنے کے لیے کمرے کی ایک کھڑکی کھول دی۔ ”حمرازدی“ گئے کی پچی، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ جتنی کسی کو اٹھا اٹھا کر بیٹھا رہا تھا۔

یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے دست ستم کا نشانہ بننے والی اس کی بیوی زلفا ہے۔ بیگم زلفا کنوڑ جو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ جس کی خوشنودی کا خاطر لوگ قدموں میں نیچے جاتے تھے۔ جو ہر جگہ دی آئی بی بھی جاتی تھی۔ وہی زلفا اپنے شوہر کے ہاتھوں گدھے کی طرح بیٹ رہی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ کنوڑ اس صورت حال کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ اتنی بڑی عمارت تھی۔ وہ چاہتا تو کسی اندرونی کمرے میں جا کر

ہوئی کی ”عزت افزائی“ کر سکتا تھا۔ یقیناً یہاں ایسی بہت سی جگہیں ہوں گی جہاں میرا ہونے والا شور و غل کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچا نہ کنوڑ کو اس کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ باؤ رہا تھا۔ ”میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ گئے کی پچی، انوکھی پچی، پھل ہو گئی ہے تو تیرا اٹھا پاگل خانہ ہے۔“

پھر کوئی چیز جتنا سے ٹوٹی۔ مسز زلفا کنوڑ کی تھکی تھکی چٹائی دی۔

میں کھڑکی میں کھڑا دم بخود رہتا رہا۔ یہ بنگلہ بازو ہو تو رہا دس منٹ جاری رہا۔ پھر ایک دم سکوت چھا گیا۔ اس دوران میں میں نے ایک دو ملازموں کو برآمدے میں آتے جاتے دیکھا۔ وہ بالکل بالعلق نظر آ رہے تھے۔ ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس قسم کی باروداڑ جتنی پیلے کی چار دیواری میں کوئی انوکھی یا نئی بات نہیں۔ جتنی کنوڑ کی یاد قار اور شاندار شخصیت کا یہ پلو میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ میں نے رات کا باقی مختصر حصہ اسی بنگلے کے بارے میں سوچتے گزارا۔ اس سوچ بچار کا یہ قاعدہ ہوا کہ غزالہ کا چاکا تصور میرے ذہن پر شدید ترین طے نہ کر سکا۔ صبح سویرے اٹھا۔ میری نگاہ زلفا کنوڑ پر پڑی۔ وہ شب خوابی کے ذلیلے ڈھالے لباس میں تھی۔ بالوں میں ”دولرز“ لگے تھے۔ میک اپ اتر ہوا تھا۔ شاید اس طے میں بھی وہ خوبصورت ہی نظر آتی تھی۔ رات کی مار پیٹ نے اس بے چاری کا خلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ ایک آنکھ سوچ کر گھبرا ہو گئی تھی۔ ”وہاں میں رخسار پر گہرے خیر تھے۔ ایک ہاتھ پر بھی پچی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بچہ سے نکل کر آکر بڑبڑایا کہ کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ پھر اس کی ایک جھٹکی دیکھ پاپا تھا۔ ”نام یہ ایک جھٹکی ہے۔ سب کچھ دکھانے اور سمجھانے کے لیے کافی تھی۔ وہ اور عورتوں میں سے تھی، شوہر کے ستم سہتا جن کا معمول ہو ہے۔ وہ ختمہ، مشق بن کریوں روز ترو کے کاموں میں مشغول ہو جاتی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن اس کیس میں حیرت مقام یہ تھا کہ بیٹے والی کوئی سیدھی سادی اُن پڑھ عورت نہیں تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، انتہائی ماڈرن، بے باک اور آہ بوجھ والی بیگم صاحبہ تھیں لیکن جیسے اونٹ بھاڑتے آہ ہے وہ بھی ایک جابر ترین شخص کے شکنجے میں تھی۔

خدا بخش اب مجھ سے مکمل کربات کرنے لگا تھا۔ میں نے اس سے رات کی مار کٹائی کے متعلق پوچھا تو وہ بڑا۔ جتنی کنوڑ اس وقت گھر سے باہر تھا اور جب وہ باہر تھا، خدا بخش اور دیگر ملازمین خود کو خاصا ”ایزی“ محسوس کرتے تھے کہنے لگا ”بس جی! جب صاحب کا پارا چڑھا

ہے تو وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ جھنجھلاہٹ تو ان پر اسی وقت سوار ہو گئی تھی جب پتا چلا تھا کہ مسز کھارک نہیں آئیں گے۔“ اور یہ بیگم صاحبہ سے بھی ایک غلطی ہو گئی۔ انہوں نے باقی تو سب کچھ پوچھ لیا لیکن بچے کے بارے میں پوچھا نہ ہو گئیں۔ اپنی عبادت کے مطابق وہ بچے کو اپنے ساتھ ہوائی اڈے لے گئی تھیں۔ اس بات پر صاحب مشتعل ہو گئے۔ یہ تو خیر ایک واقعہ تھا، بعض اوقات وہ اس سے بھی معمولی باتوں پر آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ چند دن پہلے ایک ملازم کو صرف اس بات پر بنگا کر کے الٹا لٹکا دیا گیا کہ اس نے صاحب کی میز پر پانی کا گلاس ڈھک کر نہیں رکھا تھا۔ صاحب نے اپنے ہاتھ سے مارا کہ اس کی چھڑی اور چھڑی تھی لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ صاحب ہر وقت مار دھاڑ پر اترے رہتے ہیں یا ان میں نرمی نہیں۔ عام حالات میں وہ بے حد نرم خو، نرمی اور مہربان ہیں۔ کسی کا احسان یا بھلائی یا دل رکھنے کے سلسلے میں ان کا حافظہ بے حد تیز ہے۔ اپنے وفاداروں کو کسی بھی حالت میں بھولتے نہیں ہیں۔ اگر یہ خویاں ان میں نہ ہوتی تو آج اس مقام پر نہ ہوتے۔“

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک ٹوپوٹا جب پورج میں داخل ہوئی۔ اس کے پیشے رنگین تھے۔ یہ جتنی جیلں کی جپ تھی لہذا خدا بخش میرے قریب مطمئن کھڑا رہا۔ چند لمحوں بعد جب کے دووازے کھلے۔ پہلے دو مسلح افراد نیچے اترے پھر میں نے کیے بعد دیگرے زریں گل اور بوٹا ٹنگہ کو اترتے دیکھا۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ مجھے پتا تھا کہ جتنی کنوڑ کے آدمی سرحد پار بوٹا ٹنگہ اور زریں گل کا کھوج لگا رہے ہیں لیکن یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اتنی جلدی انہیں نہ صرف ڈھونڈ لیا جائے گا بلکہ وہ میرے پاس بھی پہنچ جائیں گے۔

زریں گل اور بوٹا ٹنگہ دونوں کے ہاتھ پست پر بندھے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ پٹیائیں تھیں۔ زریں گل کے چہرے پر ایک دو چوڑیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اس کا کریاں چاک تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں پہنچنے سے پہلے اس نے جتنی کنوڑ کے آدمیوں سے ہاتھ پائی کی ہے۔ وہ اب بھی مشتعل نظر آ رہا تھا۔ وہ میل مرغ کی طرح سینہ پھلا کر جب سے اترتا اور غرانے لگا۔ ”خوجے ام مار وار سے نہیں ڈرتا اور مارو۔ اپنا سارا ارمان نکال لیو لیکن قسم خدا کا ام بھی تم کو بھونڈے گا نہیں۔“

وہ بار بار سر جھٹک کر آنکھوں سے پٹی اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے برعکس بوٹا ٹنگہ خاموش کھڑا تھا۔

زریں گل کی طرح بوٹا ٹنگہ بھی اسی لباس میں تھا جس میں میں نے اسے فرید کوٹ کے نواحی ڈاک بنگلے میں چھوڑا تھا۔ خدا بخش کا اشارہ پاکر کنوڑ کے آدمیوں نے بوٹا اور زریں کی آنکھوں سے سیاہ پٹیائیں اتار دیں۔ وہ دونوں کچھ دیر چند حیاتی آنکھوں سے ارد گرد دیکھتے رہے پھر زریں گل کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس کا منہ ایک دم حیرت سے کھل گیا۔ اس کی نگاہ کا تعاقب کر کے بوٹا ٹنگہ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ جتنی کنوڑ کے ایک کاندے نے چاقو کی مدد سے وہ ریتیاں کاٹ دیں جنہوں نے بوٹا اور زریں کے ہاتھ پست پر بکڑ رکھے تھے۔ وہ دونوں ایک کر میری طرف آئے۔ پہلے زریں گل، بشکریہ ہوا پھر بوٹا ٹنگہ نے سرت سری اکال کہہ کر معاف کیا۔

خدا بخش کا اشارہ پاکر زریں گل اور بوٹا ٹنگہ کو لانے والے خاموشی سے واپس چلے گئے۔ زریں گل بولا۔ ”استاد جی۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ ام نے ان لوگوں میں سے ایک آدمی کو قتل نہیں کرنا والا۔ ام سمجھتا تھا کہ یہ ام سے بھوت بول رہا ہے کہ ام کو آپ کے پاس لے کر آئے گا۔ ام نے ان میں سے ایک بندے سے بہت دل چسپی لیا تھا۔ بس ایک سینڈ ام کو مل جاتا تو ام اس کے پیچھے میں گولی اتار دیتا۔ ام سلام کرتا ہے بوٹا ٹنگہ کو۔ اس نے امارا ہاتھ دوک لیا۔ اس وقت ام کو اس پر بڑا غصہ آیا تھا۔ بات یہ غصہ آنے والا تھا۔ اس نے ام کو گولی چلانے سے روک دیا اور وہ سب کا سب ام پر چڑھ دوا۔ انہوں نے ٹھک ٹھاک پھینچی لگایا ام کو لیکن اب اس پھینچی کا ام کو کوئی غم نہیں ہے۔ ام نے آپ کو دیکھ لیا۔ امارا آنکھیں ٹھنڈا ہو گیا۔ دل بکری بند سب ٹھنڈا ہو گیا۔“

خدا بخش نے کہا۔ ”آپ لوگ اندر چل کر باتیں کریں۔ میں جتنی صاحب کو بتاؤں کہ بندے پہنچ گئے ہیں۔ وہ کل سے کئی بار اس بارے میں پوچھ چکے ہیں۔“

میں زریں اور بوٹا ٹنگہ کے ساتھ آئے کمرے میں گیا۔ بوٹا ٹنگہ نے کہا۔ ”یہ بہت بڑی جگہ ہے۔ لگتا ہے کسی راجے مہاراجے کی کوٹھی میں آگئے ہیں اور یہاں توپیں والے بھی آ جا رہے ہیں۔“ بات کرتے کرتے وہ چاک خاموش ہو گیا اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ”جہاں صاحب کھتی ناف! آپ کچھ تراش بجز آ رہے ہیں۔ آنکھیں بھی مٹی مٹی ہیں۔ میرا مطلب ہے یہاں سب کھیرت تو ہے؟“

اس سوال کا سچا جواب تو یہ تھا کہ ”خیریت بالکل نہیں۔ مجھ پر قیامت گزر چکی ہے۔ کوئی میری زندگی لوٹ کر چلا بنا ہے اور مجھے کافروں کی بیج پر زندہ لاش کی صورت پیش کر گیا ہے لیکن یہ جواب میری زبان پر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے بعد

کوشش مسکرا کر کہا " بالکل ٹھیک ہے تم دونوں سناؤ۔ کیسے اور کب پاکستان پہنچے اور بانی لوگ کہاں ہیں؟ "

جواب میں زریں گل اور بوٹا ٹکھ نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے: مجھے خزانہ اور نشا کو بیچنا عاصم کے اُجرتی غنڈوں نے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد تینوں کا زیاں آگے پیچھے دوڑتی غائب ہو گئی تھیں۔ ہمارے جانے کے بعد بوٹا ٹکھ نے اپنے جیسے دادوں کے ساتھ مل کر ہماری تلاش شروع کی۔ بابو لیاقت اور زریں گل وغیرہ بھی اس تلاش میں شریک تھے اس روز سترہ پہر کے وقت مجھے درختوں سے نشا کی لاش مل گئی تھی۔ خود کار رائفل سے ایک برہست اس کے سر میں لگا تھا اور اس کا خون خشک پتوں پر دور تک بکھرا ہوا تھا۔ یہ لاش بابو لیاقت کے کارکن اپنے ساتھ فرید کوٹ لے گئے اور اسے داروں تک پہنچا دیا۔ میری اور خزانہ کی تلاش بدستور جاری رہی۔ بابو لیاقت نے چار بار نیاں بتائیں اور انہیں مختلف اطراف میں روانہ کر دیا۔ زریں گل اور بوٹا ٹکھ ایک ہی پانی میں تھے۔ اس پانی کا تیسرا کارکن بوٹا ٹکھ کا ایک سامھی منوہر ٹکھ تھا۔ تینوں ٹکھوں پر سوار تھے۔ زریں گل اور بوٹا ٹکھ کے پاس رپوالور تھے جب کہ منوہر ٹکھ کہان سے مسلح تھا۔ وہ ڈاک بیٹھے سے تقریباً پندرہ میل شمال کی طرف نکل گئے۔ یہاں ان کی ٹُھہ بھیر خٹکر شہر کے آدمیوں سے ہو گئی۔ وہ تعداد میں سات آٹھ کے قریب تھے ان کے سرخ نے زریں اور بوٹا ٹکھ سے کہا کہ پاکستان میں استاجو جانی صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، ہم تمہیں پاکستان لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ زریں گل کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے ان لوگوں سے الجھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں اس نے ہاتھ پائی کر کے ایک شخص کا رپوالور چھین لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، بوٹا ٹکھ نے ہاتھ مار کر رپوالور گر دیا۔ خٹکر شہر کے آدمیوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا اور ایک بند گاڑی میں ڈال کر فرید کوٹ پہنچا دیا۔ رات کو دونوں ایک کمرے میں سوئے تھے لیکن صبح آٹھ بجی تو اس جیب میں تھے جو انہیں بمبئی پیس لائی۔ ان کے ہاتھ پست پر بند تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔ زریں گل اور بوٹا ٹکھ کی روداد ختم ہوئی تو میں نے ان سے ارجمند بانو اور گوگلی لڑکی جھمکو کے بارے میں پوچھا۔

زریں گل بولا۔ " وہ دونوں ڈاک بیٹھے والے سے خانے میں ہی تھیں۔ اس انوکھی چچی ارجمند بانو کا تمام کو کوئی ٹکر نہیں، وہ درکار دھورتے جلجل میں رہے یا سنگل میں اس

کے لیے برابر ہے۔ لیکن وہ جھمکدہ بڑی جلی ناس ہے بالکل اللہ میاں کی گائے ہے ام نے اس کو بمیں بولا ہے ام کو اس کی طرف سے بہت کھر ہے۔ اگر اماردی طرح باو لیاقت وغیرہ بھی قابو آگیا ہے تو میرہوہ ہے چاری اکیلی رہ گئی ہوگی۔“

پوچھا کھنے لگا۔ ”جہانی صاحب! آپ نے ہم سے تو سب کچھ پوچھ لیا ہے۔ اپنے بارے میں ابھی کوئی کھل بات نہیں بتائی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں اور کیا کچھ آپ کے ہی گھنے پر ہمیں انڈیا سے لایا گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھئی کتور کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟“

زیریں گل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں! اخنڈوں میں کئی بار پڑھا ہے۔ بھئی کتور نے یوں کر دیا“ بھئی کتور نے دوں کر دیا۔ شاید اس خانہ خراب کا فوٹو مونو بھی دیکھا ہے ام نے۔“

”ہستہ بولو۔“ میں نے کہا۔ ”ہم اسی خانہ خراب کے مہمان ہیں۔ یہ پنجاب کا طاقتور ترین شخص ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پنجاب کا اصل گورنر نہیں ہے۔ جو شخص گورنر ہاؤس میں بیٹھا ہے وہ صرف ”ڈبی“ ہے۔ بھئی کتور کا تعلق قادر زماں سے بھی ہے اور یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عینی جان“ شکر شکر! ”افزا ہم سب بھئی کتور کے وھڑے سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شکر شکر کا کارندوں نے ہمیں پکڑنے کے بعد سیدھا میاں پارسل کر دیا ہے۔“

”لیکن آپ میاں کیسے پارسل ہوا؟“ زیریں گل نے جرائی سے پوچھا۔

”قادر زماں کی معرفت“ میں نے جواب دیا اور مختصر الفاظ میں ان دونوں کو بتایا کہ کس طرح قادر زماں مجھے پاکستان لے کر آیا اور کیسے میں جموں صاحب کی حولی سے لاہور میں بھئی بیلس پہنچا۔ آخر میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ فزالد میاں پہنچ چکا ہے۔

فزالد کی پاکستان آمد کا سن کر وہ ایک دم خوش نظر آنے لگے جیسے کوئی بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ در حقیقت میری روداد سے انہیں یہی تا چلا تھا کہ فزالد انڈیا میں رہ گئی ہے۔ وہ اس بات پر پشیمانی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے نیشاکی لاش تو دھوڑ نکالی لیکن فزالد کا سراغ نہ لگا سکے۔

ابھی زیریں اور ہوتا سے میری گفتگو جاری تھی کہ بھئی کتور کا بلاوا آگیا۔ بلاوالا نے والا ایک ملازم سکندر تھا۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ صاحب نفست گاہ میں ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں نفست گاہ میں پہنچا تو بھئی کتور پینٹ نوٹ

ہے، چھوڑا رہا تھی لگائے کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ حسب معمول اس کے ہاتھ میں سگاز تھا۔ یہ حد پر سکون اور خوش نظر آ رہا تھا وہ اس کا موڈ دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ رات میں شخص اپنی پیڑی پر روندے کی طرح بجھت رہا تھا اور اسے اٹھا اٹھائے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جتنی نے بغیر کسی حیرت کے کہا ”تیس میرے ساتھ گاڑن ٹاؤن تک چلنا ہے۔ میں ڈانسن کا رہ جاؤں گا، علم علیہ گاڑی میں جاؤں گے۔ میرے پیچھے پیچھے رہنا پڑے گا۔“ کوئی ہرچا اے؟ کے سامنے میں گاڑی روک لوں گا تم سیدھا آگے نکلے چلے جانا۔ قریب ایک فرلانگ آگے میں روڈ کے سگھر پر ایک پوسٹ آئی ہے اس کے سامنے گاڑی روک لینا۔ میں جب تک واپس نہ آؤں تمہیں اسی جگہ ڈکنا ہے۔“ ایک لمحہ توقف کر کے اس نے سگاز کاٹش لیا اور بولا ”تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ اگر سیاہ رنگ کی ایک مارک ٹوئیل میں روڈ سے ڈیڑھ سڑک پر مڑتی نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دو۔ اس اطلاع کے لیے وائی ٹاکی استعمال ہوگا۔ وائی ٹاکی کا ایک سیٹ تمہاری گاڑی میں رکھو اور ایسا کیا ہے یہ دو سرائیٹ میرے پاس ہے۔“

جتنی نے اسے کوئی کی جب سے ایک چھوٹا سا انکس وائی ٹاکی نکال کر تجھے دکھایا۔ وائی ٹاکی کا طریقہ کار بجانے کے بعد اس نے اسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر بولا ”رہو اور تو تمہارے پاس موجود ہے؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا ”ٹھیک ہے کپڑے بدل لو۔ بالی ہاٹ میں نہیں روائی سے پہلے دوں گا۔“

میں نے موٹو انداز میں سر جھکایا اور باہر نکال آیا۔ جتنی سگاز ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا پس منظر جاکیر دارانہ تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ حکم اس کی طبع کا جُزو خاص تھا۔ اس کے لیے یہ امر طے شدہ تھا کہ وہ کسے گا اور لوگ سنیں گے، وہ حکم دے گا اور لوگ عمل کریں گے۔ وہ فیصلہ کرے گا اور اس فیصلے کو تسلیم کیا جائے گا۔ میری مرضی جانے بغیر وہ مجھے ایک کارندے کی طرح استعمال کر رہا تھا اور پُر تعین تھا کہ میں اپنی اس حیثیت سے بہت خوش ہوں۔ اس نے پانچ لاکھ کے نوٹ معمولی ایشیائی کی طرح میری الماری میں رکھوا دیے تھے۔ ابھی میں ان کا پچاسواں حصہ بھی خرچ نہیں کیا تھا تاہم خلیفہ خدا بخش کئی بار پوچھا کہ تمہارے رقم کی ضرورت تو نہیں اور صرف دولت ہی نہیں زندگی کی ہر آسائش اور بیش اس چار دیواری میں موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک میں نے ان ”سوئٹوں“ سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جتنی کے

سایہ عافیت میں آنے کے بعد میں قانون کے لیے اپنا اپنی  
”مستدرس گائے“ بن گیا تھا۔ میری آزادی سراسر غیر قانونی  
تھی لیکن پولیس میرا مت دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی  
تھی۔ قانونی کارروائی تو دہری ایک طرف! ابھی تک میرے  
سلسلے میں کوئی خاندانی ہرجی کی کارروائی بھی نہیں کی گئی تھی۔

○☆☆○

ٹھک ایک گھنٹے بعد میں اور عزت مآب مجتبیٰ کنور  
صاحب آگے پیچھے لاہور کی سڑکوں پر دواں تھے اس وقت  
تک دن کے بارہ بج چکے تھے۔ زندگی اپنی پوری رفتار سے  
صحرا تھی۔ مجتبیٰ کنور بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری  
پروٹوکول کے جا رہا تھا۔ دو گاڑی بھی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔  
گاڑی کے پیشوں پر بڑے چمچے تھے۔ مجتبیٰ نے اپنا ٹیلیفون بھی  
تعمودا بہت تبدیل کیا تھا۔ سیاہ پیشوں والی ٹیک تاکراس نے  
ایک بی بی کیپ پہن لی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس  
پرانے مائل کی جھولی سی گاڑی میں مجتبیٰ کنور جا رہا ہے۔  
دونوں گاڑیاں گاڑن ٹاؤن کے علاقے میں داخل ہوئیں اور  
مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد اس بنگلی سڑک پر مڑ گئیں  
جہاں کو بھی نمبر اسی ۴۳ واقع تھی۔ پوسٹ آفس کے  
سامنے ایک گاڑیاں اور موٹر سائیکل کھڑے تھے۔ میں نے  
گاڑی کو مناسب رخ پر پارک کیا اور سرگرمی سے مٹا کر بیٹھ گیا۔  
دھن بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ مجتبیٰ بڑے پراسرار  
انداز میں یہاں پہنچا تھا۔ یقیناً اسے کچھ لوگوں سے خطرہ بھی  
تھا۔ اس نے مجھے یہ تاکید خاص طور پر کی تھی کہ اپنا ریو اور  
ساتھ رکھوں۔ اس کے علاوہ اس نے ریو اور کے فائور اوٹ  
بھی مٹا کر لیے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کوئی خفیہ سیاسی  
بینک رہی ہوگی۔ سیاسی رہنما جو ٹوڑوڑ کے لیے ایسی ملاقاتیں  
کرتے ہی رہتے ہیں۔

مجتبیٰ کا ریو ہوا داک ٹائیپری گود میں پڑا تھا۔ اچانک  
واکی ٹائیپ کا تنہا سرخ بلب روشن ہوا اور ”پ۔ پ۔ پ۔ پ۔“ کی  
آواز آئی۔ میں نے آواز رسیو کرنے کے لیے ہنر دیا۔  
دوسری طرف مجتبیٰ تھا۔ ”ہیلو شاہ جہاں پوسٹ آفس پہنچ گئے  
ہو؟ اور“

”جی جناب! آپ کی بتائی ہوئی جگہ پر گاڑی کھڑی کی  
ہے۔ اور“

”ٹھک ہے ہوشیاری سے۔ ممکن ہے مجھے ایک ڈیڑھ  
گھنٹہ لگ جائے۔ پریشان نہیں ہونا اور۔“

”بہت بہتر جناب! آپ قلمت کریں اور“

”اوکے اور اینڈ آل“

واکی ہاکی خاموش ہو گیا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ چھوکتا رہا اور میری نگاہیں اس سیاہ سڑک پر جمی رہیں جس پر ہر قسم کی تیز رفتار گاڑیاں فراتے بھر رہی تھیں۔ ان گاڑیوں میں دو تین بار سیاہ مارک فوجی دکھائی دی۔ ایسے موقعوں پر میرے اعصاب تن گئے لیکن یہ گاڑیاں تیز رفتاری سے سیدھی نکلتی چلی گئیں۔ مجھنی نے ایک لمحے کا کما تھا لیکن ڈھائی گھنٹے گزرنے کے باوجود وہ خود نظر آنا نہ دی ہاکی ہاکی پر اس کی آواز ابھری۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اوکھ سی آنے لگی تھی۔ شاید یہ رات بھر کی بیواری کا نتیجہ تھا۔ رات ایک بجے کے لیے بھی میری آنکھ نہیں کھلی تھی اور یہ کل رات ہی کی بات نہیں تھی۔ بہت راتوں سے میری نیند مجھ سے خفا تھی۔ کبھی آنکھ کھلتی تھی تو غزال کی ابدی جدائی کا تصور ہی رہے تھے۔ مجھ کو بھجور کر مجھے بچا رہا تھا۔

نشست سے ٹھیک لگنے لگے آنکھیں بند ہونے لگیں تو میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میری غفلت مجھنی کنور کے لیے کسی بہت بڑی مشکل کا باعث بن سکتی تھی۔ نیا سگریٹ ملنے کے لیے میں جب سے لاٹرنگ ریل پر تھا جب اچانک میری نگاہ سیاہ مارک نو گاڑی پر پڑی۔ وہ ٹریفک کے ازدحام میں درمیانی رفتار سے دوڑا رہے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کا دایاں "ایڈی کیو" آن تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا تاہم میں نے بڑی کوشش کے ساتھ اس کی نمبر پلیٹ دیکھ لی۔ وہ وہی گاڑی تھی جس کی طرف سے مجھنی نے مجھے خبردار کیا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے واکی ہاکی آن کہا۔ "مرغ بلب جل کر بجھ گیا۔" میں نے بار بار جین آن آف کیا لیکن واکی ہاکی خاموش رہا۔ اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ واکی ہاکی کام نہیں کر رہا۔ یہ بڑے تشویشناک لمحات تھے گاڑی لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہی تھی وہ میرے سامنے سے گزر کر کوئی کی طرف بڑھ جاتی تو تب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ میں نے گاڑی اس بجلی سڑک پر موڑی جہاں سے سیاہ مارک نو کو گزرتا تھا۔ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے گاڑی کو بجلی سڑک پر موڑ کر ریورس کرنا چاہتا ہوں۔ جو کسی گاڑی سڑک پر آڑی ہوئی "میں نے فیوڈ کھینچ کر ابھی بند کر دیا اور دو واڑہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ سیاہ مارک نو وہاں تک پہنچی" میں بھاگنے والے انداز میں چلتا ہوا چلاؤں پارک میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں میں نے گاڑی بند کی تھی وہاں پہلے سے ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ دو دنوں گاڑیوں نے مل کر رستہ مسدود کر دیا تھا۔ اب ممکن نہیں تھا کہ سیاہ مارک نو یا کوئی دوسری گاڑی

وہاں سے آگے بڑھ سکتی۔ پارک میں داخل ہوتے ہی میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے عقب میں سیاہ مارک نو کا مسلسل ہارن سنائی دے رہا تھا۔ قریباً ایک منٹ تک مسلسل بھاگ کر میں کوئی تھرا جاؤں گا۔ ۴۰ کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ شاید ارکو بھی نو سائز اوپن تھی یعنی اس کو دو طرف سے سڑک کھنی تھی۔ تاہم میں اس گیت پر پہنچا تھا جہاں سے مجھنی کنور اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے بلا تکلف کال ہیل کے پٹن پر انگلی رکھ دی۔ گیت پر کوئی ملازم نہیں تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ کوئی کے اندر بھی کوئی ملازم نہیں کیونکہ کال ہیل کے جواب میں ایک خندہ لڑکی باہر نکلتی تھی۔ اس نے ایک اندرونی دو واڑہ کھول کر باہر بھاگنا۔ وہ مجھ سے قریب تھیں قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ پھر بھی میں اس کے چہرے پر پریشانی کے شاید دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ڈبلی پگلی خوشنوا لڑکی تھی۔ لمبے بال چہرے اور کندھوں پر منتشر تھے اس کے باہر نکلتے ہی ایک چھوٹا سا سفید کتا بھی مگر سے نکل آیا اور تیزی سے اس کے ارد گرد پھرتا لگا۔ لڑکی سوائے نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ معلوم نہیں اس کے سامنے مجھنی کا نام لینا مناسب تھا یا نہیں۔ میں سوچ رہی رہا تھا کہ مشکل آسان ہو گئی۔ ایک کھڑی کابینہ کھول کر مجھنی نے مجھے اپنا دیر اکر کیا اور وہاں سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

اس کے بال منتشر تھے اور لڑکی کی طرح وہ بھی میرے دخل ورمقولات پر ندوس سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "جناب! گاڑی آ رہی ہے"

مجھنی کے چہرے نے یقیناً رنگ بدلا ہو گا تاہم میں دور سے اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ وہ تیزی سے بولا۔ "تم خود کیوں آئے؟"

"واکی ہاکی نے کام نہیں کیا۔" میں نے بھی تیزی سے جواب دیا۔

"اوکے۔ تم جاؤ۔" وہ افراتفری میں بولا۔ گیت چھوڑنے سے پہلے میں نے دیکھا۔ خود لڑکی رکتے سمیت فوراً اندر چلی گئی تھی۔ میں واپس گاڑی کی طرف جانے کے بجائے سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ سیلف گاڑی میری جیب میں پڑا تھا۔ یقیناً گاڑی کو دھکا لگا کر سی راستے سے بنایا جاسکتا تھا۔ میں ممکن تھا، اب تک وہاں ٹریفک جام ہو چکا ہو۔ میں واپس جا کر تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ گاڑی کا کیا تھوہ پھر بھی آسکتی تھی۔ مجھنی کے کسی ملازم کا ملازم بھی ایک اشارہ کرنا تو ٹریفک پولیس والے خود گاڑی مطلوبہ مقام پر پہنچا

دینے

میں فیوڈ کنور روڈ پر واقع ایک رستوران میں جا کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ لگانا میرے لیے ہرگز مشکل نہیں رہا تھا کہ مجھنی کنور آج صبح سے کسی خاص مہم پر نکلا ہوا ہے۔ یہ حد عجیب بات تھی کہ مجھنی جیسا ذمے دار اور با اختیار شخص کسی کا ٹھیک لڑکے کے سے انداز میں معاشقے لڑا رہا تھا۔ یہ سوچ کر شرمندگی سی ہونے لگی کہ وہ اپنی محبوبہ کے گھر گیا تھا اور مجھے اپنے پرے پر کھڑا کر گیا تھا۔ یہ ذمے داری استاد جہانی کے شاہان شان ہرگز نہیں تھی۔

میں اپنی جگہ بیٹھا کر دھار اور سوچتا رہا کہ وہ سیاہ گاڑی کس کی تھی جس کے "استقبال" کے لیے مجھے پوسٹ آفس کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کو بجلی سڑک کی

طرف آتے دیکھا تھا۔ اس میں صرف ایک شخص تھا۔ فاصلہ کافی تھا۔ میں ٹھیک سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن وہ کوئی نوجوان شخص تھا۔ میں ممکن تھا کہ وہ مجھنی کنور کی محبوبہ کا بھائی یا شوہر ہو۔ شوہر کے امکانات زیادہ تھے کیونکہ وہ لڑکی اپنے لباس اور طور اطوار سے شادی شدہ لگی تھی۔ یہ میں کس پتھر میں پہنچ گیا تھا۔ میرا ٹارگٹ شیطان ابن شیطان شکر شکرا تھا اور وہ لوگ تھے جو اس کے ساتھ مل کر ایک پیش ہما دینے کو اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اس کو دیکھنے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ دولت اتنی زیادہ ہے کہ بے شمار بھوکے بچے، ضرورت مند انسانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اگر اس دولت کو استعمال ہی ہوتا تھا تو پھر محفوظ ہاتھوں میں کیوں نہ پہنچتی اور اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیوں نہ ہوتی؟ کیوں وہ عیاش مہم جوؤں کی تجویزوں میں بھری جاتی اور سیاہ کاریوں میں آزادی جاتی۔

گمشدہ ٹرک کا تصور پوری جزئیات کے ساتھ میرے تصور میں چمک اٹھا۔ وہ ٹرک اپنے مال و اسباب سمیت ہوا میں تحلیل نہیں ہوا تھا۔ یقیناً وہ ہمارے ارد گرد ہی کہیں موجود تھا۔ سرحد کی اس جانب یا اُس جانب ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ اسے تلاش کیا جائے اور بات صرف ٹرک ہی کی نہیں تھی، سفود کی بھی تھی۔ سفود جو اپنے چند روزہ ساتھ میں میرے دل پر اپنی دوستی اور محبت کے اگست نقوش چھوڑ گیا تھا۔ وہ ٹرک کے ساتھ ہی لا پتا ہو گیا تھا۔ اس کا تصور ہر وقت میرے ذہن سے چپکا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انجم کی سوال پوچھتی آنکھوں کا تصور بھی۔ سفود "انجم کی محبت ہی نہیں اس کی زندگی بھی تھی۔

مجھنی کنور کسی اور ٹائپ کا شخص تھا۔ وہ اپنے ہر فیصلے کو

حرف آخر سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہی طرز عمل ٹھیک ہے جو اس کے نزدیک ٹھیک ہے۔ ایسے شخص کو دلیل اور منطق سے اپنا خیال بنانا قریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں مجھنی کے مزاج کی اس گہ کو اچھی طرح دیکھ اور پرکھ چکا تھا۔ اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چونکا پڑا۔ چنانچہ کچن کی آواز آئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر ہو گیا۔ سائیں عالی لمبے چوڑے میں لبوس اپنے ننگے پاؤں کو حرکت دیتے میری سمت چلا آ رہا تھا۔ حسب معمول اس کے بال جٹاؤں کی صورت کندھوں پر بکھرے تھے۔ گلے میں اوڑیاں، بے شمار ملاؤں اور گھنٹیوں میں سے چھٹا چھن کی آواز آ رہی تھی۔ سائیں کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز بیاض زخم کا پراانا نشان تھا۔

ایک ہیرا تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ "معاف کرو یا بھئی! ہر چلو"

سائیں عالی لاجت سے دانت نکالنے کے بجائے طلق کے بل دباؤا۔ "دفعان ہو جا مردود۔ پیچھے ہٹو۔ ہمیں اپنے یار سے بات کرنے دے۔"

سائیں عالی کے لب و لہجے کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف بڑے سسم گئے بلکہ موٹی توند والا خیر بھی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے سائیں کے جاہ و جلال کا معترف ہو گیا۔ سائیں عالی شان بے نیازی سے میزوں کے درمیان سے گزرا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چوہو دیر اپنی حد بھنگیلی آنکھوں سے میری حیرانی ملاحظہ کرنا پھر بغیر کسی تہدید کے بولا "بیٹا! جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہے۔ وہ ہے جو نظر نہیں آتا ہے۔ جس راستے پر چل رہے ہو چلے رہو۔ تم وہیں پہنچو گے جہاں پہنچنا چاہتے ہو۔ ہاں ہاں چلے رہو۔ مجھنی کنور کے پیچھے اسے خود پتا نہیں کہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ وہیں جا رہا ہے جہاں تم جانا چاہ رہے ہو۔"

"مممم۔ میں کچھ سمجھا نہیں سائیں" میں نے کہا۔ "مجھنی کی ضرورت ہی نہیں" وہ بولا "بس تمہیں کدھر رہا ہوں تاکہ مجھنی کے پیچھے چلے جاؤ۔ ہاں چلے جاؤ اس بے خبر کے پیچھے۔"

"لیکن آپ یہاں کیسے پہنچے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہمیں بس زیادہ سوال مت کرو۔ ورنہ میں شفیق محمد کو بلوا لوں گا۔" وہ تنہم سے بولا۔

اس نے "حق ہو" کے چند ٹک ٹکاف نعرے لگا کر

رستوران میں سسٹنی کی لہرو ڈالی اور مجھے اچانک آیا تھا ویسے ہی باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ رستوران میں موجود لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں خود بھی حیران تھا کہ یہ سائنس عالمی واقعہ تو ایک دم کہاں سے آچکا ہے۔ وہ کسی سامنے کی طرح میرے تعاقب میں تھا اور میرے معمولات کی اسے پوری اطلاع رہتی تھی۔ کبھی کبھی میرے دل سے صدا اٹھتی تھی کہ یہ شخص گوشت و پوست کا ہونے کے باوجود گوشت و پوست کے انسانوں سے بہت مختلف ہے۔

سائنس عالمی ذہن معنی باتیں کر کے گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں مجبئی کنور کے ساتھ لگا رہوں۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہنے لگا کہ جب تک کوئی دوسری اچھی تجویز ذہن میں نہیں آتی، میں سائنس عالمی کی ہدایت پر ہی عمل کروں۔ میں رستوران سے اٹھا اور اس ارادے کے ساتھ واپس مجبئی ہیلز کی طرف چل دیا کہ اگلے چند روز میں یہ قیام کروں گا۔

☆ ☆ ☆

میں مجبئی ہیلز واپس پہنچا تو مجبئی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے نیلے پردوں والی ستر زائل فائنس پورج میں کھڑی دیکھی۔ انیسکی کے لان میں زیریں گلی اور بوٹا تھکے آہنی پائنتی مارے بیٹھے تھے اور شام کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ زیریں گلی کے چہرے پر دنیا جہان کا نظکر مٹا ہوا تھا جیسے دنیا کے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال دینے کی تمام تر ذرے داری اسی پر عائد ہوتی ہو۔ میں نے جب بھی اسے اخبار پڑھتے دیکھا، یہی پدیشائی اور تشویش اس کے چہرے پر دکھائی دی۔ حتیٰ کہ جمعہ سیکریٹریان قلمی صفحہ پڑھتے ہوئے بھی اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اخبار ہاتھ میں لیتے ہی چہرے پر ”تشویش“ سمجائی جاسیے۔

اس سے قبل کہ میں بوٹا تھکے اور زیریں گلی کو مخاطب کرتا یا وہ میری طرف متوجہ ہوتے ایک جانب سے خدا بخش عرف اللہ دین کے چراغ کا جن نمودار ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ مجبئی صاحب کالی دیر سے میری راہ دیکھ رہے ہیں۔

میں نے خدا بخش کو بتایا کہ جس کو نا گاڑی پر میں گاڑوں گا توں گیا تھا وہ وہاں ایک بگلی سڑک پر بند پڑی ہے۔ اسے وہاں سے منکوا لیا جائے۔ خدا بخش نے کہا ”بہتر بہتر جی“ میں نے گاڑی کی چابی اسے دے دی اور خود مجبئی صاحب سے ملنے کے لیے نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ مجبئی ایک ہلکا چٹکا لباس پہنے ہوئے صوفے پر نیم دراز تھا اور سگار

پھونک رہا تھا۔ اس نے بے تکلف لہجے میں میرے سلام کا جواب دیا اور سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ محبوبہ سے ملنے کے بعد اس کا موڈ بحال تھا اور ہونٹ خوشگوار انداز میں کھچے ہوئے تھے۔ پرچہ لگا ”کیا بات ہوئی تھی۔ واکلی ٹاکی کیوں استعقال نہ کیا؟“

”آپ خود ہی دیکھ لیں جی“ میں نے واکلی ٹاکی جیب سے نکال کر اسے تھمادیا۔

وہ کچھ دیر اسے اٹ پلٹ کر دیکھا رہا، پھر بولا ”واقعی یہ تو کام نہیں کر رہا ہے۔ بہر حال ٹوٹل ڈن۔ تم نے بدوقت فیصلہ کیا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے گاڑی ترجیحی کر کے سڑک پر بند کر دی تھی؟“

”اس کے سوا مجھے کچھ ٹوجہا ہی نہیں“ میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرایا ”حاضر دانی مجھے اچھی لگتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں ایسے لوگوں کا دربان ہوں لیکن ایک بات پر میں حیران ہوں۔ تم جیسے حاضر دماغ اور ہوشیار شخص کی محبوبہ تم سے کیسے جھین لی گئی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ تم نے یہ غم جان بوجھ کر گلے لگایا ہے۔ وہ مجھے پرانے زمانے کی روٹی دھوٹی فلوں میں دلب کمار کیا کرتا تھا اور سب کچھ کرتا ہے مگر محبوبہ سے شادی نہیں کرتی۔ اگر شادی ہو بھی رہی ہو تو خود ہی اس کے راستے میں روڑے انکا دینے ہیں۔ اور پھر اٹھا رہا تھا وہ گائے ایک فلم میں گا کر آخر میں موت کو گلے لگالیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان فلوں نے ایک طرح کی خود اذیتی کو رواں دواں کیا اور یہ روان کسی نہ کسی طور آج تک چل رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ میں نے یہ شادی جان بوجھ کر نہیں کی ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں میں جس قسم کی زندگی گزار رہا ہوں اس میں ٹھکر بہتی تھی لہے کوئی محتاجش نہیں نکلتی۔ ایک بھلی مانس شریف لڑکی کو اپنے ساتھ خراب کرنے کے بجائے میں نے بہتر سمجھا کہ اسے کوئی دوسرا راستہ چننے دوں۔“

”یہ سب فضول باتیں ہیں۔“ مجبئی نے ہنسی سے سگار اٹش ٹرے میں مسلا ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ جو دوسرا راستہ اس نے چنا ہے وہ خرابی کا نہیں ہوگا۔ بہر حال میں اس معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن تمہارے لیے میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔ تم صرف ایک بار ”ہاں“ کہہ دو۔ وہ لڑکی جہاں اور جس حال میں بھی ہوگی تم تک پہنچ جائے گی۔“

میں نے بلا ٹالنے کے لیے کہا۔ ”جناب، میں آپ کی مہربانیوں کا بہت ممنون ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔“

”اوکے“ مجبئی نے سگار رکس سے ناگوار نکالے ہوئے کہا۔ ”تمہارے دونوں ساتھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی موجودگی میں تم خود کو یہاں زیادہ ”ایڑی“ محسوس کرو گے۔ باقی کسی بھی قسم کی ضرورت ہو، خدا بخش سے کہو۔ خدا بخش نہ ہو تو سکندر ہے۔ سکندر چوہیں کھٹے یہاں موجود رہتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد میں مجبئی کنور سے رخصت ہو کر انیسکی میں واپس آ گیا۔ آدھ ہون کھٹے کی گفتگو میں مجبئی نے سیاہ مارک ٹو کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی کوئی نمبر انچ اے ۳۳ کے حوالے سے کوئی وضاحت کی تھی اور میں تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ از خود یہ موضوع چھیڑتا۔

بوٹا تھکے اور ہنس کھڑے زیریں کی موجودگی میں مجبئی ہیلز کا قیام ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا لیکن میں جس ذہنی کرب سے دوچار تھا اس نے مجھے کسی کڑھ جہن نہیں لینے دیا۔ میں نے اب تک زیریں اور بوٹا کو فرال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن وہ میرے دوشے سے بھانپ چکے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی ساتھ کچھ پر گزر چکا ہے۔ اگلے چار پانچ روز میں مجھ پر کچھ اہم انکشافات ہوئے۔ ان انکشافات کا حلقہ مجبئی کی نجی زندگی سے تھا۔ مجبئی ایک دل پیونک شخص مشہور تھا۔ آج کل اس کا معاشرہ سلمان آذر دانی ایک جوان سال شیکر کی خود بخود پوری تائید سے چل رہا تھا۔ تائید آذر ایک بچے کی ماں تھی اور اُمرا کے حلقوں میں ”پرانی گرل“ کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور عمومی طور پر اس کی فلی کو بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ درحقیقت یہ حکمران پارٹی کے ایک نوجوان رسائی سیاستداں اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ماڈرن لڑکی کا معاشرہ تھا۔ دونوں شادی شدہ اور بال بچے دار تھے۔ اپنی جگہ دونوں کی بہت سی مجبوریاں تھیں اور ان محنت مآلی بندھنوں نے دونوں کو جکڑ رکھا تھا مگر وہ بڑی خاموشی سے ایک ایکٹنڈل کو پروان چڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ تبھی ایک بے خوف اور دلیر شخص تھا۔ اقتدار و آؤر رٹونف نے اس کی دلیری کو دو آتشہ کر دیا تھا اور جب مودلر دیا اختیار ہو تو اس کی عورت کو شکار کرنے کی صلاحیت کی نگاہ نہ دیا جاتی ہے۔ ابھی مجبئی و تائید کے پیار کا قصہ عام نہیں ہوا

تھا اور گھٹے افراد کو ہی اس بارے میں پتا تھا لیکن یہ بات تادیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

نہیں روز بعد بندہ وار چھٹی تھی۔ بننے کی رات کو مجبئی نے اپنی ۳۶ واپس ساگر کا ایک کانا۔ یہ ٹیک ایک شاندار تقریب میں کانا کیا۔ باقی جنزری کے قریب کچھ درجن خواتین و حضرات اس تقریب میں موجود تھے۔ صاحبان ڈنر ٹوٹ ڈالنے اگلیوں میں سگار واپ دباے پھر رہے تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں جام بھی نظر آ رہے تھے۔ خاتون جدید ترین فیشن کے کپڑوں میں لیوٹس اپنے اپنے ہیڑا شاگل اور میک اپ پر تازاں فلوں کی صورت میں کھڑی مصوب گفتگو تھیں۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں کوک کے گلاس تھے اور کچھ نے سگریٹ بھی سٹکا رکھے تھے۔ وہ بڑی روانی سے گاڑیوں کے نئے ماڈلز، نئی فلوں اور نئے اسٹینڈرڈ کی باتیں کر رہی تھیں۔ گاہے گاہے سٹریٹ قبوں کا جلتیگ بج اٹھتا تھا۔ مجھے اس گھما گھمی میں ناہید بھی نظر آئی۔ اپنے جھمرے بدن اور لمبے ریشمی بالوں کی وجہ سے وہ بہت ممتاز نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک جھلملائی ساری پہن رکھی تھی۔ گلے میں بے موتیں کا ہار تھا۔ تائید کے ساتھ اس کا شہر آؤر بھی تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک قبول صورت شخص تھا۔ رنگ سفید اور ہونٹ ضرورت سے زیادہ سرخ تھے جیسے ان پر سرنی لگائی گئی ہو۔ پدیشائی سے بال آؤرے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑی بے تکلفی سے مجبئی کے قریب کھڑا ہے، دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر یہ گمان بہت مشکل تھا کہ وہ اپنی بیوی اور مجبئی کے ”بھٹے پھولنے“ تعلقات کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ پیار کرنے والوں کی دنیا جڈا ہوتی ہے۔ وہ بھری محفل میں بھی ہوں تو تھائی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے ہیں لہذا اور گردے سے بالکل بے خبر ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں اکثر ان سے ایسی حرکتیں بھی سرزد ہوجاتی ہیں جو دوسروں کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ میں اس تقریب میں اس ساری تصویر کو پرکھنے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ مجبئی اور تائید کی نگاہیں بار بار ملتی تھیں اور ان نگاہوں کے ملنے سے ایک شرارہ سا چھوٹ جاتا تھا۔ معلوم نہیں اس شرارے کو اور کتنے لوگ دیکھ رہے تھے۔ بہر حال میں بخوبی دیکھ رہا تھا۔ بھری بڑی محفل میں نگاہوں اور مسکراتے ہونٹوں کی جنبش سے ایک دلچسپ کھیل کھل جاتا تھا۔ ایک تادیر وہ ڈور ہی تھی جو میزبان اور خوبصورت مہمان کے درمیان تھی ہوتی تھی۔



ایک مٹ جانے کے بعد رقص کا دور چلا۔ رقص گاہ کے چمیل سیاہ فرش پر روشنیوں اور رنگوں کا سیلاب سا آیا۔ آرکسٹرا ”چاچا پاپا“ کی دھن بکھیرنے لگا۔ خوشنما جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اور جسم سے جسم ملا کر مچر رقص ہو گئے۔

آرکسٹرا نے کئی دھنیں بجائیں اور وقفے وقفے سے رقص کے تین دور ہوئے۔ اس دوران میں پارٹنر بھی بدلے جاتے رہے۔ ایک موقع پر میں نے بھینگی کو ٹاہید کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر میری نگاہوں نے آؤر کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس تقریب میں جاگیردار قادر زماں بھی اپنے دو بونے باڑی گاؤں سمیت موجود تھا۔ دو تین بار اس سے میری آنکھیں چار ہوئیں لیکن حیرت انگیز طور پر وہ لاپتہ رہا۔ بالکل بے گانہ نظر آ رہا تھا۔ وہ نہ اس کے چہرے پر مجھے دوستی نظر آئی اور نہ دشمنی۔ ساری حالات کی بات تھی۔ کسی عام شخص نے معمولی سی غلطی بھی کی ہوتی تو قادر زماں اپنے عقوبت خانے میں لے جا کر اس کی کھال کھینچ لیتا۔ میں نے ٹکے کی چوٹ پر اس سے فکری تھی۔ اس پر رائفل تان کر اسے پینڈ زاپ کرایا تھا اور دو نہایت قیمتی ہونوں سے اسے محروم کیا تھا لیکن وہ نہ تو مجھ پر بجلی بن کر کرا تھا اور نہ اس نے میری کھال کھینچنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ سب اس لیے تھا کہ میں بھینگی کنور کا منظور نظر بن کر اس کے ذخایہ عاطفت بھرا گیا تھا۔

ذرا بعد مسانوں نے ساغر وینا سے جی بھر کر دل پہنایا۔ یہ بھلے فضا و طرب رات ڈھائی بجے تک برپا رہی۔ پھر مسان جانا شروع ہو گئے۔ کچھ پاؤں پر چل کر گئے اور کچھ کو

ان کے ڈرائیوروں اور گاؤں وغیرہ نے سارا دے کر گاڑیوں تک پہنچایا۔ ایک مشہور و معروف صنعت کار کو باقاعدہ گود میں بھر کر پارکنگ لائٹ تک پہنچا دیا۔ انا غصیل ہونے والوں میں ٹاہید کا شوہر نامہ ارسلان آؤر بھی شامل تھا۔ وہ بسکی بسکی ہاتھیں کر رہا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ از خود گاڑی ڈرائیو کر کے گھر پہنچ سکتا۔ بھینگی کنور نے اپنے ذاتی ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ مسٹر اور مسز آؤر کو مرینڈیز میں ان کے گھر تک پہنچا دے۔ مجھے حفاظت کی غرض سے ان دونوں کے ساتھ کر دیا گیا۔ یوں تو بھینگی کنور عموماً منڈب و شائستہ لہجے میں بات کرتا ہی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ٹاہید کی موجودگی میں اس کی تہذیب اور شائستگی اتنا کم چھوڑی ہے۔

گاڑی بھینگی پلس سے روانہ ہو کر نیم تاریک سنان سڑکوں پر پہنچے لگی۔ ٹاہید اپنے شوہر کے ساتھ پچھلی نشست پر بھی جب کہ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آؤر ترک میں انہی سیدھی کرکٹیں کر رہا تھا۔ کسی وقت عقبی نشست سے چڑھ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ گاڑی میں ہی بیوی سے محبت جتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی وقت وہ بسکی بسکی سرو آہیں بھرنے لگا۔ پھر وہ بھینگی کنور کی شان میں قصیدے پڑھنے لگا۔ ”بھینگی صاحب بڑے اچھے ہیں۔ بڑے بڑے۔ بڑے ہی اچھے ہیں۔ ہیں ٹاہید؟ دیکھو کتنے مہربان ہیں۔ ہمیں اپنی گاڑی میں بھیج دیا ہے۔ کہتے تھے میں ہمیں اپنے ساتھ امریکا کے دورے پر بھی لے جاؤں گا۔ ہا۔ امریکا، واشنگٹن ڈی سی، وھائٹ ہاؤس، گوری گوری پنڈلیوں والی گوری گوری میسین“

آؤر اور ٹاہید کو گاؤں ٹاؤن میں ان کے گھر اتار کر ہم بھینگی پلس واپس روانہ ہو گئے۔



اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔